معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت آٹھ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

جلد ۷۵ ماہ جمادی الاول ۱۳۷۴ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۵۵ء عدد ۱

مضامین

مجلسِ ادارت

(۱) جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی — صدر

(۲) جناب مولینا سید مناظر احسن صاحب گیلانی، — رکن

(۳) جناب ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی، — "

(۴) جناب مولانا عبدالسلام صاحب ندوی — "

(۵) شاہ معین الدین احمد ندوی — مرتب

(۶) سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے — شریک مرتب

اسلام اور عربی تمدن

یعنی شام کے مشہور فاضلِ اجل علامہ محمد کرد علی کی کتاب الاسلام والحضارۃ العربیہ کا اردو ترجمہ جس میں مذہبِ اسلام اور اسلامی تمدن و تہذیب پر علمائے مغرب کے اہم اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، اور یورپ پر اسلام اور مسلمانوں کے اخلاقی، علمی، اور تمدنی احسانات اور اُس کے اثرات و نتائج کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اور قرونِ وسطیٰ کی پرفریب سیاست کا پردہ چاک کیا گیا ہے۔

(از شاہ معین الدین احمد ندوی)

قیمت: [illegible]

حکمائے اسلام جلد اوّل

دوسری صدی سے لیکر خاندانِ خیرآباد و فرنگی محل تک کے تمام مشہور مسلمان فلاسفہ کے حالات، اور ان کے فلسفہ پر تبصرہ، یہ جلد پانچویں صدی ہجری تک کے حکماء کے حالات پر مشتمل ہے، شروع میں ایک مقدمہ ہے جس میں یونانی اور اسلامی فلسفہ کی مختصر سرگذشت تحریر ہے، کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ مسلمان فلاسفہ اور حکماء نے فلسفہ سے مذہب کی تخریب و بیخ کنی کے بجائے زیادہ تر مذہب کی تائید و حمایت کا کام لیا ہے،

(مؤلفہ عبدالسلام ندوی)

قیمت: [illegible]

مسئلہ پر غور کرنے اور اس کا حل تلاش کرنے کے لئے ۱۰ ر ۱۱ جنوری کو بمبئی میں ایک آل انڈیا دینی تعلیمی کنونشن منعقد کیا ہے جس میں ہر طبقہ کے علماء، مفکرین، ماہرین تعلیم اور اس مسئلہ سے دلچسپی رکھنے والوں کو شرکت کی دعوت دی ہے، افسوس ہے کہ راقم خصوصی دعوت کے باوجود بعض مجبوریوں کی بنا پر اس اہم کنونشن کی شرکت سے محروم رہا،

ہندوستانی مسلمانوں کی دو حیثیتیں ہیں، ایک مذہبی و ملی، دوسری قومی اور وطنی، اور ان پر ان دونوں کے حقوق و فرائض ہیں، اور وہ ان کو اسی وقت ادا کر سکتے ہیں، جب ان کی مذہبی و قومی تعلیم میں توازن ہو تاکہ وہ اپنی مذہبی و تہذیبی خصوصیات کو بھی برقرار رکھ سکیں، اور ہندوستانی قومیت اور وطنیت سے بھی بیگانہ نہ ہوں، اور ملک و وطن کی محبت اور خدمت میں ان کا قدم کسی سے پیچھے نہ رہے، ایک مسلمان ملک کا اسی وقت سچا خادم ہو سکتا ہے جب وہ اپنی دینی روح سے آشنا اور سچا مسلمان ہو، اس لئے کہ مذہب خود وطن کی محبت کی تعلیم دیتا ہے، چنانچہ ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں انہی مسلمانوں کا زیادہ حصہ رہا ہے، جو مذہبی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے، اس لئے قومی و وطنی نقطۂ نظر سے بھی مسلمانوں کی مذہبی تعلیم ضروری ہے، گو اس کے لئے کسی عمر کی قید نہیں لیکن عقائد و خیالات کا نقش ابتدا ہی سے بیٹھتا ہے، اس لئے ابتدائی تعلیم ہی سے دینی تعلیم کی بنیاد پڑنا ضروری ہے، مگر سیکولر حکومت مذہبی تعلیم کا انتظام نہیں کر سکتی، اس لئے مسلمانوں کو خود اس کا نظام قائم کرنا ہوگا،

مگر یہ کام محض چند مقامات پر دینی مکاتب قائم کر دینے یا مذہبی نصاب تیار کر دینے سے پورا نہیں ہو سکتا، اس کے لئے پورے ہندوستان میں اس کا مکمل نظام قائم کرنے کی ضرورت ہوگی، جو مسلمانوں کی اقتصادی حالت اور [illegible] کو دیکھتے ہوئے آسان نہیں ہے لیکن اس کے بغیر چارہ کار بھی نہیں، اگر مسلمان اس تعلیم کا انتظام خود نہیں کرتے، اور ان کے بچے صرف سرکاری بیسک تعلیم پر رہ جاتے ہیں، تو ان کی آیندہ نسلیں محض نام کی مسلمان باقی رہیں گی، اور ان میں نام کے علاوہ ان کے مذہب و تہذیب کی کوئی نشانی باقی نہ رہ جائیگی، اس لئے کنونشن کی تجویزوں کے مطابق جمعیۃ العلماء کی نگرانی میں اس نظام کو بہرحال قائم کرنا ہے،

اتر پردیش میں حکومت کی تھوڑی سی توجہ و امداد سے اس صوبہ میں اس کام میں آسانی ہو سکتی ہے، اس کے لئے کسی رعایت کی ضرورت نہیں بلکہ مسلمانوں کو جو تعلیمی حقوق حاصل ہیں، ان کو عملاً پورا کیا جائے، مثلاً اگر مسلمان اردو کی تعلیم کے شرائط کے مطابق اس کی تعلیم حاصل کرنا چاہیں تو اس میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالی جائے، اور ان کی تعلیم کا انتظام کیا جائے، اس کے نصاب کی معیاری کتابیں مہیا کی جائیں، اسلامی مکاتب کا پرانا نظام جسکو رفتہ رفتہ ختم کیا جا رہا ہے، باقی رکھا جائے، اور اسکو ترقی دیجائے اور ڈسٹرکٹ بورڈوں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

انگریزی حکومت پر یہ بڑا الزام تھا کہ اس کا بنایا ہوا نظام تعلیم خالص اس کے اغراض کے مطابق تھا جس میں ہندوستانیوں کی قومی و مذہبی ضرورتوں کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا تھا اس لئے اسی زمانہ سے اسکی مخالفت شروع ہوگئی تھی اور تعلیم کو قومی بنانے کی تحریک شروع ہوگئی تھی اب آزاد ہندوستان کی بنیادی تعلیم کے سلسلہ میں قریب قریب اسی قسم کی صورت حال مسلمانوں کو پیش ہے انگریزوں کے زمانہ کی تعلیم تو بہرحال [illegible] کے معاملہ کے مطابق تھی مگر بنیادی تعلیم تمامتر ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں تھی اسی کا نتیجہ تھا کہ اس زمانہ میں بھی یہ تعلیم مسلمانوں کے جذبات و خیالات سے بالکل خالی اور ہندوؤں کے تہذیبی رنگ و مذہب [illegible] تھی مگر لازمی نہ تھی اس لئے مسلمان اس سے کم فائدہ اٹھاتے تھے لیکن ایک حد تک اس کی تلافی اردو کے اسکولوں اور غیر سرکاری مکاتب اسلامیہ سے ہو جاتی تھی مگر اب اردو تعلیم سے بالکل خارج کردی گئی ہے اور جن شرائط کے ساتھ اس کی تعلیم کی اجازت دی گئی ہے ان پر بھی عمل نہیں ہو رہا ہے اور نصاب کی کتابیں محض نام کے لئے اردو کی ہیں ان کی زبان نہایت خراب ہندی نما اور ان کے مضامین [illegible] ہندو تہذیب [illegible] پر مشتمل ہیں [illegible] ہو گیا [illegible] طریقۂ تعلیم [illegible] ان کو حاصل کرنے پر مجبور ہیں [illegible] اپنے مذہب اور اپنی تہذیب و روایات سے کیا تعلق رہ جائے گا۔

ہندوستان کی سیکولر جمہوری حکومت نے تمام فرقوں اور اقلیتوں کو اپنی مذہبی اور تہذیبی خصوصیات کو قائم رکھنے کا پورا حق دیا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ان کی بنیادی تعلیم ان کی ضروریات کے مطابق ہو، اس لئے یہ مسئلہ تنہا مسلمانوں کا نہیں بلکہ ہندوستان کی تمام اقلیتوں کا ہے، مگر دوسرے فرقوں کے لئے اس مسئلہ کا حل زیادہ مشکل نہیں ہے لیکن مسلمانوں کی حالت نے اس کو ان کے لئے بہت دشوار بنا دیا ہے، ان حالات کے پیش نظر جمعیۃ العلماء اس

مقالات

حضرت شیخ سماء الدین دہلوی

از ڈاکٹر نذیر احمد ایم، اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ

شیخ سماء الدین[1] کنبو ملتانی ثم دہلوی، نویں صدی ہجری کے اکابر مشائخ میں تھے، جو عوام سے بڑھ کر خواص میں اس حد تک مقبول تھے کہ سلاطین وقت اُن کے آستانے کی خاک کو طرۂ افتخار سمجھتے تھے۔

پیدائش | سرزمین ملتان کو شیخ سماء الدین کی ولادت کا شرف حاصل تھا، مگر بدقسمتی سے اُن کی پیدائش کی صحیح تاریخ معلوم نہ ہو سکی، البتہ دوسرے اور واقعات کے ملانے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ۸۰۰ھ ہجری کے قریب وہ پیدا ہوئے ہوں گے، حسب ذیل قرائن اس قیاس کے مؤید ہیں،

(۱) خزینۃ الاصفیا[2] میں شیخ کبیر الدین اسماعیل کی وفات کا ۸۲۵ھ ہجری درج ہے، چونکہ شیخ سماء الدین نے شیخ کبیر ہی سے خرقۂ خلافت پایا تھا، اس لئے اُن کی وفات کے وقت اول الذکر کی عمر کسی حال میں ۲۵۔۳۰ سے کم نہ ہوگی،

(۲) شیخ سماء الدین اپنے سفر گجرات کے موقع پر ۸۵ سال[3] کے تھے، وہاں سے واپسی اور ورود دہلی کے درمیان کم از کم دو اور[4] مقامات پر قیام کر چکے تھے، ایک نتھمبور میں، دوسرے بیانے میں، بیانے میں شیخ اس

---

[1] چند جگہ یہ نام بہاء الدین ملتا ہے، مثلاً فرشتہ ج ۲ ص ۴۰۰، اور طبقات اکبری کا ایک نسخہ، مگر یہ غلط ہے [2] ج ۲ ص ۶۵ "شاہ دین، اکبر کبیر" تاریخ ہے، مگر یہ تاریخ شبہ سے خالی نہیں ہے [3] سیر العارفین نسخۂ مملوکہ ڈاکٹر ہاشمی ورق ۱۲۵ [4] ورق ۱۲۳ الف، ۱۲۵ ب

اور میونسپلٹیون کو ان کے قائم رکھنے پر مجبور کیا جائے اگر مصارف کی زیادتی کا عذر ہو تو اس مد کی رقم مین اضافہ کیا جائے جب تعلیم کے تمام شعبون مین توسیع و ترقی اور ان کے مصارف مین اضافہ ہو رہا ہے، تو کوئی وجہ نہین کہ اسلامی مکاتب کے مصارف مین تخفیف کیجائے یا ان کو سرے سے ختم کر دیا جائے، اصولاً اس مین بھی اضافہ ہونا چاہیے، ان مکاتب مین مسلمانون کی مخصوص تعلیم کے ساتھ دوسرے ضروری مضامین بھی پڑھائے جائین، اور ان کا درجہ بیسک سکولون کے برابر مانا جائے تاکہ مسلمان بچون کو آیندہ تعلیم مین دشواری نہو اگر حکومت ان مطالبات کو جو مسلمانون کا تسلیم شدہ حق ہے عملاً مان لے، تو اس صوبہ مین مسلمانون کی بنیادی تعلیم کا مسئلہ نسبۃً آسان ہو جائیگا مگر اسکی امید نہین ہے، اگر حکومت کی نیت نیک ہوتی، تو یہ مشکلات ہی نہ پیش آتین، اسلئے مسلمانون کو یہ کام اپنی قوت و ہمت کے بھروسے پر کرنا ہوگا ورنہ ان کی مذہبی و تہذیبی خصوصیات کے ساتھ ان کا ملی وجود باقی نہین رہ سکتا،

سر شانتی سروپ بھٹناگر کی موت ہندوستان کا بڑا قومی حادثہ اور علمی نقصان ہے، انکی موت سے ہندوستان ایک بڑے ماہر سائنس دان سے محروم ہو گیا، وہ سائنس کے عالم ہونے کیساتھ اردو کے خوش مذاق ادیب شاعر بھی تھے، جس کا اجتماع کم ہوتا ہے، یہ ذوق ان کو اپنے نامور نانا سے ورثہ مین ملا تھا، وہ غالب کے مشہور و محبوب شاگرد منشی ہرگوپال تفتہ کے نواسے تھے جن کو غالب محبت مین مرزا تفتہ کہا کرتے تھے، مکاتیب غالب مین ان کے نام کے بہت سے خطوط ہین، سر شانتی اردو شاعری کا بڑا ستھرا مذاق رکھتے تھے، ان کے کلام کا مجموعہ لاجونتی کے نام سے عرصہ ہوا شائع ہو چکا ہے، اردو زبان سے ان کو بڑی محبت تھی، اور غالباً وہ جامعہ اردو علی گڈھ کے عہدہ دار بھی تھے، اب ایسے خوش مذاق صاحب علم مشکل سے پیدا ہون گے،

یہ خوشی کا مقام ہے کہ لکھنو مین انجمن ترقی اردو کی صوبائی شاخ قائم ہو گئی، پنڈت کشن پرشاد کول اس کے صدر حیات اللہ انصاری جنرل سکریٹری، پروفیسر احتشام حسین خزانچی، اور کئی نائب صدر اور جوائنٹ سکریٹری مقرر ہوئے، اس صوبہ مین اردو کا علمی کام اسی جماعت کو کرنا ہے، اسی نے اردو علاقائی زبان جیسی تحریک کو کامیاب بنایا، اور اب اسکولون مین اردو کی تعلیم کو عملاً جاری کرانے کی کوشش کر رہی ہے، اور آیندہ بھی اس قسم کے کام یہی جماعت انجام دیگی، اسلئے لکھنو مین صوبائی شاخ کے قیام کی بڑی ضرورت تھی، اس سے اس صوبہ مین اردو کے کامون کو بڑی مدد ملے گی،

معلوم نہیں مگر اخبار الاخیار میں اُن کا ذکر دو بزرگوں کے درمیان ہے جن میں پہلے یعنی شیخ نورالدین کی وفات ۸۱۳ھ میں اور دوسرے یعنی شیخ اختیارالدین عمر کی ۸۰۹ھ میں ہوئی، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ شیخ راجو کا انتقال ان ہی ایام میں یعنی ۸۱۲ھ کے اندر ہوا ہوگا، ۸۱۲ھ ہجری کے قریب انتقال پانے والے شیخ سے ارتباط رکھنے والے کی پیدائش ۸۰۰ھ سے قبل فرض کرنا پڑے گی،

(۴) اخبار الاخیار[1] سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ نے طویل عمر پائی تھی، اگرچہ طویل عمر کا فقرہ مبہم ہے پھر بھی قیاس ہوتا ہے کہ وہ سو سال سے کم نہ رہے ہوں گے، چونکہ سنہ وفات بالاتفاق[2] ۹۰۱ھ ہجری ہے اس لیے ۸۰۰ھ کے کچھ قبل تاریخ پیدائش متعین ہو سکتی ہے،

والد ماجد کے حالات — سیر العارفین[3] میں ایک واقعہ کے ضمن میں شیخ سماء الدین کے والد ماجد کا ذکر آگیا ہے، چونکہ اس کے راوی خود شیخ موصوف ہیں، اس لئے اس کی صحت مشکوک و مشتبہ بھی نہیں سمجھی جا سکتی، اس واقعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کے والد بزرگوار کا اسم گرامی خواجہ بدھ فتح اللہ تھا، ایک بار انھوں نے اپنے ایک پڑوسی ملک نامی کی انتہائی منت و سماجت پر اس کی جاگیر کی درستی محصول کی ذمہ داری قبول کر لی لیکن چند دنوں بعد سلطان المشائخ سید صدرالدین کو خواب میں دیکھا کہ وہ اس کام سے منع فرماتے ہیں

(بقیہ حاشیہ ص ۶) وفات ۸۲۵ھ ہجری لکھی ہے، حالانکہ سیر العارفین ورق ۱۲ الف میں شیخ سماء الدین کے حوالے سے شیخ راجو کا انتقال پہلے بتایا گیا ہے (۲) کسی تذکرہ میں شیخ راجو کی طویل عمر نہیں بتائی گئی ہے، حالانکہ ۹۰۳ھ ہجری تک بقید حیات رہنے کے معنی یہ ہیں کہ کم از کم ۵۲ سال تک صاحب سجادہ تھے (۳) دونوں بھائیوں کی عمروں میں کافی تفاوت ملتا ہے، حضرت مخدوم جہانیاں ۷۸۵ھ ہجری میں ۸۰ سال کی عمر میں فوت ہوئے (اخبار الاخیار ص ۱۴۳) لیکن امکان اس کا بھی ہو سکتا ہے کہ شیخ کبیر ہی کی وفات کا سنہ غلط ہو، اس صورت میں شیخ راجو کے سنہ وفات کے مشتبہ ہونے کا کوئی قوی قرینہ باقی نہیں رہتا، بہرحال شیخ سماء الدین کی پیدائش پر ان اختلافات کا کوئی خاص اثر نہیں ہوتا،

[1] ص ۲۱۱ [2] ایضاً [3] ورق ۲۰ ب،

وقت مقیم تھے، جب وہان کا حاکم احمد[1] جلوانی تھا، جو سلطان بہلول لودی سے الگ ہوکر سلطان حسین شرقی سے ملنا چاہتا تھا، تاریخون سے پتہ چلتا ہے[2] کہ سلطان حسین نے بھائی محمود کو ہٹا کر ۸۶۲ھ مین تخت نشین ہوگیا، اور بہلول سے صلح کر لی، چنانچہ قطب خان لودی[3] کو جو محمود شرقی کے ہاتھون گرفتار ہوگیا تھا، سات سال کی قید کے بعد رہا کیا، اس اعتبار سے قطب کی رہائی ۸۶۹ھ میں ہوئی، کچھ مدت بعد حسین شرقی نے پھر بہلول پر چڑھائی کی، مگر جلد ہی صلح ہوگئی، یہ مدت خاصی طویل ہوگی، اس لئے قیاس ہے کہ سلطان حسین کے حملے کو ۸۷۰ھ ہجری کے قریب کا تصور کرنا چاہئے، صلح کی میعاد تین سال کی تھی، اسی درمیان مین احمد جلوانی سلطان حسین سے ملنے کی فکر کر رہا تھا، اس سے شیخ سماء الدین کا قیام بیانہ[4] ۸۷۳ھ ہجری کے قبل پوری طرح ثابت ہے، اس طرح اگر شیخ کی پیدائش ۸۰۰ھ ہجری سے کچھ قبل تسلیم کر لی جائے تو ان کا قیام گجرات ۸۶۵ھ کے قبل ثابت ہو جائے، اور گجرات، رنتھنبور اور بیانے کے قیام کی مدت تقریباً ۵۰ سال کی ہوجائے، جو قرین قیاس ہے،

(۳) شیخ سماء الدین نے حضرت مخدوم جہانیان کے بھائی اور اپنے والد کے پیر و مرشد شیخ راجو قتال کو نہ صرف دیکھا تھا، بلکہ ان سے کسی[5] حد تک مربوط بھی رہ چکے تھے، اگرچہ شیخ راجو کے انتقال کی صحیح[6] تاریخ

---

[1] سیر العارفین مین اور ایک طبقات اکبری مین (ج ۳ ص ۵۰۱ ترجمہ) سلطان احمد جلوانی درج ہے، مگر اول الذکر مین بھی ایک جگہ صرف احمد ہے، سلطان نام کا جز معلوم نہین ہوتا [2] طبقات اکبری ج ۱ ص ۳۰۴، فرشتہ جلد ۲ ص ۳۰۶، بدایونی ج ۱ ص ۳۰۷ [3] طبقات ج ۱ ص ۳۰۴ [4] بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ۸۷۵ھ کے قریب دہلی مین موجود تھے [5] ملاحظہ ہو سیر العارفین ورق ۱۲۱ ب [6] خزینۃ الاصفیا ج ۲ ص ۴۰ بہ صاحب مدارج النبوۃ کے حوالہ سے وفات کی تاریخ ۱۵ جمادی الآخر ۸۲۳ھ ہجری، اور مبارک شاہ ابن خضر خان کا عہد درج ہے، رجب ۸۲۷ھ مین ختم ہوتا ہے، صاحب خزینۃ الاصفیا نے صدر الدین محبوب اور بڑی مین دو تاریخین بھی لکھی ہین، مگر یہ تاریخ مشکوک ہے، کیونکہ (۱) اسی تذکرہ مین شیخ کبیر الدین اسمٰعیل کی تاریخ

"الٰہا بادشاہا! سماء الدین را از کرم عمیم خود ابواب سعادتِ ابدی، و اسباب دولتِ سرمدی مفتوح و میسر گردان"

شیخ سماء الدّین خاندانِ کنبوہ[1] کے چشم و چراغ تھے، شیخ جمالی جو ان کے عزیز قریب[2]، شاگرد اور داماد[3] بھی تھے، وہ دہلی کے اسی خانوادہ کے ایک فرد تھے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملتان اور دہلی کے ان دو کنبوہ خاندانوں میں عرصہ سے رشتہ داری قائم ہوتی چلی آ رہی تھی،

استاد اخبار الاخیار[4] سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ موصوف کے استاذ مولانا نثار الدین تھے[5]، جو میر شریف جرجانی کے بھی شاگرد رہ چکے تھے، مگر سیر العارفین میں مولانا نثار الدین کو مولانا فتح اللہ ملتانی کا استاد بتایا گیا ہے[6] تعجب یہ ہو کہ اس واقعہ کے ذرا ہی بعد[7] مولانا سماء الدین کے حوالہ سے خود اُن کے باپ خواجہ بدھ فتح اللہ کا ذکر ملتا ہے مگر کہیں بھی ایسا جملہ نہیں ہے جس سے ظاہر ہو کہ شیخ سماء الدین یا اُن کے والد خواجہ بدھ نے مولانا

(بقیہ حاشیہ ص ۸) گذرے ہیں، ملاحظہ ہو سیر العارفین ورق ۱۱۷ - ۱۱۸ و تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۸۱۴ [4] ورق ۱۲۰ اب،

[5] سیر العارفین ورق ۱۲۱ اب،

[1] تذکروں میں بشمول سیر العارفین خاندانی نسبت مذکور نہیں، مگر تاریخوں میں موجود ہے [2] و [3] تذکرۂ ریاض الشعرا (نسخۂ لکھنؤ یونیورسٹی) ورق ۸۰، پر شیخ سماء الدین کو شیخ جمالی کا خالو تو بتایا ہے مگر مخزن افغانی میں شیخ جمالی کو داماد بتایا گیا ہے (ملاحظہ ہو ص ۱۸۲) [4] ص ۱۱۲ [5] اخبار الاخیار میں اس لفظ کا املا "ثں" سے ہے، مگر سیر العارفین کی بزشت سے آیا ہے [6] ورق ۶۹ بعد . . . . [7] ملتان کے بہت بڑے فاضل تھے، اس شہر کے بیشتر علماء انہی کے شاگرد تھے، شیخ جمالی سے بڑا اتحاد و ارتباط تھا، اُن کے دو ممتاز شاگرد مولانا عزیز اللہ، اور مولانا امام الدین اس شہر میں بڑے نامور تھے، ان دونوں سے شیخ جمالی کے خصوصی تعلقات کا پتہ چلتا ہے، ملاحظہ ہو، سیر العارفین ورق ۶۶، ۶۷،

[8] ورق ۶۹ ب،

چنانچہ خواجہ فتح اللہ اس کام کو چھوڑ کر اپنے گھر لوٹ گئے لیکن ملک کی دوبارہ منت سے مجبور ہو کر خواجہ کو اس کی جاگیر پر پھر جانا پڑا لیکن اسی دن بالاخانہ پر وضو کر رہے تھے کہ سلطان المشائخ نمودار ہوئے اور انھوں نے خواجہ بدھ کو نیچے ڈھکیل دیا، خواجہ بچ گئے لیکن اس کام سے علٰحدگی اختیار کر کے اہل اللہ کے زمرے میں داخل ہو گئے، اور شیخ راجو قتال سے رابطۂ ارادت استوار کر کے سہروردیہ سلسلہ میں شامل ہو گئے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ سماء الدین بھی باپ کے ہمراہ شیخ راجو کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے سیر العارفین میں ہے[۵۱]:

"چنین استماع است کہ پدر بزرگوار ایشان مرید و مربوط حضرت محبوب العارفین و مطلوب المحققین حضرت سید صدر الدین[۵۲] محمد نیرۂ سید اعمال المعروف بہ شیخ راجو قتال بود، اگرچہ حضرت مخدومی مرشدی و مولائی شیخ سماء الملۃ والدین قدس سرہٗ مربوط و محبوب ایشان بودند لیکن خرقۂ خلافت و ارشاد از حضرت شیخ الاسلام و زبدۂ مشائخ عظام کبیر الدین[۵۳] اسماعیل کہ ظاہر و باطن آئینہ انوار نبوی و مظہر آثار مصطفوی بود داشتند"

شیخ سماء الدین کو بچپن سے عبادت میں جس قدر شغف تھا[۵۴] اس کا حال سیر العارفین میں خود شیخ کے حقیقی بھائی شیخ اسحاق کے حوالہ سے بیان ہوا ہے بارہ سال کی عمر سے تہجد کی نماز کبھی فوت نہیں ہوئی، شیخ جمالی نے خود شیخ سماء الدین سے ایک[۵۵] واقعہ نقل کیا ہے، کہ جب بارہ برس کے ہوئے تو اُن کے والد آدھی رات کے وقت اپنے پاس بُلاتے اور طرح طرح کی نصیحتیں کرتے اور یہ دعا مانگتے،

---

۵۱ ورق ۱۲۱ ب ۵۲ انھوں نے اپنے والد سید احمد کبیر سے ارادت و خلافت پائی، اپنے بھائی مخدوم جہانیان سید جلال بخاری کے بھی خلیفہ تھے، اُن کی وفات کے بعد ۷۸۵ھ میں سجادۂ خلافت بھی مل گیا، ہمیشہ عالم استغراق میں رہتے، ملاحظہ ہو اخبار الاخیار ص ۱۵۴، و سیر العارفین ورق ۱۱۶-۱۱۷ و تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۴۱۷ ۵۳ حضرت مخدوم جہانیان کے پوتے، اور حضرت شیخ راجو قتال کے شاگرد و خلیفہ تھے، عوارف کو انھوں نے شیخ سے سبقاً سبقاً پڑھا تھا، اُن کے دو صاحبزادے شیخ عبد الشکور اور شیخ عبد الغفور بڑے صاحب حال اہل کمال

کے بعد شیخ سماء الدین نے حضرت شیخ المشائخ شیخ کبیر الدین اسماعیل کی طرف رجوع کیا، سیر العارفین میں خود شیخ مذکو کے حوالہ[1] سے لکھا ہے کہ حضرت شیخ الاسلام صدر الدین محمد المعروف بہ شیخ راجو قتال (جو حضرت شیخ کے والد کے پیر و مرشد تھے) کے انتقال کے بعد وہ ایک روز حضرت کبیر الدین کی خدمت میں حاضر ہو کر شفقت و رحمت کے طالب ہوئے، حضرت شیخ کبیر نے ایک دوسرے صوفی درویش شیخ فضل اللہ کا ذکر کیا، اور اُن سے خرقۂ خلافت دلانے کا وعدہ کیا لیکن شیخ سماء الدین نے کچھ بھی نہ کہا اور مکان واپس چلے آئے، کچھ دنوں بعد پھر شیخ کبیر کے آستانہ پر گئے، اور وہی درخواست پیش کی، مگر شیخ نے گذشتہ موقع کی طرح پھر شیخ فضل اللہ کا تذکرہ کیا، اس پر شیخ سماء الدین نے کہا

"پیری و مریدی و مرشدی و مسترشدی برابطۂ قلبی و فرط محبت نہادہ اند و من این معنی نسبت حضرت مخدومی مستحکم و مستقیم می یابم"

اس جواب سے شیخ کبیر اس قدر متاثر ہوئے کہ فوراً اٹھ کر اُن سے بغل گیر ہوئے، اور حجرۂ خاص میں لیجا کر تلقین و ذکر شروع کیا ان ہی ایام[2] میں شیخ سماء الدین کے دل میں ترک علم ظاہری کا خیال راسخ ہو گیا تھا، شیخ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا کہ اساس دین کی بنیاد علم ظاہری پر ہے، اس لئے اس کو ترک کرنے کا خیال ختم کر دینا چاہیئے،

اس بیان سے صاف ظاہر ہو کہ شیخ سماء الدین کا تعلق سہروردیہ سلسلے سے تھا، سیر العارفین میں شیخ کے مرید شیخ جمالی نے اپنے اس تعلق[3] کا تفصیلی ذکر کیا ہے، اور اپنے سلسلے کے بزرگان شیخ بہاء الدین زکریا، شیخ صدر الدین اسید جلال الدین وغیرہ کا حال بڑی دلچسپی اور عقیدتمندی سے لکھا ہے، خزینۃ الاصفیاء[4] میں لفظ سہروردیہ اُن کے نام کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔

---

[1] سیر العارفین ورق ۱۲۱ وغیرہ [2] ایضاً ورق ۱۲۲ [3] ملاحظہ ہو سیر العارفین ورق ۱۴-۱۵ – بغداد کے قیام کے دوران میں شیخ عبد القادر جیلانی، شیخ شہاب الدین عمر سہروردی اور حضرت ابو حنیفہ کے مزارات کی زیارت کے موقع پر شیخ سہروردی حضرت کے صاحب سجادہ شیخ شہاب الدین احمد کے استفسار کے جواب میں۔

[4] ج ۲ ص ۴۷-۶۶

ثناء الدین کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا ہو، البتہ آخر الذکر کا حال کسی قدر تفصیل[1] کے ساتھ لکھا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان اسمٰعیل روبصلی، مولانا ثناء الدین بڑی صلاحیت کے عالم تھے، چند سال شیراز میں رہ کر سید شریف سے بھی علوم حاصل کرکے اپنے ہم عصروں میں بے حد ممتاز ہو گئے، ان کے والد قطب الدین بہرام تھے، جو کمسنی تک لاولد تھے، کلام اللہ کے حافظ تھے، ہر شب جمعہ کو حضرت بہاء الدین زکریا اور اُن کے صاحبزادے حضرت صدر الدین کے مقبرے پر حاضر ہوتے اور ایک ختم قرآن کے بعد واپس آتے، ایک شب ختم کلام کے بعد غنودگی طاری ہوئی حضرت شیخ صدر الدین کو خواب میں دیکھا کہ دو خرمے دے رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ ایک خود کھاؤ اور دوسرا اپنی زوجۂ محترم کو کھلا دو، انشاء اللہ تم کو فرزند نیک بخت حاصل ہوگا، ابھی اس جگہ سے نکل رہے تھے کہ ایک اور بزرگ نے دو خرمے دیے، ان دونوں کے حسب ارشاد عمل کرنے کا نتیجہ مولانا ثناء الدین کی ذات بابرکات تھی، شیخ جمالی نے اس واقعہ کو خود مولانا سے مذکور کے شاگرد مولانا فتح اللہ سے سُنکر نقل کیا ہے اور آخر الذکر نے خود اپنے شاگرد سے یہ باتیں سنی تھیں۔

بہرحال شیخ سماء الدین نے خواہ مولانا ثناء الدین سے علم حاصل کیا یا کسی اور بزرگ سے، یہ واقعہ ہے کہ انھوں نے علوم ظاہری میں بھی کافی دستگاہ پیدا کرلی تھی، اور ان کا معمول تھا کہ ہر روز[2] نماز چاشت سے دوپہر تک تفسیر، حدیث اور اصول فقہ کا درس دیتے جس میں اکابر علماء شریک ہوتے، ایک بار[3] اُن کی یہ بھی خواہش ہوئی کہ علوم ظاہری سے پوری طرح بے تعلق ہو جائیں، مگر اپنے پیر و مرشد کے حکم سے ان علوم سے دلچسپی باقی رکھنا پڑی،

خرقۂ ارادت اخبار الاخیار[4] میں لکھا ہے کہ شیخ سماء الدین شیخ کبیر نبیرۂ سید جلال الدین بخاری کے مرید تھے، اور سیر العارفین[5] سے اس کی پوری وضاحت ہوتی ہے، چنانچہ جیسا اشارہ ہو چکا ہے، بچپن میں ان کے والد خواجہ بدھ نے انھیں بھی شیخ راجو کا معتقد کر دیا تھا، لیکن باقاعدہ ان سے صرف نہیں ملی تھی، ان کی وفات

---

[1] ورق ۹۰ ا، [2] سیر العارفین ورق ۲۲ ب [3] ورق ۲۲ الف [4] ص ۱۲۱ [5] مثلاً دیکھو ورق ۱۲۱ وغیرہ۔

سفر گجرات | ناگور میں کچھ دنوں قیام کے بعد شیخ سماء الدین گجرات کی طرف چلے گئے[1]، اُس وقت اُن کی عمر ۶۵ سال کی تھی، اس لحاظ سے اُن کا سفر ۸۶۴ھ ہجری کے قریب ہوا ہوگا، گجرات کے قیام میں اُن کی ملاقات شیخ وجیہ الدین[2] احمد سے ہوئی جو بقول صاحب سیر العارفین[3] اُس وقت ۱۲۰ سال یا ۱۲۳ سال کے تھے، وہ علوم ظاہری میں "ابو حنیفۂ وقت" اور علوم باطنی میں "بایزید زمانہ" تھے، شیخ کے آنے کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے اُن کے ساتھ باوجود اتنی سال کے ایسا برتاؤ کیا، جو کوئی خورد اپنے بزرگ کے ساتھ کرتا ہے، حالانکہ دونوں کی عمر میں تقریباً ۶۰ سال کا فرق تھا، اور اپنا ایک خاص مصلا شیخ سماء الدین کی خدمت میں پیش کیا،

اخبار الاخیار[4] میں متاخرین مشائخ گجرات میں وجیہ الدین نام کے ایک بزرگ کا حال درج ہے، مگر ان دونوں نام بزرگوں کے حالات کے مقابلے سے بحقیقت آئینہ ہو جاتی ہے کہ دونوں دو الگ الگ شخص تھے جن کے زمانوں

[1] سیر العارفین ورق ۱۲۴ – ۱۲۵، [2] ان کے والد کا نام ملک ختیار الدین محمد تھا، جو فیروز شاہ تغلق بادشاہ ہند کے عزیز قریب تھے، باپ کی وفات کے بعد بہت زیادہ دولت و ثروت کے مالک ہوئے، اور ان کی زندگی کے ایام لہو و لعب اور فسق و فجور میں صرف ہونے لگے، اس پر ستم یہ ہوا کہ اس قدر حسین تھے کہ لوگ یوسف ثانی کہتے، ایک روز حضرت ابو اسحاق مغربی کی خانقاہ کی طرف سے گذر ہوا، شیخ نے دیکھتے ہی ایک کلوخ اُن کی طرف مارا اور کہا کہ اے لڑکے اس طرح کی زندگی کب تک بسر کرتا رہے گا، ان الفاظ کو سنتے ہی شیخ وجیہ بیہوش ہو گئے، ابو اسحاق ان کو اپنی خانقاہ میں لے گئے، اور پانی اُن کے حلق میں ٹپکایا، ہوش میں آئے تو حال دگرگون تھا، شیخ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے، اور کل دولت مستحقوں میں تقسیم کر دی، چند ہی دنوں میں مرتبۂ قطبیت تک پہنچ گئے، شادی نہیں کی تھی، ۱۱ سال مدینۂ طیبہ میں رہے، وہاں سے گجرات آئے، سلطان مظفر گجراتی اُن کا بے حد عقیدت مند تھا، احمد آباد شہر کے نزدیک ایک قصبہ میں مدفون ہیں، شیخ جمالی نے حج سے واپسی پر اُن کے یہاں حاضری دی، (ملاحظہ ہو سیر العارفین ورق ۱۲۵) [3] ایضاً مگر ندوہ کے نسخہ میں صرف ایک سو بیس سال درج ہے [4] ایضاً ص ۱۶۳،

ملتان سے روانگی اور ناگور میں قیام

ہندوستان کی علمی و تمدنی تاریخ میں ملتان کو غیر معمولی اہمیت حاصل رہی ہے، اس سرزمین میں سینکڑوں ایسے علما و فضلا پیدا ہوئے، جن کی وجہ سے سارے ہندوستان میں علم کا چراغ روشن ہوا، نویں صدی ہجری میں بھی اس خطے نے اپنی قدیم روایات قائم رکھیں، شیخ سماء الدین نے ایسے ہی علمی و ادبی ماحول میں نشو ونما پائی تھی، اُن کی زندگی کا بیشتر حصہ یہیں بسر ہوا، یہیں انھوں نے ظاہری علوم حاصل کئے، اور یہیں باطنی علوم میں کمال حاصل کرکے اکابر مشائخ میں شامل ہوئے، لیکن چند وجوہ سے انھیں اپنا وطن چھوڑنا پڑا، اخبار الاخیار میں ہے[1] کہ

"از ملتان بنا بر بعضے وقائع کہ دراں دیار واقع شدہ برآمد"

منتخب التواریخ[2] میں مولانا عبداللہ الہ داد طلبنی کے وطن چھوڑنے کی وجہ "خرابی ملتان" لکھی ہے، مولانائے مذکور شیخ سماء الدین کے ہم عصر تھے، قیاس ہے کہ صاحب اخبار الاخیار کے "بعض وقائع" اور صاحب منتخب کی "خرابی ملتان" سے ایک ہی چیز مراد ہوگی،

وطن سے روانگی کے وقت شیخ سماء الدین کی عمر ۴۰ سال سے کچھ زیادہ رہی ہوگی، قیاس ہوتا ہے کہ یہاں سے نکل کر وہ ناگور آئے، اور کچھ دنوں قیام کرکے گجرات چلے گئے، اس وقت اُن کی عمر ۵۰ سال کی تھی، اس طرح اُن کے وطن سے نکلنے کی تاریخ [illegible]ھ ہجری کے قریب ہوگی، سیر العارفین سے پتہ چلتا ہے کہ وطن سے نکلنے کے بعد چار مقام پر ان کا قیام رہا، اُن میں ناگور سب سے پہلے آتا ہے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ملتان سے سیدھے اسی مردم خیز خطے میں وارد ہوئے ہوں گے، یہاں کے قیام کا صرف ایک واقعہ سیر العارفین میں درج ہے[3]، ایک عورت شیخ کی بڑی عقیدت مند تھی، اس کے پاس ایک گائے تھی، اس کا دودھ دہی وغیرہ شیخ کی خدمت میں بھیجا کرتی تھی، ایک رات چور اُسے چرالے گئے، اُس نے یہ واقعہ شیخ سے کہا، وہ عشاء کی نماز میں تھی کہ اُس نے سنا گویا شیخ فرما رہے ہیں کہ تمھاری گائے آگئی ہے، نماز کے بعد اُس نے وہ گائے اپنے صحن میں پائی،

---

[1] ص ۱۱۱ [2] ج ص ۳۲۲ [3] ورق ۱۲۰، ۱۲۱ ؛

قیام بیانہ | شیخ سماء الدین زنبور سے بیانہ آئے لیکن یہاں آنے کی کوئی تاریخ معلوم نہیں ہے، البتہ یہاں انکا قیام زیادہ دنوں تک معلوم ہوتا ہے، بیانہ ان دنوں سیاسی حیثیت سے بہت زیادہ اہمیت حاصل کرچکا تھا سلاطین شرقی سلاطین دہلی کے درمیان برابر آزمائی جاری تھی، اور یہ کبھی حکومت دہلی کا جزو ہوجاتا، اور کبھی سلاطین شرقی اس پر اپنا قبضہ جما لیتے، اس اعتبار سے شیخ کے قیام کو ایک گونہ سیاسی اہمیت حاصل ہوجاتی ہے، اگرچہ شیخ کا تعلق براہ راست سیاست سے بالکل نہ تھا لیکن سلطان حسین شرقی اور بہلول لودی دونوں شیخ کی توجہ حاصل کرنے کے خواہاں تھے، ایک بار سلطان احمد جلوانی[1] حاکم بیانہ شیخ موصوف کی خدمت میں حاضر ہوا، اس کے ہمراہ مرتضی خان رسولدار کے علاوہ چند دوسرے امرا بھی تھے، یہ وہ زمانہ تھا جب سلطان حسین کے سر میں دہلی پر قبضہ کرنے کا سودا سوار تھا، اور احمد جلوانی مذکور سلطان حسین سے خفیہ سازش کرچکا تھا، چنانچہ شیخ کے حضور میں دعا کے لئے ہاتھ بلند کئے، اور شیخ سے بھی سلطان حسین کی کامیابی کے لئے دعا کا طالب ہوا، یہ سنتے ہی شیخ نے فرمایا "احمد! تیرے آبا و اجداد بہلول لودی کے پروردہ ہیں، اور تو بھی اسی کا نوازش یافتہ ہے، باوجود اس یقین کے کفران نعمت مذلت وعدم دولت کا موجب ہوتا ہے، اتنے حقوق نعمت پر یکبارگی کیونکر خاک مذلت ڈالتا ہے" اور اپنی تقریر اس جملے پر ختم کی،

"مرا چہ نسبت بہ عالے ظالمے کہ دست ظلم کشادہ پائے تعدی از دائرۂ عدالت بیرون نہاد

و بقصد عزیزے دود کہ ہموارہ تشفقی وار سر تعبد از زمین تعہد عبادت بر نمی دارد"

سلطان احمد جلوانی کو یقین ہوگیا کہ سلطان حسین کی کامیابی مشکل ہے، چنانچہ بقول شیخ جمالی[3] وہ سلطان بہلول سے بغاوت کرنے سے باز رہا لیکن تاریخوں[4] سے معلوم ہوتا ہے کہ چند روز بعد اس نے بہلول لودی سے

---

[1] ورق ۱۲۳ | [2] یوسف خان جلوانی کا لڑکا تھا (ملاحظہ ہوں طبقات اکبری ج ۱ ص ۳۰۸)

[3] سیر العارفین ورق ۱۲۳ ب [4] ملاحظہ ہو منتخب التواریخ ج ۱ ص ۳۰۸ اور طبقات اکبری ج ۱ ص ۳۰۸،

تقریباً سو سال کا فرق ہے، شیخ سماء الدین کے دوست جن کا ذکر جمالی نے سیر العارفین میں کیا ہے، اُن کی پیدائش سنہ ۷۸۱ھ[1] کے کچھ بعد ہوئی ہوگی، سنہ ۹۴۲ھ[2] میں وہ بقیدِ حیات تھے، اور نویں صدی کے ختم کے قریب انتقال پا چکے ہوں گے، شیخ جمالی جب سنہ ۸۹۶ھ کے قریب سیاحت بلادِ اسلامی سے واپس آئے ہیں، تو شیخ وجیہ الدین احمد فوت ہو چکے تھے، اور اخبار الاخیار والے بزرگ سنہ ۹۹۰ ہجری[3] تک حیات تھے، اول الذکر بزرگ کے والد شیخ فیروز تغلق کے عہد کے تھے، اور آخر الذکر اکبری عہد کے،

یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ شیخ سماء الدین گجرات میں کب تک مقیم رہے، اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم نہیں کہ وہاں کس غرض سے تشریف لے گئے تھے،

سکونت رنتھمبور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ گجرات سے واپسی پر شیخ سماء الدین رنتھمبور[4] کی طرف آئے، اور یہاں کے قلعہ کے قریب بلائیہ[5] نام کے ایک قریہ میں قیام کیا، اسی قریہ میں شیخ جمالی نے شیخ سماء الدین سے بیعت کی تھی، شیخ جمالی نے لکھا ہے[6] کہ ایک روز ایک درویش شیخ سماء الدین کی خدمت میں آئے، اُن کے پاس مکتوبات عین القضاۃ ہمدانی کا ایک نسخہ تھا، حضرت نے اُسے اپنے ہاتھ میں لیا، اور چند ورق مطالعہ کرنے کے بعد شیخ عین القضاۃ کا ایک واقعہ نقل کیا، ایک بار اُن کی بیس جگہ دعوت تھی لیکن وہ حجرہ سے باہر نہ نکلے، اور ہر جگہ موجود بھی تھے، شیخ جمالی کے دل میں شبہہ پیدا ہوا، چنانچہ حسب معمول جب وہ طشت و مشربہ لے کر شیخ سماء الدین کے کمرہ میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ شیخ اپنی جگہ پر موجود ہیں، اور چاروں کونوں میں اُن کی چار صورتیں کھڑی ہیں، اس کے بعد خود فرمایا کہ "درویشوں میں یہ قوت ہوتی ہے کہ ایک ہی وقت میں کئی جگہ حاضر ہو جائیں لیکن یہ باتیں ہر شخص سے کہنے سننے کی نہیں ہیں"،

---

[1] سیر العارفین میں سنہ ۹۰۱ھ کے قریب عمر ۱۲۳ یا ۱۲۰ سال کی بتائی گئی ہے، ملاحظہ ہو ورق ۱۲۵ [2] ایضاً [3] اخبار الاخیار ص ۱۹۳ [4] سیر العارفین ورق ۱۲۵، ب [5] ایک نسخہ میں ملانیہ، دوسرے میں بلائیہ ہے [6] سیر العارفین ورق ۱۲۵، ب،

ایک روز سلطان بہلول زیارت کے لئے آیا خبر کی گئی کہ بادشاہ قدمبوسی کا ملتمس ہے۔ شیخ سماء الدین نے حکم دیا کہ اندر بلوایا جائے۔ بادشاہ اندر گیا، حضرت کے قدم مبارک پر سر رکھ دیا، اور سامنے دو زانو بیٹھ گیا، اور تھوڑی دیر بعد عرض کی :

"این معتقد را دیدۂ ظاہر و باطن ناظر بر چہرۂ کرم و شفقت حضرت مخدومی ست زیرا کہ بادشاہ معانی درویشان اند و ما ریزہ چین صورت ایشان"

حضرت مخدوم نے فرمایا :

"ریزہ چیدن از صورت ایشان این معانی دارد کہ اگر کسے توفیق رفیق عرق حوال ایشان نیابد بارے بار افعال و اعمال این قوم نبشتہ ہمتا اثر صورت ظاہر درویشان زنگ کدورت باطن ایشان بزداید"

اس کے بعد زبانِ مبارک پر یہ کلمات آئے :

"سہ کس از انعام مستدام حضرت عزت محروم باشند اول پیرے کہ در معصیت بدل و جان خود بکوشد دوم جوانے کہ با تسبیہ توبہ ظن خود را بمعصیت بیند و سوم سلطانے کہ با وجود حصول تکلیف زادات مرزوی و گمی چراغ سلطنت خود را بصر بصر دروغ بے فروغ گرداند تا پیر فرمان تسویف ہے بروے شنیدہ سیہ دل ترا بعد ضعف پیری چہ امید زیستن بود کہ دیوار توبہ محکم نسازی از غفلت و قوت معصیت از بنیاد سستی ۔ اندختی و با جوان ندا و ہند کہ اے جوان نادان غدا فستی کہ شیخ و شاب و اطفال را اسپہ حیات بید قدرت و قضائے ربانی است تو کہ بامید توبہ پیری بصحرائے معصیت بنخت می خرامیدی عاقبت ندیدی کہ بہ پیری نرسیدی کہ تائب گردی۔ بادشاہ کاذب را بدین خطاب و عتاب در اضطراب زند کہ عاقل روزگار دروغ از بہر طلب عقبیٰ نباشد مگر از برائے ربط و ضبط دنیائے فانی از ان چہ کم داشتی کہ تخم کذب در مزرعۂ اعمال

باغی ہوکر حسین شرقی کے نام کا خطبہ جاری کر دیا تھا، اگرچہ احمد جلوانی بہت سخت مزاج حاکم تھا، مگر لوگ بیان کرتے تھے کہ اس دن شیخ کی ہیبت اتنی غالب تھی کہ وہ کانپ رہا تھا،

قیام دہلی اور شیخ کے روابط سلاطین لودی سے

شیخ سماء الدین[1] بیانہ سے دہلی چلے آئے، اور تا آخر حیات یہیں مقیم رہے، اگرچہ دہلی آنے کی صحیح تاریخ نہیں معلوم ہے لیکن سیر العارفین[2] سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ مذکور کے بڑے صاحبزادے شیخ عبد اللہ بیابانی ساٹھ سال سے کچھ زیادہ جنگل و بیابان میں رہ کر راہی ملک بقا ہوئے، چونکہ شیخ عبد اللہ کا سنہ وفات ۸۹۴ھ[3] ہے، اس لئے ان کے ترک تعلقات کرنے کی تاریخ ۸۳۵ھ کے قریب ہوگی، اور یہ بھی معلوم ہے کہ دہلی میں وہ کچھ دنوں باپ کے ساتھ رہ چکے تھے، اس لئے شیخ سماء الدین کے دہلی تشریف لانے کی تاریخ ۸۳۵ھ سے چند سال پہلے ہوگی،

اس عہد میں دہلی کا تاجدار بہلول لودی تھا، وہ شیخ سماء الدین کا بے حد عقیدت مند تھا، اور ان کی خدمت میں کبھی کبھی حاضر ہوتا تھا، شیخ کو بھی بہلول سے بڑی محبت تھی، اور وہ اسے تخت دہلی کا صحیح وارث و جانشین تصور کرتے تھے، مگر شیخ کی محبت میں کوئی ذاتی غرض شامل نہ تھی، اس کی خدا ترسی و رعایا پروری سے شیخ کافی متاثر ہو چکے تھے، اگر ایسا ہی فائدہ پیش نظر ہوتا، تو بیانہ کے قیام کے دوران میں وہاں کے حاکم کی رائے کے خلاف وہ بہلول کی اتنی مدح سرائی، اور حسین شرقی کی اتنی مذمت نہ کرتے، ظاہر ہے کہ شیخ کے ان خیالات و جذبات کی شہرت شخص کے دل میں جگہ ہوگی، سلطان بہلول کو جب ان حالات کی اطلاع ہوئی ہوگی تو اس کی عقیدت اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہوگی،

سیر العارفین[4] میں شیخ جمالی نے بہلول لودی کی شیخ کے آستانہ پر حاضری کا بیان اس طرح کیا ہے،

---

[1] سیر العارفین ورق ۱۲۳ ب [2] ایضاً ورق ۱۲۰ ب [3] خزینۃ الاصفیا ج ۲ ص ۸۱، ۸۲ [4] ملاحظہ ہوں دو نسخے ناجو ورق ۲۲ پر درج ہیں [5] ورق ۱۲۳، ۱۲۴، میرے پیش نظر نسخہ کی عبارت بہت غلط نقل ہوئی ہے، اس کا مقابلہ ندوہ کے نسخے سے کر لیا گیا ہے (ملاحظہ ہوں اوراق ۱۵۲ اب جبعد)

زمانے بعد ادائے فاتحہ اخلاص در مراقبہ آوردہ شد و بعد ازان برخاست و بزبان گوہر نثار فرمود سبحان اللہ

این مرد دنیا بکام رانی گذرانید و از برکت فرط محبت و اعتقادے کہ با دوستان خدا تعالیٰ داشت اینجا نیز

مرتبۂ عالی یافت"

بہلول کی وفات ۸۹۴ھ ہجری مین ہوئی، اس کے بعد اس کا لڑکا سکندر لودی تخت نشین ہوا، باپ کی طرح

وہ بھی درویشوں کا بے حد عقیدتمند تھا، حضرت شیخ سماء الدین سے بھی بڑی ارادت رکھتا تھا، چنانچہ جب تخت نشینی

کے لئے اُس کو دعوت دی گئی، تو سب سے پہلے وہ شیخ کی خدمت مین حاضر ہو کر دعا کا طالب ہوا، تاریخون مین یہ واقعہ

بڑی دلچسپی سے بیان ہوا ہے، طبقات اکبری[۱] مین اس طرح ملتا ہے:-

"در وقتے کہ سلطان بہلول در گذشت و سلطان سکندر را بجہت سلطنت طلب می داشتند و

او ارادہ رفتن نمود، روزے کہ از دہلی بیرون می رفت، بخدمت شیخ سماء الدین[۲] کہ از بزرگان وقت

بود بجہت التماس فاتحہ رفت وگفت کہ من کتاب میزان صرف[۳] پیش شما می خواہم کہ بخوانم...... چون

خواند، بداند اسعدک اللہ تعالیٰ فی الدارین"، سلطان گفت، باز بگوئید، و تا سہ مرتبہ

تکرار کردہ دست آن عزیز را بوسیدہ، سلطان این دعا را بفال نیک گرفتہ روان شد"

بدایونی سے مزید[۴] یہ پتہ چلتا ہے کہ سکندر کو ڈر تھا کہ ایسا نہ ہو شیخ سماء الدین اُس کے دوسرے بھائیون کی سفارش

کرین اُس کے الفاظ یہ ہین:-

---

[۱] ج ۱ ص ۳۳۳، ۳۳۴ [۲] طبقات اکبری کے نسخون مین اختلاف ہے ایک نسخے مین اس طرح آیا ہے،

"در روزے کہ از دہلی نزد سماء الدین بجہت التماس فاتحہ رفت"

مگر یہ غلط معلوم ہوتا ہے کیونکہ ان ایام مین شیخ کا قیام دہلی کے باہر نہین تھا [۳] فرشتہ جلد ۱ ص ۱۸۰، مطبوعہ نسخہ

بہاء الدین ہے، جو غلط ہے کیونکہ فرشتہ اور طبقات کے ایک نسخہ مین "صرف" محذوف ہے [۴] منتخب التواریخ ج ۱ ص ۳۱۳، ۳۱۴،

بدایونی کا بیان فرشتہ، طبقات اور مخزن افغانی ص ۵۷، سے بہت مختلف ہے،

پیوستہ می کاشتی کہ در پیری بادشاہی یافتہ و دل خود را از خوفِ الٰہی آگاہی بخشی و خود را از کذب و معصیت ..... باز داری و پیوستہ در شکر نعمت منعمِ حقیقی مستغرق مانی ، بحکم لَئِن شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ وَ لَئِن کَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ "

ان نصائح کا سلطان پر اتنا اثر ہوا کہ وہ زار زار رونے لگا اور بزبانِ عجز سے یوں کہا :-

"حضرت مخدوم باوجود چندین تقصیرات محبتِ درویشان در خود زمان زمان فزیدی یابم امید کہ حق تبارک تعالیٰ بہ برکتِ محبتِ این قوم مرا نجات ارزانی دارد"

بادشاہ نے اس درجہ عجز و نیاز کا اظہار کیا کہ حاضرینِ مجلس پر عجیب عالم طاری ہوا ، آخر کار شیخ نے اسے ایک خاص مصلّا عنایت فرمایا اور سلطان نے وہاں سے مراجعت کی ،

اس تفصیل سے بہلول لودی کی اس عقیدت کا پتہ چلتا ہے جو اس کو فقرا و مشائخ سے تھی ، اور غالباً اسی ارادت مندی کا نتیجہ تھا کہ اس نے اپنی ایک لڑکی کی نسبت ایک صوفی درویش شاہ عبد اللہ قریشی سے کردی جو ملتان کے رہنے والے ، اور حضرت بہاء الدین زکریا کی اولاد میں تھے ، شاہ عبد اللہ موصوف حضرت شیخ سماء الدین کے ہم وطن تھے ، بلکہ دونوں ایک ہی سلسلۂ سہروردیہ سے مربوط تھے ، ان دونوں بزرگوں کے اس غیر معمولی خلوص سے یہ بھی قیاس ہو سکتا ہے کہ سلطان بہلول کو اس سلسلہ سے زیادہ رغبت تھی ،

شیخ سماء الدین بہلول لودی کے متعلق جو خیال رکھتے تھے ، وہ نیا نہ تھا ، کیونکہ ورود دہلی کے قبل ہی انھوں نے عالم بیانہ کی جس طرح تنبیہ کی تھی ، اس کی مثال گذر چکی ، دہلی پہنچنے کے بعد ان کا ویسا ہی خیال قائم رہا ، سلطان کے مرنے کے بعد اس کے متعلق شیخ کے خیال کا پتہ حسب ذیل واقعہ[۲] سے بھی چلتا ہے ،

" روزے حضرت مشارٌ الیہ بعد وفات سلطان[۳] بہلول لودی نور اللہ مرقدہٗ بزیارت او قدم رنجہ فرمود "

[۱] اخبار الاخیار ص ۱۸۲ [۲] سیر العارفین ورق ۲۴ ب [۳] مخزن افغانی ص ۵۰۱ پر لکھا ہے کہ شیخ بہلول اور سکندر دونوں کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے لئے گیا تھا ، یہی صورت افغانی ص ۵۰ پر بھی ہے لیکن یہ غلط ہے کیونکہ سکندر شیخ کی وفات کے ۲۲ سال بعد مرا ہے "

اگرچہ یہ معاملہ براہِ راست شیخ سماء الدین سے تعلق نہین رکھتا لیکن سلطان سکندر کا ان کے پاس خط لکھنا اس بات کا ثبوت ہے کہ سلطان کے رشتۂ ارادت مین جو ۹۰۴ھ ہجری سے بہت قبل استوار ہو چکا تھا، کسی قسم کی کمزوری کے آثار پیدا نہین ہوئے تھے، شیخ جمالی کو سکندر کے پاس بھیجنے مین شیخ سماء الدین کی مصلحت صرف اس قدر بھی کہ وہ بادشاہون کی مجلسون مین فقراء کی موجودگی کو باعثِ برکت سمجھتے تھے، ان کا خیال تھا کہ فقراء ہی کی دعاؤن کی وجہ سے بادشاہ اپنے مقاصد مین کامیاب ہوتے ہین،

سے یہ الفاظ مخزن اور عرصت مخزن مین پائے جاتے ہین،

بزمِ صوفیہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب ایم اے

جس مین عہدِ تیموریہ سے پہلے کے صوفیہ کرام حضرت شیخ ابوالحسن علی ہجویری، حضرت خواجہ معین الدین چشتی، حضرت خواجہ بختیار کاکی، حضرت قاضی حمید الدین ناگوری، حضرت خواجہ نظام الدین اولیا، حضرت بوعلی قلندر پانی پتی، حضرت شیخ فخر الدین عراقی، حضرت برہان الدین غریبؒ، حضرت ضیاء الدین نخشبی، حضرت شرف الدین احمد منیری، حضرت جہانیان جہان گشت، حضرت اشرف جہانگیر سمنانی، اور حضرت خواجہ گیسو درازؒ کے مستند حالات اور تعلیمات پیش کی گئی ہین،

قیمت :- ۳ء

"منیجر"

"می گویند کہ وقت روان شدن از دہلی بہ تقریب تفاؤل نزد شیخ سماء الدین کنبوہ پیر شیخ جمالی کہ از علمائے کبار و مشائخ عظام روزگار بود، رفت، باین تقریب مباداً در رضا بہ سلطنت برادران دیگر داشتہ باشد و حق صرف ہوائے او بانہ ساختہ بیان معنی عبارت اسعدک اللہ از خدمت شیخ پرسید، چون گفت و نیک بخت گرداناد ترا خدائے تعالیٰ، التماس کرد کہ این لفظ سہ مرتبہ بزبان مبارک خود برانید، شیخ سہ بار گفت، او برخاستہ عرض داشت کہ من مدعا خود را حاصل کردم، نزد شیخ استمداد طلبیدہ متوجہ لشکر شد"

بہر حال ان بیانات سے صاف ظاہر ہے کہ اُس زمانے میں شیخ کو غیر معمولی اثر و رسوخ حاصل تھا، مگر بظاہر انھوں نے کبھی اپنے رسوخ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی، اور خدا ترس اور رعایا پرور بادشاہ کے لئے ہمیشہ دعا کرتے رہے۔

سکندر لودی کو مشائخ سے جو عقیدت تھی، اُس سے تاریخ کے صفحات بھرے ہوئے ہیں، شیخ جمالی سے اس کے بڑے گہرے تعلقات تھے، ان سے اُس کے حصول نیاز کے سلسلے کی جو تفصیلات ملی ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ جمالی جب ۸۰۹ھ ہجری کے کچھ قبل سیر بلاد اسلامی سے واپس ہوئے، تو بادشاہ کو معلوم ہوا کہ شیخ نے اپنے قیام تبریز کے دوران میں ایک مثنوی یا نظم مہر و ماہ کے عنوان سے لکھی ہے، اُس نے ایک منظوم رقعۂ دعوت اپنے دستخط خاص سے شیخ کے پاس بھیجا، شیخ اُس کے پاس جانے کے لئے راضی نہ ہوئے البتہ مثنوی مطلوب روانہ کر دی، اس کے مطالعہ کے بعد شیخ سے ملاقات کا اشتیاق زیادہ ہوا، اس لئے سلطان نے ایک رقعہ شیخ سماء الدین کے پاس لکھا، انھوں نے شیخ جمالی کو سکندر لودی کے پاس سنبھل روانہ کر دیا،

---

[1] ملاحظہ ہو مخزن افغانی ص ۰۰، واقعات افغانی ص ۱۳۵ ۔ ۵۲ یہ تاریخ قیاسی ہے، ان دنوں سلطان سنبھل میں مقیم تھا اور یہیں اُسے شیخ کے آنے کی اطلاع ہوئی، ملاحظہ ہو مخزن و واقعات"

* سلاطینِ گجرات میں پہلا شخص سلطان مظفر اوّل ہے، جو محمد شاہ تغلق کی طرف سے یہان کا ناظم (گورنر) مقرر ہوا تھا، اور آخر میں خود مختار ہو گیا، اس کا لڑکا تاتار خان دہلی مین رہتا تھا، تیمور شاہ کے حملہ ۸۰۰ھ کے قبل وہ گجرات چلا آیا، اور باپ کی مرضی کے خلاف خود بادشاہ بن بیٹھا، لیکن کثرتِ مے نوشی کی وجہ سے بہت جلد مر گیا، (۸۰۶ھ) پھر کئی برس کے بعد مظفر شاہ جس کا اصلی نام مظفر خان ہی تخت نشین ہوا لیکن اس کے سکّے بہت ہی کم یاب ہیں،

جن سلاطین کے نام کے سکّے ہیں وہ حسب ذیل ہیں،

سنہ تخت نشینی	اسمار مع خطاب
سنہ ۸۰۶ھ، اس کے دوسرے سکّہ مین ہی: الواثق بتائید الرحمٰن افتخار الدنیا والدین ابو المغازی محمد شاہ بن مظفر شاہ السلطان ہے،	(۱) ناصر الدنیا والدین محمد شاہ تاتار خان اوّل ابن مظفر شاہ بن وجیہ الملک
سنہ ۸۱۰ھ / ۱۴۰۸ء	(۲) شمس الدنیا والدین مظفر شاہ بن وجیہ الملک سدھارن،
سنہ ۸۱۳ھ (بانی احمد آباد)	(۳) ناصر الدنیا والدین احمد شاہ اوّل بن محمد شاہ اوّل،
سنہ ۸۴۶ھ / ۸۵۵	(۴) غیاث الدنیا والدین محمد شاہ ثانی بن احمد شاہ اوّل،
سنہ ۸۵۵ھ (بانی کانکریہ تالاب)	(۵) قطب الدنیا والدین احمد شاہ ثانی بن محمد شاہ ثانی
سنہ ۸۶۲ھ	(۶) سلطان داؤد شاہ، (چند ماہ)

گجراتی بادشاہون کے سکے

از

مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی

سنہ ۱۹۲۱ء سے گجراتی سکے میری نظر سے گذرنے شروع ہوئے، اور مین نے اُن کو جمع کرنا شروع کیا، آہستہ آہستہ اُن کی بڑی تعداد میرے پاس جمع ہوگئی، مین نے اس پر ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کیا، اور اس کے بارہ مین کچھ نوٹ بھی کئے، لیکن تاریخ گجرات لکھنے مین کچھ اس طرح مشغول ہو گیا کہ ذہن سے یہ بات فراموش ہوگئی، اب جب کہ اس سے فارغ ہوا، تو پھر اس طرف توجہ کی، میرے پاس اس وقت ہندوستان اور غیر ممالک کے ہزارون سکے موجود ہین، لیکن محمود غزنوی کے کچھ سکون کے علاوہ نقش ٹیک کی کڑی مفقود ہے۔ باقی ملبن سے لے کر برٹش گورنمنٹ کے ہر قسم کے سکے ہین،

ان مین سے فی الحال صرف گجراتی سلاطین کے بارہ مین لکھا جاتا ہے، کیونکہ گجراتی سکون پر بہت کم لوگون نے قلم اٹھایا ہے، مسٹر ہوڑی والا (جونا گڑھ) مسٹر تھایان (جونا گڈھ) اور گورنمنٹ بمبی کے ریسرچ ڈیپارٹمنٹ کے علاوہ اور کسی کا مضمون اس موضوع پر میری نظر سے نہین گذرا، رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے جرنل مین بھی کچھ لکھا گیا ہے، مگر مین نے اس کو نہین دیکھا،

سلاطین گجرات کے نام اور خطابات

ان سکون مین بادشاہون کے نام مع خطابات مقامات ضرب (ٹکسال) اور سنہ درج ہین، قیمت اور وزن نہین ہے جس سے بڑی مشکل یہ پیش آتی ہے، کہ سکے سے یہ نہین معلوم ہوتا کہ اس کی قیمت کیا ہے، صرف اندازہ سے قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ روپیہ، اٹھنی، چونی یا پیسہ دھیلا وغیرہ ہے،

واضح رہے کہ آخری سلطان مظفر کی حکومت ۹۸۰ھ میں اکبر نے ختم کر دی تھی، اور گجرات پر مغلیہ سلطنت کی حکومت قائم ہو گئی تھی، اور مظفر شاہ کو اکبر اپنے ساتھ لیتا گیا، مگر کچھ عرصہ کے بعد وہ گجرات واپس آگیا، اور باغی کی حیثیت سے ۱۰۰۱ھ تک زندہ رہا اور اس کے نام کے سکے ڈھلتے رہے،

ٹنکہ | ٹنکہ اصل میں سنسکرت لفظ ہے جس کے معنی وزن کے ہیں، پھر سکہ کے لئے بولا جانے لگا، اور جہاں سکے ڈھلتے تھے، اسکو ٹنکسال اور پھر ٹکسال کہنے لگے، ٹنکہ چار ماشہ کا ہوتا تھا[1]

ٹنکہ پہلے چاندی کے سکہ کو کہتے تھے، جس کو شیر شاہ کے زمانہ میں "روپیہ" کہنے لگے، کیونکہ وہ روپا یعنی چاندی کا ہوتا تھا، پھر چاندی اور تانبہ کے سکہ کو بھی ٹنکہ کہنے لگے، اور دونوں میں فرق کے لئے ٹنکہ سفید اور ٹنکہ سیاہ کا لفظ استعمال کیا جانے لگا، میں نے سلاطین گجرات کے سکوں میں سلطان محمود بیگڑہ (لمبی مونچھوں والا) کا سکہ (ٹنکہ) جب وزن کیا، تو ایک تولہ کا نکلا، اسی مظفر ثالث کا ۹۹۱ھ ایک تولہ کا محمود بیگڑہ کا ۹۱۰ھ و ۹۱۴ھ ایک تولہ کا، احمد ثالث کا ۹۶۱ھ ایک تولہ کا، پھر وجیہ شاہ عالم کا ایک تولہ کا،

اس عہد میں جو سکے رائج تھے، ان کے نام محمودی، مظفری، جنگیزی، اور جامی ملتے ہیں، مظفری اور محمودی، تمام گجرات میں، جنگیزی صرف بڑودہ اور جامی کا ٹھیاواڑ میں رائج تھے، قدیم کتابوں میں سکے کے متعلق کوئی تفصیل آج تک میری نظر سے نہیں گذری، صرف ابن بطوطہ جلد دوم کے محشی اردو نے اس پر کچھ بحث کی ہے، آئین اکبری میں بھی کوئی تسلی بخش بات مجھے نہیں ملی، اس لئے جو چیز جہاں سے ملی ناظرین کی ضیافت کے لئے درج کی جاتی ہے،

(۱) ٹنکہ طلا، (زرد یا سرخ) ایک تولہ کا (اشرفی) محمودی

(۲) ٹنکہ نقرہ (سفید) ایک تولہ کا، (روپیہ)

(۳) جیتل مس (پول) تانبہ کا ایک تولہ کا، پچاس جیتل کا ایک ٹنکہ سفید (روپیہ)

---

[1] سنسکرت انگلش ڈکشنری، بائی دیم صاحب،

اسماء مع خطاب	سنہ تخت نشینی
(۷) ناصر الدنیا والدین ابو الفتح محمود شاہ اول ابن محمد شاہ ثانی،	سنہ ۸۶۳ھ / ۹۱۷ (فاتح جوناگڈھ وچانپانیر) اس کو محمود بیگڑہ بھی کہتے ہیں،
(۸) شمس الدنیا والدین ابو النصر مظفر شاہ ثانی بن محمود اول	سنہ ۹۱۷ھ / ۹۳۲ (مظفر حلیم بھی کہتے ہیں) فاتح مالوہ
(۹) ابو اثق باللہ المنان ابو الفتح ناصر الدنیا والدین سکندر شاہ بن مظفر شاہ ثانی	سنہ ۹۳۲ھ / ۹۳۲
(۱۰) سلطان محمود ثانی	سنہ ۹۳۲ھ / ۹۳۲
(۱۱) قطب الدنیا والدین بہادر شاہ بن مظفر شاہ ثانی،	سنہ ۹۳۲ھ / ۹۴۳ (فاتح چتوڑ)
(۱۲) محمد شاہ فاروقی حاکم خاندیس،	سنہ ۹۴۳ھ / ۹۴۳ دو ماہ
(۱۳) ناصر الدنیا والدین ابو الفتح محمود شاہ ثالث بن لطیف خان بن مظفر شاہ ثانی	سنہ ۹۴۳ھ / ۹۶۱
(۱۴) سلطان مظفر سوم	سنہ ۹۴۳ھ (چند ماہ)
(۱۵) ناصر الدنیا والدین اور دوسرے میں غیاث الدنیا والدین اور تیسرے میں معین الدنیا والدین احمد شاہ ثالث	سنہ ۹۶۱ھ / ۹۶۸
(۱۶) شمس الدنیا والدین مظفر شاہ رابع	(سنہ ۹۶۸ھ / ۱۰۰۰) اس کا لڑکا بہادر شاہ ثانی تھا لیکن نہ تخت نشین ہوا نہ کوئی سکہ ملا،

آباد کیا گیا تھا، اور پہاڑ پر ایک مضبوط قلعہ کی بنیاد رکھی گئی تھی، محمود بیگڑہ نے اس کو فتح کر کے پہاڑ کے دوسری جانب ایک جدید شہر کی بنیاد رکھی جس کا نام "محمد آباد" رکھا۔ جو دیکھتے ہی دیکھتے احمد آباد کے مقابل کا بہترین شہر ہو گیا، شاہ ہمایون اور سلطان بہادر کی جنگ میں یہ شہر آتش زدگی کے سبب سے ویران ہونا شروع ہوا، اور آج تک مسجد کے سوا اس کا کوئی نشان باقی نہیں ہے، سکون میں ان چارون شہرون کے نام مندرجۂ ذیل طریقہ سے درج ہیں۔

(۱) شہر معظم احمد آباد (۲) شہر ہمایون احمد نگر (۳) شہر مکرم محمد آباد (چانپانیر) (۴) شہر اعظم مصطفیٰ آباد (جوناگڑھ) باقی ٹکسالون کے نام جو مجھے دستیاب ہوئے مندرجۂ ذیل ہیں: (۵) سورت، (۶) کھنبایت (۷) بھروچ (۸) ... (۹) گودھرہ،

ان ٹکسالون میں زیادہ تر تانبا اور چاندی کے سکے ڈھالے جاتے تھے، یہان کا ڈھلا ہوا سونے کا کوئی سکہ آج تک نظر سے نہین گذرا، سونے کے جو سکے مین نے دیکھے ہین، وہ زیادہ تر احمد آباد کے مسکوک تھے، ایک بات اور قابل غور ہے کہ ان سکون مین "سلطان" کا لفظ کبھی نام کے آگے آتا ہے، اور کبھی پیچھے، گجراتی سکے تمام عربی حروف اور عربی زبان مین ہین، صرف ایک سکہ محمد شاہ ثانی کا فارسی نظم مین ہے، یہان جس قدر سکے مجھے ملے ہین، انھی کے متعلق لکھا ہے، سلاطین گجرات کے اور سکے جو مختلف قسم کے مسکوک ہوئے، اور مجھے نہین ملے وہ اس مین درج نہین ہین، گو دوسرون کی فہرست مین ہین،

سلطان مظفر اول | گجرات مین ٹھاسرا مشہور جگہ ہے، وہان دو بھائی راجپوت خاندان کے رہتے تھے، جو غالباً گاؤن کے پٹیل تھے، ایک کا نام سادھو اور دوسرے کا سہارن تھا، فیروز شاہ تغلق (متوفی ۷۹۰ھ) ابتدائے شباب مین بغرض شکار اس علاقہ مین گیا، اور رات ہو جانے کے سبب سے اس مقام پر شب باش ہوا، ان دونون بھائیون نے اس کی بڑی خدمت کی، اس کے صلہ مین بادشاہ دونون کو دہلی ساتھ لایا، اور شراب داری کا عہدہ عطا کیا، آخر مین یہ دونون بھائیون نے اسلام قبول کر لیا، سہارن کو وجیہ الملک کا خطاب ملا، اسی کا لڑکا مظفر خان ہے،

(۴) ایک ٹنکہ سفید = آٹھ ہشت گانی (مساوی ایک معری درہم)

(۵) ایک ہشت گانی = ۴ سلطانی

(۶) ایک سلطانی = ۲ جیتل

(۷) ایک جیتل = ۴ کوڑیا (پیسہ) آنہ

(۸) ایک ٹنکہ = ۲۰ پیسہ

(۵) ایک ٹنکہ عدلی کے = ۵۰ جیتل (پول سیاہ)

(۱۰) ٹنکہ سیاہ جس میں چاندی کم اور تانبہ زیادہ ہوتا = ۱۲ پول

(۱۱) ایک ٹنکہ (روپیہ) = ۱۰۰ دو کرا ،

(۱۲) ایک ڈوکریا = ۱۹ بادام

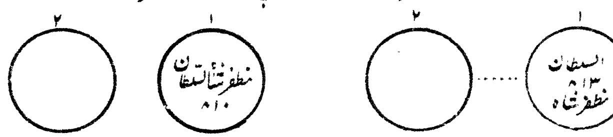
(۱۳) ایک روپیہ = ۱۹۰۰ بادام

(۱۴) ۱۹ جیتل = ایک ٹنکہ سیاہ (۴ آنہ)

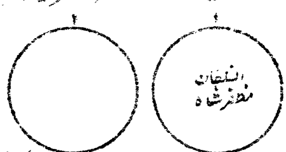
(۱۵) ۴ ٹنکہ سیاہ = ایک ٹنکہ سفید (روپیہ)

ٹکسال | سلاطین گجرات کے عہد میں مختلف مقامات میں ٹکسال قائم کئے گئے ، ان میں سے زیادہ مشہور مقامات ہیں جو گجرات کے پایۂ تخت تھے ، ان میں سے ۴ شہروں کی خاص اہمیت ہے ، ایک احمد آباد جو آخر تک مستقل پایۂ تخت سمجھا جاتا رہا ، دوسرا احمد نگر جس کو آج کل ہمت نگر یا ام نگر کہتے ہیں ، ایڈر کے پاس واقع ہے ، تیسرا جوناگڑھ ہے ، اصل جوناگڑھ کی آبادی جو قلعہ جوناگڑھ سے فاصلہ پر تھی ، عرصۂ دراز سے ویران ہو گئی ہے ، موجودہ جوناگڑھ کا اصلی نام مصطفےٰ آباد ہے ، یہ سلطان محمود بیگڑہ کا آباد کیا ہوا ہے لیکن قلعہ سے متصل ہونے کے سبب سے اس کے اصلی نام کی شہرت نہیں ہوئی ، اور جوناگڑھ (جو دراصل قلعہ کا نام ہے) کے نام سے مشہور ہو گیا ، چوتھا شہر چانپانیر ہے ، پاوا گڑھ ایک مشہور پہاڑ ہے جس کے دامن میں چانپانیر نامی شہر قدیم زمانہ میں

مظفر شاہ اول | سلاطین گجرات کے جس قدر سکے آج تک دریافت ہوئے ہیں، اُن میں سب سے زیادہ نایاب سلطان مظفر اوّل کا سکہ ہے، غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ خود مختار بادشاہ کی حیثیت سے اس کی حکومت کی مدت بہت کم رہی، اس کا ایک بہت صاف سکہ ہوتی والا کے پاس ہے جو مسٹر ٹھیان بی اے علیگ جوناگڑھی نے اُن کے نذر کیا تھا، باقی جسقدر سکے ملے ہیں سب مشکوک ہیں، میرے پاس جو سکے ہیں، وہ بھی سنہ کے اعتبار سے مشکوک ہیں، ایک سکہ جو مجھے ملا، اس کے ایک رُخ پر "مظفر شاہ السلطان" ہے، اور ۸۱۳ھ جیسا نظر آتا ہے، اور دوسرا رُخ پڑھا نہیں جاتا، غالباً شمس الدنیا والدین ہوگا، اسی طرح دوسرا بھی ہے جس پر ۸۱۰ھ جیسا نظر آتا ہے،



ایک دوسرا سکہ اور ہے جس کے ایک رُخ پر "مظفر شاہ السلطان" ہے اور دوسرا رُخ غیر ملفوظ ہے، اس میں صرف ۸ پڑھا جاتا ہے، اور چونکہ ۸ سے شروع ہونے والے سنہ کے عدد ہیں، اور کوئی دوسرا مظفر شاہ نہیں ہے، اس لئے ماننا پڑتا ہے کہ یہ سکہ مظفر اوّل ہی کا ہے:



مظفر شاہ ۸۱۰ھ میں تخت نشین ہوا ہے، اس لئے ۸۱۰ھ سے ۸۱۳ھ تک کوئی عدد ہوگا، باقی دائرہ کا نقش اس قدر گھس گیا ہے کہ شیشہ کی مدد سے بھی پڑھا نہیں جاتا،

سلطان احمد شاہ اوّل ناصر الدنیا والدین | سلطان احمد شاہ بن محمد شاہ بن مظفر شاہ اول دہلی میں پیدا ہوا، اور ایک عرصہ کے بعد وہ اپنے دادا مظفر شاہ کے پاس پٹن (گجرات) آیا، ۸۱۳ھ میں مظفر شاہ کے انتقال کے بعد تخت نشین ہوا، ۸۴۶ھ میں بمقام احمد آباد وفات پاکر مانک چوک کے مقبرہ میں دفن ہوا،

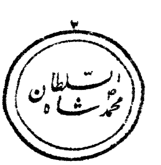
احمد شاہ اوّل کے سکے اس کثرت سے دستیاب ہوئے کہ حیرت ہوتی ہو کہ اتنا زمانہ گذر جانے پر بھی کس طرح اتنے سکے محفوظ رہے، ان میں ہر قسم کے چھوٹے بڑے سکے ہیں، اس میں ایک طرف "سلطان الاعظم ناصر الدنیا والدین" دوسری

یہ دہلی میں پیدا ہوا اور امیروں کے لڑکوں کے ساتھ پرورش اور تعلیم پائی، جب فیروز شاہ تغلق کا لڑکا محمد شاہ تغلق ۷۹۳ھ میں مستقل بادشاہ ہوا، تو گجرات کے ناظم نظام مفرح راستی خان کی بدانتظامی اور باغیانہ حالات معلوم کرکے مظفر خان کو وہاں کا ناظم مقرر کیا، اُس نے راستی خان کو شکست دے کر ملک کا بہترین انتظام کیا، محمد شاہ تغلق ۷۹۶ھ میں وفات پاگیا، اور اس کا لڑکا سلطان محمود شاہ تخت نشین ہوا،

۸۰۰ھ میں تیمور شاہ نے دہلی فتح کر لی، اور لوٹ مار کر لوٹ گیا، اس ہنگامہ میں محمود شاہ نے بھاگ کر مالوہ میں پناہ لی، اور تیمور کی واپسی پر وہ بھی دہلی واپس آ گیا، لیکن اب سلطنت کے تمام صوبہ دار تقریباً خود مختار ہو چکے تھے مرکز میں اتنا دم نہ تھا کہ صوبہ داروں کو قابو میں رکھ سکے، اور اوسکی حکومت از دہلی تا پالم رہ گئی تھی، دربار کے امرا اقتدار کے لئے اس میں رسہ کشی میں مصروف تھے،

سلطان محمد شاہ نے مظفر خان کے لڑکے محمد تاتار خان کو بطور ضمانت کے اپنے ہی پاس رکھ لیا تھا، اور اب اس کا شمار امیروں میں تھا، وہ تلوخان امیر سے شکست کھا کر اپنے باپ کے پاس گجرات چلا آیا، اور دہلی پر فوج کشی کی تحریک کی، مظفر نے صاف انکار کر دیا، اس نے کچھ امیروں کو ملا کر مظفر شاہ کو بھروچ میں نظر بند کر دیا اور خود بادشاہ بن کر سکے جاری کئے، اور فوج لے کر دہلی روانہ ہوا، مگر کثرت شراب نوشی سے راہ میں بماہ شعبان ۸۰۶ھ وفات پاگیا،

محمد شاہ اول کے سکے | محمد شاہ اول کے تانبہ کے سکے دو قسم کے دست یاب ہوئے ہیں، ایک کا نقش جو خاص تانبہ کا تقریباً ایک تولہ وزن کا ہوگا، یہ ہے





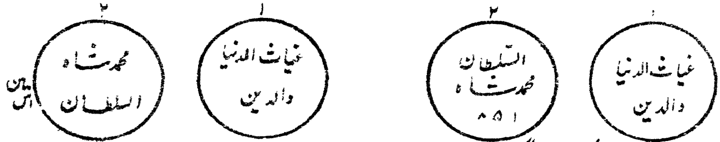
دوسرے کا نقش اس طرح ہے،

(۲)
محمد شاہ بن مظفر شاہ السلطان

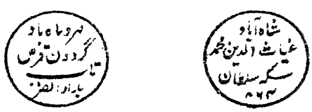
واثق بتائید الرحمٰن
[illegible]

ین فارسی زبان استعمال کی، ورنہ عموماً سکہ کی زبان عربی ہوتی تھی، البتہ غزنوی غوری، التمش وغیرہ نے ہندی الفاظ سکہ مین مسکوک کرائے، مثلاً شری سلطان وغیرہ، شعر

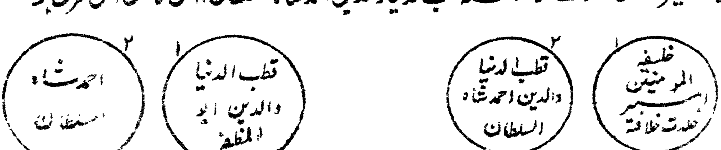
سکۂ سلطان غیاث الدین محمد شاہ باد   تا بدار الضرب گردون قرص مہر و ماہ باد



السلطان کا لفظ محمد شاہ کے نیچے دیا گیا ہے، ۸۵۵ھ مین اس نے وفات پائی،



قطب الدنیا والدین احمد شاہ ثانی | سلطان قطب الدین کا اصلی نام احمد ہے، وہ اپنے خاندان مین دوسرا احمد ہے، اپنے باپ محمد شاہ ثانی بن احمد شاہ اول بن محمد شاہ اول بن مظفر شاہ اول کے انتقال کے بعد ۸۵۵ھ مین تخت پر بیٹھا، اس کے بھی دو قسم کے سکے ملے ہین، ایک عام قسم کا سکہ جس پر قطب الدنیا والدین ابو المظفر احمد شاہ السلطان ہے، دوسرا سکہ غالباً اس کے اخیر زمانہ کا ہے، جب کہ مصری خلافت کا وفد یہان آیا تھا اور اسکی جانب سے خلیفۂ امیر المومنین کا خطاب اس کو ملا تھا، چنانچہ سکہ مین مندرجۂ ذیل عبارت درج ہے:
خلیفۂ امیر المومنین خلدت خلافتہ ۸۶۱ھ قطب الدنیا والدین احمد شاہ السلطان، اس کا نقش اس طرح ہے:

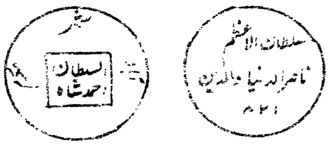


اس کے مختلف سکے ۸۵۶ھ تا ۸۶۲ھ کے ملے ہین، بعض سکون مین صرف سنہ پڑھا جاتا ہے، باقی حروف مٹ گئے ہین، اور کچھ سکے بغیر سنہ کے بھی ملے ہین، ۸۶۳ھ مین قطب الدین نے وفات پائی،

سلطان داؤد شاہ | سلطان قطب الدین کے کوئی نرینہ اولاد نہ تھی، اس لئے اس کے بعد امیرون نے سلطان

عزت احمد شاہ السلطان" در کنارہ "بر شہر ہمایون احمد نگر" ہوتا ہے، عموماً اس کے سکے شہر معظم احمد آباد اور شہر ہمایون احمد نگر کے مسکوک ہیں اور ۸۲۰ھ، ۸۲۸ھ، ۸۳۰ھ، ۸۳۳ھ، ۸۳۴ھ، ۸۴۰ھ، ۸۴۲ھ، ۸۴۳ھ، ۸۳۹ھ، ۸۴۳ھ، ۸۴۴ھ، ۸۴۵ھ کے سکے موجود ہیں،

(۱) 

(۲) 

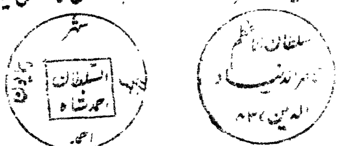
ایک دوسرا سکہ ۸۴۳ھ کا ہے، جس کا نقش مندرجۂ ذیل ہے،

(۳) 

دوسرا گوشہ غیر محفوظ ہونے کے سبب سے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ وہ احمد آباد ہے یا احمد نگر، یہ سب سکے تانبے کے ہیں، اس کے ایک سکہ میں جو تانبے کا ہے، مندرجۂ ذیل نقش ہے :-

(۴) 

ایک دوسرا سکہ ۸۳۲ھ کا ہے، اس کا نقش یہ ہے :-

(۵) 

نمبر ۵ کے سکے میں نگر کی گاف بخط عربی ہے،

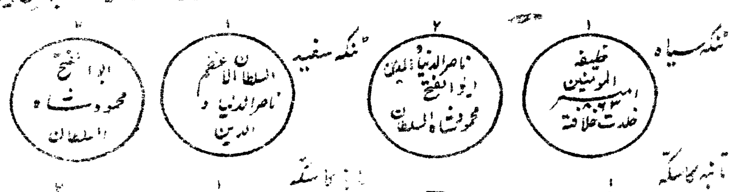
غیاث الدنیا والدین محمد شاہ ثانی	احمد شاہ کے بعد اس کا لڑکا محمد شاہ ثانی ۸۴۶ھ میں تخت نشین ہوا، اس کے دو قسم کے سکے دستیاب ہوئے ہیں، پہلے میں "غیاث الدین والدین محمد شاہ السلطان" ہے اور

دوسرے میں ایک شعر فارسی کا ہے، جہاں تک مجھے معلوم ہے، اسلامی حکومت کی ابتدا سے محمد شاہ تک کسی نے فارسی میں شعر سکہ میں داخل نہ کیا، غالباً محمد شاہ ثانی گجرات کا پہلا بادشاہ ہے، جس نے مغلیہ سے پہلے سکہ

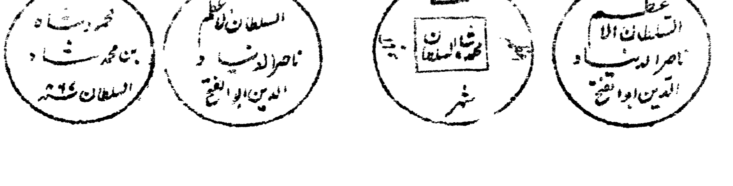
اسی طرح کے سکے تانبے کے بھی ہیں چھوٹے سکوں میں دھیلا، دوکڑہ وغیرہ بھی نظر سے گذرے، پائیاں بھی ملیں، مگر کسی پر قیمت نہیں لکھی ہے جس طرح آج ہر بڑے چھوٹے سکہ پر قیمت نقش ہوتی ہے، اس طرح گجراتی سلاطین کے سکوں میں قیمت درج نہیں ہوتی تھی، صرف قیاس سے اُن کی قیمتوں کا اندازہ لگا سکتے ہیں سلطان محمود نے تقریباً پچاس برس حکومت کی ۹۱۷ھ میں وفات پائی شیخ احمد کھٹو رحمۃ اللہ کے مقبرہ کے پاس تالاب کے کنارہ پر مدفون ہوا، اس کا عرف بیگڑہ (بہ واؤ مجہول) ہے، گجراتی میں بیگڑہ اس بیل کو کہتے ہیں جس کی سینگیں بھی ہو کر اس طرح مڑجاتی ہیں جس طرح انسان کسی کو آغوش میں لینے کے لئے دونوں ہاتھ بڑھاتا ہے اس کے مقابلہ میں بھیلو (بہ واؤ مجہول) کا لفظ ہے جو ایسے بیلوں کو کہتے ہیں جن کی سینگیں چھوٹی ہوں، محمود بیگڑہ کی مونچھیں اس قدر لمبی تھیں کہ وہ سینگوں کی طرح معلوم ہوتی تھیں کبھی کبھی وہ ان کو کانوں میں لپیٹ لیا کرتا تھا، عربی زبان میں ایسے آدمی کو "ذوالقرنین" کہتے ہیں"

سلطان محمود کی وفات کے بعد صرف ایک ہی لڑکا زندہ رہا جو اس کے بعد تخت نشین ہوا، محمود اپنے بعض سکوں میں اپنے باپ کا نام بھی تحریر کرتا ہے، السلطان الاعظم ناصر الدنیا والدین ابو الفتح محمود شاہ بن محمد شاہ سنہ ۸۶۲ھ، مندرجہ ذیل سنوں کے سکے میرے پاس موجود ہیں، ۸۶۳ھ، ۸۶۹ھ، ۸۷۶ھ، ۸۸۰ھ، ۸۸۱ھ، ۸۸۴ھ، ۸۸۶ھ، ۸۸۸ھ، ۸۸۹ھ، ۸۹۱ھ، ۸۹۳ھ، ۹۰۰ھ، ۹۰۲ھ، ۹۰۴ھ، ۹۰۶ھ، ۹۰۷ھ، ۹۰۸ھ، ۹۰۹ھ، ۹۱۰ھ، ۹۱۱ھ، ۹۱۳ھ، ۹۱۶ھ، ۹۱۷ھ، بعض سکوں کے نقوش حسب ذیل ہیں

تنکہ سیاہ تنکہ سفید



تانبہ کا سکہ تانبا سکہ



داؤد کو تخت نشین کیا، جو سلطان احمد شاہ اول کا نبیرہ تھا، لیکن اس کے اخلاق وزیروں کو پسند نہ آئے، اس لئے ایک ہفتہ کے بعد معزول کر دیا، اس کا کوئی سکہ میری نظر سے نہیں گذرا،

سلطان محمود شاہ اول عرف بیگڑہ ناصر الدنیا والدین	سلطان محمود شاہ بروز یک شنبہ ماہ شعبان ۸۶۳ھ میں احمد آباد کے تخت پر جلوس فرما ہوا، یہ قطب الدین کا سوتیلا بھائی اور محمد شاہ ثانی بن احمد شاہ اول

بانی احمد آباد کا لڑکا ہے، اس کی والدہ سلطان جام سندھ کی شاہزادی تھی، ۹۲۰ھ میں اس کے اور احمد شاہ اول کے سکے جمعہ بازار میں اس کثرت سے ملتے تھے کہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی، یہ سکے ہر قسم کے اور ہر سائز کے تھے روپیہ، پیسہ، دھیلا وغیرہ مگر دوسری جنگ کے بعد سے نہیں ملتے، سب کو ڈھال کر تانبہ بنا لیا گیا، جن کی ضرورت میدان جنگ میں اس وقت بہت تھی،

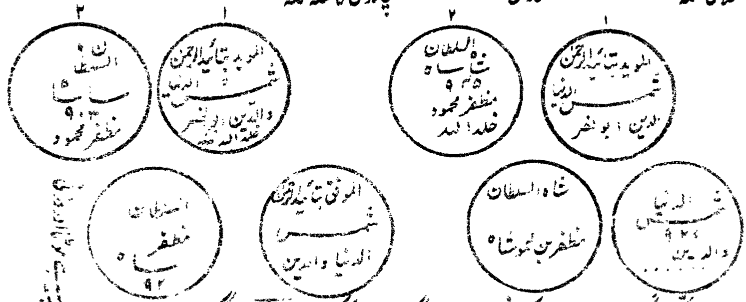
واضح رہے کہ تمام گجراتی سکوں پر خواہ وہ سونے کے ہوں، یا چاندی کے یا تانبے کے ایک قسم کا نقش ہوتا تھا، اس کا افسوس ہے کہ گجراتی بادشاہوں کے سب طلائی سکے نظر سے نہیں گذرے لیکن سلطان محمود اول، اور سلطان مظفر ثانی بن محمود اول کے طلائی سکے کھنبائت اور احمد آباد میں دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے جس سے قیاس ہوتا ہے کہ غالباً تمام سلاطین کے مسکوک ایک ہی طرح کے ہیں، چاندی، سونے اور تانبے کے سکے گول وزنی تقریباً ایک تولہ کے ہوتے تھے محمود اول کے چاندی کے سکے کئی بار وزن کئے، سب ایک تولہ کے نکلے،

سلطان محمود کے طلائی سکے پر یہ تحریر ہے: "السلطان الاعظم ناصر الدنیا والدین ابو الفتح محمود شاہ السلطان"

چاندی کے سکے کے نقوش مختلف ہیں بعض پر مندرجۂ بالا تحریر منقوش ہے اور بعض پر احمد آباد، مصطفیٰ آباد وغیرہ کا اضافہ ہے، ایک تیسرے قسم کا سکہ ہے جس میں چاندی کم اور تانبہ زیادہ ہے، غالباً اسی کو ٹنکہ سیاہ کہتے تھے، یہ بھی دوسرے سکوں کی طرح گول، وزنی تقریباً ایک تولہ کا ہوگا، یہ سکہ غالباً ابتدائی زمانہ کا ہے، جو قطب الدین کے آخر زمانہ میں مسکوک ہوا، اور اس کے بعد بھی سکہ محمود کے نام سے جاری کیا گیا، عبارت یہ ہے:-

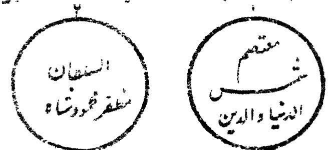
"خلیفۃ امیر المومنین خلدت خلافتہ ناصر الدنیا والدین ابو الفتح محمود شاہ السلطان"

طلائی سکہ محمودی چاندی کا سکہ ٹنکہ



یہ سکہ کا سنہ غالب دھیلا ہے، دین کے نیچے کا حصہ مٹ گیا ہے، غالباً کنیت ابو نصر ہوگی،

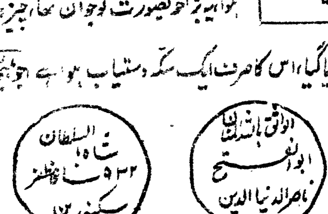
اس کا ایک سکہ اور دستیاب ہوا ہے جس میں نہ سنہ ہے اور نہ کنیت، اس لئے مجھے وہ مشکوک نظر آیا، ممکن ہے کہ وہ مظفر آخری سلطان کا ہو، اس کا نقش یہ ہے:-



اس میں معتصم کا لفظ مشتبہ ہے، کیونکہ مظفر شاہ حلیم کے عہد تک کسی نے ہندوستان میں خلفائے عباسیہ کے القاب اختیار نہیں کئے تھے، ۹۳۲ھ میں اس کا انتقال ہوا، اور سرکھیج میں باپ کی قبر سے متصل دفن کیا گیا،

سلطان سکندر بن مظفر شاہ ثانی ناصر الدنیا والدین	مظفر شاہ حلیم کے انتقال کے بعد اس کا بڑا لڑکا سکندر شاہ ۹۳۲ھ میں تخت نشین ہوا، یہ بڑا خوبصورت نوجوان تھا، جیز پہننے کی ایجاد کا شوق رکھتا تھا لیکن دو ہی

مہینے کے اندر قتل کر دیا گیا، اس کا صرف ایک سکہ دستیاب ہوا ہے جو نہایت ہی مبہم ہے،

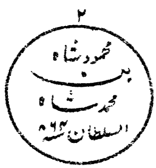


محمود شاہ بن مظفر شاہ ثانی برادر سکندر	سکندر کے قتل کے بعد اس کے ایک لڑکے نصیر خان الملقب بہ محمود ثانی کو جس کی عمر چھ سال کی تھی امیر الامراء عماد الملک نے تخت نشین کیا، اس کے صرف دو سکے مجھے ملے ہیں مگر

بعد کو کٹ گئے ہیں، یہ بادشاہ چانپانیر سے متصل گودھرہ میں تخت نشین ہوا تھا، اس لئے سکہ غالباً اسی جگہ مسکوک ہوا،

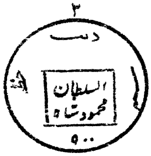
تانبہ کا سکہ





جزیرہ دیو کا سکہ





سلطان محمود ثالث کا ایک چاندی کا سکہ مندرجہ ذیل ہے:

نقرئی سکہ



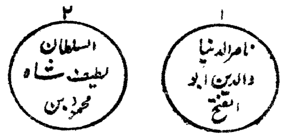


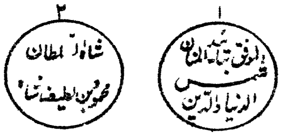
سلطان مظفر حلیم ثانی

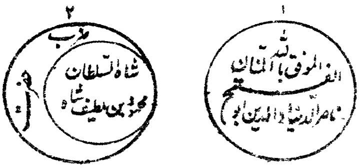
سلطان محمود بیگڑہ کے انتقال کے وقت اس کے چار لڑکون مین صرف یہی ایک لڑکا زندہ تھا، اس کا نام مظفر خان تھا، ۹۱۷ھ مین تخت نشین ہوا، سلاطین گجرات مین اس سے بڑھ کر کوئی عالم نہین ہوا، حافظ قرآن تھا، حدیث مین بھی ماہر تھا، اگر بادشاہ نہ ہوتا، تو گجرات کا بڑا محدث شمار ہوتا، طبیعت کا بڑا حلیم تھا، اسی لئے اس کو سلطان مظفر حلیم کہتے تھے، اس کے اساتذہ مین بڑے بڑے مشہور لوگون کے نام آتے ہین، فن خطاطی مین بھی اس کو کمال تھا، سال مین دو قرآن پاک اپنے ہاتھ سے لکھ کر مکہ و مدینہ (زادہما اللہ شرفہما) بھیجا کرتا تھا، اس کی حکومت بھی تمام سندھ کی شمالی حد تک تھی، اس کے عہد کے سونے چاندی اور تانبہ ہر طرح کے سکے نظر سے گذرے، پیسہ دھیلا، دوکڑہ وغیرہ بھی اس کے عہد مین بکثرت مسکوک ہوئے، مختلف سکون پر مختلف عبارتین درج ہین، "شمس الدنیا والدین" اس کا خطاب اور ابو النصر کنیت ہے،

سونے کا جو سکہ کھنبایت مین نظر سے گذرا، وہ زمین کھودتے وقت ایک شخص کو دست یاب ہوا تھا، اس کا نقش بالکل چاندی کے سکہ کی طرح ہے، اور اس پر "المؤید بتائید الرحمٰن شمس الدنیا والدین ابو النصر مظفر شاہ محمود شاہ السلطان سنہ ۹۲۲ھ" درج ہے،

چاندی کے سکے مین مختلف عبارتین درج ہین، کسی مین اس کا تنہا نام ہے اور کسی مین اس کے باپ کا بھی نام ملتا ہے، کسی مین مظفر بن محمود ہے، اور کسی مین مظفر محمود ہے، یعنی بن کا لفظ نہین ہے، اس کی شکلین یہ ہین،

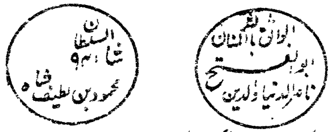
۴


۵


۶


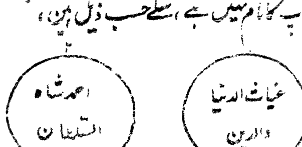
اس کے دوسرے رُخ کے اطراف میں ضرب حضرت صرف ملفوظ ہوا، تیسرے طرف احمد آباد یا محمود آباد ہونا چاہیے، کیونکہ انھی دو جگہوں میں اس کا قیام رہتا تھا،

اس کے ایک طلائی سکہ کا نقش یہ ہے :-

۷


۱۳ ربیع الاول ۹۶۱ھ میں بمقام محمود آباد شہید کر دیا گیا، اور محمود بیگڑا کے مقبرہ میں دفن ہوا،

سلطان احمد شاہ سوم | سلاطین گجرات میں احمد شاہ تین ہوئے ہیں، اول احمد شاہ بانی احمد آباد، اور دوسرا اسی کا پوتا قطب الدین احمد شاہ بن محمد شاہ بن احمد شاہ بانی احمد آباد، اور تیسرا بہادر شاہ کے بھتیجے محمود شاہ بن لطیف شاہ کے بیٹے احمد شاہ، اول اپنے سکہ میں ناصر الدنیا والدین مسکوک کراتا تھا، دوسرا احمد قطب الدنیا والدین تحریر کرتا تھا، اس لئے جن سکوں کا آگے ذکر کیا جائے گا وہ قطعاً اسی تیسرے احمد کے ہونگے جس کے سکہ میں غیاث الدنیا والدین ہے کیونکہ اس کے سوا اور کوئی دوسرا سلطان احمد گجرات میں نہیں ہوا، جو اپنے کو غیاث الدین لکھتا ہو، ان میں سے دو سکوں پر باپ کا نام نہیں ہے، سکے حسب ذیل ہیں،

(۱)


(۲)


پہلے سکہ میں سلطان کا لفظ احمد شاہ کے نیچے ہے، اور دوسرے میں احمد شاہ کے اوپر ہے،

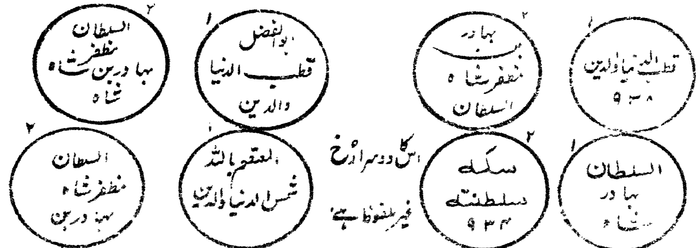
(۳)




یہ سکہ تانبہ کا ہے اور چھوٹا ہے،

سلطان بہادر شاہ بن مظفر شاہ ثانی

سکندر کی موت کے وقت اس کا چھوٹا بھائی بہادر شاہ دہلی میں تھا، موت کی خبر سن کر گجرات آیا، اور ۲۷ رمضان ۹۳۲ھ کو احمد آباد میں تخت نشین ہوا، اور عید بعد چانپانیر پہنچا، اور محمود شاہ ثانی کو قتل کرکے وہاں دوبارہ تخت نشین ہوا، اس کے سکے مختلف قسم کے دستیاب ہوئے یہ سب تانبہ کے ہیں، چاندی یا سونے کا کوئی سکہ نہیں ملا، ان کے نقش یہ ہیں،

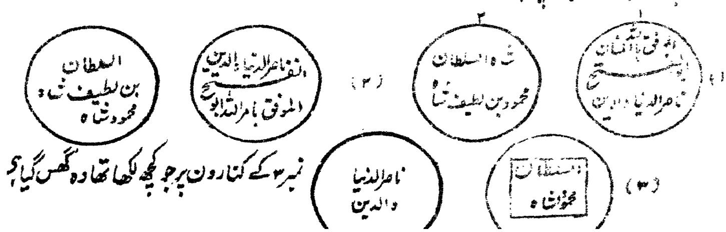


اس کا دوسرا رخ غیر ملفوظ ہے

سلطان محمود شاہ ثالث بن لطیف خان

رمضان ۹۴۳ھ میں بہادر شاہ پرتگیزوں کے ہاتھ سے سمندر میں غرق ہو گیا، اور گیارہ برس کی عمر میں سلطان محمود بن لطیف خان بن مظفر ثانی یعنی بہادر شاہ کا بھتیجا ۹۴۳ھ میں تخت نشین ہوا،

اس بادشاہ کے سکے بھی بہت ملے ہیں، اور مختلف القاب کے ہیں، ان القاب کے بار بار بدلنے کے اسباب تاریخ میں نہیں ملے، ابتدا میں وہ مختلف وزیروں اور امیروں کے ماتحت نظر بند رہا، اور آخر میں خود مختار ہوا، ممکن ہے ہر امیر نے نئے خطاب سے سکہ مسکوک کرایا، لیکن زیادہ تر ناصر الدنیا والدین ہی کا خطاب سکوں میں ملا، اس لئے اصلی اور پہلا خطاب اسی کو سمجھنا چاہئے،



نمبر ۳ کے کناروں پر جو کچھ لکھا تھا وہ گھس گیا ہے

اس کی حکومت رہی، پھر اکبر بادشاہ سلطان مظفر کو آگرہ لیتا گیا، اور عرصہ تک نظر بند رکھا، مگر جب گجرات پر اس کا مکمل تسلط ہو گیا، تو پھر سلطان مظفر کی نگرانی کی جانب زیادہ توجہ نہ کی، اور اس نے موقع پاکر راہ فرار اختیار کی، اور گجرات پہنچکر آکر مدعی سلطنت ہو گیا، اور عرصہ تک کاٹھیاواڑ مین شورش برپا کرتا رہا، آخر ۱۰۰۱ھ مین گرفتار ہوا، مگر راستہ مین اُس نے اُسترہ سے خودکشی کر لی،

اُس کے سکّے تین قسم کے ہین، اول خاص مظفر کے ۹۶۸ھ سے ۹۸۰ھ تک کے، دوسرے اس کے بعد سے ۱۰۰۱ھ تک اور تیسرے جام اور پوربندر کے، اس کا اپنا خاص سکہ جو ۹۶۸ھ سے شروع ہوتا ہے، اس کے پہلے رُخ پر "المؤید بتائید الرحمٰن شمس الدنیا والدین" اور دوسرے پر "مظفر شاہ السلطان" باقی اطراف کی تحریر پڑھنے مین نہین آتی،





میرے پاس مختلف قسم کے سکے ہین بعض بڑے موٹے اور دبیز، بعض چھوٹے بعض پتلے، چپٹے، اور بڑے بعض چھوٹے، اُن کے سنہ مختلف ہین، اور ۹۷۹ھ، ۹۶۹ھ، ۹۸۰ھ کے متعدد سکے ہین بعض کے اعداد صاف نہین پڑھے جاتے، ایک اور قسم کا سکہ بھی مسکوک ہوا تھا، اس مین تانبے کا پیسہ دھیلا، وغیرہ ہر طرح کے موٹے پتلے اور چھوٹے بڑے سکے ہین، اس کے ایک رُخ پر "المؤید بتائید الرحمٰن ابو الفتح ناصر الدنیا والدین" اور دوسرے پر "مظفر شاہ بن محمود شاہ السلطان" ہے میرے پاس اس قسم کے ۵۲ سکے ہین، ان مین سے ۱۴ سکے ۹۸۰ھ کے بعد کے ہین، یعنی ۹۸ھ تحریر ہے، ۰ کا عدد کٹ گیا ہے، اور ۱۴ سکے اسی طرح کے ۹۷۰ھ کے بعد کے ہین، ایک سکہ پر البتہ صاف طور پر ۹۸۰ھ درج ہے باقی سکون کے سنہ صاف طور پر نہین پڑھے جاتے





ایک سکہ چاندی کا بھی ملا ہے، جس کو مظفری کہتے تھے، اس کا نقش یہ ہے،

(۴) اسی قسم کا ایک اور سکہ ہے :-



۱ ۵



۲

ان تینوں سکوں پر غور کرنے سے یقین ہو جاتا ہے کہ وہ احمد شاہ ثالث ہی کے ہیں، کیونکہ سکوں میں سنہ صاف پڑھا جاتا ہے یعنی سنہ ۹۶۲ھ باقی ایک اور ۲ کا ہندسہ زیادہ صاف نہیں ہے اور گجرات کے تخت پر سنہ ۹۶۱ھ سے سنہ ۹۶۸ھ تک کوئی دوسرا شخص احمد نامی نہیں بیٹھا، البتہ تاریخ گجرات میں کوئی ایسا احمد نہیں ہے جس کے باپ کا نام محمود شاہ ہو، تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح محمود شاہ بن لطیف شاہ ہے، اسی طرح احمد شاہ بن محمود شاہ ہوگا، یعنی لطیف شاہ بادشاہ نہ تھا، بلکہ فقط خاندان شاہی میں سے ایک شاہزادہ تھا، اسی طرح محمود شاہ ہوگا، لیکن مرأة سکندری میں اس کا نام "احمد شاہ بن لطیف خان بن نبیرۂ لشکر خان بن سلطان احمد بانی احمد آباد" لکھا ہوا ہے، اور ظفر الوالہ میں احمد شاہ بن لطیف خان بن نظام خان بن لشکر خان بن سلطان احمد اول تحریر ہے، اور فرشتہ احمد ثانی یعنی قطب الدین کے اولاد سے بتلاتا ہے، جو صحیح نہیں ہے، کیونکہ قطب الدین کے کوئی نرینہ اولاد تھی ہی نہیں، ممکن ہے کہ نواسوں میں ہو،

اس لئے مندرجۂ بالا امور کو مدنظر رکھتے ہوئے میرا خیال ہے کہ تاریخوں میں احمد شاہ اور لطیف خان کے درمیان محمود خان کا نام غلطی سے رہ گیا ہے، جس کی تصدیق سکوں سے ہوتی ہے،

مظفر شاہ رابع عرف نتھو

اس کا اصل نام نتھو ہے، ہندوستان اور گجرات میں ننھا نتھو، چھوٹے بچوں کو پیار سے کہتے ہیں، اور بعض لوگوں کی آخر عمر تک اسی نام سے شہرت رہتی ہے، مرأۃ احمدی میں اس کا نام نتھو (بہ تائے ہندی) مرقوم ہے جو کتابت کی غلطی ہے، کیونکہ طبقاتِ اکبری میں بھی نتھو (ن) سے ہے، شمار کے اعتبار سے یہ چوتھا مظفر ہے لیکن سلطان مظفر سوم صرف چند دن بادشاہ رہا، اس لئے عام طور پر اس کو مظفر سوم ہی سمجھا جاتا ہے، یہ ابھی خورد سال تھا کہ سلطان احمد کے انتقال کے سبب سنہ ۹۶۸ھ میں تخت نشین ہوا، اعتماد خان وزیر نے قسم کھا کر کہا تھا کہ "یہ محمود بن لطیف خان کا لڑکا ہے" یہ گجرات کا آخری بادشاہ ہے سنہ ۹۸۰ھ تک

شری جام کا لفظ گجراتی خط میں ہو، بعد کے سکوں میں اول رخ پر شمس الدنیا والدین کا لفظ مٹ گیا ہو اور آخر کے سکوں پر فقط لفظ شمس رہ گیا، باقی جگہوں میں صرف لکیریں ہیں، اس قسم کے سکے میرے پاس بہت ہیں،

محمودی جامی | یہ عجب بات ہو کہ سلطان محمود بن لطیف کے نام سے بھی جام نے سکے ڈھالے ہیں، جس سے اوپر کا نظریہ باطل ہو جاتا ہے لیکن میرا قیاس ہے کہ جب مغلیہ عہد میں جام کو سکے ڈھالنے کی ممانعت کر دی گئی تو اس نے بجائے .... مظفری کے محمودی نقش کرانا شروع کر دیا، اس کے ایک رخ پر محمود شاہ لطیف شاہ اور نیچے شری جام گجراتی میں ہے، دوسری جانب شمس الدنیا والدین ہے، اور اس کے نیچے کٹار کی شکل منقوش ہو، یہ سکہ بیضوی اور وزنی ہے، سنہ کوئی نہیں ہے، یہ سکے بھی بڑی تعداد میں ملے ہیں، اور سب تانبے کے ہیں،



راناپور بندر کی مظفری | راناپور بندر (کاٹھیاواڑ) نے بھی مظفری مسکوک کی، اس کے ایک رخ پر مظفر شاہ سلطان اور اس کے نیچے رانا لکھا ہوا ہے، اور دوسری طرف شمس الدنیا والدین ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جام کو دیکھ کر رانا نے بھی سکے مسکوک کرنا شروع کر دیئے تھے، سنہ اس میں بھی نہیں ہے لیکن جام کی طرح اس کا بھی دوسرا رخ بگڑتا گیا ہے جس میں صرف شمس پڑھا جاتا ہے، باقی لکیریں نظر آتی ہیں، اس کے چھوٹے بڑے سب قسم کے تانبے کے سکے موجود ہیں،

خلفائے راشدین رض

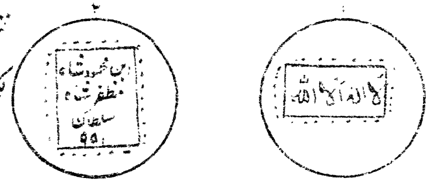
اس میں خلفائے راشدین رض کے ذاتی حالات و فضائل، مذہبی اور سیاسی کارناموں اور فتوحات کا مفصل بیان ہے، قیمت :- ۵ر طبع چہارم (مرتبہ مولانا حاجی معین الدین ندوی مرحوم)

"منیجر"



اسی نقش کا ایک سکہ طلائی بھی ملا ہے، اور اسی نقش کا تانبہ کا بھی دیکھا،

ایک سکہ اور ملا ہے، جو اس کے گرہ سے بھاگ آنے کے بعد کا ہے، یہ ایک طرح سے اکبر کے سکہ کی نقل ہے، یعنی اس کے ایک رخ پر کلمہ لا الٰہ الا اللہ اور دوسرے پر سلطان مظفر شاہ بن محمود شاہ ہے، سلطان کے بعد دونوں رخ کے حاشیہ میں کچھ لکھا ہے جو کٹ گیا ہے،

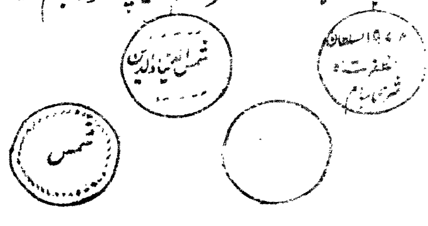


اس کا ایک اور سکہ ۹۷۳ھ کا ہے جس پر شمس الدنیا والدین مظفر شاہ السلطان ۹۷۴ھ تحریر ہے، اسی طرح ایک سکہ جو پائی معلوم ہوتی ہے، اس پر ۹۷۵ھ درج ہے، اسی قسم کا ایک سکہ دھیلا معلوم ہوتا ہے، جو چھوٹا سا گول ہے، اس پر ۹۷۶ھ منقوش ہے،

۹۷۷ھ کا بھی تانبہ کا ایک سکہ ہے، اس کے کنارے پر شاید احمد آباد تحریر ہو جو کٹ گیا ہے،

مظفری جامی | ۹۷۸ھ میں سلطان مظفر تھو نے جام نگر (کاٹھیاواڑ) کے راجہ جام کو سکہ ڈھالنے کی اجازت دی، اس لئے اس نے ہر سکہ پر اسی سنہ کو بطور یادگار قائم رکھا، جو پڑھنے میں ۹۸۰ھ یا ۹۷۸ھ نظر آتا ہے، سب تانبے کے ہیں، چاندی یا سونے کا سکہ نظر سے نہیں گذرا،

جام کے زیادہ تر بیز، وزنی اور بڑے سکے میرے پاس زیادہ ہیں جن کے ایک رخ پر "شمس الدنیا والدین" دوسرے پر "مظفر شاہ السلطان (یا السلطان مظفر شاہ) نیچے "سری جام" اور اوپر ۹۷۸ھ نقش ہے،



خلاف رہا، اور شعرائے اردو کسی اور دنیا کے رہنے والے تھے، جو ملک کے حالات سے بے خبر رہے، اور سوائے غزل کے فرسودہ مضامین کے اُن کو نئی شاہراہیں نہ مل سکیں، اس صحبت میں ہم اس غلط خیال کی تردید کے لئے اجمالاً مشاہیر شعرائے اردو کے کلام سے ایسے اشعار پیش کریں گے جس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جائیگی" کہ ہمارے شعراء زندگی کی حقیقتوں سے بے خبر نہیں تھے، اور اُن کی نظر میں سیاست کا خاکہ تھا گو وہ ملاہی سہی شہنشاہیت اور جاگیرداری نظام کے خلاف جو آوازیں آج بہت زور شور سے سنائی دیتی ہیں، وہ اردو شاعری میں دو سو سال پہلے سے سنائی دے رہی تھیں۔

اردو شاعری میں جو سرمایہ فارسی سے منتقل ہوا، وہ غزل کی قدیمی روایات تھیں، متقدمین نے انھیں سر آنکھوں پر رکھا، مگر اسی کے ساتھ انھوں نے ہندوستانی رسم و رواج ہندوستانی تہذیب و معاشرت کا پورا خاکہ بھی اپنے اشعار میں کھینچا، شیر شاہ سوری نے جس اتحاد قومی کی بنیاد ڈالی تھی، اور اکبر نے جس کو پروان چڑھایا تھا، وہ اگرچہ حکومت کے انحطاط کے ساتھ کمزور پڑ گئی لیکن اتحاد قومی کا دامن کبھی بھی پارہ پارہ نہ ہو سکا؛ اورنگزیب کی موت مغلیہ سلطنت کے لئے پیغام زوال تھی، اس کے جانشین خود اپنی حفاظت ہی نہ کر سکتے تھے تو ملک کی حفاظت کیا کرتے، ملک مختلف سیاسی، قومی اور مذہبی تحریکوں میں بٹ گیا، آصف جاہ اول نے جنوبی ہند کے چھ صوبے دبا لیے، بنگال کا صوبہ دار خود مختار ہو گیا، گجرات اور راجستھان کے علاقے مرکز سے باغی ہو کر الگ ہو گئے، باہمی سازش اور جوڑ توڑ کا نتیجہ یہ نکلا کہ مرہٹوں نے صوبہ احمد آباد وغیرہ سے اُبھر کر پورے ہندوستان کو زیر و زبر کر ڈالا، اور بڈھا بہادر شاہ اول چار برس میں ناکام زندگی گذار کر چل بسا، بیٹے نا اہل تھے، آپس میں ٹکرا گئے، جہاندار شاہ کامیاب رہا، مگر جو تلوار کی چمک سے گھبرا جائے، وہ ہندوستان کے تخت پر کس طرح رہ سکتا تھا، چنانچہ کچھ دنوں بعد جہاندار شاہ قتل ہوا، اور اس کی حکومت فرخ سیر نے سنبھالی، اس کو سید برادران نے حکومت بخشی تھی، اور انہی کے ہاتھوں چند سال بعد یہ نام کا شہنشاہ ہندوستان قتل ہوا، مرزا بیدل جو سید برادران کے وظیفہ خوار شمار ہوتے تھے خاموش نہ رہ سکے، اور کہا "سادات بو نمکحرامی کردند

اردو شاعری اور سیاست

از

جناب کلب علی خان صاحب رامپوری

اردو میں سیاسی شاعری کا وجود ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب کے نزدیک بیسویں صدی عیسوی سے پایا جاتا ہے، اس سے قبل کہیں کہیں معمولی سے اشارے ملتے ہیں، اس سلسلہ میں آزاد اور حالی کی نظموں کو بنیاد اولین مان لیا گیا ہے، غدر سے قبل کی شاعری صرف گل و بلبل، ہجر و وصال، رقیب و دربان میں اور کنگھی چوٹی میں الجھی ہوئی تھی، اور اگر کسی نے قومی نظریہ پر لکھنا چاہا، تو صرف ہندو اور مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے لکھا گیا، حالی کی مسدس[۵۱] اسی کی آئینہ دار ہے،

تحریک آزادی[۵۲] — اردو کا سیاسی رجحان ۱۸۵۷ء کے بعد بالعموم ہندوستان کی ہر سیاسی قابلِ قدر اور ہر دل عزیز تحریک سے متاثر ہوتا رہا ہے، اب فرید طالعہ کے بعد اس نظریہ میں تبدیلی ہوئی ہے اور ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب کو بھی تسلیم کرنا پڑا کہ ہندوستان میں قومیت کا وہ نظریہ نہیں تھا جس کو آج دنیا زندگی سمجھتی ہے، خود یورپ میں قومیت کا جدید تصور اٹھارھویں صدی کے دوسرے نصف سے مانا جاتا ہے، اس سلسلہ میں اردو ادب کی چھان بین کسی نے گہری نظر سے نہیں کی، اور ادھر ادھر سے جو نمونے پیش کئے گئے ہیں، وہ کسی حد تک بھی قابلِ اطمینان نہیں، اور یہ بطور کلیہ کے مان لیا گیا ہے کہ اردو شاعری کا رجحان زمانہ کے حالات اور تقاضوں کے بالکل

---

[۵۱] نئے ادبی رجحانات ص ۹۷، از ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب [۵۲] ایضاً ص ۱۲۶۔

[۵۳] فن کار اکتوبر نومبر ۱۹۵۳ء،

منبر پر سے کھینچ لیا گیا، روشن الدولہ نے جوہری کو اپنے یہاں پناہ دی تھی، اس لئے اس کی مرمت بھی کی گئی قمر الدین خان وزیر اعظم بھی اس ہنگامے میں ذلیل ہوئے،..... ان واقعات سے شعراء کا گروہ بھی متاثر ہوا چنانچہ بینوا نے جوتہ فروش اور جوہری کے سلسلہ میں ایک شہر آشوب لکھ ڈالی، شہر آشوب میں واقعہ کی تفصیل کے ساتھ ساتھ روشن الدولہ کا بھی مضحکہ اُڑایا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شعراء بھی شخصی نظام سے تنگ آچکے تھے،

کتنوں کو مار جی سے قضا نے گرادیا — کتنوں کو جی بچا کے بہت ٹھہرادیا

کاغذ پہ بینوا نے یہ سن کر چڑھا دیا — لگتے ہی مار جوتیوں طُرّہ گرا دیا

تا حشر ہر زبان پہ رہے گا یہ یادگار

قبل ۲۴ رجب ۱۱۴۶ھ مطابق دسمبر ۱۷۳۳ء	شیخ نجم الدین عرف شاہ مبارک آبرو گوالیاری ثم الدہلوی، خان آرزو کے شاگرد بھی تھے، اور قریبی رشتہ دار بھی عالمگیر کے آخری عہد میں اُن کی ولادت ہوئی

زندگی کی پچاس بہاریں دیکھ کر ۲۴ رجب ۱۱۴۶ھ کو راہی ملکِ بقا ہوئے، اُن کی شاعری پر بڑا اعتراض یہ ہے کہ ایہام اور رعایت لفظی کی بھول بھلیاں ہے لیکن غائر نظر سے دیکھنے کے بعد ان خزف ریزوں میں گوہر نایاب بھی ہاتھ آہی جاتے ہیں، چنانچہ وہ بھی بگڑے ہوئے حالات سے مطمئن نہ تھے، چنانچہ اقتصادی بدحالی کا نقشہ اس شعر میں نظر آتا ہے،

اب زمانہ ہے بے طرح بگڑا — کیا بنے روزگار کی صورت

امراء اور اراکین حکومت عوام کی حالت زار سے جس قدر غافل تھے، یہ شعر اس کی پوری مصوری کرتا ہے،

دلّی میں دردِ دل کا کوئی پوچھتا نہیں — مجھ کو قسم ہے خواجہ قطب کے مزار کی

اقتصادی بحران عام تھا جس سے عوام اور خواص دونوں متاثر تھے، صرف چند اراکین سلطنت داد عیش

---

۱ بقیہ حاشیہ ص ۴۴، ہنگامہ کفش فروشان شدص ۴۶، ۲ تنقیح الاخبار مخطوطہ رضا لائبریری رامپور صفحہ ۲۳۴ تاریخ ہند جلد ہشتم مولوی ذکاء اللہ خان واقبالنامہ محمد شاہی مخطوطہ ص ۷، ۱۵۱ مبارک اللہ آبرو تخلص از اولاد شیخ

دہلی میں چند مہینوں کے اندر کئی بادشاہ ان بھائیوں نے بنا ڈالے، آخر قرعۂ فال محمد شاہ کے نام پڑا، سید برادران پر فی تورانی عصبیت کا تشدد کار ہو کر بادشاہ گری کے منصب سے معزول و مقتول ہوئے، محمد شاہ کا آغاز سلطنت ایسا دکھائی دے رہا تھا، کہ یہ ڈوبتی ہوئی کشتی شاید منجدھار سے نکل جائے لیکن جوانی دیوانی مشہور ہے، محمد شاہ بابر جیسا عزم کہاں سے پیدا کرتا، دہلی کی نام نہاد شاہی پر قناعت کر کے داد عیش و نشاط دینے لگا، امرا ایرانی تورانی گروہ میں بٹ گئے، راجپوتوں نے مرکز سے رابطہ چھوڑ دیا، ایسی حالت میں مرہٹوں کا عزم تسخیر پھر کیوں کا ٹھنڈا ہوتا، ہر صوبہ دار باغی ہو گیا، دہلی کے متصلہ صوبے اگرچہ اہل امراء کے ہاتھوں میں تھے لیکن مرکز کی کمزوری کا نتیجہ یہ نکلا کہ سب نے اپنی فکر شروع کر دی تھی، روہیل کھنڈ میں روہیلہ پٹھانوں نے ایک نئی ریاست کی بنیاد ڈالی محمد خان بنگش نے دوسری ریاست فرخ آباد قائم کی، برہان الملک نے اودھ کی حکومت کا ڈھانچہ کھڑا کیا اس انتشار کا یہ نتیجہ نکلا کہ مرہٹوں نے ۱۱۴۹ھ میں دہلی پر پہلا حملہ کر کے مرکزی حکومت کو میدان جنگ میں نیچا دکھا دیا، ۱۱۵۱ھ میں نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کر کے دہلی کو زیر و زبر کر ڈالا جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، یہی زمانہ ہماری اردو شاعری کا زریں دور کہلاتا ہے، متقدمین اردو شاعری کے اولین معمار ہی نہ تھے، بلکہ بعض حیثیتوں سے اسکے خاتم بھی تھے، چنانچہ سودا و میر کا ثانی پیدا نہ ہو سکا، اس لئے دیکھنا یہ ہے کہ ان شعراء نے اپنے عہد کی ترجمانی کس حد تک کی ہے، ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ اردو شعرائے متقدمین و متوسطین نے اپنے احول کی جو عکاسی کی ہے، اس سے بہتر ممکن ہی نہیں ہے، ہندوستان اس زمانہ میں جس تاریخی دور سے گذر رہا تھا، اس کا پورا پورا نقشہ ہماری نظروں کے سامنے اردو شعراء نے پیش کر دیا ہے۔

شعبان ۱۱۴۲ھ مطابق مارچ ۱۷۳۰ء	ہولی کے دنوں میں دہلی میں ایک ہندو جوہری کے ہاتھ سے ایک مسلمان جوتہ فروش مارا گیا، اس کا بڑا ہنگامہ ہوا، یہاں تک کہ خطیب (بروز جمعہ جامع مسجد دہلی) کو

---

۱ اس بارے میں اختلاف ہے کہ اس حملہ میں کتنے آدمی مرے آٹھ ہزار ڈیڑھ لاکھ تک تخمینہ کیا گیا ہے ... لوٹ کا تخمینہ کوئی ستر کروڑ کوئی بیس کروڑ بتاتا ہے، جواہرات تفصیل ... تاریخ ہند ذکاء اللہ ج ۹ ص ۲۹۰، ص ۲۵۹ ؎ روز جمعہ دوم شعبان ۱۱۴۲ھ ہجری

اس وقت وقن ہونا نصیب ہوا، اس واقعہ سے ہم اُس عہد کا صحیح اندازہ کرسکتے ہیں، ان حالات میں عیش پسند امرا نادری فوج کا مقابلہ کس طرح کرسکتے تھے، ناجی نے شہر آشوب میں اس ماحول کی سچی تصویر کھینچی ہے، دو بند ملاحظہ ہوں،

لڑتے ہوئے تو برس بیں اُن کو بیتے تھے	دعا کے زور سے دائی دوا کے جیتے تھے
شراب گھر کی نکالے مزے سے پیتے تھے	نگار و نقش میں ظاہر گویا کہ چیتے تھے

گلے میں ہنسلیاں، بازو او پہ طلا کی نال

قضا سے بچ گیا مرنا نہیں تو ٹھانا تھا	کہیں نشان کے ہاتھی اور نشانا تھا
نہ پانی پینے کو پایا وہاں نہ کھانا تھا	ملے تھے دھان جو شکر تمام چھانا تھا

نہ ظرف مطبخ و مکان، نہ غلہ و بقال

وفات ۱۱۶۴ھ | سید عبدالحی تاباں دہلوی، حاتم، سودا اور محمد علی حشمت کے شاگرد شمار ہوتے ہیں، محمد شاہی دور کے نوجوان شعراء میں تھے، غالباً اُن کی ولادت ۱۱۳۰ھ ہجری کے لگ بھگ ہوئی مختلف امراء سے وابستگی رہی خصوصاً نواب عمدۃ الملک میرخان کی تعریف دیوان میں پائی جاتی ہے تاباں نے ہوش سنبھالتے ہی ہنگامۂ نادری دیکھا، دلی عروس البلاد تھی، نادر شاہ نے تیس ہزار بے گناہ شہریوں کو تہ تیغ کرکے اپنا رعب قائم کیا، اور ہر مالدار سے انتہائی اذیت کے ساتھ روپیہ حاصل کیا تخت طاؤس جو نادر روزگار تھا مع تمام مال غنیمت کے ہندوستان سے لے گیا، محمد شاہ کی رگوں میں تیموری خون تھا لیکن روانی نہ تھی تلوار ہاتھ سے چھوٹ چکی تھی، اتنی عبرت انگیز تباہی بھی اُس کی آنکھیں نہ کھول سکی، وہ خود محفوظ رہا، اس لئے عوام و خواص کا درد محسوس نہ کرسکا، مگر تاباں کا ہندوستانی خون کھولنے لگا، اُس نے اس شکست کو اپنی شکست اور اس تباہی کو اپنی تباہی سمجھا، تخت طاؤس شاہجہانی اُس کے وقار وطن کا باعث تھا، نادر کا تخت لیجانا ہندوستان کی عزت پر حملہ تھا، اُس نے عوام کے درد کو محسوس کیا، اور پکار اٹھا،

دے رہے تھے، کچھ قدیمی امرا زادے باپ دادا کا اندوختہ اڑا رہے تھے لیکن وہ مخالف حالات کا کب تک مقابلہ کر سکتے تھے، جب کہ مرکز ٹوٹ چکا تھا، اور حکومت کی عطا کردہ جاگیروں پر نئے وارث بزورِ شمشیر قابض تھے جن سے مقابلہ کا اُن میں دم نہ تھا، اس لئے گھر کا سامان بیچ کر گذر بسر کر رہے تھے،

ایک امیرزادے بیٹھے گھر ہیں : ہر سیں اکثر گنوا دیتے ہیں گے کھٹ راگ نیچے پر سیں

زبانی ہے شجاعت ان سبھوں کی امیر اس جگ کے ہیں سب شیر قالی

مالکینِ سلطنت کی جاگیریں دہلی کے قریب ہی تھیں، اس لئے وہ اطمینان سے عیش و عشرت میں مشغول تھے، اور مرکز کی اُن کو کوئی فکر نہ تھی، مگر جب مرہٹوں نے صوبہ اکبرآباد (آگرہ) پر حملہ کیا، اس وقت اُمرا میں ہراس پیدا ہوا، امیر الامرا مرہٹوں کی تنبیہ کو نکلے، مگر جب دیکھا کہ مرہٹوں سے لڑائی اُن کے بس کی بات نہیں، تو صلح کر کے لوٹ آئے، نواب عمدۃ الملک میر خان انجام نے مزاحاً اس واقعہ کی تاریخ کہی ہے جو آئینۂ حال ہے، مصرع

نواب آئے ہمارے بھاگ آئے،

۱۱۴۷ھ
۱۷۳۴ء

۱۱۵۱ھ د ۱۱۵۲ھ | سید محمد شاکر ناجی محمد شاہ کے ہم عصر اور قدیم شعرائے اردو میں ہیں، میر اور قائم نے اُن کو کم سنی میں دیکھا تھا، چیچک رو تھے، سپاہی پیشہ اور ہنس مکھ تھے، بات بات میں مزاح کرتے تھے، ہنگامۂ نادری کے بعد انتقال کیا، تیس ہزار شرفائے دہلی کا تہِ تیغ ہونا، اور دہلی کا لٹنا، اپنی آنکھوں سے دیکھا، ہندوستانی فوج کی حالت ناقابلِ بیان تھی، سپاہ کو نہ تو وقت پر تنخواہ ملتی تھی، نہ سامانِ جنگ تھا، امرا بڑی بڑی جاگیریں دبائے بیٹھے تھے، فوج کی تنخواہ کہاں سے ادا ہوتی، مصاحبین اور اربابِ نشاط پر انعام و عنایات کی بارش تھی، عمدۃ الملک امیر خان انجام جس شان و شوکت سے رہتا تھا وہ شاہِ وقت سے کم نہ تھی، اُس کے قتل پر ضبط شدہ سامان کا تخمینہ ساٹھ لاکھ روپیہ کیا گیا، لیکن مرتے وقت ملازموں کی تنخواہیں واجب الادا تھیں، اور چار دن کے بعد جب ادا ہوئیں

(بقیہ حاشیہ ص ۴۵) محمد غوث گوالیاری از مشاہیر ریختہ گویان. ۲۴ رجب ۱۱۴۶ھ تاریخ محمدی ص ۱۰۹،)

تاباں اپنے دور کی پریشان حالی کا ذکر کرتا ہے، مگر حالات پر گہری نظر نہ تھی، اس لئے لہجہ میں یاس پائی جاتی ہے،

اس زمانے میں تو تابانؔ یہ ستم آیا ہوں تنگ　　　تنگی گور بھلی، وسعت دوران کے عوض

مساوات کی تعلیم بھی دیتا ہے جس کو ہم خواہ کمیونزم نہ کہہ سکیں، ترقی پسند خیالات ماننے پر مجبور ہیں،

ہو شاہ و گدا میں فرق لیکن تاباںؔ　　　آزاد کے نزدیک ہیں دونوں یکساں

شاہی تو کسی طرح سے دنیا میں نہ ہو　　　دن عمر کے ہر طرح سے کٹ جائینگے یاں

ولادت ۱۱۳۰ھ
وفات ۱۱۶۹ھ

انعام اللہ خان یقینؔ مجددی پیرزادے تھے تا نا شاہی امرا میں تھے، مرزا مظہر جان جاناں سے نسبت شاگردی ہی نہ تھی بلکہ اُن پر اُستاد کی خاص توجہ تھی، اُن کے معاصرین اُن کے مقبول عام کلام سے حسد کرنے لگے، اُن کا تغزل شیرینی و لطافت درد و اثر اور موسیقیت سے معمور ہے، اُن کی ولادت ۱۱۳۰ھ کے لگ بھگ ہوئی، محمد شاہی دور نشاط میں غزل ہی زندگی میں چھائی تھی، مگر اس پردہ میں بھی کہیں کہیں ماحول کی تصویر آجاتی ہے، رشوت ستانی عام تھی، وزرا و امرا و عہدہ داروں کے لئے شاہ وقت کو لاکھوں اور کروڑوں روپیے بطور نذرانہ پیشکش کرتے تھے، اور پھر جاگیرات سے لوٹ کھسوٹ کر اس کمی کو پورا کرتے، اس کی تصویر اس شعر میں ملاحظہ ہو،

خدمتوں میں بھی تجارت سے ہے زیادہ منفعت　　　رشوتوں میں ترتیب لاکھوں دو کے لیتے ہیں کرور

شاعر زمانہ کے حالات میں تبدیلی کا خواہش مند ہے، دوست احباب روکتے ہیں، کہ اس وادی پرخار میں قدم نہ رکھو، اس کے جواب میں کہتا ہے،

عمر آخر ہے جنوں کر لوں بہاراں پھر کہاں　　　ہاتھ مت پکڑو مرا یارو گریباں پھر کہاں

یقیں سے جلتے بجتے کا سر آنا بھی نہ ٹھکرا دو　　　اس آتش سے ارے دامن درازو کنارے رکھو

بہار آئی ہمیں کیا حکم ہوا ہے باغباں سچ کہہ　　　چمن میں رہنے پاویگا ہمارا آشیاں سچ کہہ

داغ ہو ہاتھ سو نادر کے مرادل تاباںؔ — نہیں مقدور کہ جا چھین لوں تخت طاؤس

محمد شاہ کی رنگین مزاجی ہندوستان کی تباہی کا باعث بنی، عوام اسے محسوس کر چکے تھے تاباںؔ نے ہندوستان کے اس عیش پرست بادشاہ پر بھی طنز کیا ہے، کہ اگر اسکندر کی طرح محمد شاہ بھی جرأت کرے، تو ہندوستان کے زرنگین دنیا ہو سکتی ہو، مگر محمد شاہ کے کانوں تک یہ آواز کون پہنچاتا، ذرا اس حب الوطنی کو دیکھئے، جو ۱۷۴۰ء میں تاباںؔ نے محسوس کی تھی،

طرح اسکندر کے تاباںؔ شاہ ہفت اقلیم ہو — گر ٹک اک جرأت کرے یہ خسروِ ہندوستاں

وہ محمد شاہ کی تباہی کا ذمہ دار عیش دوست امراء کو قرار دیتا ہی،

دیکھ کر ان کے تئیں شاہ بھی مردی پکڑے — ہو شجاعت کا اگر جزو امیروں کے بیچ

دلی کی بربادی کا نقشہ ان شعروں میں نظر آتا ہے،

فرش پر مخمل کے جو سوتے تھے ہائے — اب میسر اُن کو نہیں ہوتا ہے ٹاٹ

گھر کے گھر خاک میں مل گئے ہیں فلک کے ہاتھوں — پر نہیں اس کی خرابی کے کچھ آثار ہنوز

سرمایہ داروں کو تنبیہ کرتا ہے،

وہ کام تو کر جس سے تری گور ہو گلزار — کیا خانۂ دیوار کو کرتا ہے مقرنس

یہ دولت مند اگر شب کو نہیں یار تو پھر کیا ہے — کہ ہیں یہ چاندنی راتوں کو بھی محتاج مشعل کے

زندگی گذارنے کا طریقہ بتاتا ہے،

مرد کہتے ہیں اُسی مرد کو سب اہل تمیز — جو کرے زیست کو دنیا میں قلندر کی طرح

اس کے بعد شاہ علیہ الغفور جیسے فقرا پر جو عوام و خواص کو دام تزویر میں پھنسا کر دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹتے تھے، اس طرح طنز کرتا ہے،

یہ جو ہیں اہل ریا آج فقیروں کے بیچ — کل گنیں گے جتا انہی کو پیروں کے بیچ

گویا جہان سے جاتا رہا سخاوت و پیار

یہان کے قاضی و مفتی ہوتے ہین رشوت خور — یہان کے دیکھو تو سب اہلکار ہین گے چور
یہان کرم سے نہین دیکھتے ہین اور کی اور — یہان سبھون نے بھلائی ہے دل سے موند کے گور
یہان نہین ہے مدارا بغیر دار و مدار

امیرزادے ہین حیران اپنے حال کے بیچ — تھے آفتاب پر اب آ گئے زوال کے بیچ
پھرے ہین چرخ سے ہر دن تلاش مال کے بیچ — وہی گھمنڈ امارت کا پر خیال کے بیچ
خدا جو چاہے تو پھر ہو پر اب تو ہے دشوار

حرام خور جو تھے اب حلال خور ہوئے — جو چور تھے جو سو ہوئے شاہ، شاہ چور ہوئے
جو زیر دست تھے سو ان دنون مین زور ہوئے — جنھون کو زور تھا سو اب مثال مور ہوئے
جو خاک چھانتے پھرتے تھے سو ہوئے زردار

جہان مین صاحب خس خانہ گھاس ڈالے ہین — جنھون کے محل تھے اُن کو کھنڈر کے لالے ہین
کئی جو ہم نے بھی ٹکڑے کھلا کے پالے ہین — سو اب دماغ مین وہ رانی خان کے سالے ہین
وہ ہین سلام طلب ہم سے جب کہ ہو ہین دوچار

عجب یہ الٹی بہے ہے گی باد دلی مین — کہ شاہ باز چڑے مار کی ہے انٹی مین
روغن فروش کی ہین پانچون انگلیان گھی مین — جنگل کو چھوڑ کے بوم آ بسے ہین بستی مین
نجیب چھوڑ کے شہرون کو ہین جنگل مین خوار

کرے ہی چرخ اگر تجھ اُپر جفا حاتمؔ — تو سفلے پاس نہ کر جا کے التجا حاتمؔ
ترے ہے رزق کا ضامن سدا خدا حاتمؔ — تو انقلاب زمانہ سے غم نہ کھا حاتمؔ
کہ تجھ کو رزق بہت اور روزگار ہزار

ان اشعار میں دلی جذبات کی ترجمانی کے ساتھ دنیا کے مسائل پر بھی دھیمے دھیمے لہجہ میں اشارے ہیں، اور غزل کی زود زبان میں ولولۂ مردانہ ہے۔

ولادت ۱۱۱۱ھ
وفات ۱۱۹۷ھ

ظہور الدین شاہ حاتم ۱۱۱۱ھ میں پیدا ہوئے ۱۱۲۰ھ میں میدان سخن میں قدم رکھا، اُن سودا کی اُستادی سے شہرت پائی، عالمگیری عہد میں پیدا ہوئے، اور شاہ عالم کے عہد کی مرہٹہ گردی دیکھ کر دنیا سے رخصت ہوئے، ۱۱۶۹ھ میں دیوان زادہ مرتب کرکے قدیم دیوان کو جدید دیوان میں شامل کر دیا، انھوں نے بھی شہر آشوب لکھا، اور اپنے عہد کا صحیح خاکہ کھینچا، مسلسل انقلابوں کے اثر سے آخر میں تصوّف کے دامن میں پناہ لی، مشاعروں کا شوق آخر عمر تک رہا، جاگیردارانہ نظام کی ٹوٹ پھوٹ اُن کی نظر میں تھی، عوامی طاقتیں اُبھرنے لگی تھیں، دولت محلوں سے کھنچ کر عوام میں پہنچنے لگی تھی، متوسط طبقہ جو امراء کا دست نگر تھا، زیادہ پریشان حال تھا، پرانے امراء کی جاگیریں نئے طاقت ور حکمرانوں میں بٹ چکی تھیں، اس لئے اب شعراء کی پرورش کون کرتا، علماء، صلحاء، فقراء دست نگر کس کے پاس جاتے، حاتم سپاہی پیشہ تھے، اس لئے ان واقعات پر جھنجھلا اٹھتے ہیں، دلی میں بادشاہ میں فوج رکھنے کی طاقت ہی نہ تھی، امراء باتوں سے کام چلانا چاہتے تھے، غیرت و حمیت اُٹھ چکی تھی، دلی پر روزانہ حملے ہوتے رہے، جس میں عوام و خواص فوجوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوتے، شہر آشوب میں حاتم نے اس طبقاتی کشمکش کو صحیح طور پر پیش کیا ہے، جس کی روشنی میں بہت سے تاریخی مسائل حل ہوتے ہیں، اُس کے کچھ بند ملاحظہ ہوں،

تو کھول چشم حق، اور دیکھ قدرت حق یار	کہ جس نے ارض و سما، اور کیا ہے لیل و نہار
کہو تو عمر کو غفلت میں ٹک تو ہو ہشیار	کہ دور بارہ صدی کا ہے سخت کج رفتار

جہان کے باغ میں یکسان ہے اب خزان و بہار

شہوں کے بیچ عدالت کی کچھ نشانی نہیں	امیروں بیچ سپاہی کی قدر دانی نہیں
بزرگوں بیچ کہیں بوئے قدر دانی نہیں	تو اغنیٰ کھانے کو جا ہو کہیں تو پانی نہیں

جاتا تھا جب ڈپٹ کے میں اس کو حریف پر ... دوڑا وہ تھا، اپنے پاؤں سو چون طفل نے سوا
جب دیکھا میں کہ جنگ کی اب بندی ہی شکل ... بے جوتیوں کو ہاتھ میں گھوڑا بغل میں مار
دھر دھمکا وہاں سے لڑتا ہو شہر کی طرف ... القصہ گھر میں آن کے میں نے کیا قرار

سودا نے شیدی فولاد خان کی ہجو میں جو مثنوی کہی ہے، وہ صرف ذاتی عناد کا مسئلہ نہیں، بلکہ اس میں پولیس کی نااہلیت کو ثابت کیا گیا ہے، اس کا لہجہ اگرچہ تمسخرانہ ہے لیکن تنقید سیاسی ہے، شیدی فولاد خان دلی کا کوتوال تھا، چوریوں کا زور ہوا، اور اُس سے انسداد نہ ہوسکا، تو سودا نے حکومت کو متوجہ کرنے کے لئے مزاحیہ انداز میں یادگار زمانہ ہجو لکھ ڈالی، اس میں کوتوال اور چوروں کا مکالمہ بڑا دلچسپ ہے، سودا نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ امراء کے مکان چوروں کے اڈّے ہیں، کوتوال کا بیان قابل غور ہے،

بولے ہو وہ کہ میں بھی ہون ناچار ... گرم ہے چوٹوں کا اب بازار
کرتے ہیں مجھ سے اب بجا کر ڈھول ... میری پگڑی کا میرے سر پہ مول
یارو کچھ چل سکے ہے میرا زور ... دیکھ تو ٹک کہاں کہاں ہیں چور
مٹ سکے مجھ غریب سے یہ خلل ... ہے امیروں کے گھر میں چور محل

اسی طرح شہر آشوب میں سودا نے بھی دلی کا مرثیہ نہیں لکھا ہے، بلکہ مغل حکومت کے دم توڑنے اور عوام و خواص کی تباہی و بربادی کا نقشہ بھی دکھایا ہے، ایسی حالت میں اگر یہ شہر آشوب قومی مرثیہ نہیں تو کیا ہے،

یہ جتنے نقدی و جاگیر کے تھے منصب دار ... تلاش کرکے ڈھیلتی انھوں نے ہو ناچار
نہ ان قرض میں بنیوں کے وہی سپر تلوا ... گھروں سے اب جو نکلتے ہیں لیکے وہ تھیا

بغل کے بیچ تو سونٹا ہے ہاتھ میں کچکول

دیا بھی وان نہیں روشن تھی جس جگہ فانوس ... پڑے ہیں کھنڈروں میں آئینہ خانہ کے مانوس

حاتم نے کتنا سچا نقشہ اپنے عہد کا کھینچا ہے، اُس نے امرائے سلطنت سے آگے بڑھکر کھلم کھلا کہہ دیا کہ بادشاہ مین عدالت نہین اور قاضی و مفتی رشوت خوار اہلکاران حکومت چور ہین،

ولادت ۱۱۱۸ھ
وفات ۱۱۹۵ھ

مرزا رفیع سودا مشہور عالمگیری امیر و ادیب نعمت خان عالی کے نواسے[۱] اور مرزا محمد شفیع کے بیٹے تھے، جو اپنے عہد کے نامی تاجر تھے، عالمگیر کے سال وفات مین یہ آفتاب طلوع ہوا بہادر شاہ اور جہاندار شاہ کے عہد حکومت مین تو انھین اتنا ہوش نہ تھا کہ واقعات مین تمیز کرتے، البتہ فرخ سیر کے زمانہ مین تمیز عمر ہو چکی تھی، کہ انقلاب کی ہواؤن سے متاثر ہوے، محمد شاہ کے آغاز عہد مین یہ جوان تھے، مرہٹون کا دلی پر جب پہلا حملہ ۱۱۴۹ھ مین ہوا، اور کالکا کے میلہ کو لوٹا گیا، تو شہر مین ہل چل پڑ گئی، وزیر اعظم قمر الدین خان اور امیر الامراء مرہٹون کی سرکوبی کے لئے فوجین لے کر دلی سے جا چکے تھے، ایسی حالت مین کچھ نچلے جوان مقابلے کو چلے لیکن وہ دم خم کہان تھا جو جنگ جو قوم کے لئے ضروری ہے، یہ لڑائی سودا نے دیکھی تھی، اس سلسلہ مین اُس نے قصیدہ تضحیک روزگار لکھا جس مین نظام حکومت پر تنقید کی ہے، اور گھوڑے کی ہجو کے پردے مین تاریخی پس منظر صاف جھلک رہا ہے،

جن کے طویلے بیچ کوئی دن کی بات ہے ہرگز عراقی و عربی کا نہ تھا شمار
اب دیکھتا ہون مین کہ زمانہ کے ہاتھ سے موچی سے نقش پا کو ٹکاتے ہین وہ اُدھار

آگے چل کر سوار اور سواری کا ذکر سنیئے،

دلی مین آن پہنچا تھا جس دن کہ مرہٹہ مجھ سے کہا نصیب نے آکر ہے وقت کار
مدت سے کوڑیون کو اُڑایا ہے گھر مین بیٹھ ہو کر سوار اب کرو میدان مین کارزار
اتنے مین مرہٹہ بھی ہوا مجھ سے آ دوچار گھوڑا تھا بسکہ لاغر و بیت ضعیف و خوار

[۱] مرزا محمد رفیع صاحب مرحوم منظور ولد مرزا محمد شفیع متخلص سودا، پسر دختر نعمت خان عالی، در سخن سنجی زبان ہندی در زبان خویش نظیرے نداشت...... توصیف کمالش از تحریر بیرون مجمع الانتخاب، از شاہ کمال،

تصحیح واستدراک

بسلسلۂ پورب کی چند برگزیدہ ہستیان

از

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی

(۱) اس مضمون مین شاہ یٰسین کو مین نے حضرت مخدوم شاہ طیب کا فرزند اس بنیاد پر لکھدیا تھا کہ تذکرہ کی بعض کتابون مین ایسا ہی لکھا ہے، مثلاً بحر زخار مین ہے،

"شاہ یٰسین خلف و خلیفہ شاہ طیب .... مناقب العارفین نام کتاب دراحوال اولیاء جمع نمودہ "

لیکن تحقیق سے معلوم ہوا کہ وہ اُن کے پروردہ ضرور تھے، مگر اُن کے بیٹے نہین تھے، اُن کے والد کا نام شیخ احمد تھا، اور وہ بندگی شیخ ادھن صدیقی جونپوری کی اولاد مین سے تھے، سلسلۂ نسب اس طرح پر ہے، شاہ یٰسین بن شیخ احمد بن شیخ محمد بن شیخ عبدالرحیم بن بندگی شیخ ادھن، شاہ یٰسین کا مزار جھوسی مین شیخ نصیرالدین اسد العلماء کے روضہ کے اندر ہے، ملاحظہ ہو سمات الاخیار ص ۶۸،

(۲) ایک جگہ مین نے شاہ یٰسین کے کرّہ جانے اور وہان شیخ جمال اولیاء کی خدمت مین ان کی تحصیل علم کا ذکر کیا ہے، یہان کرّہ کے بجائے کوڑہ صحیح ہے، غلط فہمی کی بنیاد یہ ہے کہ فارسی کی قلمی کتابون مین کڑہ اور کوڑہ دونون کو کرہ لکھا جاتا ہے مگر پہلے کو کَرہ پڑھا جاتا ہے اور دوسرے کو کُرہ، ابتداءً مجھ کو تنبہ نہین ہوا، اور مین نے مناقب العارفین مین لفظ کرہ دیکھ کر اس مضمون مین اس کو کرّہ لکھدیا، بعد مین تنبہ ہوا کہ شیخ جمال اولیاء کا وطن تو

کروڑ دل ہوا نا اُمید ہو گئے مایوس گھرون سے یون نکل کے نکل گئی ناموس

ملی نہ ڈولی انھین جو تھے صاحب چنڈول

نجیب زادیون کا ان دنون ہے یہ معمول وہ برقعہ سر پہ ہے جس کا قدم تلک ہے طول

ہے اُن کی گود مین لڑکا گلاب کا سا پھول اور اُن کے حسب طلب کا ہر ایک سے یہ اصول

کہ خاک پاک کی تسبیح ہے جو لیجئے مول

غرض مین کیا کہون یار و کہ دیکھ کر یہ تمسر کروڑ مرتبہ خاطر مین گذرے ہے یہ لہر

جو ٹک بھی اس دل اپنے کو دیوے گردش دہر تو بیٹھ کر کہین، یہ روئیے کہ مردم شہر

گھرون سے پانی کو باہر کرین جھکول جھکول

باقی

نوائے حیات

جناب یحییٰ اعظمی کا مجموعۂ کلام نوائے حیات جس سے ناظرین معارف اور دوسرے اصحاب ذوق پوری طرح واقف ہین، وہ دوبارہ چھپ گیا ہے، اس اڈیشن مین بہت سی نئی غزلون اور نظمون کا اضافہ ہے، اور اب یہ مجموعہ پہلے سے زیادہ جامع اور مکمل ہو گیا ہے، اس کے شروع مین مولٰینا سید سلیمان ندوی کے قلم فیض رقم سے ایک مبصرانہ مقدمہ ہے،

قیمت مجلد للعہ

" غیر مجلد ہیہ

"منیجر"

استفسار و جواب

قرآن کی جمع و ترتیب کے سلسلہ میں ایک سوال

عبد الرشید صاحب ڈاکخانہ موسیٰ بنی مائنس
مان بھوم۔ بہار

حدیث کی تمام معتبر کتابون مین مذکور ہے، کہ قرآن کی جمع و ترتیب کے وقت ایک صحابی حضرت خزیمہؓ کے تنہا بیان پر قرآن مین ایک آیت داخل کر لی گئی، اس لئے کہ اُن کی تنہا شہادت کو آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو شہادت کے برابر قرار دیا تھا، مگر ایک دوسرے موقع پر حضرت عمرؓ نے آیت رجم الشیخ والشیخۃ اذا زنیا الخ کے بارے مین کہا کہ یہ قرآن کی ایک آیت ہے، تو وہ داخل نہین کی گئی، کیا حضرت عمرؓ کا درجہ حضرت خزیمہؓ سے کم تھا، کیا آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے بارے مین یہ نہین کہا تھا کہ اگر میرے بعد نبوت کسی کو ملتی تو عمر کو، پھر اُن کے اکیلے بیان پر آیت رجم قرآن مین کیون نہین داخل کی گئی، ان واقعات کو پڑھ کر دل مین ایک خلجان پیدا ہوتا ہے، براہ کرم اس کا کوئی تشفی بخش جواب عنایت فرمایئے،

معارف: آپ کے استفسار کے جواب مین چند باتین عرض کی جاتی ہین، اُمید ہے کہ ان سے آپ کا خلجان رفع ہو جائے گا،

یہ بات کسی روایت مین بھی مذکور نہین ہے کہ حضرت عمرؓ نے یہ فرمایا ہو کہ فلان آیت کو قرآن مین

کوڑہ (جہان آباد) تھا، اور وہی اُن کی جاے اقامت تھی، جیسا کہ تقصار (ذکر میر سید محمد کالپوری) وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے، اس لئے تصحیح کی ضرورت پیش آئی، کوڑہ کو بحر زخار میں اس شکل سے لکھا ہے کرّہ، ملاحظہ ہو بحر زخار قلمی نسخہ فرنگی محل ذکر شیخ سالار بدہ کرّدی،

(۳) اسی طرح میں نے شیخ سالار بڈہ کو ساکن کٹرہ لکھا ہے، یا یہ لکھا ہے کہ اُن کا مزار کٹرہ زمانک پور میں ہے، وہان کٹرہ کے بجاے کوڑہ (جہان آباد) ہونا چاہیئے، بحر زخار میں ہے کہ شیخ سالار بڈہ کی وفات ۹۴۷ھ میں ہوئی اور کرّہ (کوڑہ) کے چکلہ میں اُن کا مزار ہے، اور مناقب العارفین میں ہے کہ

"بر عوارف شرح خوب نوشتہ"

(۴) مناقب العارفین میں شاہ حسن کے سالِ وفات کا جہان ذکر ہے، وہان تسع مائۃ تو بالکل صاف ہی، اس سے پہلے کے الفاظ مشکوک ہیں، اس لئے میں نے اُن کا سال وفات ۹۰۰ھ لکھدیا ہے لیکن شیخ فرید کے حال میں شاہ یٰسینؒ نے لکھا ہے کہ ان کی وفات شاہ حسن کے تھوڑے ہی دن بعد ہوئی ہے، اس لئے صحیح یہ معلوم ہوتا ہی کہ شاہ حسن کا واقعۂ شہادت بھی ۹۰۶ھ میں پیش آیا، مناقب العارفین میں اس مقام پر بھی کاتب کے تصرف سے عبارت محرف ہوگئی ہی، ورنہ بات بالکل صاف ہوجاتی،

تنبیہ: مولانا سید عبدالحیٔ ناظم ندوہ نے "نزھۃ الخواطر" جلد چہارم میں غالبًا گنج رشیدی کے حوالہ سے اور صاحب بحر زخار نے بھی شاہ حسن کا سال وفات ۹۶۰ھ لکھا ہے، مگر یہ قطعًا غلط ہی اس لئے کہ دونوں بزرگوں نے شیخ فرید کا سال وفات ۹۰۶ھ لکھا ہے اور شاہ یٰسین نے تصریح کی ہے کہ شاہ حسن کی وفات شیخ فرید کی زندگی میں ہوئی ہے،

جانتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انہی میں سے چند ذہین افراد کو کلامِ الٰہی کی کتابت کے لئے مقرر فرمایا تھا، مگر قرآن کا نزول تیئیس برس کی مدت میں رفتہ رفتہ ہوا تھا، اور یہ ظاہر ہے کہ اس پوری مدت میں ہر کاتب ہر وقت خدمتِ نبوی میں موجود نہیں رہ سکتا تھا، اس لئے نزولِ قرآن کے وقت جو کاتبِ وحی موجود ہوتا، آپ نازل شدہ حصہ اس کو لکھوادیا کرتے تھے، اس طرح پورا قرآن تحریر میں آجانے اور سیکڑوں آدمیوں کو زبانی یاد ہونے کے باوجود اس کے اجزاء سورتیں اور آیتیں منتشر اور غیر مرتب شکل میں مختلف افراد کے سینوں اور سفینوں میں تھیں، پورا قرآن ایک صحیفہ کی شکل میں مرتب و مدون نہیں ہوا تھا، اور آپ کی حیاتِ مبارکہ میں یہ کام ہو بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ نزولِ قرآن کا سلسلہ برابر جاری تھا، آپ کی وفات کے بعد حضرت عمر فاروقؓ کے دل میں یہ مبارک خیال پیدا ہوا کہ قرآن کے منتشر اور متفرق اجزاء کو ایک صحیفہ کی شکل میں جمع کر دیا جائے۔ انھوں نے اپنے اس خیال کا ذکر حضرت صدیقؓ سے کیا، اُن کو اس میں اس وجہ سے تامل ہوا کہ حیاتِ نبویؐ میں یہ کام انجام نہیں پایا تھا، مگر پھر اُن کے ذہن میں بھی جلد ہی اس کی مصلحت آگئی، اور وہ اس کے لئے آمادہ ہو گئے، اور انھوں نے اس کام کے لئے حضرت زید بن ثابتؓ کو جو کاتبِ وحی ہونے کے ساتھ پورے قرآن کے حافظ اور نہایت ذہین اور عربی و عبرانی دونوں زبانوں کے واقف کار تھے، مقرر کیا، گو اُن کی مدد کے لئے کچھ اور صحابہ بھی تھے جن میں ایک نام حضرت عمرؓ کا بھی لیا جاتا ہے[۱]، مگر اس کام کے اصل ذمہ دار یہی بنائے گئے اس کے بعد حضرت فاروقؓ نے عام اعلان کرا دیا کہ جن لوگوں کے پاس قرآن کا کوئی حصہ ہو خواہ زبانی ہو یا تحریری اسے لا کر پیش کریں۔ ان مراحل کے طے ہو جانے کے بعد حضرت زیدؓ نے قرآن کے منتشر اجزاء کی تدوین و ترتیب شروع کر دی۔

حضرت زیدؓ گو خود پورے قرآن کے حافظ تھے، مگر حضرت ابوبکرؓ کے حکم اور شدتِ احتیاط کی بنا پر ہر آیت کے موقع و محل اور اُس کے تلفظ و قرأت کے بارے میں زبانی شہادتوں کے ساتھ دو تحریری شہادتیں بھی لیتے جاتے تھے، چنانچہ جب سورۂ توبہ کی آخری دو آیتوں اور سورۂ احزاب کی ایک آیت کے موقع و محل کا ثبوت تلاش کیا جانے لگا، تو اُس کی زبانی شہادتیں تو بہت تھیں لیکن تحریری شہادت محض ایک ملی یعنی آول الذکر آیتیں حضرت ابو خزیمہؓ کے پاس، اور

---

[۱] فتح الباری ج ۹ ص ۱۳، ۲ ایضاً،

داخل کر لیا جائے مگر اس بارے مین ان کی تنہا شہادت کافی نہین سمجھی گئی، اس لئے وہ آیت قرآن مین داخل نہین کی گئی. آپنے جس روایت کا حوالہ دیا ہے، اس مین بھی اس کا کوئی ذکر نہین ہے، اور عربی کا وہ ٹکڑا جسے آپنے نقل کیا ہے تو اس بارے مین تو یہ صحیح ہو کہ حضرت عمرؓ نے اس کو آیتِ رجم قرار دیا تھا، اور نہ وہ سرے سے قرآن کا جز تھا ہی، اس لئے اس کے قرآن مین داخل کرنے کا کوئی سوال نہین پیدا ہوتا تھا، خواہ اس کے لئے ایک کیا کتنی شہادتین کیون نہ مل جاتین. بخلاف حضرت خزیمہ انصاریؓ کی شہادت کے، کہ انہین تنہا یہ خصوصیت بھی تھی کہ اُن کی اکیلی شہادت دو کے برابر تھی، اس لئے وہ آیت قرآن مین داخل کر لی گئی، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ قرآن کی جمع و ترتیب کے وقت جو آیتین، سورہ توبہ اور سورہ احزاب کا جز بنائی گئین وہ قرآن مجید کا مسلمہ جز تھین، سیکڑون صحابہ کو وہ آیتین زبانی یاد تھین، بار ہا نمازون مین پڑھی گئی تھین، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو خود کاتبین وحی سے لکھوایا تھا، اور اُن کے فضائل بیان کئے تھے، اس لئے اُن کے قرآن کا جز ہونے مین کوئی شبہ یا شک نہین تھا بلکہ زبانی شہادت کے ساتھ صرف اس کی تحریری شہادت کا [illegible] گیا. تھا جس کی تکمیل حضرت خزیمہؓ کی تصدیق کے ذریعہ ہو گئی، اس لئے دونون واقعون مین بڑا فرق ہے. آیتِ رجم کے سلسلہ مین آپ کو جو خلجان ہے، اس پر معارف کے کسی آیندہ نمبر مین تفصیلی بحث کی جائیگی، البتہ حضرت خزیمہؓ کے جس واقعہ سے قرآن کی جمع و ترتیب کے بارے مین آپ کو جو خلش پیدا ہو گئی ہے، اُس کے بارے مین تھوڑی تفصیل کر دیجاتی ہے جس سے واقعہ کا پورا پس منظر سامنے آجائے گا اور آپ کی خلش دور ہو جائے گی.

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کلام الٰہی کا کوئی حصہ نازل ہوتا تھا، تو آپ کاتبین وحی کو بلا کر ہدایت فرماتے تھے کہ اس حصے یا اس سورہ کو فلان سورہ مین فلان آیت یا فلان سورہ کے بعد لکھا جائے، چنانچہ آپ کے حکم کے مطابق وہ لکھ لیا جاتا تھا، اس طرح آپ کی حیاتِ مبارکہ ہی مین پورا قرآن احاطہ تحریر مین آچکا تھا، مگر اس وقت تک عرب مین کاغذ کا عام رواج نہین ہوا تھا، اس لئے قرآن کے نازل شدہ حصے کبھی کھجور کے پتون کبھی درختون کی چھالون کبھی ہڈیون کے ٹکڑون اور پتھر کی سلون پر لکھ دیئے جاتے تھے، نیز عرب مین اس وقت تک لکھنے پڑھنے کا بھی عام رواج نہین تھا، اہلِ عرب زیادہ تر اپنے حافظہ سے تحریر کا کام لیتے تھے، صحابہ مین صرف چند آدمی لکھنا پڑھنا

كنت اسمع رسول الله صلى الله عليه وسلم يقرأ بها لم اجدها مع احد الا مع خزيمة الانصاري الذي جعل رسول الله صلى الله عليه وسلم شهادته شهادة رجلين[1]	آیت کی تحریر نہیں ملی، حالانکہ میں اس آیت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے برابر سنا کرتا تھا، تلاش کے بعد اس کی تحریر حضرت خزیمہ انصاریؓ کے پاس ملی، جن کی تنہا شہادت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو کے برابر قرار دیا تھا،

ان دونوں بیانوں سے یہ واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے تمام اجزا، سورتیں اور آیتیں لوگوں کے سینوں اور سفینوں میں موجود و محفوظ تھیں حضرت زیدؓ نے صدیق اکبرؓ کے مشورے سے اتنا کام کیا کہ ان منتشر اجزا کو نہایت احتیاط کے ساتھ منشائے نبوی کے مطابق مرتب و مدون کر دیا،

آپ کو غالباً اُن کے دوسرے بیان کے آخری ٹکڑے سے یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ اس آیت کا علم کسی دوسرے صحابی کو تھا ہی نہیں، لیکن اگر آپ اُن کا پورا بیان اپنے سامنے رکھیں، تو یہ غلط فہمی دور ہو جائے گی کہ محض ایک صحابی کے کہنے سے کوئی آیت قرآن میں داخل کی گئی، خاص طور سے اُن کے یہ الفاظ قابلِ غور ہیں، فقدت اٰية اسمع فتتبعت القرآن یعنی وہ کہتے ہیں کہ وہ آیتیں سورہ توبہ اور سورہ احزاب کا جز تھیں، اور میں نے اُن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سنا تھا، مگر ان کے نوشتے تلاش کے بعد ملے، اس بارے میں حافظ ابن حجر کا بیان ملاحظہ ہو،

والحق ان المراد بالنفي وجودها مكتوبة لا نفي كونها محفوظة،	حضرت زیدؓ نے آیت کے نہ ملنے کا جو ذکر کیا ہے، اس سے اُن کی مراد یہ نہیں ہو کہ وہ آیت اب محفوظ و مامون نہیں رہی، بلکہ اُن کا مقصد یہ تھا کہ اُن کو اس کی تحریر یا دو صحابہ کی گواہی نہیں بلکہ محض ایک صحابی کے پاس ملی،

---

[1] بخاری جلد ۲ باب جمع القرآن ص ۷۴۵،

آخر الذکر آیت حضرت خزیمہ انصاریؓ کے پاس لکھی ہوئی ملی[1]، مگر اُن کے سورۂ توبہ اور سورۂ احزاب کا جز ہونے کا علم اُن کو پہلے سے تھا، اس لئے اُن کے بارہ مین ایک ہی شہادت کافی تھی، اور وہ قرآن کا جزء بنادی گئین،

ما جز کی تحقیق مین اگرچہ یہ صحیح نہین ہے کہ یہ آیتین محض ایک ایک ہی صحابی کے پاس لکھی ہوئی تھین، تاہم اُن کا جزء قرآن ہونا مسلم تھا، اور محض عہد نبویؐ کے کسی معتبر نوشتے سے یہ اطمینان کر لینا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان آیتون کو سورۂ توبہ اور سورۂ احزاب ہی کا جزء قرار دیا تھا، اور یہ مقصد ایک ہی ایک شہادت کے ذریعہ پورا ہوگیا، دو دو شہادتون کا لینا فی نفسہ اصل مقصد نہین بلکہ مقصد کا ذریعہ تھا،

اس سلسلہ مین اب آپ حضرت زیدؓ کا بیان ملاحظہ فرمائین، وہ فرماتے ہین کہ جب اس کام کی ذمہ داری مجھ پر ڈالی گئی، تو شروع مین مین نے اس کے اٹھانے مین پس و پیش کیا، مگر پھر اس کے لئے کمر ہمت باندھ ہی لی.

فتتبعت القرآن اجمعه من اللخاف	اور قرآن کے اجزاء کھجور کی چھالون، پتھر کی تختیون
والعسب وصدور الرجال حتی	اور لوگون کے حافظے سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر جمع
وجدت من اٰخر سورة التوبة	کرنے لگا، چنانچہ سورۂ توبہ کی دو آخری آیتین
اٰیتین مع ابی خزیمة لم اجدھا	ابو خزیمہ کے پاس ملین، اُن کے علاوہ مین نے
مع احد غیره[2]	اس کی تحریر کسی کے پاس نہین پائی،

سورۂ احزاب کی آیت کے بارہ مین اُن کا بیان یہ ہے،

لما نسخنا الصحف فی المصاحف	جب ہم لوگ قرآن کے اجزاء کو صحیفون مین
فقدت اٰیة من سورة الاحزاب	منتقل کرنے لگے، تو سورۂ احزاب کی ایک

---

[1] سورۂ احزاب کی آیت کی شہادت کے متعلق گو بعض لوگون نے حضرت عثمانؓ کے زمانہ کا واقعہ قرار دیا ہے، جب مصحف صدیقی کی نقل سارے ممالک اسلامیہ مین بھیجی جا رہی تھی، مگر ہر نوع جو باتین اس سلسلہ مین کہی گئی ہین، ان پر اس اختلاف زمانہ کا کوئی اثر نہین پڑتا، [2] بخاری ج ۲ باب جمع القرآن،

آپکے سامنے بھی یہ دونون روایتین نہین تھین بلکہ ایک روایت تھی، اس لئے آپ کے ذہن مین بھی یہی آیا، کہ چونکہ حضرت خزیمہؓ کی شہادت دو کے برابر تھی، اس لئے اُن کی شہادت پر قرآن مین ایک آیت داخل کر لی گئی، اور حضرت عمرؓ کی شہادت دو کے برابر نہین تھی، اس لئے اُن کی شہادت رد کر دی گئی، مگر اوپر کی تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ قرآن مین کسی آیت کے شامل کئے جانے کا تعلق شہادت کی تعداد سے نہین تھا، بلکہ واقعی اُس کے قرآن کا جزء ہونے سے تھا، پھر شہادت اس بات پر تولی بھی نہین گئی تھی کہ یہ آیت قرآن کا جزء ہے یا نہین، کیونکہ یہ تو ایک معلوم و مشہور بات تھی، بلکہ شہادت اس بات پر لی گئی، اور تحقیق اس کی کی گئی تھی کہ ان آیتون کی ترتیب اور اُنکا موقع و محل عہد نبویؐ کے نوشتون مین کیا ہے؟

(مجیب)

سلسلۂ سیر الصحابہ

سیر الصحابہ جلد ہفتم

یہ جلد سیر الصحابہ کی آخری کڑی ہے، اس جلد پر یہ مقدس سلسلہ تمام ہو جاتا ہے، اس مین ۲۵۰ صحابہ کے حالات ہین، جو فتح مکہ کے بعد مشرف باسلام ہوے، یا اس سے پہلے اسلام قبول کر چکے تھے، مگر شرف ہجرت سے محروم رہے، یا سنہ ہجرت کے کچھ قبل یا بعد پیدا ہوئے، اور عہد رسالت مین کم سن تھے۔

(مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی)   قیمت : ہے

اہل کتاب صحابہ و تابعینؒ

اس کے شروع مین ایک مقدمہ ہے جس مین جزیرۂ عرب کے یہود و نصاریٰ کی تاریخ، اور اُن کے تمدنی و اخلاقی حالات کی تفصیل کی گئی ہے، اس کے بعد یہودی و نصرانی صحابہ و صحابیات اور تابعین کے حالات و سوانح ہین،

(مؤلفہ مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی رفیق دار المصنفین)

قیمت للعہ

"منیجر"

اور تحریری شہادت پر زور اس لئے دیا جارہا تھا کہ

وکان غرضهم ان لا یکتب	ان حضرات کی غرض یہ تھی کہ قرآن بالکل
الا من عین ما کتب بین یدی	اسی ترتیب اور ان ہی نوشتوں کے مطابق
النبی صلی اللہ علیہ وسلم من	لکھا جائے، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے
مجرد الحفظ،	قائم کی تھی، اور جن کے مطابق آپ نے کاتبین
	وحی کو لکھوایا تھا، محض ذہنی یادداشت سے
(فتح الباری ج ۹ ص ۱۰)	نہ لکھا جائے، (کیونکہ اس میں غلطی ہوسکتی تھی)

اس موقع پر ایک اور بات ذہن میں رکھنے کی ہے، جو جمع و ترتیب کے سلسلہ میں عموماً غلطیاں کا سبب بنتی ہو، قرآن کی جمع و ترتیب کی بحث کے ضمن میں دو مواقع پر یہ ذکر آتا ہے کہ فلاں فلاں آیتیں فلاں فلاں صحابی کی تحریری شہادت کی بنا پر قرآن میں داخل کی گئیں، ایک سورہ توبہ کی آخری دو آیتیں، دوسری سورۂ احزاب کی آیت رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ، سورۂ توبہ کی آیتوں کی تحریر جن صحابی کے پاس ملی تھی، ان کا نام ابوخزیمہ ہے، اور سورۂ احزاب کی آیت کا نوشتہ جن کے پاس ملا تھا، ان کا نام خزیمہ بن ثابت انصاری ہے، مگر دونوں ناموں میں بڑی حد تک مشابہت ہے، اس لئے عام طور پر محدثین سے اُن کے بارے میں تسامح ہو جاتا ہے جس سے عام قاری کو بڑی پریشانی ہوتی ہے حتی کہ امام بخاری سے بھی مسامحت ہوگئی ہے، چنانچہ انھوں نے سورۂ توبہ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ اسکی آخری آیتیں خزیمہ انصاری کے پاس تھیں، مگر یہی روایت جب وہ باب جمع القرآن میں لائے، تو انھوں نے اُن کا نام خزیمہ کے بجائے ابوخزیمہ انصاری لکھا ہے، پھر سورۂ احزاب کی تفسیر میں دوبارہ خزیمہ انصاری کا نام لیا ہے، حالانکہ صحیح یہ ہے کہ سورۂ توبہ کی آیتیں جن کے پاس ملیں ان کا نام ابوخزیمہ تھا، اور سورۂ احزاب کی آیت جن کے یہاں دستیاب ہوئی اُن کا نام خزیمہ انصاری ذوالشہادتین ہے،

سلہ فتح الباری ج ۹ ص ۱۲،

(۵۵)

جناب مولینا :- السّلام علیکم

اس سے پہلے ایک کارڈ آپ کی خدمت مین لکھ چکا ہون، اور ایک ملفوف خط بھی لکھ چکا ہون، پاسپورٹ ۱۹ اکتوبر سے پہلے ہم سب کو مل جائین گے، اب فیصلہ یہ ہے کہ ہم ۲۰ اکتوبر کو لاہور سے صبح کی ٹرین مین پشاور کو روانہ ہون، اور ۲۱ کی صبح کو کابل روانہ ہون، جلدی اس واسطے ہے کہ نومبر مین وہان سردی ہو جاتی ہے، سید راس مسعود ۱۹ کی شام کو لاہور پہنچ جائین گے، آپ بھی مہربانی کرکے ۱۹ کی شام کو لاہور پہنچ جائیے، یا ۲۰ کی صبح کو ایسے وقت پہنچیے کہ آپ ہمارے ساتھ ۲۰ کی صبح کو میل ٹرین مین سوار ہوسکین، قونصل خانہ سے جو آدمی ہمارے ہمراہ جائیگا، وہ بھی لاہور ہی سے ساتھ ہوگا، زیادہ کیا عرض کرون، جب ملاقات ہوگی تو مفصل عرض کرون گا، اس انتظام کے لئے قونصل جنرل صاحب کو اطلاع دیدی ہے، والسّلام

مخلص محمد اقبال

۱۰ اکتوبر ۳۳ء

(۵۶)

مخدومی : آپ کا پوسٹ کارڈ ابھی ملا ہے، مین اس سے پہلے ایک ملفوف خط ارسال خدمت کر چکا ہون، آپ ۱۹ اکتوبر کی شام کو لاہور پہنچ جائیے، یہان سے ۲۰ اکتوبر کی صبح پشاور روانہ ہو جائین گے، سید راس مسعود بھی ۱۹ کی شام کو لاہور پہنچین گے، قونصل جنرل صاحب کو بھی آپ تار دیدین کہ آپ ۱۹ کی شام کو لاہور پہنچ جائین گے،

اگر آپ کو پاسپورٹ، ارکول جائے تو مجھے تار دینے کی ضرورت نہین، قونصل جنرل کو بذریعہ تار مطلع کرین اور لاہور ۱۹ کی شام کو پہنچ جائیے، والسّلام

محمد اقبال ۱۴ اکتوبر ۱۹۳۳ء

آثارِ علمیہ و ادبیہ

مکاتیبِ اقبال

بنام

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

(۵۴)

مخدومی مولینا! السلام علیکم

سید راس مسعود اصرار کرتے ہیں کہ لاہور سے ۲۰ر اکتوبر کی صبح کو پشاور کی طرف روانہ ہوں، شام کو پشاور پہنچ جائیں گے، رات بھر وہاں ٹھہر کر ۲۱ر کی صبح کو روانہ کابل ہوں گے آپ ایسا انتظام کریں کہ یا تو ۲۰ر کی صبح کو لاہور پہنچیں یا ۱۹ر کی شام کو لاہور پہنچ جائیں، امید کہ آپ کو پاسپورٹ اس سے پہلے مل جائے گا، میرا پاسپورٹ کل مل جانے کی توقع ہے، البتہ ملازم کا دو تین روز بعد ملے گا، زیادہ کیا عرض کروں، امید کہ مزاج والا بخیر و عافیت ہوگا،

یہ بھی ممکن ہے کہ آپ ہم سے ۲۱ر کی صبح کو پشاور میں مل جائیں، اگر ہم پہلے پہنچیں گے تو آپ کے لئے آدمی اسٹیشن پر بھجوا دیا جائیگا، اس کارڈ کے جواب میں فوراً خط لکھیے، تاکہ آپ کے انتظامات کا حال معلوم ہو جائے،

مخلص محمد اقبال

۱۴ر اکتوبر ۱۹۳۳ء

ہے گا، میں نے شاہ ظاہر کو تار دے دیا تھا جس کا جواب پرسون موصول ہوا، صدر اعظم صاحب کا تار بھی آیا تھا، امید آپ نے بھی اُن کو خیریت کا تار دیا ہو گا، زیادہ کیا عرض کروں،

امید کہ جناب کا مزاج بخیر ہو گا، والسلام

محمد اقبال

(۵۹)

لاہور

۹ر دسمبر ۱۹۳۳ء

مخدومی! السلام علیکم

عمر خیام پر آپ نے جو کچھ لکھ دیا ہے اس پر اب کوئی مشرقی یا مغربی عالم اضافہ نہ کر سکے گا، الحمد للہ کہ اس بحث کا خاتمہ آپ کی تصنیف پر ہوا،

مولوی نور الاسلام کا رسالہ فی تحقیق المکان کی نقل رامپور کتب خانہ سے آگئی ہے، اب آپ کے ایفائے وعدہ کا انتظار ہے، امید ہے کہ آپ ادھر جلد توجہ فرما کر مجھے شکر گذاری کا موقع دیں گے، زیادہ کیا عرض کروں، امید کہ جناب کا مزاج بخیر ہو گا، والسلام

مخلص محمد اقبال

(۶۰)

لاہور

۱۵ر دسمبر ۳۳ء

مخدومی جناب مولانا السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ ابھی ملا ہے تلخیص کے لئے نہایت شکر گذار ہوں، مگر اسے پڑھ کر میرے دل میں ایک خیال

(۵۷)

جناب مکرم! السلام علیکم

آپ کا تار کل ملا جس سے معلوم ہوا کہ ۸ر اکتوبر تک آپ کو پاسپورٹ نہیں مل سکا، ممکن ہے ۱۸ ر یا ۱۹ تک مل جائے ہم یعنی سید راس مسعود اور میں ۲۰ر کی صبح کو لاہور سے روانہ ہوں گے، تمام انتظامات مکمل ہو چکے ہیں، اگر آپ ۲۱ کی صبح تک بھی پشاور پہنچ سکیں، تو خوب ہے، ڈین ہوٹل میں رات بسر ہوگی، یہ ہوٹل پشاور چھاؤنی کے اسٹیشن سے بالکل قریب ہے، آپ وہیں کے پتہ پر ہم کو تار دیدیں، ہم آپ کی گاڑی کا انتظار کریں گے، اور اسٹیشن پر آپ کے لئے آدمی بھیج دیا جائے گا، اگر آپ کل شام یا ۲۰ر کی صبح کو لاہور پہنچ سکیں، تو ٹکٹ صرف لاہور ہی تک کا خرید کریں جیسا کہ میں دے چکا ہوں، اگر یہ ممکن نہ ہو تو ٹکٹ پشاور چھاؤنی اسٹیشن تک کا خرید کریں، آپ کے تمام مصارف ادا کئے جائیں گے، امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے، اور آپ کی معیت سے ہم سب مستفیض ہوں گے، والسلام

محمد اقبال لاہور

۸ر اکتوبر ۱۹۳۳ء

(۵۸)

لاہور

۱۰ر نومبر ۱۹۳۳ء

مخدومی جناب قبلہ مولانا السلام علیکم

معارف سے معلوم ہوا کہ آپ مع الخیر وطن پہنچ گئے،

یہ عریضہ حضرت محی الدین ابن عربی کے مسئلہ زمان و مکان کی تحقیق کی یاد دہانی کے لئے لکھتا ہوں، مجھے چند روز تک اس کی ضرورت پڑے گی، اس واسطے التماس ہے کہ ادھر جلد توجہ فرما کر مجھے ممنون فرمائیے،

شاہ نادر کی شہادت کا قلق ہوا، خدا تعالیٰ اپنی جوار رحمت میں جگہ دے، انشاء اللہ افغانستان میں امن وا

اور اگر کوئی کتابیں ایسی ہوں جن کا مطالعہ اس ضمن میں مفید ہو تو اُن کے ناموں سے آگاہ فرمائیے، والسلام

محمد اقبال

(۶۲)

لاہور

۲۴ر جنوری ۱۹۳۴ء

مخدوم و مکرم السلام علیکم

کچھ روز ہوئے ایک عریضہ لکھا تھا، غالباً آپ کی عدیم الفرصتی جواب سے مانع رہی، اس خط کے جواب کا انتظار ہے، کل میں آپ کے پرانے خطوط پڑھ رہا تھا، جو میرے پاس محفوظ ہیں، اُن میں سے ایک خط میں آپ نے یہ لکھا ہے کہ اسلامی ریاست کے امیر کو اختیار ہے کہ جب اُسے معلوم ہو کہ بعض شرعی اجازتوں میں فساد کا امکان ہے تو ان اجازتوں کو منسوخ کر دے، عارضی طور پر یا مستقل طور پر، بلکہ بعض فرائض کو بھی منسوخ کر سکتا ہے؟[۱] اس وقت آپ کا خط میرے سامنے نہیں ہے، حافظہ سے لکھ رہا ہوں کیا یہ بات صحیح ہے؟ اگر صحیح ہے تو اس کا حوالہ کہاں سے ملے گا؟ مہربانی کر کے اس کتاب کا پتہ دیجئے جس میں یہ مسئلہ درج ہے،

۲- کیا یہ صحیح ہے کہ متعہ (نکاح موقت) حضرت عمرؓ سے پہلے مسلمانوں میں مروج تھا، اور حضرت عمرؓ نے اُسے منسوخ کر دیا، نیز زمانۂ حال کا کوئی امیر بھی کسی امر کی نسبت ایسا فیصلہ کرنے کا مجاز ہے؟

سفرنامۂ کابل بہت دلچسپ ہے ممکن ہے آپ کو ایک دفعہ وہاں پھر جانا پڑے،

امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا،

مخلص محمد اقبال

---

[۱] ڈاکٹر صاحب کے حافظہ نے غلطی کی ہے، ملتوی کی جگہ منسوخ لکھ گئے ہیں،

یا سوال پیدا ہوا ہے جس کا پوچھنا ضروری ہے،

اگر دہر حقیقت اور مستمرہ ہے اور حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی ہے تو پھر مکان کیا چیز ہے؟ جس طرح زمان دہر کا ایک طرح سے عکس ہے، اسی طرح مکان بھی دہر ہی کا عکس ہونا چاہیئے، یا یوں کہئے کہ زمان و مکان دونوں کی حقیقت اصلیہ دہر ہی ہے، کیا یہ خیال محی الدین ابن عربی کے نقطۂ خیال سے صحیح ہے؟ اس کا جواب شاید فتوحات ہی میں ملے، مہربانی کر کے تھوڑی سی تکلیف اور گوارا فرمائیے، اور دیکھئے کہ کیا انھوں نے مکان پر بھی کچھ بحث کی ہے، اور اگر کی ہے تو مکان اور دہر کا تعلق ان کے نزدیک کیا ہے، اس زحمت کے لئے معافی چاہتا ہوں، اور جواب جہاں تک ہو جلد مانگتا ہوں۔

میں نے زمان و مکان کے متعلق تھوڑا سا مطالعہ کیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے بڑے بڑے مسائل پر غور و فکر کیا ہے، اور اس غور و فکر کی تاریخ لکھی جا سکتی ہے، یہ کام صرف آپ ہی کر سکتے ہیں، میرے خیال میں آپ کو چاہیئے کہ اس کام کو اپنی زندگی کے اہم مقاصد میں شمار کریں،

جواب کا انتظار رہے گا، والسلام

مخلص محمد اقبال

(۶۱)

لاہور

۱۵ جنوری سنہ ۱۹۳۴ء

مخدومی السلام علیکم

دنیا اس وقت عجب کشمکش میں ہے، جمہوریت فنا ہو رہی ہے، اور اس کی جگہ ڈکٹیٹرشپ قائم ہو رہی ہے، جرمنی میں مادی قوت کی پرستش کی تعلیم دی جا رہی ہے، سرمایہ داری کے خلاف پھر ایک جہاد عظیم ہو رہا ہے، تہذیب و تمدن (بالخصوص یورپ میں) بھی حالت نزع میں ہے، غرض کہ نظام عالم ایک نئی تشکیل کا محتاج ہے، ان حالات میں آپ کے خیال میں اسلام اس جدید تشکیل کا کہاں تک ممد ہو سکتا ہے، اس مبحث پر اپنے خیالات سے مستفیض

(۶۴)

لاہور

۹ ستمبر ۱۹۳۲ء

مخدومی مولنا، السلام علیکم

یہ خط اعظم گڈھ کے پتہ پر لکھتا ہوں معلوم نہیں کہ آپ بھی علی گڈھ ہی میں ہیں، یا وہاں سے واپس آگئے، راغب اصفہانی نے مفردات میں لفظ نبی کی تشریح میں لکھا ہے کہ لفظ نبی کے دو معنی ہیں، خبر دینے والا اور مقام بلند پر کھڑا ہونے والا، اول الذکر نبی ہمزہ کے ساتھ اور دوسرا بغیر ہمزہ کے، اس ضمن میں راغب نے ایک حدیث بھی نقل کی ہے یعنی حضور رسالت مآب نے فرمایا کہ میں نبی بغیر ہمزہ کے ہوں، یہ صحاح ستہ میں ہے یا نہیں؟[1]

قرآن شریف میں جن انبیاؑ کا ذکر ہے، ان میں کون سے نبی بالہمزہ ہیں، اور کون سے بغیر ہمزہ؟ یا سب کے سب بغیر ہمزہ ہیں؟[2]

۲۔ لفظ نار[3] کا روٹ عربی زبان میں کیا ہے؟

۳۔ لفظ نجات کا روٹ کیا ہے اور روٹ کے رو سے اس کے معنی کیا ہیں؟ غالباً راغب ہی نے لکھا ہے کہ اس کے معنی بلندی کے ہیں؟

نمبر ایک میں جو سوال میں نے لکھا ہے وہ بڑا اہم ہے، کیونکہ اگر قرآنی انبیا یا حضور رسالت مآب نبی بغیر ہمزہ ہیں تو لفظ نبی کا انگریزی ترجمہ (Prophet) جس کے معنی خبر دینے والا کے ہیں، کیونکر درست ہو سکتا ہے؟

---

[1] یہ حدیث صحاح میں نہیں، آپ نے اس لئے نبی کہنے سے منع فرمایا کہ لغت کی رو سے منصب دار نبوت کے لئے نبیؐ لفظ ہے نبیٔ نہیں

[2] یقیناً سب کے سب نبیؐ بلا ہمزہ کے ہیں [3] ن و ر معلوم ہوتا ہے، اس روٹ کے اصلی معنی چمک کے معلوم ہوتے ہیں، نور، روشنی، نار، آگ، نَور، چونا، نورۃ کلی اسی ایک مفہوم کے مظاہر ہیں [4] ن، ج، و، معنی بلندی کے یعنی جو سیلاب کے وقت پناہ کی جگہ بن سکے، اسی سے نجوۃ ہے، اسی سے موجودہ نجات ہے۔

(٦۳)

لاہور

یکم فروری ۱۹۳۴ء

جناب مولنٰنا! السلام علیکم

۱۔ آپ کا والا نامہ ابھی ملا ہے جس کے لئے بہت شکر گذار ہون۔ مین نے آپ کا پہلا خط پھر دیکھا ہے۔ آپ نے جو کچھ لکھا ہے، درست ہے، مگر مین ان معاملات کی فہرست چاہتا ہون جن کے متعلق رائے قائم کرنا امام کے سپرد ہے اجرائم مین ایسے جرم مین جن کی تعزیر غالبًا قران شریف مین مقرر ہے، ان کے متعلق امام کیونکر رائے دے سکتا ہے؟

۲۔ آپ فرماتے ہین کہ تواتر عمل کی ایک مثال نماز ہے۔ مالکیون اور حنفیون اور شیعون مین جو اختلاف صورت نماز مین ہے، وہ کیونکر ہوا؟

۳۔ ایک سوال اور پوچھنے کی جرأت کرتا ہون (۱) احکام منصوصہ مین توسیع اختیارات امام کے اصول کیا ہین؟ (۲) اگر امام توسیع کرسکتا ہے، تو اُن کے عمل کو محدود بھی کرسکتا ہے؟ اس کی کوئی تاریخی مثال ہو تو واضح ف (۳) زمین کا مالک قرآن کے نزدیک کون ہے؟ اسلامی فقہاء کا مذہب اس بارے مین کیا ہے؟ قاضی مبارک مین شا اسکے متعلق کوئی فتویٰ ہے، وہ فتویٰ کیا ہے؟ اگر کوئی اسلامی ملک روس کی طرح زمین کو حکومت کی ملکیت ق دے تو کیا یہ بات شرع اسلام کے موافق ہوگی یا مخالف؟ اس مسئلہ کا سیاست اور اجتماع معاشرت سے گہرا تعل ہے کیا یہ بات بھی رائے امام کے سپرد ہوگی؟ (۴) صدقات کی کتنی قسمین اسلام مین ہین؟ صدقہ اور خیرات مین کی ہے؟ تکلیف تو آپ کو ان سوالون کے جواب مین ہوگی، مگر مجھے امید ہے کہ آپ مجھے اس زحمت کے لئے معاف ف

تعلیمی مشورت کے لئے جو جلسے آپ کے آنے سے پہلے ہوئے، ان کے متعلق کچھ نوٹ سید راس مسعود نے اُن کی خدمت مین ہم دونون کے علاوہ سردار فیض محمد خان وزیر خارجہ اور افغانی تعلیمی بورڈ کے ممبر، غالبًا ترکی تعلیمی تھے۔ سرور خان کے خطوط بھی آئے تھے، والسلام

مخلص محمد اقبال

۳- اگر توہین رسول کی مثالین کتب فقہ مین مذکور ہون تو مہربانی فرما کران مین سے چند تحریر فرمائے
کتاب کا حوالہ بقید صفحہ تحریر فرما کران مین سے چند تحریر فرمائیے

امید کہ اس عریضہ کا جواب جلد ملے گا، زیادہ کیا عرض کرون میری صحت پہلے سے بہتر ہے،

امید ہے اس دفعہ کے علاج سے زیادہ فائدہ ہوگا،

والسلام

مخلص محمد اقبال (لاہور)

حال وارد :- بھوپال　　　　(باقی)

(بقیہ حاشیہ ص ۷۲) کہ یہ جزوی فضیلت حقیقت مین فضیلت کے شمار مین ہے بھی، مثلاً زیادہ متمدن زمانہ مین ہونا کوئی فضیلت نہین، کیونکہ خود تمدن نہ کوئی دینی فضیلت ہے نہ اخلاقی نہ عقلی، بلکہ ممکن ہے کہ اس کے بعد اور بھی دنیا زیادہ متمدن ہو جائے، تو اس زمانہ کے آدمی پر بھی اس زمانہ کے آدمی کو فوقیت ہو جائے، اور اگر یہ امر باعث فضیلت ہے تو غلام احمد قادیانی کیا، اقبال سیالکوٹی کو بھی یہ جزوی فضیلت حاصل ہے، بلکہ غلام احمد سے زیادہ، کیونکہ مرزا صاحب نے صرف اس کو دور سے دیکھا ہے، دیکھا اور آزمایا نہین، ساے یہ نقل کفر مجھ سے نہ ہوگا، آپ السیف المسلول علی شاتم الرسول دیکھ لیجئے

محمد علی

ذاتی ڈائری کے چند ورق

رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم کے سوانح وحالات وقائع زندگی جو صاحب تفسیر قرآن مولنا عبدالماجد دریابادی پر بصدق کے ذاتی مشاہدہ وتجربہ مین آئے، اس مین اُن کی زندگی کے ہر پہلو پر نہایت بسط وتفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، محمد علی مرحوم کیا کچھ تھے اسکی صحیح تصویر آپ کو اس کتاب مین نظر آسکتی ہے، اس کا دوسرا حصہ زیر طبع ہے،

قیمت :- ۸؍　　　　"منیجر"

امید کہ آپ کا مزاج بخیر و عافیت ہوگا،

آپ کا سفر نامۂ افغانستان خوب ہے لوگوں نے بہت پسند کیا، ہاں ایک ضروری بات یاد آگئی یہاں ایک صاحب کے پاس شاہ ولی اللہؒ کے تفہیمات الٰہیہ کی دوسری جلد ہے جو شاہ عاشق حسین (شاگرد شاہ ولی اللہ) کی لکھی ہوئی ہے، کیا ندوہ کے کتب خانہ میں یہ کتاب موجود ہے، مولوی نواب صدر یار جنگ کے یہاں جو نسخہ ہے، وہ پہلی جلد ہے یا دوسری یا دونوں ؟ کیا کسی نے اس کتاب کے اردو ترجمہ کا انتظام کیا ہے ؟ مجھے ایسا یاد پڑتا ہے کہ شاید معارف میں اس کے اردو ترجمہ کا اعلان کیا گیا تھا، والسلام

مخلص محمد اقبال

(۶۵)

بھوپال، شیش محل

۱۹ر جولائی ۱۹۳۵ء

مخدوم و مکرم جناب قبلہ مولوی صاحب

السلام علیکم : میں گلے کے برقی علاج کے لئے کچھ مدت کے لئے بھوپال میں مقیم ہوں، اس خط کا جواب بھی مذکورۂ بالا پتہ پر عنایت فرمائیے،

۱- کیا فقہ اسلامی کی رو سے توہین رسول قابل تعزیر جرم[۵۱] ہے، اگر ہے تو اس کی تعزیر کیا ہے[۵۲] ؟

۲- اگر کوئی شخص جو اسلام کا مدعی ہے یہ کہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کو حضور رسالت مآبؐ پر جزوی فضیلت حاصل ہے اس واسطے کہ مرزا قادیانی ایک زیادہ متمدن زمانہ میں پیدا ہوئے ہیں، تو کیا ایسا شخص توہین رسول کے جرم کا مرتکب ہے ؟ بالفاظ دیگر اگر توہین رسول جرم قابل تعزیر ہے، تو عقیدۂ مذکور توہین رسول کی حد میں آتا ہے یا نہیں[۵۳] ؟

---

[۵۱] بے شبہہ [۵۲] تعزیر حسب رائے امام قید سے لیکر قتل تک [۵۳] حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کسی کو جزوی فضیلت حاصل ہونا جائز ہے، اور ایسا کہنا نہ کفر ہے نہ توہین نبی کا باعث ہے، البتہ مقتضائے محبت کے خلاف ہے، اور پھر یہ بھی دیکھنا ہے

عزم فلک شگاف ہو یا فکر ارجمند
سب نذر پائے دوستی جانان ہے آج کل

اس انقلاب دہر نے دل ہی بدل دیا
پہلے جو تھا چمن وہ بیابان ہے آج کل

ایسا بھی کوئی ہے جسے انسان کہہ سکیں
ہندو ہے کوئی کوئی مسلمان ہے آج کل

اختر وہ ذوق عشرت رندانہ کیا ہوا
شام و سحر وظیفہ قرآن ہے آج کل

غزل

از نواب زادہ سید شمس الحسن خان صاحب

ہر منزل خودی سے محبت گذر گئی
مستی بھری کسی کی نظر کام کر گئی

اب سامنے ہے کوئی تو اٹھتی نہیں ہے آنکھ
بیباکیٔ نگاہ محبت کدھر گئی

کیا ہوتا اگر وہ رہتی نظرون کچھ اور دیر
اتنی سی دیر مین تو قیامت گذر گئی

عرض نگاہ شوق بھی جس کو نہ کر سکی
وہ کام میری آتش خاموش کر گئی

جس آرزو کو سمجھا تھا سرمایۂ حیات
وہ آرزو بھی آج نظر سے اتر گئی

اے حسن یار تو نے تو دیکھا نہین اسے
چمکی تھی ایک برق نہ جانے کدھر گئی

ویرانہ حیات کی اللہ ری جنتین
وہ کیا گئے کہ رونق دیوار و در گئی

ان کی تو آن رہ گئی مین مٹ گیا تو کیا
کچھ غم نہین جو آہ مری بے اثر گئی

وہ کیا ڈرے گا جس کو یقین ناخدا ہو
طوفان مین بھی کشتی دل بے خطر گئی

کیا کیا گھٹائین اٹھی ہین الہی کہ الامان
اس رخ پہ جب وہ زلف معنبر بکھر گئی

دیکھین حریم ناز سے آتا ہے کیا جواب
لیکر پیام شوق نسیم سحر گئی

اے شمس اپنے حال پہ روتا ہے تو مگر
کس کو خبر کہ حسن پہ خود کیا گذر گئی

ادبیات

آج کل

از جناب سید اختر علی صاحب تلہری

بدلی ہوئی مشیتِ یزداں ہے آج کل
بے رنگ دہر کا چمنستاں ہے آج کل

ہر برگ پر رقم ہے تباہی کی داستاں
سامان عبرتوں کا گلستاں ہے آج کل

طوفانِ بادِ فتنہ و غارت ہے پُر خروش
دنیائے صلح و امن پریشاں ہے آج کل

آدم کی وحشتوں کے ہیں جھونکے تبائش
شمعِ سکونِ جاں تہِ داماں ہے آج کل

عفریتِ بدخصال ہے خنداں مثالِ گل
انسانیت کا چاک گریباں ہے آج کل

انساں کی عشرتوں کا یہ پُر نور گل کدہ
تاریک تر ز کلبۂ احزاں ہے آج کل

چاروں طرف بپا ہیں وہ فتنے کہ الاماں
نوعِ بشر جحیم بداماں ہے آج کل

وہ عزتِ حرم ہو کہ ہو عزتِ وطن
سب کچھ حصولِ جاہ پہ قرباں ہے آج کل

صدق و خلوص رہ میں سیاست کی بہ گئے
جنسِ فریب و مکر فراواں ہے آج کل

دل میں ہے زہر اور زبانوں پہ شہد ناب
دنیا کی زندگی کا یہ عنواں ہے آج کل

جنگ و جدال میں ڈھونڈھ رہا ہے نجات کو
کس درجہ دور عقل سے انساں ہے آج کل

تھا جس پہ ناز ہم کو وہ روحانیت کا ذوق
پامالِ فکر فتنہ بداماں ہے آج کل

بدلا ہے رنگ دہر کا ایسا کہ ہر طرف
درد و فغان و آہ کا ساماں ہے آج کل

مطبوعات جدیدہ

فتنۂ پرویز و حقیقتِ حدیث
از جناب ایم عبدالرحمٰن صاحب مباحب، تقطیع: وسط ضخامت ۲۰۰ صفحات، کاغذ،
کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد ۔۔ پتہ: ایم ثناء اللہ خان نمبر ۲۲ ریگو روڈ لاہور

کلام مجید ایک اصولی کتاب ہے جس میں زیادہ تر بنیادی اصولی احکام و قوانین ہیں جن کی جزئیات کی تصریح و تفصیل احادیثِ نبوی سے معلوم ہوتی ہے، اس لئے اگر ان کو نہ مانا جائے تو بہت سی دینی پابندیاں ختم ہو جاتی ہیں، آیاتِ قرآنی میں بھی من مانی تاویلات کی گنجائش نکل آتی ہے، مگر حدیثوں کے صریح انکار سے اس قسم کے نام نہاد مسلمانوں کا پردہ بالکل فاش ہو جاتا ہے، اور عام مسلمان ان کے فریب میں نہیں آسکتے، اس لئے وہ حدیثوں کی صحت کو مشتبہ قرار دے کر تمسک بالقرآن کے پردہ میں ان کے دینی حجت ہونے سے انکار کرتے ہیں جس سے ان کو بہت سی دینی پابندیوں سے نجات مل جاتی ہے، اس فتنہ کی تردید میں بہت لکھا جا چکا ہے، مذکورۂ بالا کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک مفید کوشش ہے، اس میں خصوصیت کیساتھ منکرینِ حدیث کے امام وقت مرزا غلام احمد کے ہم نام غلام احمد پرویز کے ہفوات کی تردید کی گئی ہے، اور ان کی تحریروں سے منکرینِ حدیث کے اصل مقصود یعنی، دینی پابندیوں سے فرار، قرآن مجید کی معنوی تحریف اور اطاعتِ رسول سے انحراف وغیرہ کو دکھایا گیا ہے اور منکرینِ حدیث کی جانب سے حدیثوں کی صحت اور ان کے دینی حجت ہونے پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں، ان کا جواب دیا گیا ہے، اور اس سلسلہ میں حدیث کی دینی حیثیت، اطاعتِ رسول کے قرآنی احکام، قرنِ اول میں حفظ حدیث، اسکی صحت و حفاظت کے اہتمام، اس کے ذرائع حفظ و کتابت، اصول روایت و درایت اور تدوینِ حدیث کی تاریخ

غزل

ازجناب عارف عباسی

ایک بھولا ہوا اندازِ کرم یاد آیا
ہائے وہ وقت کہ جب اُن کا ستم یاد آیا

غیر ممکن ہے ملے قیدِ تعین سے نجات
دیر جب یاد نہ آیا تو حرم یاد آیا

رات کیوں نبضِ جہاں رُک سی گئی تھی اے دوست
ہاں تری یاد میں مصروف تھے ہم یاد آیا

بڑھ کے لبیک کہا ذوقِ جراحت نے مرے
حسن کو جب کوئی عنوانِ ستم یاد آیا

تذکرہ تھا اگر لطف و عنایات کا کہیں
مجھکو اپنا دلِ برباد کرم یاد آیا

ایک مرکز پہ کہیں رہتی ہے شوریدہ سری
دل جو گھبرایا مسرت سے تو غم یاد آیا

دامنِ گل پہ نظر آئی جو شبنم عارفؔ
جانے کیوں مجھ کو مرا دیدۂ نم یاد آیا

آئینۂ حیرت

ازجناب عبدالمجید حیرتؔ شملوی

جس ترقی کا اس قدر غل ہے
وہ ترقی نہیں تنزل ہے

ہے تو سینہ میں دل مگر خاموش
شمعِ محفل میں ہے مگر گل ہے

جب تغافل نہ تھا، توجہ تھی
اب توجہ نہیں، تغافل ہے

حسنِ خود بیں کا اک بڑا فتنہ
وہ بھی ہے جس کا نام کاکل ہے

ہم کو نسبت ہے اُس گلستاں سے
جس گلستاں کا خار بھی گل ہے

نہ سہی امن و عافیت پیہم
کشمکش میں تو اک تسلسل ہے

ہم نفس کوئی دور تک بھی نہیں
تلخ یوں بھی نوائے بلبل ہے

ان سے کیا بحث کیجئے حیرتؔ
جن کے نزدیک جزو ہی کل ہے

آرام باغ کراچی،

نماز کی عظمت و اہمیت اور اس کی تصحیح و تکمیل کے لوازم و شرائط اور ان سے متعلق احکام و مسائل پر امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا ایک رسالہ "کتاب الصلوٰۃ وما یلزم لہا" کے نام سے ہے، جو عرصہ ہوا چھپ چکا ہے، مذکورہ بالا کتاب اسی کا اردو ترجمہ ہے، لائق مترجم نے اس کے شروع میں حضرت امام کے مختصر حالات و سوانح بھی تحریر کر دیئے ہیں، جس سے اس کا فائدہ بڑھ گیا ہے، یہ رسالہ نماز کی تصحیح و تکمیل کے مسائل سے واقفیت کے لئے مفید ہو،

روایات الطیب مرتبہ جناب مولٰنا محمد طیب صاحب تقطیع اوسط ضخامت ۸۸ صفحات کاغذ، کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد عہ، پتہ: ادارہ تاج المعارف دیوبند،

علماء و اخیار کی زندگی کا کوئی واقعہ بھی فائدے اور سبق سے خالی نہیں ہوتا، دیوبند کے سلسلہ کے اکابر کے ایسے بہت سے واقعات ہیں جو عام طور سے معلوم و مشہور نہیں ہیں، اور بطور روایت کے سینہ بسینہ منتقل ہوتے چلے آتے تھے، فاضل مرتب نے افادۂ عام کے لئے حضرت شاہ ولی اللہ، شاہ عبد العزیز صاحب، مولانا شاہ عبد القادر صاحب، مولانا اسمٰعیل شہید، مولانا شاہ محمد اسحٰق اور حضرت سید احمد بریلوی کے سبق آموز نادر واقعات کو مرتب کرکے شائع کر دیا ہے، ان میں معمولی واقعات بھی ہیں، اور اہم بھی، مگر کوئی واقعہ بھی کسی نہ کسی مفید سبق سے خالی نہیں ہے، مرتب نے ان کو شائع کرکے ایک مفید خدمت انجام دی ہے،

مینا بازار مرتبہ و مترجمہ جناب ڈاکٹر محمد احمد صاحب صدیقی تقطیع بڑی ضخامت ۱۳۱ صفحات کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ، پتہ: منیجر اسرار کریمی پریس الہ آباد،

مینا بازار جو عام طور سے ظہوری کی جانب منسوب ہے، اور جس کے مصنف کی تحقیق کے بارہ میں دو فاضلوں کے درمیان معارف میں مباحثہ چل رہا ہے، قدیم فارسی درسیات کی مشہور کتاب ہے، اور اس زمانہ میں بھی وہ یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہے، اس لئے ڈاکٹر محمد احمد صاحب صدیقی نے اس کو تصحیح تحشیہ، ترجمہ و تشریح اور مقدمہ کے ساتھ بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے، مقدمہ میں مینا بازار پر مختصر تبصرہ اور اس کے مصنف کی تحقیق کی گئی ہے، اس کے بعد اصل

پروردہ ڈالی گئی ہے، اور حدیثوں کی کثرت کے متعلق مبالغہ آمیز بیانات کی تردید کی گئی ہے، اور آخر میں منکرین حدیث کے تقلید سلف سے گریز، دین کی تخریب، اور اس کی مخالفت میں اُن کے اور کمیونسٹوں کے خیالات میں مشابہت دکھائی گئی ہے، خالص علمی و تحقیقی حیثیت سے اس موضوع پر اس سے بہتر کتابیں موجود ہیں، مگر یہ کتاب بھی فائدہ سے خالی نہیں ہے، اور اس میں پرویز کی تحریروں سے انکا تضاد بیانی اور دین سے منکرین حدیث کا فرار خصوصیت کے ساتھ بڑی خوبی سے دکھایا گیا ہے، جناب طالوت کا مقدمہ بہت دلچسپ اور ان کی طرز خاص کا اچھا نمونہ ہے،

تذکرہ شیخ محمد بن طاہر پٹنی و ترجمہ رسالہ مناقب | از مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۷۸ صفحات کاغذ کتابت بہتر قیمت مجلد عہ، پتہ : ندوۃ المصنفین اردو بازار دہلی،

تاریخ گجرات مصنف کا خاص موضوع ہے، اور اس سلسلہ میں انھوں نے گجرات کے بعض اکابر علماء و مشائخ کی علمی یادگاریں اور اُن کے متعلق کتابیں بھی شائع کی ہیں، اسی سلسلہ میں انھوں نے امام الحدیث فی الہند شیخ محمد طاہر پٹنی کے حالات میں اُن کے پوتے شیخ عبدالوہاب کے ایک فارسی رسالہ رسالۂ مناقب کا ترجمہ کیا ہے، اور اس پر ایک مبسوط مقدمہ لکھا ہے، جو مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے، اس میں شیخ کے سوانح، اُن کے نسبی و خاندانی حالات تعلیم و تحصیل علم، اساتذہ علمی و روحانی کمالات، درس و تدریس، تالیف و تصنیف، ارشاد و ہدایت، اصلاح و تزکیہ، تصانیف، اور اولاد وغیرہ کا ذکر ہے، اور اس سلسلہ میں گجرات میں اسلامی حکومت کی مختصر تاریخ، شیخ کے عہد کے سیاسی اور فرقہ مہدویہ کے حالات وغیرہ اس دور کے متفرق اور مفید واقعات بھی آگئے ہیں، شیخ کے ذکر کے سلسلہ میں بوہرہ قوم کی اصل و نسل پر محققانہ بحث کی گئی ہے، مقدمہ کے بعد شیخ علاء الدین کے رسالہ مناقب کا ترجمہ ہو، اور اس میں جو تاریخی غلطیاں ہیں، انکی تصحیح کردی گئی ہے، یہ کتاب تذکرہ علمائے ہند میں اچھا اضافہ ہے،

کتاب الصلوٰۃ دو ماہیئرہم ہما | مترجمہ جناب شیخ علی جواد صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۸۵ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر مجلد قیمت تحریر نہیں، پتہ: نور محمد کارخانہ تجارت کتب

مکتبۂ دار المصنفین

سلسلۂ تاریخ اسلام

تاریخ اسلام (حصۂ اول) عہد رسالتؐ و خلافت راشدہ
یعنی آغاز اسلام سے لیکر خلافت راشدہ کے اختتام تک اسلام
کی مذہبی، سیاسی، تمدنی، اور علمی تاریخ، قیمت [illegible]

تاریخ اسلام (حصۂ دوم) (بنی امیہ) یعنی اموی سلطنت
کی صد سالہ سیاسی، تمدنی، اور علمی تاریخ کی تفصیل قیمت [illegible]

تاریخ اسلام (جلد سوم) (خلافت عباسیہ) یعنی ابو العباس
سفاح ۱۳۲ھ / ۷۵۰ء سے ابو اسحاق متقی اللہ ۳۳۳ھ / ۹۴۴ء تک دو
صدیوں کی سیاسی تاریخ، قیمت [illegible]

تاریخ اسلام (جلد چہارم) (خلافت عباسیہ دوم)
اس مین مستکفی باللہ کے عہد سے آخری خلیفہ مستعصم باللہ
تک خلافت عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی تاریخ ہے، اور
آخر مین ایک مستقل باب مین عباسیون کے تمدنی کارنامون
پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اس طرح سے یہ جلد پہلی دو جلدون
سے کہین زیادہ ضخیم اور مکمل ہو گئی ہے،

(از شاہ معین الدین احمد ندوی)

قیمت: [illegible]

نئی کتابین

تاریخ سندھ، سندھ کی مفصل سیاسی، نظامی، علمی، و تمدنی
تاریخ:- قیمت: [illegible] (چھ روپیے)

اقبال کامل، ڈاکٹر اقبال کے سوانح حیات کے علاوہ انکے فلسفیانہ
اور شاعرانہ کارنامون کے اہم پہلوؤن کی تفصیل، [illegible]

بزم تیموریہ، تیموری بادشاہون، شاہزادون اور شاہزادیون کے
علمی ذوق اور اُن کے دربار کے امراء و شعراء اور فضلاء کے مختصر تذکرہ
کے ساتھ اُن کے علمی و ادبی کمالات کی تفصیل، قیمت [illegible]

امام رازی، امام فخر الدین رازی کے سوانح و حالات انکی
تصنیفات کی تفصیل اور فلسفہ و علم کلام و تفسیر کے اہم مسائل
کے متعلق اُن کے نظریات و خیالات کی تشریح قیمت [illegible]

بزم صوفیہ، عہد تیموریہ سے پہلے کے صاحب تصنیفات صوفیۂ کرام
مثلاً شیخ ہجویری، خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ نظام الدین اولیاء
وغیرہ کے مستند حالات اور تعلیمات، قیمت [illegible]

تاریخ اندلس (جلد اول) اندلس کے عہد بعہد کی مفصل سیاسی
تاریخ کیساتھ اندلس کی و تمدنی تاریخ، قیمت [illegible]

اہل کتاب صحابہ و تابعین، یہودی و نصرانی اہل کتاب صحابہ و تابعین کا تذکرہ [illegible]

کتاب ہے، اور آخر میں اس کا ترجمہ، حل لغات اور تشریح ہے، تشریح میں جا بجا اس کے ادبی محاسن کی بھی وضاحت کی گئی ہے، یہ ترجمہ اور تشریح فارسی کے طلبہ کے لئے بہت مفید اور کارآمد ہے،

شیخ نیازی از جناب رشید احمد صاحب صدیقی تقطیع اوسط ضخامت ۲۰۰ صفحات، کاغذ، کتابت طباعت بہتر قیمت عہ پتہ: مسز جبیب اینڈ کمپنی، یونیورسٹی علی گڑھ،

یہ پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی کا پرانا اور نہایت دلچسپ افسانہ ہے، جس میں شیخ نیازی کے بچپن کے واقعات کو بڑے دلکش پیرایہ میں لکھا گیا ہے جن لوگوں کو شیخ نیازی سے تعارف حاصل ہے، وہ ان کی خصوصیات سے واقف ہونگے اس افسانہ میں ان کی قلندرانہ شان، معصومیت، بھولے پن، عادات، خصائل، مشاغل، دوستوں، بھائی بہنوں سے صلح و جنگ، مرغوبات لباس و وضع قطع وغیرہ کو اپنے خاص انداز میں لکھا ہے، اور شیخ نیازی کے پردہ میں بچپن کی معصوم زندگی کی بڑی دلکش تصویر کی ہے، اس لئے یہ کتاب نہ صرف بچوں بلکہ بوڑھوں کے لئے بھی دلچسپ ہے، اس کے آخر میں دو اور مختصر افسانے ہیں، اس کا پہلا اڈیشن کئی سال ہوئے شائع ہوا تھا، اب ترمیم و اضافہ کے بعد دوسرا اڈیشن شائع ہوا ہے، اس اڈیشن میں شیخ صاحب کی تصویر اور زیادہ دلچسپ ہوگئی ہے،

آسان ریاضی حصۂ سوم مرتبہ جناب شوکت علی صاحب بی اے، ایل ٹی تقطیع اوسط ضخامت ۴۴ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی قیمت ۲؍ پتہ: مکتبہ جماعت اسلامی ہند، ریاست رام پور۔

جماعت اسلامی ہند نے مسلمان بچوں کی تعلیم کے لئے مذہبی نصاب کے ساتھ تاریخ جغرافیہ اور ریاضی وغیرہ کا بھی پورا نصاب مرتب کیا ہے جس میں اسلامی رنگ پیدا کرنے کا ممکن حد تک لحاظ رکھا ہے، مگر ریاضی میں اس کی گنجایش بہت کم ہے تاہم مشق و مثالوں میں جہاں تک گنجایش نکل سکی ہے اس کتاب میں اسکا لحاظ رکھا گیا ہے

جسٹرڈ نمبر اے ۵۲۰

اپریل سنہ ۱۹۵۵ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت آٹھ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

۱۹۵۵ء کی نئی کتاب

بزمِ مملوکیہ

ہندوستان کے تیموری سلاطین کی علم نوازی اور معارف پروری پر ایک کتاب بزمِ تیموریہ کے نام سے شائع
ہو چکی ہے، اس سے پہلے کے مسلمان حکمران خاندانوں یعنی غلاموں، خلجیوں، تغلقوں اور لودیوں کے علمی و مذہبی کارناموں اور ان کے
درباروں سے متوسل علماء و مشائخ اور ادباء و شعراء کے حالات میں بھی ایک سلسلہ لکھا جا رہا ہے، یہ جلد غلام سلاطین اور ان کے
امراء اور شہزادوں کے حالات میں ہے، انھوں نے میدانِ جنگ میں اپنی شجاعت و بہادری کے جو جوہر دکھائے، اور اپنی نبرد آزمائی و
جنگ آوری کا جو ثبوت دیا، اس کی داستان تو بہت لکھی گئی ہے لیکن انھوں نے شعر و سخن، و علم و ادب کی جو خدمت کی، اور
علماء و شعراء کی جو قدردانی کی، اس کی تفصیل اس کتاب میں بیان کی گئی ہے، اس میں بہاء الدین اوشی، فضلی ملتانی، امام
صغانی، سدید الدین عوفی، نظامی نیشاپوری، مولانا منہاج سراج، فخر مدبر، ناصری، روحانی، تاج الدین ریزہ، شہاب مہرہ بدا
یونی، شمس دبیر، امیر خسرو، اور حسن سجزی وغیرہ جیسے باکمال علماء و فضلاء و شعراء کے علمی و ادبی کارناموں پر نقد و تبصرہ کیا گیا
خصوصاً اس دور کے ممتاز و سرآمد روزگار شعراء ریزہ، شہاب اور عمید کو پردۂ گمنامی سے نکال کر اردو زبان میں پہلی
بار منظرِ عام پر لایا گیا ہے، ان کے کلام سے اندازہ ہوگا کہ ان کو شعر و سخن، اور زبان و ادب پر کتنی قدرت تھی، اس میں انھوں نے
کیا کیا جدت طرازیاں کیں، اور اپنی قادر الکلامی اور کمالِ فن کا کیا ثبوت دیا، مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمن ایم اے

تأمل و مشیت

اس میں حیاتِ انسانی کے دو بنیادی تصورات تأمل و مشیت کی فلسفیانہ تحلیل کی گئی ہے، شروع میں
ایک مختصر مقدمہ ہے، اس کے بعد انہی دونوں موضوع پر سلسلۂ افکار دو دفتروں میں پیش کیا گیا ہے، آخر میں چند صفحوں میں
پوری بحث پر تبصرہ ہے، (از صاحبزادہ ظفر حسین خان صاحب مترجم مقالات روسو)

قیمت عہ

(طابع و ناشر صدیق احمد)

جلد ۷۵ ماہ شعبان المعظم ۱۳۷۴ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۵۵ء عدد ۴

مضامین

اس صوبہ میں اردو کے وجود کا اقرار تو کیا، ورنہ وہ تو اردو نامی زبان کے وجود ہی کے سرے سے منکر تھے۔

اس کو ہندی والوں کے وہم کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ان کو سمپورنانند جی جیسے اردو نواز وزیر اعظم کے عہد حکومت میں بھی اردو کا خطرہ نظر آتا ہے، ان کے زیر سایہ اردو کے پنپنے کا بھلا کیا امکان ہے، اگر کسی وزیر یا مدبر نے کسی وقتی مصلحت یا اردو والوں کو بہلانے کے لیے اردو کے حق میں کوئی کلمۂ خیر کہہ بھی دیا تو اسکو حقیقت پر محمول کرنا خود سمجھنے والوں کی خوش فہمی ہے، اور اگر بالفرض اردو کے کسی حق کیلئے کوئی سرکار بھی جاری کر دیا گیا تو حکومت کے فراج شناس عمال کہاں کے ایسے گئے گذرے اور کند ذہن ہیں کہ وہ اس کی تعمیل بھی کر دیں گے، جس کا تجربہ مدتوں سے ہو رہا ہے، ایسی حالت میں ہندی کو اردو سے کیا اندیشہ ہو سکتا ہے،

اسی کے ساتھ اس کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ ایسے حق پرست ہندو اب بھی موجود ہیں جو اردو کو اپنی مادری زبان سمجھتے ہیں، اور اسکی حمایت میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں، چنانچہ اردو کے ساتھ دلی کی ریاست اور اسکی میونسپلٹی کے معاندانہ رویہ کی مخالفت، اردو کی حمایت اور اسکو دلی کی علاقائی زبان بنانے کی تحریک میں ہندو مسلمان دونوں برابر کے شریک ہیں، اس سلسلہ میں جناب گوپی ناتھ امن کا وہ خطبۂ صدارت جو انھوں نے جامعہ اردو علی گڈھ کے جلسۂ تقسیم اسناد میں پڑھا تھا خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے، اس میں انھوں نے جس جرأت، دلیری اور معقول دلائل کے ساتھ اردو کی وکالت کی ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے، اور اس سے یقین ہوتا ہے کہ پنڈت کشن پرشاد کول کی موت سے جو جگہ خالی ہوئی ہے وہ خالی نہ رہے گی اور اس کے سب سے زیادہ مستحق امن ہی صاحب ہیں، جب تک ایسے حق پرست اور منصف مزاج ہندو موجود ہیں، اس وقت تک اردو کو تنہا مسلمانوں کے سر نہیں منڈھا جا سکتا،

ابھی اسی مہینہ میں پارلیمنٹ اور اتر پردیش کی اسمبلی میں قریب قریب ایک ساتھ گاؤکشی کے قانونی انسداد کیلئے بل پیش ہوئے، پارلیمنٹ میں مہاسبھائی ممبر سیٹھ گووند داس نے بل پیش کیا تھا، اور اتر پردیش میں خود حکومت کی جانب سے پیش کیا گیا ہے، سیٹھ گووند داس کے بل کی مخالفت میں پنڈت جواہر لال نے بڑی سخت تقریر کی اور یہاں تک کہدیا کہ "اس بل کے منظور کرنے کے مقابلہ میں اپنے عہدہ سے مستعفی ہونا پسند کرونگا" اور اس بارہ میں اتر پردیش کی حکومت پر بھی سخت نکتہ چینی کی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رائے شماری میں بڑی اکثریت سے یہ بل مسترد کر دیا گیا، مگر اس سے ہمارے صوبہ کے وزیر اعظم کے تیور میں کوئی فرق نہیں آیا ہے، جیسا کہ ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے وہ اپنے عزم پر پوری طرح قائم ہیں،

شذرات

حافظ ابراہیم صاحب نے بجٹ کی تقریر میں بعض وقتی مصالح کی بنا پر اردو کے بارہ میں بھی چند فقرے کہے تھے، گو ان میں کوئی نئی بات نہیں تھی، بلکہ وہی پرانے بے معنی الفاظ دہرائے گئے تھے، جو دوسرے وزراء کہتے چلے آئے ہیں، مگر معلوم نہیں کیوں اس سے ہندی والوں کو غلط فہمی اور شاید بعض اردو کے حامیوں کو بھی خوش فہمی پیدا ہوئی اور غالباً خود وزیر اعظم کے دل میں بھی کچھ شبہ پیدا ہوا، اس لیے انھیں خود اس کی وضاحت میں لب کشائی کرنا پڑی اور انھوں نے بڑی صفائی کے ساتھ کہہ دیا کہ "وزیر مالیات کی تقریر میں کوئی نئی بات نہیں کہی گئی ہے، اس میں نہ تو ہندی کی جگہ کسی دوسری زبان کو سرکاری زبان بنانے کا اعلان کیا گیا ہے اور نہ کسی زبان کو علاقائی زبان تسلیم کیا گیا ہے، اس میں صرف اتنا کہا گیا ہے کہ اگر کوئی چاہے تو اردو میں بھی درخواست دے سکتا ہے، مگر حکومت کا سارا کام ہندی زبان اور دیوناگری رسم الخط میں ہوگا" اردو کی تعلیم کے بارہ میں بھی پوری وضاحت کر دی ہے، جس کے بعد کسی غلط فہمی کا امکان باقی نہیں رہ جاتا،

حافظ ابراہیم صاحب نے بڑی مسرت کے ساتھ اردو کی درخواستوں کے بارہ میں وزیر اعظم کی فیاضی کا حوالہ دیا تھا، اس کی حیثیت بھی واضح کر دی کہ "یہ سہولت اس لیے دی گئی ہے کہ یوپی کے بعض حصوں میں مسلمان اور کچھ ہندو بھی صرف اردو جانتے ہیں اور ہمارے صوبہ میں جو پناہ گزیں آئے ہیں وہ بھی اردو جانتے ہیں، اس لیے انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ حصول انصاف کیلیے اردو کی درخواستوں کو نہ روکا جائے" یعنی یہ اجازت اردو کے کسی حق کی بنا پر نہیں، بلکہ مجبوری کی بنا پر دی گئی ہے، معلوم نہیں حافظ صاحب کو ان کے متن کی اس شرح سے کہاں تک اتفاق ہے۔

وزیر اعظم بیرسٹر تو پرانے ہیں، جن کا کام ہی اجمال کی تفصیل اور ابہام کی تشریح ہے، غالباً وکیل بھی ہوں گے، یا کم از کم وزارت سنبھالنے کے بعد کاروبار نے قانونی موشگافیوں کا ماہر بنا دیا ہے اور ان کی نگاہ ہر گوشہ اور ہر شوشہ پر رہتی ہے، اسلیے انھوں نے اردو میں درخواست کی اجازت کو ہر پہلو سے ایسا جکڑ دیا ہے کہ کہیں سے اردو کو سہارا ملنے کی گنجایش نہ رہے، تاہم اس عدل نوشیروانی کی داد دینا چاہیے کہ اس کے طفیل میں سمپورنانند جی نے کسی درجہ میں سہی

مقالات

قرآن میں آیتِ رجم

از جناب حافظ مولوی مجیب اللہ صاحب ندوی

(۳)

ان معنوی خرابیوں کے علاوہ ان روایتوں میں اس جملے کے جو الفاظ منقول ہیں ان میں بھی کافی اضطراب اور کمی وزیادتی ہے،

حضرت ابی بن کعب نے اس جملہ کو فارجموھما البتۃ تک روایت کیا ہے، ابو امامہ نے اس میں بما قضیا من اللذۃ کا اضافہ کیا ہے، اور حضرت زیدؓ کی روایت میں نکالاً من اللہ واللہ عزیز حکیم کا مزید اضافہ ہے،

ان تفصیلات سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اس جملے کو جن لوگوں نے منسوخ کلام الٰہی قرار دیا ہے ان کے بیانات میں اصول درایت و روایت کے اعتبار سے اتنا نقص اور لفظی و معنوی لحاظ سے اتنا تضاد و اختلاف ہے کہ اس کو کلام الٰہی کہنا، خواہ وہ منسوخ ہی کیوں نہ ہو، کلام الٰہی کی توہین ہے۔

اب اس سلسلہ کی آخری روایت پر جو حضرت عمرؓ سے مروی ہے، غور کیجئے،

اوپر ذکر آچکا ہے کہ حضرت عمرؓ کی جو تقریر امام مالک سے مروی ہے، اس میں تو الشیخ والشیخۃ والے ٹکڑے کا ذکر ہے، مگر صحاح کی دوسری کتابوں میں نہ تو اس ٹکڑے کا کوئی ذکر ہے اور نہ آیت رجم

اس واقعہ سے مرکز اور صوبوں کی پالیسی میں تضاد کا کسی قدر اندازہ ہو جاتا ہے، درحقیقت بہت سے مسائل میں ان دونوں کے تصور میں اتنا بنیادی اختلاف ہے کہ وہ کبھی ایک نہیں ہو سکتے، پنڈت جی کا نقطۂ نظر خالص سکولر ہے، وہ ساری دنیا کی نظروں میں ہندوستان کو سربلند کرنا چاہتے ہیں، اور صوبائی حکومتوں خصوصاً ہمارے صوبہ کی حکومت کا مقصد ہر چیز کو ہندوئیت کے رنگ میں رنگنا ہے، جس کا ثبوت قدم قدم پر ملتا ہے، تاہم اس ذہنیت میں بہت سے نقصانات کے ساتھ یہ فائدہ بھی ہے کہ اس سے خود اس کے ہاتھوں نام نہاد سیکولرزم کی حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے اور دنیا کو اس کا اصلی چہرہ نظر آجاتا ہے،

ناظرین کو یہ سنکر مسرت ہوگی کہ ادھر چند سال کے اندر ہندوستان میں اردو کی جس قدر کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں دار المصنفین کی کتاب آل و مشیت سب سے بہتر قرار پائی، اور مرکزی حکومت نے پانچ ہزار کے گرانقدر انعام سے اس کے فاضل مصنف جناب ظفر حسن خانصاحب کی قدر افزائی کی، موصوف کو دار المصنفین سے بہت پرانا تعلق ہے، اسکے ابتدائی دور میں انکی ایک کتاب مقالات روسو دار المصنفین سے شائع ہو چکی ہے، آل و مشیت بھی دار المصنفین ہی کے سلسلہ کی کتاب ہے، اسلیے اس اعزاز میں دار المصنفین بھی شریک ہے، اور یہ اس کا ثبوت ہے کہ آج بھی دار المصنفین کی کتابوں کا معیار کتنا بلند ہے، اور اہل نظر کی نگاہ میں ان کا کیا درجہ ہے،

سلیمان نمبر قریب قریب چھپکر تیار ہو گیا ہے، رمضان المبارک کا پرچہ انشاء اللہ سلیمان نمبر ہوگا، یہ نمبر تقریباً چار سو صفحات کی ضخیم کتاب ہے، اور اس میں حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کے سیر و سوانح، اخلاق و شمائل علمی کمالات، علمی و دینی اور قومی و ملی کارناموں کا پورا مرقع آگیا ہے، مضمون نگاروں میں دار المصنفین کے رفقاء و مصنفین کے علاوہ مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی، مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی، مولانا عبد الباری صاحب ندوی، مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی، مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی، مولانا مسعود عالم مرحوم، پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی، ڈاکٹر ذبیر صدیقی، پروفیسر عبد المنان بیدل، مالک رام صاحب ایم اے، اور بہت سے اصحاب علم و قلم کے مضامین ہیں، منظومات، قطعات، تاریخ، اہم تاریخی مکاتیب وغیرہ متفرقات اس کے علاوہ ہیں، اس طرح اس نمبر میں سیرت سلیمانی کا پورا خاکہ آگیا ہے، یہ نمبر معارف کے خریداروں کو دو روپے اور عام خریداروں کو علاوہ محصول ڈاک چار روپے میں دیا جائیگا، جن اصحاب کو خریداری منظور ہو وہ پہلے سے مطلع فرما دیں تو تعمیل میں سہولت ہوگی،

واسطہ سے جن ائمۂ حدیث نے یہ روایت کی ہے، ان میں سے کسی نے اس ٹکڑے کا ذکر نہیں کیا ہے، حتی کہ امام مالکؒ نے بھی امام زہریؒ کے واسطہ سے اس تقریر کی جو روایت کی ہے، اس میں بھی اس ٹکڑے کا کوئی ذکر نہیں ہے، محض ان کے ایک شاگرد یحییٰ بن سعید نے یہ ٹکڑا روایت کیا ہے،

مگر اس وضاحت کے بعد بھی حضرت عمرؓ کی طرف اس ٹکڑے کی نسبت صحیح نہیں ہو، یہ سوال تشنۂ تحقیق رہ جاتا ہے، کہ امام بخاریؒ اور دوسرے اصحاب صحاح نے گو وہ ٹکڑا نقل نہیں کیا ہے، پھر بھی ان سب نے آیت رجم کے نزول کا ذکر کیا ہے، آخر اس سے کیا مراد ہے۔ اس بارہ میں بخاری کے الفاظ ملاحظہ ہوں،

فکان مما انزل اللہ آیۃ الرجم	اللہ تعالیٰ نے جو کلام نازل فرمایا ہے اسمیں آیت رجم بھی ہے۔

اس بارے میں آیندہ صفحات میں ہم تفصیل سے بحث کریں گے کہ "آیت رجم" سے حضرت عمرؓ کی کیا مراد ہے۔ اس سلسلہ میں چند باتیں عرض کی جاتی ہیں،

امام بخاریؒ نے حضرت عمرؓ کی مذکورہ تقریر کے مختلف ٹکڑے کتاب میں متعدد جگہ نقل کیے ہیں، مگر کتاب المحاربین میں اس کی مفصل روایت کی ہے، جس کا ذکر اوپر آچکا ہے،

یہ روایت انھوں نے اپنے دو شیوخ علی بن عبد اللہ اور عبد العزیز بن عبد اللہ سے بیان کی ہے، ان دونوں شیوخ کی روایتوں کے متن اور سند میں قدرے اختلاف ہے، عبد العزیز بن عبد اللہ کی مفصل روایت اوپر گذر چکی ہے جس میں آیت رجم کے نزول کا ذکر ہے، مگر علی بن عبد اللہ کی روایت میں "آیت رجم" کا لفظ مذکور نہیں ہے، بلکہ اس میں "انزال فریضۃ" اور "الرجم حق" وغیرہ الفاظ ہیں، وہ روایت یہ ہے:

قال عمر لقد خشیت ان یطول	حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں اس بات سے ڈرتا ہوں
بالناس زمان حتی یقول قائل	کہ کچھ زمانہ گذر جانے کے بعد لوگ کہنے لگیں کہ ہم
لا نجد الرجم فی کتاب اللہ	کتاب اللہ میں رجم کا ذکر نہیں پاتے، اس طرح وہ ایک

کے نزول و منسوخ ہونے کا تذکرہ ہے، ظاہر ہے کہ اگر اصحاب صحاح اس کو منسوخ آیت رجم سمجھتے اور انکو یہ یقین ہوتا کہ حضرت عمرؓ نے یہ فرمایا ہے تو اس کو ضرور نقل کرتے خصوصیت سے امام بخاری کو جنھوں نے حضرت عمرؓ کی اس تقریر کی سب سے زیادہ مفصل روایت کی ہے، یہ ٹکڑا ضرور ہی نقل کرنا چاہیے تھا، مگر انھوں نے ایسا کیوں نہیں کیا، اس بارے میں حافظ ابن حجر بخاری کی اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ولعل البخاری هو الذی حذف ذلك عمداً فقد اخرجه النسائی عن محمد بن منصور... ثم قال لا اعلم احداً ذكر فی هذا الحديث الشيخ والشيخة غير سفيان و ينبغی ان يكون وهم فی ذالك

امام بخاری نے اس ٹکڑے کو قصداً حذف کر دیا ہے، نسائی نے محمد بن منصور سے روایت کرنے کے بعد کہا ہے کہ میں نہیں جانتا کہ سفیان ثوری کے علاوہ کسی نے الشیخ والشیخۃ والے ٹکڑے کا ذکر کیا ہو، یہ ان کا وہم معلوم ہوتا ہے،

اس کے بعد حافظ ابن حجر اپنی رائے دیتے ہیں،

قلت وقد اخرج الائمة هذا الحديث من رواية مالك ويونس و معمر وصالح بن كيسان وعقيل وغيرهم من الحفاظ عن الزهری فلم يذكروها ووقعت هذه الزيادة فی هذا الحديث من رواية الموطا عن يحيیٰ بن سعيد عن سعيد بن المسيب

اس روایت کو بہت سے ائمہ حدیث مثلاً امام مالک، یونس، معمر، صالح بن کیسان اور عقیل وغیرہ نے امام زہری کے واسطہ سے نقل کیا ہے مگر ان میں سے کسی نے اس ٹکڑے کا ذکر نہیں کیا، اس روایت میں اس ٹکڑے کی زیادتی موطا کے اس روایت کے ذریعہ سے ہوئی ہے جو انکے شاگرد یحییٰ نے سعید بن مسیب کے ذریعہ مروی ہے،

اس سے معلوم ہوا کہ یہ ٹکڑا جن راویوں نے نقل کیا ہے وہ ان کا وہم ہے، اس لیے کہ امام زہری کے

اگر الفاظ کا جامہ اس حکم سے اتار لیا جائے، تو پھر اعتراض کرنے والوں کو وہ حکم الٰہی کس طرح دکھا کر خاموش کیا جا سکتا ہے۔ اور ان کو کیسے تسکین ہو سکتی ہے، اور کیا کوئی حکم الفاظ کے بغیر بھی ثابت کیا جا سکتا ہے، اس بنا پر حضرت عمرؓ کے مذکورہ ارشاد کا کوئی ایسا مطلب لینا چاہیے جس سے قرآن سے رجم کا ثبوت مع الفاظ کے مل جائے، اور آئندہ اس کے اسلامی حد ہونے میں کسی کو کوئی شبہہ بھی باقی نہ رہ جائے جیسا کہ حضرت فاروقؓ کا منشا معلوم ہوتا ہے،

حضرت عمرؓ کا منشا سمجھنے کے لیے ہمیں اسی سلسلہ میں بعض دوسرے صحابہ کی روایتوں اور رایوں پر بھی نظر ڈالنی ہوگی،

حضرت عمرؓ کی جو روایت اوپر گذری ہے اس کے راوی اول حضرت عبد اللہ بن عباسؓ ہیں ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ کے منشا کو ان سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے، اگر حضرت ابن عباسؓ ان کے ارشاد کا مطلب وہی سمجھتے جو امام مالک اور عام طور پر دوسرے محدثین و مفسرین سمجھتے ہیں، تو پھر وہ یہ ارشاد نہ فرماتے،

من كفر بالرجم فقد كفر بالقرآن	جس نے رجم کا انکار کیا اس نے پورے قرآن کا
من حيث لا يحتسب قوله عز وجل	انکار کیا، اس لیے کہ اس نے خدا کے اس ارشاد کو سمجھا ہی
يا اهل الكتاب قد جاءكم رسولنا	نہیں کہ اے اہل کتاب تمھارے پاس ہمارا رسول
يبين لكم كثيرا مما كنتم تخفون	آگیا ہے جو تمھارے سامنے بہت سے ایسے احکام الٰہی
من الكتاب فكان الرجم مما اخفوه[1]	کی وضاحت کرتا ہے جن کو تم چھپا رہے تھے، ابن عباسؓ
	نے کہا کہ یہ لوگ جن احکام کو چھپا رہے تھے ان ہی میں

حافظ ابن قیم نے زاد المعاد میں اس روایت کو جن الفاظ میں نقل کیا ہے، اس سے اس مسئلہ کی

---

[1] حاکم نے اس روایت کے بارے میں لکھا ہے کہ هذا حديث صحيح الاسناد ولم يخرجاه۔ امام ذہبی نے بھی تلخیص میں اس کی صحت کی تصدیق کی ہے (ج ۴ ص ۳۵۹)

فیضلوا بترک فریضۃ انزلھا اللہ الا وان الرجم حق علی من زنی وقد احصن[1]

فریضۂ خداوندی کو ترک کرکے گمراہ ہوں، خبردار سن لو کہ محصن زانی کی سزا رجم حق ہے،

حضرت عمرؓ کے اس بیان میں نہ تو آیت رجم کے نزول کا ذکر ہے، اور نہ اس کے منسوخ ہونے کا بلکہ اس میں جس بات پر وہ زور دینا چاہتے ہیں، وہ یہ ہے کہ سزائے رجم ایک فریضۂ خداوندی ہے، اور کتاب اللہ سے اس کے ثابت ہونے میں کسی شبہے کی گنجائش نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ کا یہ بیان، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، اور ابن ماجہ میں مختلف واسطوں سے منقول ہے، اور ان میں سب سے زیادہ زور جس بات پر دیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ

الا وان الرجم حق

خبردار کہ رجم کی سزا حق ہے،

اگر ان میں سے کسی نے "آیت رجم" کا ذکر کیا بھی ہے تو اس سے مراد منسوخ التلاوت آیت مراد نہیں لی ہے، اگرعام شارحین حدیث اس سے وہی منسوخ التلاوت آیت مراد لیتے ہیں، اب اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ حضرت عمرؓ اس بات کے قائل تھے کہ آیت رجم کا نزول ہوا تھا، مگر وہ منسوخ ہوگئی تو پھر ان کا یہ فرمانا کیسے صحیح ہوگا کہ رجم کتاب اللہ میں اب بھی موجود ہے، اور اگر حضرت عمرؓ کا یہ فرمانا صحیح ہے اور یقیناً صحیح ہے، کہ رجم کا ذکر قرآن میں اب بھی موجود ہے۔ تو پھر آیت کے منسوخ ہونے کی نسبت ان کی طرف صحیح نہیں ہوسکتی اس لیے کہ دونوں میں کھلا ہوا تضاد ہے،

پھر اس حیثیت سے بھی غور کیجئے کہ حضرت عمرؓ جس خدشہ کی بنا پر یہ ثابت کر رہے تھے کہ رجم کا ثبوت قرآن میں موجود ہے، ایسی حالت میں اگر اس ثبوت کے الفاظ منسوخ قرار دیے جائیں تو وہ خدشہ اپنی جگہ پر باقی ہی رہ جاتا ہے، اس لیے کہ کوئی حکم بھی ہو اس کا علم دوسروں کو تو الفاظ ہی کے ذریعہ سے ہوگا

---

[1] بخاری ج ۲ ص ۱۰۰۸

فاجلدوا کل واحدٍ منهما مائة جلدة　　ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو،

نظر کی، اور اگر وہ شادی شدہ ہوتے تو پھر اسوۂ نبویؐ کے مطابق ان کو رجم کی سزا دیجاتی تھی،

وھذا سبیلھما الذی جعل الله لھما[۱]　　اور یہی وہ راستہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے مقرر فرمایا ہے۔

یہاں بھی انھوں نے اپنے استدلال کی بنیاد پر کسی منسوخ التلاوت آیت پر نہیں بلکہ اس اسوۂ نبویؐ پر رکھی ہے، جو وعدۂ الٰہی او یجعل اللہ لھن سبیلا کی عملی تفسیر ہے، جسکا ذکر اوپر بار بار آچکا ہے،

اب حضرت عمرؓ کی مذکورہ بالا تقریر کو حضرت ابن عباسؓ کے ان ارشادات کی روشنی میں دیکھا اور سمجھا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جائے گی کہ حضرت عمرؓ کی طرف اس ٹکڑے کی نسبت صحیح نہیں ہے، جس کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ منسوخ التلاوۃ آیت رجم ہے، اور انھوں نے "آیت رجم کے نزول" و "فریضۂ خداوندی" کا جو تذکرہ کیا ہے، اس سے ان کی مراد وہی ہے جو ابن عباسؓ نے بیان فرمائی ہے، اس لیے کہ ابن عباسؓ ہی حضرت عمرؓ کی اس تقریر کے بھی راوی ہیں، اگر ان کے نزدیک حضرت عمرؓ کی طرف اس بات کی نسبت صحیح ہوتی تو رجم کے ثبوت کے لیے وہ بھی وہی رائے دیتے، سورۂ مائدہ اور سورۂ نساء کی آیتوں سے اس کا ثبوت فراہم نہ کرتے،

یہ بات اسی لیے اہم نہیں ہے کہ ابن عباسؓ حضرت عمرؓ کی مذکورہ تقریر کے راوی ہیں، بلکہ اس لیے بھی اہم ہے کہ قرآنی علوم، قرآن سے اجتہاد و استنباط اور اس میں دقیقہ سنجی کے اعتبار سے وہ جماعت صحابہ میں سب سے زیادہ ممتاز ہیں، اسی امتیاز کی وجہ سے ان کا لقب "ترجمان القرآن" ہو گیا تھا، اور اسی بنا پر کمسنی کے باوجود حضرت عمرؓ قرآن کے رموز و دقائق کے بارے میں انکی رائے

---

[۱] سنن بیہقی ج ۸ ص ۲۱۱ صاحب جوہر النقی امام بیہقی کی غلطیوں پر بڑی سخت تنقید کرتے ہیں، مگر اس روایت کے بارے میں انھوں نے کوئی تنقید نہیں کی ہے۔

اور زیادہ وضاحت ہو جاتی ہے، جو یہ ہے:

قال ابن عباس الرجم فی کتاب اللہ تعالیٰ لا یغوص علیہ الا غواص وھو قولہ یا اھل الکتاب قد جاء کم رسولنا یبین لکم کثیرا مما کنتم تخفون من الکتاب (ج ۳ ص ۲۰۸)	ابن عباسؓ نے فرمایا کہ حکم رجم کتاب اللہ میں موجود ہے، مگر یہ قرآن کے بحر زخار میں پوشیدہ ہے، اسکو وہی نکال سکتے ہیں جن میں اس بحر بیکراں میں غوطہ زن ہونے کی صلاحیت ہو، اور وہ حکم یہ ہے کہ اے اہل کتاب ہمارا رسول تمہارے پاس آچکا ہے، وہ تمہارے سامنے بہت سے ایسے احکام کو بیان کرتا ہے جنکو تم اس سے پہلے چھپا رہے تھے،

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے اس ارشاد سے حسب ذیل باتیں ثابت و مستنبط ہوتی ہیں:

۱۔ سزائے رجم قرآنی حکم ہے، اس لیے اس کا انکار پورے قرآن کے انکار کے مرادف ہے۔

۲۔ مگر رجم کا ذکر قرآن میں صراحۃً نہیں بلکہ اشارۃً و اجمالاً ہے، اس لیے اس کو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا، بلکہ صرف اصحاب علم و بصیرت ہی معلوم کر سکتے ہیں،

۳۔ وہ آیت رجم کے نزول اور منسوخ التلاوت ہونے کے قائل نہیں تھے، بلکہ انھوں نے رجم کا ثبوت ایسی آیت سے دیا ہے جو اب بھی قرآن کا جزء ہے،

اس سلسلہ میں حضرت ابن عباسؓ کی ایک اور روایت ملاحظہ ہو، یہ روایت بیہقی نے حد زنا کے سلسلہ میں نقل کی ہے،

آپ نے سورہ نساء کی آیت واللتی یاتین الفاحشۃ کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا کہ ابتدائے اسلام میں جب عورت زنا کی مرتکب ہوتی تھی تو اس کو گھر میں حبس دوام کی سزا دیجاتی تھی، اسی طرح آیت کے اس ٹکڑے فاذوھما کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ اس وقت زانی مردوں کو لعنت ملامت کے ساتھ زد و کوب بھی کیا جاتا تھا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے غیر شادی شدہ بالغوں کی سزا خواہ وہ مرد ہو یا عورت

كان النبي صلى الله عليه وسلم منهم — نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان ہی انبیاء میں تھے جنھوں نے اس کے مطابق فیصلہ کیا،

امام زہری کا مقصود یہ ہے کہ تورات میں جو احکام نازل ہوئے تھے، ان میں ایک حکم رجم بھی تھا، اور اس کے نزول کے بعد سے تمام انبیاے بنی اسرائیل اپنے اپنے زمانہ میں اس حکم کو نافذ کرتے رہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہودیوں کو جو سزا دی تھی[1]، وہ آپ کا ذاتی اجتہاد نہیں بلکہ اس سابق حکم الٰہی کا نفاذ تھا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ حکم سابق اب بھی منسوخ نہیں ہوا ہے، اور شریعتِ سابقہ کا جو حکم منسوخ نہ ہو بلکہ قرآن اس کی تصدیق کرتا ہو، وہ بمنزلہ مستقل اور نئے حکم کے ہے،

امام زہری کی یہ رائے بھی اس سلسلہ میں اہمیت رکھتی ہے، اس لیے کہ حضرت عمرؓ کی مذکورہ تقریر کے تمام سلسلۂ اسناد انہی پر ختم ہوتے ہیں، تمام کتب حدیث میں عہد نبوی کا یہ واقعہ مذکور ہے کہ ایک کنوارے اجیر نے اپنے مستاجر کی بیوی سے زنا کا ارتکاب کیا، جب مستاجر کو اس کا علم ہوا تو وہ برافروختہ ہوا، اجیر کا باپ زندہ تھا، اس کو جب علم ہوا تو اس نے اپنے لڑکے کی طرف سے کچھ بکریاں وغیرہ مستاجر کو بطور تاوان ادا کیں، اور اس طرح معاملہ رفع دفع ہو گیا، مگر اجیر کے باپ کو اب بھی تسکین نہیں ہوئی اور اس نے اہل علم سے دریافت کیا کہ اس جرم کی شرعی سزا کیا ہے؟ اسے بتایا گیا کہ زانی کو سو کوڑے اور ایک سال جلاوطنی کی اور زانیہ کو رجم کی سزا دینی چاہیے، فریقین کو جب اس کا علم ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ

فاقض بيننا بكتاب الله — آپ ہمارے معاملہ میں کتاب اللہ سے فیصلہ کر دیجیے،

آپ نے سارا قصہ سننے کے بعد فرمایا کہ

والذي نفسي بيده لأقضين — اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں تم

---

[1] اس کی تفصیل مذکورہ آیت کی تفسیر اور کتب حدیث میں ملے گی۔

کو سب پر ترجیح دیتے تھے، ان وجوہ کے پیش نظر ان کی یہ رائے بڑا وزن اور حضرت عمرؓ کے منشا کو سمجھنے میں قول فیصل کی حیثیت رکھتی ہے،

اس سلسلہ میں چند محدثین ومفسرین کی رائیں نقل کی جاتی ہیں، جن سے عاجز کے نقطۂ نظر کی مزید وضاحت ہو جائے گی،

علامہ قسطلانی بخاری کی شرح میں حضرت عمرؓ کے اس قول الرجم فی کتاب اللہ حق کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فی قولہ تعالیٰ او یجعل اللہ لھن	یعنی حضرت عمرؓ کے ارشاد کہ رجم کتاب اللہ میں ہے
سبیلا بین النبی صلی اللہ علیہ وسلم	مقصود سورۂ نساء کی آیت او یجعل اللہ لھن سبیلا ہے
ان المراد بہ رجم الثیب	جس کے اجمال کی تفصیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کی کہ
وجلد البکر[1]	ثیب کو رجم کیا جائے اور بکر کو کوڑے مارے جائیں۔

علامہ قسطلانی نے غالباً یہ اپنی ذاتی رائے نہیں دی ہے، بلکہ خود امام بخاریؒ نے سورۂ نساء کی مذکورہ آیت کی تفسیر کرتے ہوئے یہی لکھا ہے یعنی الرجم للثیب والجلد للبکر۔

حضرت ابن عباسؓ نے سورہ مائدہ کی جس آیت سے رجم کا ثبوت دیا ہے، اسکو نقل کرنے کے بعد حافظ ابن قیم لکھتے ہیں،

واستنبط غیرہ من قولہ انا انزلنا	ابن عباسؓ کے علاوہ دوسرے لوگوں نے سورہ مائدہ کی
التوراۃ فیھا ھدی ونور یحکم	اس آیت سے رجم کا ثبوت مستنبط کیا ہے کہ ہم نے توراۃ نازل کیا
بھا النبیون الذین اسلموا للذین	جس میں ہدایت اور روشنی ہے جس کے ذریعہ انبیائے کرام
ھادوا.......... قال الزھری	یہودیوں کے درمیان فیصلہ کرتے تھے، امام زہری نے فرمایا کہ

[1] ج ۱۰ ص ۲۴

قرآن میں مل جائیں گی،

پھر حدیث نبوی میں متعدد ایسی مثالیں ملیں گی جن میں آپؐ نے کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کرنے کے لیے کہا گیا ہے، اور ان میں سے کہیں بھی فرض و واجب کے معنی نہیں لیے گئے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ جب بھی دو آدمیوں کے درمیان گفتگو کے موقع پر کتاب اللہ کا لفظ استعمال کیا جائے گا تو وہاں اس سے کلام الٰہی مراد ہوگا، تفصیل کا موقع نہیں ہے ورنہ قرآن و حدیث سے اس کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں، اس لیے ارشاد نبویؐ کا صحیح اور صاف مطلب اور اس کا صحیح مصداق قرآن کی وہ آیتیں ہیں جن میں اجمالاً و اشارۃً رجم کا ذکر ہے جس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے، امام خطابی اس ٹکڑے کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں،

ان ذکر الرجم وان لم یکن منصوصا علیہ باسمہ الخاص فانہ مذکور فی الکتاب علی سبیل الاجمال والابھام ولفظ التلاوۃ منطویۃ علیہ وھو قولہ واللذان یاتیانھا منکم فآذوھما والاذی یتسع فی معناہ الرجم وغیرہ وفیہ وجہ آخر وھو ان الاصل فی ذالک قولہ او یجعل اللہ لھن سبیلا[1]	قرآن میں رجم کا ذکر اگرچہ صراحۃً اس لفظ کے ساتھ نہیں ہے مگر مجمل اور مبہم طور سے اس کا ذکر ہے، اور قرآن کے الفاظ بھی اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں، اور وہ ہے خدا کا ارشاد واللذان یاتیانھا منکم فآذوھما لفظ "اذی" کی وسعت میں رجم اور زنا کی دوسری سزائیں آجاتی ہیں، اسکے علاوہ ایک گروہ کی رائے ہے کہ رجم میں بنیادی حکم خدائے تعالیٰ کا ارشاد او یجعل اللہ لھن سبیلا ہے،

[1] معالم السنن ج ۳ ص ۳۲۴

بینکما بکتاب اللہ عزوجل — دونوں کے معاملہ میں اللہ عزوجل کی کتاب کے مطابق فیصلہ کروں گا۔

چنانچہ آپ نے دونوں کو رجم و جلد کی سزا دلوائی اور تاوان میں جو چیزیں دی گئی تھیں واپس کرا دیں۔

اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے "لاقضین بینکما بکتاب اللہ میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا" سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں رجم کا حکم موجود ہے، ورنہ آپ کتاب اللہ کا لفظ استعمال نہ فرماتے بلکہ کوئی دوسرا لفظ استعمال فرماتے،

لیکن قرآن میں رجم کا حکم صراحۃً مذکور نہیں ہے، اس لیے آپ کے ارشاد "بکتاب اللہ" کی تفسیر میں ائمہ حدیث نے مختلف باتیں کہی ہیں،

بعض لوگوں نے کتاب اللہ کا مصداق اسی منسوخ التلاوۃ آیت کو قرار دیا اور بعض اہل علم نے اس کے معنی فرض و واجب کے لیے ہیں یعنی آپ کے ارشاد کا مطلب یہ ہوا کہ خدا نے جو حکم یا فرض قرار دیا ہے اسکے مطابق فیصلہ کروں گا، ان حضرات نے قرآن کی بعض آیات سے استدلال بھی کیا ہے، مگر حدیث کے الفاظ ان دونوں معنوں سے ابا کرتے ہیں،

منسوخ التلاوۃ آیت کو اس کا مصداق بنانا تو بہرحال صحیح نہیں ہے، کیونکہ اوپر کی تفصیلات سے اس کے کلام الٰہی ہونے کی پوری تردید ہو چکی ہے،

اب رہا اس کو فرض کے معنی میں لینے والی رائے تو اس سلسلہ میں یہ تو صحیح ہے کہ قرآن میں کتاب، کُتِبَ، کَتَبَ وغیرہ کا استعمال فرض و واجب کے معنی میں ہوا ہے، مگر ایسا اس موقع پر ہے جہاں خدائے تعالیٰ کوئی بات حکم کے انداز میں کہنا چاہتا ہے، اور اس کے ساتھ علیکم کا صلہ بھی استعمال کیا گیا ہے، قرآن میں اس کی متعدد مثالیں بھی کتب علیکم الصیام، کتب علیکم القتال کتاب اللہ علیکم وغیرہ موجود ہیں، مگر جہاں قرآن نے مطلق کتاب یا کتاب اللہ کا لفظ استعمال کیا ہے وہاں اس کے معنی کلام الٰہی، پیغام الٰہی یا مطلق پیغام کے ہیں، اس کی سیکڑوں مثالیں

الله جل ثناءه للثيبين المحصنين الرجم بالحجارة وللبكرين جلد مائة ونفي سنة لصحة الخبر من رسول الله صلى الله عليه وسلم

کو رجم کی اور غیر شادی شدہ زانیوں کو جلد اور نفی کی سزا دی ہے۔

صاحب روح المعانی اور صاحب تفسیر خازن نے بھی اس آیت کی تشریح میں مذکورہ ٹکڑے کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے، بلکہ ان دونوں نے امام خطابی کی وہ رائے نقل کر دی ہے جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی رائے بھی یہی ہے،

ان تمام تفصیلات کا خلاصہ یہ ہوا کہ

۱- مذکورہ بالا ٹکڑے کو منسوخ آیت رجم یا کلام الٰہی نہ کہنا صحیح نہیں ہے،

۲- قرآن میں متعدد ایسی آیتیں ہیں جن سے اشارۃً و اجمالاً سزائے رجم کا حکم معلوم ہوتا ہے جنکی تفصیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام نے کر دی ہے، ان میں دو آیتیں سورہ نساء میں ہیں اور دو آیتیں سورہ مائدہ میں،

۳- حضرت عمرؓ نے جس تقریر میں آیت رجم کا ذکر کیا ہے، اس سے ان کی مراد یہی مذکورہ بالا آیتیں ہیں جو قرآن مجید میں موجود ہیں،

آخر میں لغوی حیثیت سے بھی اس ٹکڑے پر ایک نظر ڈال لینا مناسب معلوم ہوتا ہے،

ٹکڑے میں الشیخ کا لفظ بوڑھے مرد کے معنی میں اور الشیخۃ کا لفظ بوڑھی عورت کے معنی میں استعمال ہوا ہے، گرچہ شیخ کا استعمال بوڑھے کے معنی میں قدیم عربی ادب میں بہت کم ہوا ہے، مگر چونکہ قرآن میں یہ لفظ تین جگہ واحد اور ایک موقع پر جمع[1] استعمال ہوا ہے، اس لیے اس کی فصاحت میں کسی شبہے کی گنجائش باقی

---

[1] قصص رکوع ۳ ہود رکوع ۷ اور یوسف رکوع ۸ [2] مومن رکوع ۷

حافظ ابن حجر اس ارشاد نبوی کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کے دو معنی و مصداق بتائے گئے ہیں

والمراد بکتاب اللہ ما حکم بہ	ایک یہ کہ کتاب اللہ سے مراد وہ ہے جو خدا نے اپنے
وکتب علی عبادہ وقیل المراد	بندوں پر فرض کر دیا ہے اور جو حکم دیا ہے، دوسرے
القرآن وھو المتبادر	یہ کہ اس سے مراد قرآن ہے اور یہی مفہوم زیادہ واضح ہے،

مشہور محدث حافظ ابن دقیق العید نے پہلے معنی کو ترجیح دی ہے، اس پر حافظ ابن حجر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں

فیما قال نظر لاحتمال ان یکون المراد ما تضمنہ	انھوں نے جو کچھ کہا وہ محل نظر ہے، اسلیے یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے
قولہ تعالیٰ او یجعل اللہ لھن سبیلا	مراد خدا کا یہ قول او یجعل اللہ لھن سبیلا ہے

خلاصہ یہ ہے کہ آپ کے ارشاد میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کرنے کا جو ذکر آیا ہے اس سے مراد قرآن کی وہ آیات ہیں جن میں اجمالاً سزائے رجم کا ذکر آیا ہے،

مفسرین میں امام طبری کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے، انھوں نے سورۂ نساء کی آیت او یجعل اللہ لھن سبیلا اور زنا سے متعلق دوسری آیات کی تفسیر میں تمام اہم صحابہ و تابعین کے اقوال نقل کیے ہیں، مگر ان میں سے کسی ایک صحابی یا تابعی کی رائے سے اس بات کی تائید نہیں ہوتی کہ رجم کے سلسلہ میں قرآن میں کوئی ایسی آیت بھی نازل ہوئی تھی جس کے الفاظ بعد میں منسوخ قرار دے دیے گئے ہوں، صحابہ و تابعین کے اقوال نقل کرنے کے بعد امام طبری حسب دستور محاکمہ کرتے ہیں اور اپنی رائے ان الفاظ میں دیتے ہیں :

واولی الاقوال بالصحۃ فی تاویل	ان اقوال میں سب سے زیادہ بہتر اور صحیح قول
قولہ او یجعل اللہ لھن سبیلا	وہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ خدا نے آنحضرت
قول من قال السبیل التی جعلھا	صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ شادی شدہ زانیہ

مینا بازار

از جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب لکھنؤ یونیورسٹی

مینا بازار ایک کتاب ہے، جس میں ایک زنانہ بازار کی حسب ذیل نو دکانوں کا حال اس ترتیب سے بیان ہوا ہے:

وصف دکان جوہری، وصف دکان بزاز، وصف دکان گلفروش، وصف دکان حلوائی، وصف دکان عطار، وصف دکان میوہ فروش، وصف دکان تنباکو فروش، وصف دکان تنبولی، وصف دکان سبزی فروش،

مصنف نے اس کا کوئی نام تجویز نہیں کیا تھا، بعد کے لوگوں نے کتاب کے نام کو مینا بازار کے نام سے مشہور کر دیا، اگرچہ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اسے زنانہ بازار کے نام سے موسوم کرتے تھے، چوں کہ اس کا موضوع زنانہ بازار ہے اور یہ فقرہ خود کتاب مذکور میں موجود ہے، اس لحاظ سے لوگوں نے اس کا یہی نام قرار دیدیا، مگر مینا بازار کے نام سے موسوم کرنے کی وجہ حاشیہ نویس[1] نے یہ بتائی ہے کہ اس کی پہلی دکان جوہری کی تھی جس میں طرح طرح کے قیمتی پتھر فروخت ہوتے تھے، اور "مینا" رنگ برنگ کے شیشے یاقوت و زمرد وغیرہ جواہرات کے ٹکڑے کو کہتے ہیں، اس لیے اس کا نام مینا بازار (بہ اضافت مقلوب) پڑ گیا،

مغل بادشاہوں کو جدت و اختراع سے بڑا شوق تھا، چنانچہ انھوں نے طرح طرح کے جشن

---

[1] مینا بازار (مصطفائی) ص ۲ حاشیہ نمبر۱

نہیں رہ جاتی، مگر "الشیخۃ" کا استعمال بوڑھی (عجوز) کے معنی میں ادب و لغت کے ذخیرہ میں بھی عاجز کی نظر سے نہیں گذرا، اور نہ قرآن ہی نے اس کو استعمال کیا ہے۔ سورہ ہود میں ایک موقع پر بوڑھے اور بوڑھی کا لفظ ساتھ ساتھ استعمال ہوا ہے، مگر وہاں بھی قرآن نے بوڑھے کے لیے تو شیخ کا لفظ اختیار کیا ہے مگر بوڑھی کے لیے الشیخہ نہیں بلکہ عجوز کا لفظ استعمال کیا ہے، حالانکہ یہ موقع ایسا تھا کہ الشیخۃ کا لفظ مقابلۃً مستعمل ہوسکتا تھا، مگر ظاہر ہے کہ کلام الٰہی میں کوئی غیر فصیح لفظ نہیں آسکتا تھا، وہ آیت یہ ہے

قالت یا ویلتیٰ ءالد وانا عجوز — اس نے تعجب سے کہا کہ کیا میں لڑکا جنوں گی حالانکہ

وھذا بعلی شیخا — میں بوڑھی ہوں اور یہ میرا شوہر بوڑھا ہے۔

شاید ان ہی اعتراضات سے بچنے کے لیے اس ٹکڑے کے راویوں میں بعض نے اس کی تفسیر الثیب و الثیبۃ اور بعض نے المحصن والمحصنۃ سے کی ہے، مگر یہ تفسیر بھی صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ لغت کے اصلی معنی سے گریز اور عدول اس وقت کیا جاسکتا ہے جب اس کے لیے کوئی لغوی قرینہ موجود ہو، یہاں سرے سے اصل اور ترجمہ و تفسیر میں کوئی قرینۂ عدول موجود نہیں ہے، یہی نہیں بلکہ اس ٹکڑے کے ایک لفظ کا قدیم کلام عرب میں وجود ہی نہیں ہے۔

ان وجوہ کی بنا پر عاجز نے یہ رائے قائم کی ہے کہ اس ٹکڑے کو کلام الٰہی کہنا خواہ وہ منسوخ ہی کیوں نہ ہو قرآن کے آئینۂ فصاحت و بلاغت کو داغدار کرنا ہے، واللہ اعلم بالصواب، ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

کا بیان ہے کہ چونکہ بادشاہ آفتاب پرستی کی طرف مائل تھا، لہذا اس نے نوروز جلالی کو ایک مقدس تہوار قرار دیا۔ اور اس سلسلے میں بڑے پیمانے پر جشن ہونے لگے، آئین اکبری[1] میں لکھتا ہے کہ

شہریار قدر داں نخست گزیدہ روز شہائے پیشینیاں پژوہید و در روائی آن کوشش فرمود و بخداوند آں نگریستہ شایستہ را بگراں ارزش برگیرد، دوم در پرورش گوناگوں مردم توجہ برگمارد، و بخشش را بہانہ برجوید، بنابریں چوں سور ہائے جمشیدی و عید ہائے موبدی بسمع ہمایوں رسید پذیرش یافت و اسباب رامش آمادہ شد، نخستین جشن نوروزی۔ چوں خورشید تابان بحمل پرتو خاص بخشد تا نوزدہ روز ہنگامہ عشرت فراہم آید۔ در آں میاں دو روز بزرگ عید شود و فراواں خواستہ دیگرگوں کالا دادہ آید۔ غرۂ فروردین ماہ نوزدہم ہنگام شرف، و روزے کہ بماہ ہمنام بودہ باشد نیا بارگاہ بساط فراخ زدے و سور آراستے و کشور خدا نیز بداں پرداخت۔ نوزدہم فروردین، سوم اردی بہشت، ششم خورداد، سیزدہم تیر، ہفتم امرداد، چہارم شہریور، شانزدہم مہر، دہم آبان، نہم آذر، ہشتم و پانزدہم و بست و سوم دے، دوم بہمن، پنجم اسفندارمذ۔

یعنی سال میں ۱۴ بار جشن ہوتا تھا، مگر ہر مہینے میں صرف ایک بار ہوتا تھا، البتہ دے میں تین روز بڑے پیمانے پر جشن منایا جاتا، یہی فروردین کو جو بڑا تہوار ہوتا وہ اس میں شامل نہ تھا۔

یوں اکبر نے تخت سلطنت پر بیٹھنے کے بعد ہی نوروز منانا شروع کر دیا تھا، لیکن سب سے پہلے ۹۹۱ھ میں بڑی شان و شکوہ کے ساتھ یہ تہوار منایا گیا، طبقات اکبری[2] میں ہے:

اس سال کی ابتدا سہ شنبہ، ۲ صفر ۹۹۱ھ[3] سے ہوئی۔ اس سال کے نوروز میں محلوں کے دیوار و ستون

---

[1] آئین اکبری ج ۱ ص ۲۰۰ و ترجمہ انگریزی آئین ص ۲۷۶ [2] طبقات اکبری ج ۲ ص ۴۴۳-۴۴۵ [3] بدایونی نے ۲ صفر لکھا ہے (منتخب التواریخ ج ۲ ص ۱۲۶) ۹۹۰ھ (منتخب ص ۳۲۰ مطبع کلکتہ ج ۲ ص ۱۳۰ مگر مآثر رحیمی (ج ۲ ص ۳۴۷) میں یہی تاریخ ہے کہ مآثر رحیمی اور منتخب التواریخ دونوں میں

تینوں تاریخوں میں جلوس کا ۲۸ واں سال ہے، طبقات اکبری میں اکبر کے جلوس تخت نشینی کا ۲ ربیع الآخر ۹۶۳ھ ہے (باقی ص ۴۲۳)

کے طریقے نکالے، ہمایوں نے ایک بڑے جشن کی بنیاد ڈالی، دریاے جمنا کے کنارے کشتیوں پر ایک دو منزلہ عمارت تیار کی اور اس میں جشن خانہ قائم ہوا، اس میں ایک حصہ زنانہ بازار کے لیے وقف ہوا، چھ دکانیں اوپری منزل میں لگائی گئی تھیں، ایک باغ بھی تیار ہوا جس میں طرح طرح کے خوشنما پھول لگائے گئے تھے، دکانوں پر بڑی بڑی بیگمیں متعین ہوئیں، بادشاہ ان سے سودا[1] خریدتا پھرتا تھا، گلبدن بیگم نے ہمایوں نامہ میں[2] ۹۴۰ھ کے واقعات کے ذیل بیان کیا ہے،

و شرح توی خانہ کہ در لب دریا راست کردہ بودند و نام آن را طلسم نہادہ بودند۔۔۔

۔۔۔۔۔ در لب حوض تالارے بود و در تالار دریچہ ہا ابرک[3] گرفتہ بودند کہ جوانان درون تالار نشستند و بازی گراں بازی می کردند۔ بازار زنانہ نیز کردہ بودند و کشتی[4] ہا را آئین بستہ بودند۔ در یک کشتی مثل شش کسی و شش کنج بستہ بودند و در کشتی بالاخانہ ساختہ بودند در پایاں باغچے ساختہ بودند از قسم قلغہ[5] و تاج خروس و نافرمان و لالہ کاشتہ بودند و در یک جا ہشت کشتی کردہ بودند کہ ہشت پرچہ[6] می شد۔ غرض کہ خدائے تعالیٰ از یں قسم اختراعات در دل مبارک ایشان عطا کردہ بود۔ ہر کہ می دید متحیر و منحصر می ماند" (ص ۳۵)

اکبر نے متعدد آئین ایجاد کیے۔ ان میں جشن نوروز اور خوش روز کی اہمیت مینا بازار کے سلسلے میں بہت زیادہ ہے، نوروز ایرانیوں کے سال کا پہلا دن یعنی ماہ فروردین کی پہلی تاریخ ہے جب آفتاب برج حمل کے پہلے نقطہ میں پہنچتا ہے۔ اس تاریخ کو نہ صرف ایرانیوں میں بڑی خصوصیت حاصل تھی بلکہ دنیا کے بیشتر حصوں میں اس روز بڑا جشن ہوتا تھا۔ اکبر نے نوروز کو باقاعدہ تہوار قرار دیا، ابوالفضل

---

[1] ملاحظہ کنور محمد اشرف: زندگی و حالات مردمان ہندوستان بنگال رائل ایشیاٹک سائٹی جرنل ۱۹۳۵ء ج ۱ ص ۲۹۳-۲۹۴

[2] طبع لندن ۱۹۰۲ء ص ۳۵ [3] اس کا ترجمہ یہ دیا ہے filled with Talc windows (ص ۱۲۶)

[4] اصل نسخہ کشتی [5] یہ چار قسم کے پھول تھے [6] غالباً گلگشت ان کے معنی میں (ترجمہ ص ۱۲۶)

اسی جشن و ہنگامہ کے درمیان بازار بھی لگتے، جن میں ایک زنانہ بازار اور ایک مردانہ بازار کو خاص اہمیت حاصل ہوگئی اور اکبر نے اس کا نام آئین خوش روز رکھا، ابوالفضل کے الفاظ میں اس آئین کا حال سنیئے :

گیتی خداوند بہ پژوہش[۱] آگہی و شناسا آمدن شگرف[۲] کاری روزگار سومین روز جشن ہر ماہ والا انجمنے آراید، سوداگر زنان بر فراز گرم بازاری نشینند و کالائے[۳] ہر کشور بدکان پیدائی درآید، پرستاران مشکوئے[۴] اقبال فراہم آیند و پردگیان[۵] گوناگون مردم راہ یابند، خرید و فروخت را ہنگامہ شود، گروہا گروہ کامیاب خواہش گردند، شہریار درین نیز برگزیدن کالا و برنہادن نرخ تازہ برنقابے برسازد و بدین روش شناسائی اندوزد، نہفتگی ملک و چگونگی مردم زاد بدونیک ہر کارخانہ دریابد، و این روز را بدین نام خوانند و نوید خوش دلی بخشد، سپس بازار مردان انتظام یابد، بازرگان ہر بوم را کام دل برآید، خدیو عالم داد و ستد را عیار برگیرد، و بارِ یا دکان عشرت خریداری نمایند و ہر گروہے بے دورباش چاؤشان در دل برخوانند و متاع آرائی را دست مایۂ گزارش حال گردانند، نیکان را روز مراد بردمد و بدان را بادافراہ[۶] سامان یابد و از فراغ دیدہ وری بدین کار گنجور[۷] و مشرف[۸] بے اگاہ نباشد، ہمان زمان بے رنج انتظار زر یابند و فراوان سود بردارند"

اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ

(۱) ۲۱ر فروردین، ۵ر اردی بہشت، ۸ر خورداد، ۵ر تیر، ۹ر امرداد، ۶ر شہریور، ۸ر مہر، ۲ر آبان، ۱۱ر آذر، ۱۰ر، ۷ر، ۲۵ر دے، ۴ر بہمن، ۷ر اسفندارمذ کو یعنی سال میں ۱۳ روز یہ بازار لگتے تھے،

۱؎ نمائش ۲؎ عجائب ۳؎ رخت، سامان ۴؎ بت خانہ، مجازاً بادشاہوں کی حرم سرا ۵؎ عورتیں ۶؎ گناہ کی سزا، برائی کا بدلہ ۷؎ خزانہ دار ۸؎ لکھنے والے کا افسر

اور دولتخانہ (دیوان) عام وخاص کو مصور پردوں سے اس طرح آراستہ کیا گیا کہ دیکھنے والے متحیر ہو گئے۔ دولتخانہ کے صحن کو زردوزی وزربفت کے شامیانے سے آراستہ کرکے سونے اور جواہرات سے مرصع تخت درمیان میں بچھایا گیا۔ اس طرح رشک فردوس آرائش ہوئی، اٹھارہ روز[1] تک یہ محل اسی طرح آراستہ ہوتے رہے، رات کو جھاڑ و فانوس اپنا سماں دکھاتے، شہنشاہ ہر روز ایک بار یا دو بار تشریف لاتے مجلس آراستہ ہوتی، ایرانی اور ہندوستانی گویئے موسیقی سے تواضع کرتے۔ ہر ایک امیر و خادم عنایت خسروانہ سے بلند ہوتا شہر فتح پور اور آگرہ کے بازار کی آئین بندی ہوتی، اطراف وجوانب سے بے شمار خلائق اس جشن عالی میں شرکت کی غرض سے آتی جس کی نظیر نہ دیکھی تھی نہ سنی تھی، ہفتہ میں ایک روز عام تھا بقیہ چھ روز خواص و امرا کے لیے وقف تھے حضرت نوروز کے دن تخت سلطنت پر جلوس فرماتے، امرا و ارباب دولت مرتبہ بہ مرتبہ کھڑے رہتے، ایام نوروز کا آخری دن "شرف"[2] تھا، اس روز مجلس عالی تربیت پاتی، اور جمیع امرا خطاب نوازش سے سرفراز ہوتے۔" (ملخصاً)

(بقیہ حاشیہ ص ۲۶۱) اس حساب سے ۲۸ واں سال ۹۹۱ھ میں ہوگا، مگر پھر ۲۹ واں سال ۹۹۱ھ دیا ہے (ج ۳۶۶) اس کو ۹۹۲ھ ہونا چاہیے اور اس کے بعد کے سنہ صحیح ہیں، منتخب التواریخ میں ہر سال کی تاریخ جلوس طبقات سے ایک سال پیچھے ہے، طبقات میں ۲۸ ویں جلوس کی جو تاریخ ہے وہی منتخب میں ۲۹ ویں جلوس کی ہے، مآثر میں ۹۹۰ھ درج ہے، مگر مہینہ کی تاریخ طبقات کی طرح، ۳ صفر ہے لیکن یہ ممکن نہیں ہے۔ ۲۷ صفر کے ۹۹۱ھ اور ۱۵ صفر کے ساتھ ۹۹۰ھ چاہیے

[1] مآثر (ج ۲ ص ۳۸۸) اور منتخب التواریخ (ج ۲ ص ۳۰۱) میں بھی ۱۸ دن دیے ہیں، مگر یہ غلط ہے۔ ۱۹ ہونا چاہیے، ابوالفضل نے یہی دیا ہے، مزید توزک وغیرہ میں بھی جشن کی تاریخ ۱-۹ فروردین لکھی ہے [2] ظہوری لکھتا ہے: "آفتاب جہانتاب، محاذات دولت خانہ پادشاہی را بیت الشرف خویش می داند" اس میں بیت الشرف شمس سے مراد برج حمل ہے (سہ نثر ص ۴۹)

کرتا تھا، اور انیس روز تک امرا میں سے ایک نہ ایک کی بڑے دھوم دھام سے بادشاہ کی دعوت کرتا اور تحفے نذرانے پیش کرتا۔ بادشاہ بھی ضیافتیں کرتا، انعام واکرام تقسیم کرتا اور منصبوں میں ترقی دیتا، شاہی محل اور بازار سجائے جاتے تھے، ان دنوں زنانہ بازار بھی لگتا تھا، اگر بادشاہ دورے پر ہوتا تب بھی جشن کے موقع پر یہ بازار آراستہ ہوتا، ایک یورپی سیاح تھیوے ناٹ [1] نے اجمیر کے جشن نوروزی کے موقع پر جو زنانہ بازار ہوا تھا، اس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے، [2]

نوروز کا تہوار حرم میں شروع ہوا، اور وہاں ایک بازار بھی قائم ہوا، بڑے بڑے امرا بیویاں اور لڑکیاں اس میں شامل ہوئیں، ہر درجے کی خواتین دکاندار مقرر ہوئیں، جنھوں نے عجیب غریب چیزوں سے جو اپنے ہمراہ لائی تھیں، اپنی دکان سجائی، ان کے علاوہ امراء اور راجاؤں کی عورتوں نے بھی اپنی الگ دکانیں نہایت قیمتی سامان سے آراستہ کیں، اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا کہ جو چیزیں بادشاہ اور اس کی بیگمات کو پسند ہوئیں وہی دکانوں میں رکھی جائیں، عموماً دکانداروں کو دگنی قیمت ملتی، اور جو زیادہ عقلمند، بذلہ سنج اور خوبصورت ہوتی اس کو سب سے زیادہ نفع حاصل ہوتا تھا، بازار ختم ہونے کے بعد محل کے اندر انکی ضیافت ہوتی جہاں کنچنی رقص و سرود کی محفلیں گرم کرتیں، اس طرح یہ میلہ پانچ دن رہتا،

عہد جہانگیر کے ایک دوسرے سیاح ٹامس کوریٹ [3] نے زنانہ بازار کا بیان اس طرح کیا ہے:

بادشاہ کی بیگمات کی دلچسپی کے لیے سال میں ایک دن تمام سوداگروں کی بیویاں محل میں جاتیں، جن کے پاس کچھ چیزیں فروخت کے لیے ہوتیں، اس طرح ایک قسم کا میلہ یا بازار لگتا،

---

[1] یہ سیاح عہد عالمگیر کے نویں سال یعنی ۱۶۶۵ء میں ہندوستان آیا تھا، تقریباً بیس سال تک یہاں قیام کیا [2] سیاحت تھیوے ناٹ (انگریزی) ج ۳ ص ۰۲-۳، (ملخصاً) مگر یہ چشم دید شہادت نہیں ہے [3] یہ سیاح ۱۶۱۲ء سے ۱۶۱۷ء تک ہندوستان میں رہا، ملاحظہ ہو "آرلی ٹریولز ان انڈیا" مرتبہ ولیم فاسٹر ص ۲۷۸

(۲) زنانہ بازار محض تفریح کے لیے نہ تھا، بلکہ اس سے دور رس نتیجے وابستہ تھے،

(۳) زنانہ بازار کے بعد مردوں کا بازار لگتا جس میں ہر ملک کے تاجر آتے اور بادشاہ سے آزادی سے ملتے

(۴) اس بازار کے خزانچی اور مشرف الگ مقرر تھے،

بدایونی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جشن نوروزی کے موقع پر زنانہ بازار آراستہ ہوتا تھا اور اس کی ابتدا انیسویں سال جلوس سے ہوئی[1]، اور بدایونی اس کو دین کے ناموس پر ضرب کاری سمجھتے تھے، اس بیان سے کچھ ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ سال میں صرف اسی جشن کے موقع پر کبھی کبھی زنانہ بازار ہوتا تھا، مگر جیسا ہم اوپر لکھ چکے، ابوالفضل کے بیان سے صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ سال میں ۱۴ مرتبہ جشن ہوتا تھا اور ہر جشن کے تیسرے دن کا بازار آئین خوش روز میں شامل تھا، بدایونی نے اس بازار کا بیان ان الفاظ میں کیا ہے[2]،

> از برائے شکستن دکان ناموس دین حکم فرمودند کہ دکانہائے نوروزی را گاہ گاہے برائے تماشائے بیگمان و اہل حرم و عفائف مخدرات خاص و عام خالی سازند و آنجا زرمی بخشیدند و مہم سازی بیرونیان و نسبت مناکحت و مواصلت ابنا و بنات دران مجلس قرار یافت،

جہانگیر کے عہد میں نوروز بالکل اکبر کے زمانے کی طرح منایا جاتا تھا، جشن کا زمانہ یکم فروردین سے ۱۹ فروردین تک ہوتا تھا[3]، پہلے دن بادشاہ زمردیں لباس پہن کر تحویل آفتاب کے وقت دربار عام

[1] منتخب التواریخ کے اعتبار سے اس کی ابتدا ۱۰ ربیع الاول ۹۸۲ھ ہوئی (ج ۲ ص ۳۲۹) گر طبقات میں یہی تاریخ ۲۹ویں جلوس کی ہے، تیسویں کی ۱۹ ربیع الاول ۹۹۳ھ ہے (ص ۳۶۷-۳۹۱) بالترتیب

[2] ج ۲ ص ۳۳۹ [3] ملاحظہ ہو نگار بابت اگست ۱۹۴۸ء ص ۱۴

بہرحال اس بیان سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ سال میں ایک بار صرف نوروز کے موقع پر یہ بازار لگتا تھا، اور آٹھ روز تک بڑی چہل پہل رہتی، برنیر نے مزید[1] لکھا ہے کہ اورنگ زیب کے زمانے میں ناچنے والی عورتیں محل میں جانے نہ پاتی تھیں، اور دور سے بادشاہ کو سلام کرکے واپس چلی جاتی تھیں، آپ نے ملاحظہ کیا کہ اورنگ زیب جیسا شخص بھی اس کے قلم سے نہ بچ سکا۔

شمالی ہندوستان کے بازاروں کے علاوہ دکن کے بازاروں میں عورتوں کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے لیکن ان دکھنی بازاروں میں مرد بھی آزادی کے ساتھ شامل ہوتے تھے، سودا فروشی کا کام عورتوں کے سپرد تھا، ظہوری نے برہان نظام شاہ کے نئے شہر کے بازار کا جو نقشہ کھینچا ہے[2]، اس سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ اس بازار میں عورتوں کی وجہ سے بڑی رونق تھی لیکن احمدنگر کے بازار میں عورتوں کے بازار کا ثبوت نہیں ملتا،

برہان نظام کے اس بازار کا بیان ظہوری نے ساقی نامہ میں کیا ہے، جو ۱۰۰۲ھ کے قبل نظم ہو چکا، اس کے تقریباً ۷ سال بعد ابراہیم عادل شاہ نے نورسپور شہر آباد کیا، ظہوری نے اس نئے شہر کے بازار کا ذکر دیباچہ خوانِ خلیل میں کیا ہے، جو ۱۰۱۴ھ کے قریب مکمل ہوا، اس کے ضمن میں مولف نے ساقی نامے کے ان شعروں میں سے چند شعر درج کیے ہیں، جو برہان نظام کے نو آباد بازار کی تعریف میں لکھے گئے تھے، ان شعروں سے بھی بازار میں عورتوں کے وجود کا پتہ چلتا ہے، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مردوں کی بھی دکانیں ہوتی تھیں، لیکن شمالی ہندوستان کے زنانہ بازار کی طرح صرف عورتوں کا بازار نہیں تھا،

شمالی ہندوستان میں اس بازار کا رواج مغلیہ حکومت کے خاتمے کے بعد بھی باقی رہا، چنانچہ

---

[1] ٹراویلز ان دی مغل امپائر، ص ۲۷۵ [2] ساقی نامہ (کشوری طبع ۱۹۰۸ء) ص ۱۲۱-۱۲۸

[3] سہ نثر ظہوری (مطبوعہ ۱۲۶۲ھ) ص ۹۷، ۱۱ شعر درج ہیں،

بادشاہ اپنی بیگمات کی طرف سے دلال ہوتا، اور وہاں سوائے اس کے جو بادشاہ کا خاصہ تیار کرتا کوئی دوسرا (مرد) نہ ہوتا"

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جہانگیر کا بھی مقصد صرف تفریح نہ تھا، البتہ یہ ضرور ہے کہ اکبر کے عہد کا ماہانہ بازار سالانہ ہو گیا، جو پانچ روز تک رہتا یا صرف ایک روز۔

شاہ جہاں کے عہد میں بھی یہ بازار اسی شان و شوکت کے ساتھ آراستہ ہوتا رہا، مگر یورپی سیاحوں نے اس بادشاہ کو بدنام کرنے کے لیے طرح طرح کی افترا پردازیاں کی ہیں، ان میں "برنیر"[1] اور منوچی[2] نے خصوصیت سے حصہ لیا ہے، ان کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ زنانہ بازار آٹھ روز تک سجائے جاتے تھے، ان میں امرا اور منصب داروں کی عورتیں دکانیں لگاتیں، بادشاہ اور شاہی محل کی بیگمات سامان کی خریداری میں بے شمار روپیہ صرف کرتیں، ان سامانوں میں نفیس قسم کا دیبا، زردوزی کی عمدہ چیزیں، صافے جن پر بہترین طلائی کام ہوتا، نفیس پرنیاں جو بڑے درجے کی عورتیں استعمال کرتی تھیں، قابل ذکر ہیں، اس موقع پر کنچنیاں بھی محل میں داخل ہوتیں، اور آٹھ دن ناچنے گانے اور دوسری تفریحات میں ختم ہوتے۔

---

[1] برنیر شاہ جہاں کے آخری عہد میں آیا اور اورنگ زیب کے آٹھویں سال تک رہا، اس نے شاہجہاں کی عیش پسندی ظاہر کرکے اس کو بہت بڑا ثابت کرنا چاہتا ہے، زنانہ بازار کو وہ نفس پروری کی ایک شکل قرار دیتا ہے خصوصاً محل میں کنچنیوں کا داخلے پر بہت زیادہ طعن کرتا ہے، اور اس رسم بد کا ذمہ دار شاہجہاں کو ٹھہراتا ہے مگر خود اسی جگہ جہانگیر کے عہد کا ایک واقعہ درج کرتا ہے جس میں ایک انگریز ڈاکٹر مسمی برناڈ کی نفس پرستی کی داستان بڑے لطف کے ساتھ بیان کی ہے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ٹراولیز ان دی مغل امپائر ص ۲۷۲-۲۷۵) [2] منوچی برنیر سے بھی کئی قدم آگے ہے، اس نے ایسے من گھڑت واقعات بیان کیے ہیں جو عقل سلیم پر بار ہیں، شاہجہاں کے آخری عہد یعنی ۱۶۵۳ء میں آیا تھا (ملاحظہ ہو، منوچی، مغل انڈیا۔ ترجمہ ولیم اروِن ج ۱ ص ۱۹۴-۱۹۵

اور وہاں سے اواخر عہد اکبری میں شمالی ہندوستان لایا گیا، صاحب وار اشکوہی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۴ ۹ھ (تصحیف ۱۰۱۴ھ) یعنی عہد اکبری کے آخر میں فرنگ سے شمالی ہندوستان میں آیا، اس سلسلے میں سب سے زیادہ اہم بیان اسد بیگ قزوینی کا ہے، جو بیجاپور کی سفارت سے واپسی ۱۰۱۳ھ مطابق ۱۶۰۴ء میں اپنے ساتھ منجملہ اور تحائف کے تمباکو بھی لایا تھا، یہ دلچسپ[1] بیان حسب ذیل ہے:

بیجاپور میں مجھے تمباکو ملا، ہندوستان (شمالی) میں اس طرح کی چیز میں نے نہیں دیکھی تھی، اس لیے میں اپنے ہمراہ اسے لایا، اور ایک خوبصورت حقہ (پائپ) تیار کیا جس پر جواہرات کا کام تھا، اس کی حقہ کی نلی اچین میں ملتی تھی، میری نلی تقریباً پانچ فٹ لمبی تھی، جو پوری طرح خشک کی ہوئی اور عمدہ رنگی ہوئی تھی، اس کے دونوں کناروں پر جواہرات اور مینا کا کام تھا، مجھے ایک عمدہ خوبصورت منہ نال بھی مل گئی، یہ یمنی وی شکل کے عقیق کی بنی ہوئی تھی، اس کو میں نے نلی میں پیوست کر دیا، ایک سونے کی چلم (لمپ) روشن کرنے کے لیے مل گئی، جو حقہ کا ضروری جز تھی، عادل خاں (شاہ) نے مجھے ایک پاندان (پان کا ڈبہ) دیا جو بہت عمدہ کاری گری کا نمونہ تھا، اس میں میں نے ایسے عمدہ تمباکو سے بھرا کہ اگر اس کی ایک پتی جلائی جائے تو مہک اٹھے، ان سب کو ایک چاندی کی کشتی میں دلکش انداز میں ترتیب دیا، میرے پاس ایک چاندی کا ٹیوب تھا، جس کے ذریعہ نلی منہ نال سے پیوست کی گئی اور وہ گلابی رنگ کے مخمل سے ڈھکی ہوئی تھی،

بادشاہ میرے تحائف کو معائنہ فرما رہے تھے کہ دفعتاً ان کی نظر اس کشتی، حقے اور اس کے ساز و سامان پر پڑی، اس کو بڑا تعجب ہوا، اور تمباکو بڑے غور سے ملاحظہ کر کے اس کی ماہیت اور اس کے مقام کے متعلق سوال کیا، نواب خان اعظم (مرزا عزیز کوکلتاش) نے جواب دیا کہ یہ تمباکو ہے جو مکہ (معظمہ) اور مدینہ (منورہ) میں عام طور پر دستیاب ہوتا ہے، اور یہ ڈاکٹر (غالباً اسد بیگ کی طرف اشارہ مقصود تھا) آپ کی دوا کی غرض سے لایا ہے، بادشاہ نے اس کو دیکھا، اور حقہ تیار کرا کے تمباکو

---

[1] ... ہند ... لیپٹاٹ ... ص ۱۶۵ ... انگریزی میں ... "کیوبٹ" ہے، کیوبٹ ۱۸ ... پنچ ... کا ... پیمانہ ... ہے

کہا جاتا ہے کہ رام پور اور لکھنؤ میں بھی زنانہ بازار لگتے تھے،

لیکن تاریخی کتابوں میں لفظ مینا بازار مجھے نہ مل سکا، سب سے پہلی بار یہ لفظ بہار عجم[۱] میں ملا جو ۱۱۶۲ھ کی تالیف ہے، معلوم ہوتا ہے کہ بعد کے بازار زنانہ بازار کے بجائے عموماً مینا بازار کے نام سے موسوم ہوئے، اور اس کے نتیجے میں اس کتاب کو بھی مینا بازار کہنے لگے،

سطور بالا سے پوری طرح یہ واضح ہوتا ہے کہ زنانہ بازار صرف اکبر کے عہد سے تعلق نہیں رکھتا یہ ضرور ہے کہ اس نے اس بازار کو آئین میں داخل کر کے اسے بڑی اہمیت دیدی تھی، اور ایک لحاظ سے گویا وہ اس کا بانی بھی ہے، اس لیے کتاب زنانہ بازار کو عموماً عہد اکبری سے متعلق سمجھا گیا، حالانکہ کوئی ایک بھی ایسا قرینہ نہیں ہے جس سے اس کی تصنیف اس کے عہد کی قرار دی جا سکے، ذیل کے اوراق میں ہم مینا بازار کے زمانے اور اس کے مصنفوں کی شخصیت کی تعین کی کوشش کیجائیگی

مینا بازار کا سنہ تصنیف: جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ زیر نظر کتاب کی بیشتر چیزیں دیدہ و دانستہ پردۂ خفا میں رکھی گئی ہیں، نہ مصنف نے اپنا نام بتایا ہے، نہ یہ بتایا ہے کہ وہ کس جگہ کے بازار کا حال قلم بند کر رہا ہے، اور نہ کوئی ایسا قرینہ ہے جس سے مصنف کے نام وغیرہ کے ساتھ یہ معلوم ہو جاتا کہ کب کی تصنیف ہے، اس لیے ان ساری چیزوں کی بنیاد قیاس ہی پر ہو سکے گی،

مینا بازار میں ظہوری کے ساقی نامے کا ایک شعر درج ہے[۲]، اس سے یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ جاتی ہے کہ یہ کتاب ساقی نامۂ ظہوری سے موخر ہے، ساقی نامہ برہان نظام شاہ والی احمد نگر کے نام پر لکھا گیا جس نے ۹۹۹ھ سے ۱۰۰۳ھ تک حکومت کی، اس لحاظ سے مینا بازار کا سنہ تصنیف ۱۰۰۳ھ کے قبل قرار نہیں پا سکتا،

مینا بازار میں تمباکو فروش کا بھی ذکر ہے، مآثر رحیمی[۳] سے پتہ چلتا ہے کہ تمباکو پہلے دکن میں آیا

[۱] ج ۲ ص ۵۲۴ [۲] مینا بازار ص ۳۹ جو پان کی تعریف میں پہلا شعر ہے، ملاحظہ ہو ص ۵ [۳] ملاحظہ ہو مینا بازار حاشیہ نمبر ۱ ص ۳۱

حکیم قائل نہ ہوا۔ بہرحال وہ بڑا طبیب تھا،

میرے پاس تمباکو اور حقے کا کافی ذخیرہ تھا، اس لیے میں نے اکثر امرا کے پاس اس کو بطور ہدیہ بھیجا، بعض نے خود منگوا بھیجا، اور تمام امرا بغیر کسی استثنا کے اس کے شایق ہوگئے، اور چند دنوں میں اس کا رواج ہوگیا، اور سوداگروں نے بیچنا شروع کر دیا، اس طرح تیزی سے تمباکو نوشی کا رواج پھیل گیا لیکن بادشاہ نے اس کو اپنے معمولات میں شامل نہیں کیا"۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ شمالی ہند کے بازاروں میں تمباکو نوشی کا رواج ۱۶۰۴ء کے بعد ہوا[1]، مگر چونکہ اکبر کی وفات اس کے ایک ہی سال بعد ہوگئی[2] اس لیے اس کے زمانے میں تمباکو پینے، کھانے اور سونگھنے وغیرہ کا عام استعمال مستبعد ضرور معلوم ہوتا ہے، اور یہ مسلم ہے کہ کتاب مینا بازار اس سنہ کے بعد لکھی گئی ہوگی، کیونکہ قلعہ کے زنانہ بازار میں جگہ جگہ اور مختلف قسم کے حقے، پینے اور کھانے کے طریقے ایجاد ہونے کے بعد ہی مصنف نے اس کے لکھنے کا خیال کیا ہوگا،

---

[1] اسد بیگ کی واپسی مریم مکانی کی وفات کے چند دن بعد ہوئی، تکملہ اکبر نامہ میں انکی وفات کی تاریخ ۱۹ شہریور ۱۰۱۳ھ مطابق ۲۹ اگست ۱۶۰۴ء دی ہے لیکن زبدۃ التواریخ میں ۱۸ شہریور ۱۰۱۳ھ درج ہے، اور اسی کی بنیاد پر بیل نے ۱۰۱۳ھ قرار دیا ہے، مگر یہ غلط ہے، تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو ترجمہ (انگریزی) اکبر نامہ ج ۳ ص ۱۰۳۰ متن و حاشیہ و اکبر نامہ ج ۳ ص ۸۳۱

[2] اکبر کی وفات کی تاریخ میں اختلاف ہے تکملہ اکبر نامہ میں چہارشنبہ ۱۴ آبان ۱۰۱۴ھ (۱۵ اکتوبر ۱۶۰۵ء) [illegible] ج ۲ ص ۲۴۰ ۱۴ آبان مطابق ۲۰ جمادی الاول ۱۰۱۴ھ (۲۳ ستمبر ۱۶۰۵ء) اقبال نامہ میں ہے کہ ۱۲ آبان کو بیمار ہوا اور سہ شنبہ ۱۲ جمادی الآخر ۱۰۱۴ھ کو مرا، بظاہر ۱۲ آبان غلط ہے، ۱۴ ہونا چاہیے، فرشتہ میں ۱۳ جمادی الآخری ہے، بہرحال تاریخ محقق ہے کہ جمادی الآخر ۱۰۱۴ھ (۱۵ اکتوبر ۱۶۰۵ء) اس حساب سے اسد کی واپسی ۱۳ ماہ پہلے ہوئی ہوگی، (ملاحظہ ہو ترجمہ [illegible]
[illegible] (۱۲۹۱ [illegible])

پینے لگا، لیکن شاہی حکیم نے پینے سے روکا، مگر بادشاہ کو اتنا پسند آرہا تھا کہ اس نے دو تین بار پورا کش لیا، حکیم کو بڑی الجھن تھی، وہ نہیں چاہتا تھا کہ بادشاہ اسے اور پیئے، چنانچہ اس نے حقہ لے کر خان اعظم کی طرف بڑھا دیا، خان نے بھی دو تین کش لیے، اور اس نے (غالباً بادشاہ نے) شاہی عطار کو بلا کر اس سے تمباکو کے خواص پوچھے، اس نے جواب دیا کہ ہماری کتابوں میں اس کا ذکر نہیں، یہ نئی ایجاد ہے، اور اہل یورپ اس کے بڑے مداح ہیں، ہم حضور سے ایسی ناواقف چیز کا بیان کیونکر کریں، حضور کے لیے مناسب نہیں کہ اسے پئیں، اس پر اسد بیگ نے شاہی حکیم سے کہا یورپ کے لوگ اتنے بیوقوف نہیں کہ اس کے خواص سے ناواقف ہوں، ان میں ایسے بھی عقلمند ہیں جن سے غلطی کم سرزد ہوتی ہے، جو چیز آپ کی آزمودہ نہ ہو اور اس کے خواص سے آپ واقف نہ ہوں اس کے (اچھے یا برے ہونے کے) متعلق آپ کیونکر فیصلہ کر سکتے ہیں، اور وہ فیصلہ ایسا جس پر اطبا، سلاطین، امرا و اراکین سب عامل ہوں، کسی چیز کی اچھی بری خاصیت معلوم ہو جانے کے بعد اس کے متعلق حکم لگانا چاہیے، حکیم نے کہا: ہم کو اہل یورپ کی تقلید نہ کرنا چاہیے اور ایک ایسی رسم کو نہ اپنانا چاہیے، جو ہمارے اگلوں کے معمولات میں نہ رہی ہو، اسد نے کہا یہ عجیب بات ہے، ہر رسم ابتدا میں نئی ہوتی ہے، ایجاد ہونے کے بعد رفتہ رفتہ لوگ اس کے عادی ہو جاتے ہیں اور وہ عام ہو جاتی ہے، اس لیے حکما و عقلا کو اس کی اچھائی برائی دیکھ کر فیصلہ کرنا چاہیے، کیونکہ اس کا بھی امکان ہے کہ کسی چیز کی خوبی یک بیک ظاہر نہ ہو.....

بادشاہ میرے اس استدلال اور بحث کو سنکر بہت خوش ہوا، اور مجھے دعا دی، اور خان اعظم سے کہا، دیکھو اسد بیگ کا استدلال کتنا دل پسند ہے، سچ ہے کہ ہمیں کسی چیز کو جسے دوسری قوموں نے آزمایا بھی ہو محض اس بنا پر کہ ہماری کتابوں میں اس کا ذکر نہیں، نہ ترک کرنا چاہیے، حکیم کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ بادشاہ نے روک دیا، اور پادری کو بلایا، اس نے تمباکو کے خواص بتائے لیکن

مخاطب ساختہ، واللہ اعلم بالامور"

اس بیان کے پہلے حصے میں بتایا گیا ہے کہ خان آرزو سہ نثر کے علاوہ اور چیزوں کو ظہوری کی طرف منسوب کرتے ہیں، اور شمس الدین فقیر صرف سہ نثر کو ظہوری کی بتاتے ہیں، اور بقیہ دوسرے نثر پاروں کو واضح کی ملک قرار دیتے ہیں، انھوں نے اس میں محققین سابق کے خیال کا اتباع کیا ہے، مگر اس بیان کا دوسرا حصہ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ واضح نے ترویج کے لیے اپنا تمام سرمایہ ظہوری کے حوالے کر دیا تھا، اور اپنے معاصرین کو یقین دلانے کے لیے فیضی فیاضی کو مخاطب کیا، دلچسپ تو ضرور ہے مگر بالکل خلاف قیاس ہے، اس وجہ یہ ہے کہ ظہوری واضح سے ایک صدی[1] متقدم ہے اور فیضی فیاضی نے واضح سے تقریباً سوا سو سال قبل وفات[2] پائی،

مرزا قتیل نے واضح کو کشمیری اور مرزا بیدل کا شاگرد بتا کر یہ بات مشتبہ و مشکوک کر دی ہے کہ یہ واضح وہی ہے جس کا نام مبارک اللہ[3] تھا، اور جو اورنگ زیب کے عہد میں مختلف عہدوں پر فائض رہا، اور عہد فرخ سیر میں ۱۱۲۸ھ میں وفات پائی، یا کوئی دوسرا شخص ہے لیکن سردست مجھے اس سے بحث نہیں ہے،

(۱) سراج الدین علی خاں آرزو نے اپنا اہم تذکرہ مجمع النفائس ۱۱۶۴ھ میں مرتب کیا لیکن اس میں نہ ظہوری کے ذیل میں اس جھگڑے کا ذکر ہے، اور نہ واضح کے ذیل میں، ملک قمی جو ظہوری کا خسر تھا، اور دونوں کے حالات بڑی حد تک یکساں ہیں، اس کے ضمن میں بھی اس اختلاف کا نام نہیں، اب ہم تینوں جگہ سے کچھ ضروری عبارتیں نقل کرتے ہیں،

کمالات ظہوری[4] نظماً و نثراً ازاں مشہور تر ست کہ زبان خامہ قاصر اللسان از عہدہ ئے

---

[1] ظہوری کی وفات ۱۰۲۵ھ میں اور واضح کی ۱۱۲۸ھ میں ہوئی، ملاحظہ ہو ظہوری ص ۴۰، [2] فیضی کی وفات ۱۰۰۴ھ میں ہوئی،

[3] ملاحظہ ہو مآثر الامراج ۱ ص ۴۰۲-۵-۳، مجمع النفائس ورق ۵۱۹ ب بعد ایلیٹ تاریخ ہند ج ۸ ص ۵۳۴ وغیرہ۔

[4] قلمی نسخہ (بانکی پور) ورق ۲۹۰ ب بعد، ذیل حالات ظہوری

اس واقعہ سے ان تمام لوگوں کے خیالات کی تردید ہو جاتی ہے جو اس تصنیف کا سہرا عہد اکبری کے سر باندھنے کی کوشش میں دور از کار توجیہات اور بعید از قیاس تاویلات میں مصروف نظر آتے ہیں، لیکن اس بیان سے یہ نتیجہ نکالنا بھی صحیح نہ ہوگا کہ مینا بازار عہد اکبری کے فوراً بعد لکھی گئی، بلکہ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ عہد اکبری کے بعد کسی زمانے میں اس کی تکمیل ہوئی ہوگی خواہ وہ زمانہ جہانگیر شاہجہاں یا اورنگ زیب کسی اور بادشاہ کی حکومت کا ہو، مگر اس کے قبل کا ناممکن ہے،

مینا بازار کا مصنف جیسا کہ ارشاد ہو چکا ہے، مینا بازار کے مصنف کے بارے میں بڑا اختلاف ہے[1] بعض بیانات سے اس کا مصنف ارادت خاں واضح اور بعض سے ظہوری معلوم ہوتا ہے، لیکن یہ اختلاف نیا نہیں ہے، پرانے فضلاء میں بھی اس طرح کا اختلاف تھا، مرزا قتیل نے چار شربت[2] میں اس اختلاف کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے،

از سہ نثر شحات کلک عزائب سلکش آنچہ مشہور و متداول است چار نسخہ است، سہ نثر کہ آں ہر سہ بمنزلہ یکے ست ہرچند باعتبار حمد و نعت از قید وحدت برآمدہ، وحسن و عشق، و بازار زمانہ[3] و پنج رقعہ، سہ نثر باتفاق صغیر و کبیر از وست، و در سہ چیز دیگر اختلاف واقع شدہ، بعضے آنہا را منسوب باو کنند و مذہب خاں آرزو ہمیں است، و بعضے سواے سہ نثر از وندانند شمس الدین فقیر عباسی دہلوی ہمیں اعتقاد داشتہ۔ و دریں اعتقاد پیروی مخلصان سابق نمودہ ہر سہ نثر باقی را بگر دن ارادت خاں کشمیری متخلص بواضح شاگرد مرزا عبدالقادر بیدل بستہ اند، گویند کہ منشی موحی الیہ براے ترویج سرمایۂ خود را بملا ظہوری حوالہ نمودہ، و در مسودہ بنا بر دیا دیقین معاصران رعایت عصر ملا ملحوظ داشتہ حکیم بلند وقار شاعر خاقانی اقتدار فیضی فیاضی را

---

[1] اس سلسلے میں معارف کی، جولائی، اگست، ستمبر، نومبر اور دسمبر ۱۹۵۴ء کے شمارے ملاحظہ ہوں۔ [2] مطبوعہ ۱۲۶۱ھ

[3] بعض لوگ اس کو پنج رقعہ میں شامل سمجھتے ہیں، مگر ملاحظہ ہو میری کتاب ظہوری ص ۴۲۸ - ۴۲۹

باشتراک واین قسم ہیچ جا اتفاق نیفتادہ" (ورق ۴۵ ب)

ان اقتباسات سے یہ مقصود نہیں کہ مرزا قتیل کی اس رائے کا انکار کر دیا جائے کہ خان آرزو مینا بازار وغیرہ تمام نثر پاروں کو ظہوری کی ملکیت قرار دیتے ہیں کیونکہ اس کا امکان ابھی باقی ہے کہ اس تذکرہ میں کہیں اور اس اختلاف کا ذکر ہو مگر یہ امکان بہت ضعیف ہے، اس لیے کہ اس کے ذکر کے مواقع یہی تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خان آرزو نے اپنی کسی دوسری تصنیف میں اس اختلاف کا ذکر کیا ہوگا۔ زیادہ قیاس یہ ہے کہ سراج اللغت ہی حوالے کے سلسلے میں زیر بحث نثر پاروں کو ظہوری کے نام کے ساتھ درج کر دیا ہو سراج اللغت کا خصوصی ذکر محض اس بنا پر کیا گیا کہ بعض لغت نویسوں نے جن میں ٹیک چند بہار اور غیاث الدین شامل ہیں، مینا بازار کو ظہوری ہی کی طرف منسوب کیا ہے، اور ان کے ماخذوں میں اس کتاب کو بڑی اہمیت حاصل ہے،

(۲) بارھویں صدی کے دوسرے مصنف جس نے خان آرزو کے خیال کی تائید کی ہے ٹیک چند بہار مؤلف بہار عجم ہے۔ اس نے لفظ "گل" کی تشریح میں لکھا ہے:

"گل، به اصطلاح قماربازان نورالدین ظہوری در مینا بازار در تعریف بزاز نوشتہ
چوں سرمایہ داران نقد خرد دست بر کیسۂ شکیب می افشانند بر تختہ اوکہ از مشکباری زلف عود
قماری است گل می خوانند" (ج ۲ ص ۵۴۳ کالم نمبر ۳)

بہار عجم کی تالیف کا سنہ[۱] "یا دفقیر حقیر بہار بادہ سال" کے فقرے سے (۱۰+۱۰۵۲) ۱۰۶۲ھ نکلتا ہے لیکن اس پر نظر ثانی آخر حیات تک ہوتی رہی[۲]، کیونکہ مصطلحات الشعراء وارستہ کو اس کے

---

[۱] برٹش میوزیم کے نسخہ میں (فہرست ج ۲ ص ۵۰۲) اور بادلے (فہرست ج ۱ ص ۱۰۱۸) کے نسخے میں یہی دیا ہے، مگر نولکشوری (مطبوعہ ۱۲۸۹ھ) میں دس سال کے اضافے کا ذکر نہیں ہے۔ [۲] ملاحظہ ہو برٹش میوزیم (فہرست ج ۲ ص ۵۰۳ ب) بحوالہ بلاخمن (آئین اکبری ص ۱۰۲)۔ اسی نسخے میں دو دیباچے ہیں اور اندراس کی تلخیص کا بھی ذکر ہے جو ۱۱۸۱ھ میں عمل میں آئی۔

توصیف آں بر آید، با ایں ہمہ خط ہم خوب می نوشت، کتاب روضۃ الصفا مکرر نوشتہ و مردم بجان و دل خریدار آں بودند و شیخ فیضی را کہ ملک الشعرای اکبری است کمال دوستی و تعلق خاطر با و متحقق است و در شعر طرز خاصے دارد و کتاب الیوم ہیچکس را دست نداده غرض کہ او دریں فن یگانہ ایست علی الخصوص در نثر رنگین و مثنوی کہ ہر کہ بعد او آمده تتبع و پیروی او ست، کلیات نظم و نثر او بسیار ضخیم است، (واضح) کلیات[1] دارد ضخیم مشتمل بر غزلہا و قصائد و رباعیات و مثنویات اراده داشت کہ جواب خمسہ گوید، چند مثنوی شروع کرده اما بسرش نیامد لیکن مثنوی آئینہ راز در بحر یوسف زلیخا باتمام رسانیده و خیلے بقدرت گفتہ ... قصیده در جواب قصیده مرزا معز موسوی ... خیلے بزور گفتہ و نیز کتابے از زمی بکلمات طیبات بسیار دقیق مملو از فوائد و از انجا دریافت میشود کہ صاحب مذہب است و باجے بکسی نمی دہد، بہر حال در ایں کمال بودنش او شکے نیست، ایں قدر ہست کہ در ترکیبات فارسیہ تصرفات نمایاں داشت و دعویش ایں بود کہ ما اہل زبانیم و قادر سخن، ہر چہ ما گوئیم برائے دیگراں سند است نہ قول دیگراں برائے ما و در بلند خیالی مرتبہ رسیده کہ بسیار اشعارش فہمیده نمی شود ..... مخفی نماند کہ امانت خاں واضح ہر چند رباعیات بسیار دارد و اکثر مطالب تصوف در آں مندرج است و نثرے نوشتہ کہ شرح رباعیات مذکور است فقیر آرزو را ایں دو رباعی از آں جملہ بسیار خوش آمده

استاد ملک قمی[2] شاعر زبردست صاحب قدرت است، مثل نور الدین ظہوری چند جا در او نموده و ایں دلالت دارد بر کمال بزرگی و تمامی سخنوری ... ملا ظہوری بشرف دامادیش مشرف گشتہ ... و در اکثر جاہا از تحسین و تعریف نموده حتی کہ ہر دو شاعر مذکور کتابے تصنیف نموده اند

[1] ورق ۵۲۰ – ۵۲۲ ب، ۵۲۳ ب ... قلمی ۵۵۴، فہرست قزوینی (ورق ۲۰۴) کے ذیل میں واضح کا ذکر اس طرح کیا ہے
[illegible] واضح کہ در مدح [illegible] کرده کہ کسی است بنورس۔

بتلائی ہے کہ انھوں نے کس بنیاد پر اس کو ظہوری کی تصنیف قرار دیا ہے، بس وہ اپنے مخصوص انداز میں ایک قول نقل کر دیتے ہیں، نہ اس کے ماخذ کا پتہ بتاتے ہیں اور نہ اس پر محققانہ نظر ڈالتے ہیں، اس لیے بسا اوقات صحیح بات بھی مشکوک نظر آنے لگتی ہے، مثلاً صہبائی کو لیجئے، انھوں نے صاحب بہار عجم کا قول اپنی تائید میں پاکر صاف صاف لکھ دیا کہ محقق یہی ہے کہ مینا بازار ظہوری کی ہے، مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ صرف ایک مصنف کی سند پر ایک اختلافی مسئلہ کیونکر صاف ہو گیا، یہ صرف ان ہی مصنفین کا حال نہیں، جو لوگ اس رائے کے مخالف ہیں[1] ان کے یہاں بھی یہی نقائص ہیں، اب ہم مخالف گروہ کے چند افراد کا ذکر کرتے ہیں، جنھوں نے سہ نثر کے علاوہ کسی نثر پارے کو ظہوری کی ملک نہیں قرار دیا ہے اگرچہ ان میں سے اکثر نے اس مسئلہ پر کوئی محققانہ نظر نہیں ڈالی، بلکہ ظہوری کے کلام نثر کے ضمن میں صرف سہ نثر کا ذکر کر دیا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ظہوری کی نثری تصنیف کو صرف سہ نثر تک محدود رکھنا اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کے نزدیک مینا بازار وغیرہ ظہوری کی ملک نہیں تھی، اس گروہ میں دو تین مصنف ایسے بھی ہیں جنھوں نے اس مسئلہ پر محققانہ انداز میں گفتگو کی ہے، ذیل میں ان لوگوں کے اقوال درج ہیں:

(۱) سرخوش نے کلمات الشعرا (۱۰۹۳ھ) میں ظہوری کی تصانیف کے بارے میں لکھا ہے[2]:

"در نثر رسالہ نورس و خوان خلیل و گلزار ابراہیم بسیار خوب نوشتہ"

(۲) شیر خاں لودی نے مراۃ الخیال (۱۱۰۲ھ)[3] میں لکھا ہے:

"خطبۂ نورس کہ در علم ہندی تصنیف کردۂ سلطان است، او نوشتہ و دستگاہ سخن را

---

[1] چودہویں اور پندرہویں صدی کے چند مصنفین کے بیان کو محض اس وجہ سے نظر انداز کر دیا ہے کہ انکے یہاں کوئی خاص بات نہیں پائی جاتی، تعداد کی زیادتی یا کمی مسئلہ کی نوعیت پر بالکل اثر انداز نہیں ہوتی [2] ص ۱۹۰، محمد بقا نے مراۃ العالم (۱۰۷۸ھ) اور مولف تاریخ ظفرہ (ق ۱۲۹۹) نے گلشن ابراہیم نامی ایک رسالہ کا ذکر کیا ہے جو غالباً دیباچہ گلزار ابراہیم کی تصحیف ہے [3] ص ۷۷، میں اس نے رقعات خطبہ نورس کہا ہے، بعض لوگوں نے سہ نثر کے بجائے یہی نام لکھا ہے، ممکن ہے کہ اس نے بھی ایسا ہی کیا ہو،

ماخذ میں جگہ ملی جو ۱۱۱۶ھ[۱] میں مکمل ہوئی،

(۳) بارہویں اور تیرہویں صدی کے ایک مشہور تذکرہ نویس علی ابراہیم خاں خلیل نے اپنے دونوں تذکروں یعنی صحف ابراہیم[۲] (۱۲۰۵ھ) اور خلاصۃ الکلام[۳] (۱۱۹۸ھ) میں مینا بازار کو ظہوری کے مصنفات میں شامل کیا ہے،

(۴) اس کے بعد عبد الرزاق بمبئی نے مقدمات ثلاثۂ ظہوریہ[۴] (۱۲۱۲ھ) اور شرح زنانہ بازار و پنج رقعہ میں ان دونوں نثرپاروں کو ظہوری ہی کی طرف منسوب کیا ہے،

(۵) تیرہویں صدی کے مشہور لغت نویس غیاث الدین نے غیاث اللغات (۱۲۴۲ھ) میں اپنے ماخذ کے ضمن[۵] میں مینا بازار اور پنج رقعہ کا بھی نام درج کیا ہے، اور دونوں کو ظہوری کی تصنیف قرار دیا ہے،

(۶) ان میں سب سے اہم بیان مولانا امام بخش صہبائی کا ہے، جنھوں نے بڑے اصرار کے ساتھ ان تمام نثرپاروں کو ظہوری کی طرف منسوب کیا ہے، لیکن انھوں نے کوئی وجہ نہیں بتائی ہے، اور شرح مینا بازار (۱۲۶۲ھ) میں "گل" کی تشریح کے ضمن میں لکھا ہے[۶]:-

در بہار عجم آوردہ کہ باصطلاح قماربازان یک خاں طاس[۷] و ہمیں فقرہ را بندہ در دو اول نوشتہ کہ نورالدین ظہوری در مینا بازار در تعریف بزاز گوید، ازیں جا معلوم می شود کہ محقق ہمیں است کہ این نسخہ از ظہوری است و آنچہ از ارادت خاں گویند اصلے ندارد۔

(۷) محمد بادشاہ شاد نے بھی فرہنگ آنند راج[۸] میں (تالیف ۱۳۰۶ھ) "گل" کی تشریح میں وہی بہار عجم والی عبارت بجنسہٖ نقل کی ہے، جس میں مینا بازار ظہوری کی طرف منسوب ہے،

مگر مذکورۂ بالا مصنفین میں سے کسی نے بھی ان نثرپاروں کو ظہوری کی تصنیف قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں

---

[۱] مصنف انشائے ... اس کی تاریخ ہے [۲] ورق ۱۰۵ [۳] ورق ۱۲۲ [۴] مطبوعہ ص ۳ [۵] ص ۲ [۶] شرح مینا بازار (مطبوعہ نولکشور) ص ۵۹-۶۰ [۷] یک خاں طاس کا فقرہ بہار عجم میں محذوف ہے [۸] ج ۳ ص ۳۹

در تخلص فقیر تھا، اور وہ خان آرزو کا معاصر تھا، حدیقۃ البلاغہ ۱۱۶۱ھ میں یعنی مجمع النفائس سے چار سال بعد تصنیف ہوئی، چنانچہ اس کی تاریخ[۱] خود مصنف نے خاتمۂ کتاب میں درج کی ہے جس سے یہی سنہ نکلتا ہے؛ جس طرح مجمع النفائس میں خان آرزو نے اس اختلاف کا ذکر نہیں کیا ہے، اسی طرح حدیقہ بھی اس اختلاف سے خالی ہے، (حدیقہ چونکہ فن بلاغت کی کتاب ہے اس لیے اس میں موقع بھی کم تھا) اور جیسا ہم قیاس کر چکے ہیں خان آرزو نے اپنی قبل کی تصنیف میں اس کا ذکر کیا ہوگا، اسی طرح شمس الدین فقیر نے بھی کسی اور جگہ ظہوری کی نثری تصنیف کے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ کرکے اور نثر پاروں کو ارادت خاں کی طرف منسوب کیا ہوگا۔

(۷) اگرچہ مرزا قتیل کی رائے (جو چار شربت میں ظاہر ہوئی ہے) کا کچھ حصہ نقل ہو چکا ہے، اس حصہ میں انھوں نے زنانہ بازار وغیرہ کے مصنف کے بارے میں اختلاف رائے کا ذکر کیا ہے لیکن اس میں اپنے خیال کا اظہار نہیں کیا، مگر اسکے بعد کے حصے میں انھوں نے صراحۃً لکھا ہے کہ سہ نثر کے علاوہ جتنی نثریں ہیں وہ ظہوری کی نہیں ہیں، کیونکہ دونوں کا طرز جداگانہ ہے، اور دونوں کی مثالیں بھی پیش کی ہیں، اور انکی تشریح بھی کر دی ہے، اب ہم ذیل[۲] میں ان کی رائے پیش کرتے ہیں:

> سہ نثر کے مرتبے کی بلندی ان تمام چیزوں (نثروں) پر جو اس کے مشابہ ہیں، بدیہی ہے، اور یہ طرز خاص ظہوری کا مخترع ہے، اور بمصداق کل جدید لذیذ کے اس نے بلاغت کا سکہ الفاظ کے درہموں پر نقش کیا، ایران کے مسلم الثبوت انشا پرداز اس کے فقروں کو رشتۂ جواہر آبدار خیال کرتے ہیں لیکن چونکہ ان کو اس بارے میں اساتذۂ قدیم سے اختلاف ہے اور اپنے سانچے کو نئے قانون (اصول، انداز) سے بچاتا ہے، اس لیے اس کی پیروی اختیار نہیں کرتے لیکن اس سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کا تتبع نہایت مشکل ہے، اس کا ہر فقرہ سوا اس فقرے کے جو اس کے مقابل آیا ہے، جواب نہیں رکھتا،

[۱] بسانتین مستفیدان، خزانۂ تکمیل، تقویم دانشوران، زینت گفتار، مخزن نکات ۱۱۶۱ھ [۲] ص ۷۰۔ ۷۰

بجائے رسانیدہ کہ امروز خیال بنداں روزگار ہمیشہ معتقد اواند

(۳) کشن چند اخلاص نے ہمیشہ بہار (۱۱۳۶ھ) میں اس کی نثری تصنیف کے بارے میں اس طرح اظہار خیال کیا ہے[۱]:

دیباچۂ نورس و خوان خلیل و گلزار ابراہیم از نتائج افکار در رگفتار اوست

(۴) نقش علی نے باغ معنی (۱۱۷۵ھ) میں لکھا ہے[۲]:

در نثر طرز خاص دارد۔ دیباچۂ نورس و خوان خلیل و گلزار ابراہیم خیلے بہ لطافت نوشتہ

ہر فقرہ مسجع است و معنی تازہ دارد۔

(۵) شاہ نواز خاں نے بہارستان سخن (۱۱۹۴ھ) میں صرف سہ نثر کو ظہوری کی نثری تصنیف قرار دیا ہے، عبدالجبار خاں نے تذکرۂ محبوب الزمن میں اس کا بیان ان الفاظ میں کیا ہے[۳]:

بہارستان کے مولف نے لکھا ہے کہ ظہوری نے ابراہیم عادل شاہ کے نام پر خوان خلیل، گلزار ابراہیم اور کتاب نورس مولفہ عادل شاہ کا خطبہ لکھا، اور عبارت نثر و نظم کو نازک تشبیہات و استعارات، مبالغہ و اغراقات کے ساتھ ایسا آراستہ کیا کہ شعرائے نازک خیال اس کی بے نظیری وعدیم المثالی کو مانتے ہیں۔ اس کا ہر ایک فقرہ مسجع و مقفی اور جامع معنی تازہ و شگفتہ ہے۔

(۶) چار شربت[۴] (تالیف ۱۲۱۷ھ) میں مرزا قتیل نے شمس الدین فقیر عباسی دہلوی کے متعلق لکھا ہے کہ وہ صرف سہ نثر کو ظہوری کی ملک بتاتے تھے، اور پنج رقعہ، مینا بازار اور حسن و عشق کو راردت خاں کی تصنیف قرار دیتے اور اپنے اس قول میں پرانے محققین کی پیروی کی ہے، غالباً شمس الدین فقیر پہلا شخص ہے جو اس اختلاف کے ضمن میں واضح کا نام لایا ہے،

شمس الدین اور صاحب حدیقۃ البلاغہ بظاہر ایک ہی شخص ہیں، کیونکہ آخر الذکر کا بھی نام شمس الدین

[۱] ورق ۱۵ [۲] ص ۱۴ [۳] ج ۲ ص ۷۷۶ [۴] ص ۷۷

(ب) ایک لفظ موصوف اور اس کی صفت ایک پورا فقرہ، پھر ایک لفظ اس مجموعے کی صفت۔ پھر یہ سب ایک لفظ کی طرف مضاف اور وہ لفظ (مضاف الیہ) دوسرے لفظ کی طرف مضاف۔

شہید گلو بریدہ در خون طپیدۂ معرکۂ الفت

موصوف — صفت

موصوف — صفت (پورا فقرہ) — مضاف — مضاف الیہ

مضاف — مضاف الیہ

(ج) ایک لفظ موصوف اور اس کی صفت ایک طویل عبارت پھر یہ مجموعہ ایک لفظ کی طرف مضاف اور وہ مضاف الیہ ایک لفظ کی طرف مضاف ہو یا دو لفظ کی طرف جو واو عاطفہ سے ملحق ہوں اور معطوف ایک صفت کا موصوف ہو

قتیل ہزار زخم کاری شمشیر آبدار خوردۂ معرکۂ محبت و اتحاد روز افزوں

موصوف — صفت — مضاف — معطوف علیہ — حرف عطف — موصوف — صفت

معطوف

مضاف الیہ

مضاف الیہ

(د) ایک لفظ ایک بڑی عبارت کا موصوف ہو یہ صفت معطوف علیہ ہو اور اس کے مقابل ایک لمبا فقرہ معطوف اور یہ سب ایک لفظ کی طرف مضاف ہوں جو ایک بڑی عبارت کا موصوف بھی ہو

میہن دلشیان آسائش ہزار آرزو دیدہ و بال کشادہ بامیدہ انہ مقصود بصحرائے ناپیداکنار طلب زہر بانوں دور افتادۂ دام باج ستان از طرۂ مہوشان مہر درش [illegible]

موصوف — صفت و معطوف علیہ — حرف عطف — صفت و معطوف — موصوف — صفت

مضاف — مضاف الیہ

(ھ) احمد علی سندیلوی نے اپنے تذکرہ مخزن الغرائب (۱۲۱۸ھ) میں ارادت خاں واضح کے ذیل میں اطلاعات بہم پہنچائی ہے:

مرزا مبارک اللہ واضح تخلص مخاطب بہ ارادت خاں از امیر زادگان قدیم ہندوستان است

بہرحال اس طرز کا ایران میں، اگرچہ نہ ہونا زیادہ وہ خود اعتنا نہیں، اور جس حسن (خوبی) کا ذکر ہو رہا ہے وہ صرف (دیباچہ)، نورس وگلزار ابراہیم وخوان خلیل میں پایا جاتا ہے، دوسرے نثر پارے جو اسکی طرف منسوب کیے جاتے ہیں اس حسن سے عاری ہیں، اگرچہ بعض لوگ (مسوّد) اپنے زعم میں ایک دو ترکیب کے التباس (اشتراک) سے دونوں طرز کو ایک جانتے ہیں، مگر ظہوری کا طرز کلام کو لغویت سے پاک کرنا اور دلچسپ تشبیہ اور دلپذیر کنایہ واستعارہ وتبلیغ واغراق وغلو ومراعات النظیر سے آراستہ ومزین کرنا ہے، وہ نزاکت معنی کو اس حد تک الفاظ کا جز ولاینفک قرار دیتا ہے کہ کند ذہن اس کے کلام کے حسن کی دریافت سے قاصر رہتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس کی نزاکت فکر ہمیشہ نئے نئے مضامین (معنی بکر) کی متلاشی (صیاد) رہتی ہے، مثال

"اگر جودش دست عنایت پدرانہ بر سر یکسان نگزاشتے صدف بر قطرۂ ابر نیسانی شفقت مادری روانہ داشتے، مرغے کہ اسیر حلقۂ دام مالک شکارش گردیدہ بہ تیغ تیز شہپر رشتۂ الفت با طائران طوبی بریدہ۔"

ظہوری کا یہی طرز ہے لیکن چونکہ پنج رقعہ بھی اسی کے نام سے مشہور ہے، لہذا پنج رقعہ[1] کے طرز پر تبصرہ کیا جاتا ہے، جس سے حقیقت حال واضح ہو جائے گی،

(الف) ایک مفرد یا مرکب لفظ کو دو لفظ کے ساتھ ذکر کرتا ہے، پھر ایک دوسرا لفظ بطور صفت کے پھر ایک لفظ اس مجموعہ صفت وموصوف کی صفت کے طور پر لاتا ہی، یہ ایک فقرہ ہوا، دوسرا فقرہ اس کے مقابل اسی طریقہ سے لاتا ہے، مثلاً

سرو زیبا قامت خوش رفتار
موصوف (لفظ مفرد) صفت (لفظ مرکب) صفت (لفظ مرکب)
موصوف

یا مہ پارۂ حوار طلعت پری نژاد
موصوف (لفظ مرکب) صفت (لفظ مرکب)
موصوف صفت (لفظ مرکب)

[1] اگرچہ فی الحال ہم پنج رقعہ سے بحث نہیں کر رہے ہیں، مگر اس کی نسبت بھی (ظہوری کی طرف) غلط ہے، وجوہ تقریباً یکساں ہیں۔

یہی وہ مورخ ہے جس کے پیش نظر ظہوری کے لڑکے ملا ظہور کا محمد نامہ تھا، اور جس نے ظہوری کی وطنی نسبت قائنی لکھی ہے، جو یقینی ہے، اس لیے کہ خود ظہوری نے دو مختلف ابیات میں "قائین" کو اپنا مولد بتایا ہے، زعفر ابراہیم زبیری کا صرف سہ نثر کا ذکر کرنا اور مینا بازار وغیرہ کے بارے میں سکوت اختیار کرنا بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

(۱۰) اسد اللہ خاں غالب دہلوی نے بڑے شد و مد کے ساتھ مینا بازار و پنج رقعہ کو واضح کی طرف منسوب کیا ہے، مولوی محمد مظہر الحق نے ایک ہزار چھ شاعروں کے کلام کا انتخاب کیا تھا، اس کی تقریظ کے سلسلے میں غالب نے لکھا ہے کہ مولوی مذکور اپنے پدر بزرگوار مولانا محمد ظہور علی کے فیض یافتہ ہیں، ان کے الفاظ یہ ہیں:

> آں دیرین آموز یگانہ وزگار سخن را دیدہ دے ناز و معنی را از دے شرف جناب قدسی القاب مولانا محمد ظہور علی صاحب زاد مجدہ آنکہ بر نثر ہائے پیشینیان چناں حاشیہ ہائے خرد افزا نوشت کہ پرداختن در کنج لحد آفریں گوے اوست، شرح نگاری ایں چنیں ہمہ داں را سزد، نہ آں خیارا زجہاں ناشناساں را کہ چوں خواہند در شرح کلام سلف کوس شہرت زنند پنج رقعہ و زنانہ بازار ارادت خاں واضح را تراویدہ رگ پروین نگارہ وپرن بار مولانا نور الدین ظہوری وانمایند، ہاں وہاں غالب دانائی شیوہ از دشمن بدست ردے آردو دعاے گوہر درج سعادت کہ عقیق لب شاہد معنی بدیں بیخ نگیں مہر اوست — مرحبا مظہر ظہور علی در درزبان کن الخ (کلیات نثر غالب ص ۹۴-۹۶)

ظاہر ہے کہ اس میں مولانا صہبائی پر چوٹ کی ہے، کیونکہ انھوں نے شرح نویسی کے ضمن میں مینا بازار و پنج رقعہ کو ظہوری کی طرف منسوب کر دیا تھا، اور غالب اس کے سخت مخالف تھے، یادگار غالب میں مولانا حالی نے ایک لطیفہ بھی لکھا ہے جو اشاعت اول میں موجود ہے لیکن بعد کی اشاعت میں حذف ہو گیا ہے،

صہبائی کی رائے پنج رقعہ اور مینا بازار کی نسبت یہ تھی کہ یہ دونوں ۔۔۔۔ ظہوری کی ہیں، مگر مرزا

مولانا حالی نے اس کے خارج کرنے کی کوئی وجہ نہیں لکھی (اس حصہ کو میرے کرم فرما قاضی عبد الودود نے لکھ کر بھیج دیا ہے)

جدش نیز ارادت خاں خطاب داشت، از امرائے کلاں جہانگیری بودہ، و واضح صبیہ زادۂ جعفر قزوینی ملقب بہ آصف خاں ست عمر دراز یافت، در عہد فرخ سیر برحمت حق پیوستہ، در انشا کمال مہارت داشت، مینا بازار ظہوری کہ دریں زماں نہایت شہرت دارد گویند از انشائے واضح است۔" (ورق ۹۹۱)

بعض لوگوں نے آخری جملے سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ احمد علی کے نزدیک مینا بازار کا مصنف ظہوری ہی تھا، لیکن میرے خیال میں یہ توجیہ غلط ہے، کیونکہ احمد علی بھی حقیقتاً اس کتاب کو ظہوری کی ملک سمجھتے تو اسی ظہوری کے ذیل میں بیان کرتے، چونکہ انھوں نے واضح کے ذیل میں اس کو درج کیا ہے، اس سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اگرچہ مینا بازار عام طور پر ظہوری کی مشہور ہے لیکن بعض لوگ اسے واضح کی بھی بتاتے ہیں، اور مصنف بھی آخر الذکر گروہ کا ہم خیال ہے، اس لیے واضح کی انشا پردازی کی تعریف کے بعد مینا بازار کا ذکر اسی قیاس کا موید ہے، میرا خیال یہ ہے کہ احمد علی نے مرزا قتیل کی چار شربت سے پورا استفادہ کیا ہے، قتیل نے بھی لکھا ہے کہ اگرچہ مینا بازار وغیرہ ظہوری کی طرف عام طور پر منسوب ہیں لیکن واقعہ اس کے برعکس ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں:- (ص ۶۷)

از مترشحات کلک غرائب انچہ مشہور و متداول است چار نسخہ است، سہ نثر و حسن و عشق و بازار زنانہ و پنجرقعہ . . . . لیکن افزونی رتبہ سہ نثر از چیزہائے دگر . . . . بدیہی، و ایں حسن منحصر است در نورس و گلزار ابراہیم و خوان خلیل نہ در نثرہائے دیگر کہ با و نسبت دہند،

آپ نے ملاحظہ کیا مشہور تو ظہوری کی ہے لیکن حقیقت کچھ اور ہے،

(۹) ابراہیم زبیری نے بساتین السلاطین (۱۲۴۰ھ) میں ظہوری کی نثری تصنیف[1] میں صرف اس کے تینوں دیباچوں یعنی سہ نثر کا ذکر کیا ہے، ابراہیم زبیری بیجاپور کا اہم مصنف ہے، اور گو اس کے بعض بیان میں غلطیاں پائی جاتی ہیں، مگر ظہوری کے بارے میں اس کا بیان بہت زیادہ قابل توجہ ہے، کیونکہ

---

[1] ورق ۱۲۵

شیخ علی بخش بیمار

از جناب کلب علی خاں صاحب رامپوری

ان کے والد کا نام شیخ غلام علی اور وطن شہر بانس بریلی تھا جس قدر ان کے کلام کو شہرت حاصل ہوئی اتنے ہی انھیں گمنامی ملی ، بریلی میں کہاں رہتے تھے کس سے تعلیم پائی اور کب وطن سے نکلے ، یہ تمام امور پردۂ راز میں ہیں ، تذکروں میں جو کچھ ان کے بارے میں لکھا گیا ہے ، وہ یہ ہے[1]:

"شاگرد میاں مصحفی ، مرد خوش فکر و خوش مذاق ، حسن کلام سے مشہور آفاق تھے ، جب اس دار الریاست میں آکر سرکار کے ملازموں میں داخل ہوئے ، یہاں احمد غفلت کا دور دورہ تھا ، مصحفی ان کے شاگردوں میں شامل ہوئے ، سرسٹھ برس کی عمر ہوئی ، چوبیسویں ربیع الاول ۱۲۷۱ھ میں رحلت کی . کلام تلف ہو گیا"

صاحب گلستان سخن کا بیان ہے[2]:

"بیمار تخلص ہے ، شیخ علی بخش ساکن سنبھل ، فارسی میں استعداد کامل ہے اور ریختہ گوئی میں عبارت تمام و الفاظ کی شستگی اور زبان کی پاکی احاطۂ بیان سے خارج ہے ، سرکار محمد سعید خاں والی رامپور میں سخن بندی وسیلۂ تحصیل معاش ہے اور رئیس مذکور کی فرمائش سے کوئی جلد بوستان خیال کی کہ فسانہ ہے عجیب اور داستان ہے غریب اردو میں نظم کرتا تھا معلوم نہیں اختتام کو پہنچایا یا نہیں"

[1] انتخاب یادگار ، مؤلفہ امیر احمد امیر مینائی ص ۸۱ و ۸۲ (تاج المطابع رامپور ۱۲۹۷ھ) [2] گلستان سخن ۱۲۷۱ھ

ملفوظ از قادر بخش صابر ، مطبع مرتضوی دہلی ص ۱۶۳ ۔

اس کے خلاف تھے۔ ایک جلسے میں دونوں موجود تھے، اتفاق سے یہ ذکر چھڑ گیا، مرزا نے کہا "قطع نظر اس کے کہ سہ نثر اور پنج رقعہ و مینا بازار کی طرز میں بون بعید ہے، ظہوری کی شان سے نہیں کہ وہ نثر کے ساتھ نظم نہ لکھے، تمام سہ نثر میں ایسا ایک صفحہ مشکل سے ملے گا جس میں نثر ہو اور نظم نہ ہو، برخلاف اس کے پنجرقعہ و مینا بازار میں ایک شعر[1] کے سوا کہ وہ بھی ظہوری کا نہیں نظم کا کہیں پتہ نہیں۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جو شخص نظم و نثر دونوں ..... پر برابر قدرت رکھتا ہو اس کی نثر میں کہیں نظم نہ پائی جائے"۔ صہبائی نے کہا "ایسے اتفاقات اکثر ہو جاتے ہیں، یہ محض اتفاق کی بات ہے"۔ مرزا نے کہا "بیشک؛ مگر یہ ایسا اتفاق ہوگا کہ ایک شخص ہر لحاظ سے نہایت سنجیدہ، شائستہ اور معقول اگلے[2] کا آدمی ہے مگر اتفاق سے کاٹنے کھاتا ہے"۔ یہ سن کر سب لوگ ہنس پڑے اور صہبائی مسکرا کر خاموش ہو رہے۔

(یادگار غالب طبع اول ص ۶۷)

آپ نے ملاحظہ کیا کہ غالب نے دو وجوہ بیان کیے ہیں، جن کی بنا پر وہ مینا بازار وغیرہ کو ظہوری کی تصنیف شمار نہیں کرتے تھے (۱) مینا بازار وغیرہ کے طرز میں اور سہ نثر کے طرز میں بڑا فرق ہے، (۲) ظہوری کی نثر نظم آمیز ہوتی ہے اور مینا بازار وغیرہ نظم سے یکسر خالی ہیں، ان دونوں باتوں میں بڑا وزن ہے صہبائی نے محض اتفاق کا سہارا لے کر اپنی بات غیر مدلل کر دی،

(۱) مولف جام جہاں نما (تیرہویں صدی) نے ظہوری کی بابت یہ اطلاع[3] بہم پہنچائی ہے،

"در نظم و نثر ید بیضا داشتہ. صاحب طرز بودہ۔ اشعار دیوانش بیچ دار، و استعارات بلیغ دارد، خطبۂ نورس و خوان خلیل و گلزار ابراہیم بنام ابراہیم عادل شاہ خوب نوشتہ"۔

اس مؤلف نے بھی نثری تصنیف میں صرف ان ہی تین دیباچوں کا ذکر کر کے اس قیاس کی تائید کی ہے کہ مینا بازار وغیرہ ظہوری کی تصنیف نہیں۔	(باقی)

---

[1] مگر یہ صحیح نہیں، پنجرقعہ میں ۵ شعر ہیں جن میں ایک نظری کا ہے، اور مینا بازار میں دو شعر ہیں جن میں ایک ظہوری کے ساقی نامہ کا ہے۔
[2] یہ الفاظ غلط نامے سے بڑھائے گئے ہیں [3] جلد ۲ ورق ۱

ف نمبر ۴ جلد ۵۵،

بیمار شیخ علی بخش از مشاہیر سخنوران سنبھل مراد آباد بود از مصحفی باستفادہ گفتار پرداخت سلسلۂ ملازمت بہ رام پور افغانان داشت اوصاف او مستغنی از بیان است پرواز طائر خیالش بالاتر از گمان است' قوت بیان و لطف زبان او اگر از میر و مصحفی بیش نیست' ایں ہم نتواں گفت کہ کمتر است ہاں تقدم زبانی و تجدد زبانی چیزے دیگر است۔"

صاحب خمخانۂ جاوید[1] کی رائے ہے:

"بیمار..... شاگرد رشید میاں مصحفی و احمد خاں غفلت۔ فارسی، عربی میں استعداد کامل رکھتے تھے، طبیعت مضمون خیز اور زبان نہایت صاف و شیریں پائی تھی۔ نواب محمد سعید خاں کی فرمائش سے بوستان خیال کے کچھ حصوں کا اردو نظم میں ترجمہ کیا تھا..... رام پور، مراد آباد میں ان کے شاگرد بکثرت تھے، جن میں منشی امیر حسین تسلیم سہسوانی نے درجہ امتیاز پایا، سوز و درد کے مضامین بالخصوص نہایت مؤثر و دلکش پیرایہ میں نظم کیا کرتے تھے۔"

مذکورہ بالا رایوں کی موجودگی میں اتنا تو واضح ہوگیا کہ ان کے کلام کے سبھی معترف ہیں۔ نساخ نے "عرض نامہ" میں دھوکا کھایا ہے، سکونت مختلف ظاہر کی گئی ہے، ہماری رائے میں سید نور الحسن خاں صاحب کے بیان کا ماخذ بظاہر مستند ہی ہوگا، بیمار آنولہ سے حکیم سعادت علی خاں صاحب کے ذریعہ نواب سعید خاں کے زمانہ میں (رام پور) ملازم ہوئے۔ البتہ مصحفی کی شاگردی کا مسئلہ اہم ہے۔ ریاض الفصحا میں جو ۱۲۳۶ھ میں ختم ہوئی ان کا تذکرہ نہیں، حالانکہ ان کا سنہ ولادت ۱۲۰۴ھ ہے، اسی طرح تذکرۂ گلشن بے خار میں بھی ان کا ذکر نہیں ہے، یعنی ۱۲۵۰ھ تک ان کی شہرت دہلی نہیں پہنچی تھی، ڈاکٹر فیلن اور کریم الدین کا تذکرہ ۱۸۴۷ء میں مرتب ہوا، اس میں بھی ان کا ذکر نہیں ملتا، پہلی بار مرزا قادر بخش ۱۲۶۰ھ میں گلستان سخن میں ان کا ذکر کرتے ہیں، اور ربیع الاول ۱۲۷۰ھ میں ان کا انتقال ہوگیا، خواہر زادہ احمد خاں غفلت

---

[1] خمخانۂ جاوید جلد اول ص ۴۸۴ و ۴۸۵ مؤلفہ لالہ سری رام ایم۔ اے۔

صاحب[1] لکھتے ہیں :-

"بیمار شیخ علی بخش متوطن قدیم بریلی اگر در رام پور وطن گزید از علم بہرۂ وافی نداشت ہر آئینہ مشق بجائے رسانیدہ شعر می گفت بسیارے از صاحب زادگان اہل خاندان از و اصلاح می گرفتند از ان جملہ صاحبزادہ مہدی علی خاں بہادر تخلص نحیف بہ عایت تخلص استاد شاگرد خوش بودند، کلام او در رام پور بسیار موجود است، بہ ہمیں اکتفا نمود مشتے از خروارے زیادہ از بست سال می گذرد کہ ازیں جہاں درگذشت"

ناسخ[2] صرف نام میں اختلاف ظاہر کرتے ہیں :-

بیمار تخلص شیخ الٰہی بخش شاگرد غفلت باشندہ رام پور ملازم نواب محمد سعید خاں بہادر والیِ رام پور صاحب دیوان گذرے بعض صاحب تذکرہ نے ان کا نام علی بخش لکھا ہے"

سید نور الحسن خاں نے سب[3] سے زیادہ تفصیلات دی ہیں :

شیخ علی بخش از خاک ایک قصبہ آنولہ متعلقہ کمشنری بریلی۔ زادوائل عمر سودائے سخن گوئی در سر می داشت، در شباب شوق لکھنؤ گذر کرد و در تلامذۂ مصحفی انتظام یافت، بہ کمال شہرت سخن او نواب محمد سعید خان سروری آراے ریاست رام پور بواسطہ حکیم سعادت علی خاں بہادر جنرل فوج منصب داشتند با صرار رئیس محتشم الیہ شاگردیٔ اخوان زادہ احمد خاں غفلت تخلص رامپوری اختیار نمود صاحب زبان مغز دار است داد تا قیامت کار چندیں دیوان غزلیات و قصائد فراہم آورد و پریشاں ساخت"

سید علی حسن[4] کا بیان اس سے مختلف ہے، وہ میر مصحفی کی صف میں لے آتے ہیں، چنانچہ لکھتے ہیں :

---

[1] تذکرہ شعرائے رامپور (مخطوطہ)، مؤلفہ جارج فالتون صاحب وجر جیس (سنہ تالیف تخمیناً ۱۲۹۰ھ) [2] سخن شعرا، پریس لکھنؤ ۱۸۷۴ء مؤلفہ مولوی عبد الغفور خاں نساخ [3] طور کلیم، از سید نور الحسن خاں، مطبع مفید عام آگرہ (۱۲۹۸ھ)

[4] بزم سخن، از سید علی حسن خاں، مطبع مفید عام آگرہ (۱۲۹۸ھ) ص ۲۵

ان کے سپرد ہوا، اس کام کو بیمار نے خوش اسلوبی سے انجام دیا، اور یہ داستان نثر میں موجود ہے، اسکے نظم کیے جانے کا جن تذکرہ نویسوں نے ذکر کیا ہے وہ بے بنیاد ہے، ورنہ کوئی حوالہ انتخاب یادگار میں ضرور ملتا، ان کے رام پوری شاگرد نظام ۱۲۸۹ھ میں فوت ہو چکے تھے، مگر سید احمد علی رسا زندہ تھے، ان کے شاگردوں کی تعداد رام پور ہی میں زیادہ نظر آتی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رامپور میں ان کے رنگ سخن نے اعتبار کا درجہ حاصل کیا، اور رام پور کی سکونت کے باعث مقامی اصحاب ہی سلسلۂ تلامذہ میں داخل ہوتے رہے، ان کے شاگردوں میں سید احمد علی رسا اور سید نظام شاہ نظام رامپوری کو استادی کا درجہ حاصل ہے، ان دونوں شاگردوں سے رامپور اور بیرون رامپور ان کا سلسلہ جاری ہوا، منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی کا شمار صاحب خمخانۂ جاوید نے بیمار کے شاگردوں میں کیا ہے، تسلیم کے شاگرد راجہ کشن کمار وقار رئیس سہسپور بلاری تھے، اور نظام کے بیرونی سلسلہ میں ان کے شاگرد رشید مولوی ابوالحسن ساکت (۱۸۹۵ء) امروہوی سے سلسلہ چلا، میر کرامت علی خلش اجمیری، مولوی غلام نبی شاعر، میر عباد حسین شمیم امروہوی وغیرہ ساکت کے شاگرد تھے،

بیمار کے حسب ذیل شاگرد انتخاب یادگار سے درج کیے جاتے ہیں :-

(۱) سید احمد علی رسا متوفی محرم ۱۳۰۹ھ

(۲) سید نظام شاہ نظام " ۱۲۸۹ھ

(۳) صاحبزادہ اصغر علی خاں افگار (۱۲۹۰ھ) میں زندہ تھے،

(۴) صاحبزادہ امیر اللہ خاں امیر (" ")

(۵) حاتم علی خاں بیچین "

(۶) حاتم خاں تسلیم متوفی ۱۲۷۲ھ

(۷) مبارک شاہ خاں خانزادہ ۱۲۹۰ھ میں زندہ تھے،

کی شاگردی پر امیر بھی طنز کرتے ہیں، اور نورالحسن خاں بھی، اگر واقعی غفلت اُن کی استادی کے سزاوار تھے تو نواب محمد سعید خاں کے اصرار پر بھی بیمار کو ان کا تلمذ اختیار نہ کرنا چاہیے تھا، شاگردی کی یہ پہلی عجیب و غریب نوعیت بیان کی گئی ہے، جو نہایت مضحکہ خیز ہے، اگر یہ صورت کسی عہد میں بھی جائز سمجھی جاتی تو نواب کلب علی خاں خلد آشیاں کے عہد میں بھی اس کا اعادہ ہونا چاہیے تھا، جب کہ امیر مینائی استاد نواب تھے، لیکن کسی نے بھی اس غلط تاویل کو قبول نہیں کیا، نواب محمد سعید خاں کے عہد کے تین سال غفلت نے دیکھے اس دور میں ان کو نہ کوئی منصب ریاست میں حاصل تھا اور نہ ذاتی تقرب، پھر کس طرح کسی کو ان کی شاگردی پر مجبور کیا جاتا، اور اگر اس کو وطن دوستی پر محمول کیا جائے تو پھر لکھنؤ اور دہلی کے تمام اساتذہ کو اس پر مجبور کیا جاتا کہ وہ ہر رئیس کے عہد کے مقامی شعرا، اور ادبا کے سامنے زانوے تلمذ تہ کریں، دراصل اس داستان کے وضع کرنے میں صرف یہ جذبہ کارفرما تھا کہ رام پور کی شاعری اور ادبا کبھی قابل اعتنا نہ تھے، اور وہ بیرونی لوگوں کے طفیل میں ترقی حاصل کرتے رہے، غفلت، مصحفی سے ملنے لکھنؤ گئے تھے، اور مصحفی نے ان کی مثنویوں اور قصائد کی تعریف کی تھی، رام پور میں ان کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع تھا، یہ ضرور ہے کہ انھوں نے مضامین کی بلندی غزل میں بھی ضروری سمجھی اور تشبیہ استعارے اور فارسی تراکیب کو کلام میں داخل کیا اور اسی سبب سے مصحفی نے ان کی غزل کی تعریف کی لیکن قصائد اتنے بلند ہیں کہ ذوق کے قصائد سے کم نہیں بلکہ سودا کے قصائد سے لگا کھاتے ہیں غفلت کی شاگردی پر خود بیمار کو ناز تھا، چنانچہ کہتے ہیں ؎

نہ اصلاحِ جنابِ غفلت اے بیمار گر ہوتی ۔۔۔ تو معنی بھی نہ رکھتا شعر کوئی تجھ سخنداں کا

یہ تو ممکن ہے کہ وہ مصحفی کو دو ایک غزلیں ۱۲۳۶ھ کے بعد دکھا چکے ہوں، مگر وطن کی قربت کرتے ہوئے گمان غالب یہی ہے کہ انھوں نے غفلت ہی سے اصلاح سخن حاصل کی،

فارسی میں معقول دست گاہ رکھتے تھے، غالباً ۱۲۵۷ھ میں طلسم بیضا (بوستان خیال) کا

ز بیضۂ ہدہد سلیمان پرید رنگ رخِ مسیحا مصورِ آفتاب و زہرہ بزیرِ خامہ صور دارد

اب دیکھنا یہ ہے کہ بیمار نے معاصرین سے جدا راستہ اختیار کیا یا اسی پرانے راستہ پر چلتے رہے جس سے عوام و خواص سب بیزار ہو چکے تھے، اس لیے ہم ان کی لکھنوی رنگ سے ملتی جلتی ہوئی ایک غزل درج کرتے ہیں اور اسی کے ساتھ آتش و ناسخ کی ہم طرح غزلیں بھی درج کی جاتی ہیں، تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ بیمار نے لکھنوی رنگ میں بھی انفرادیت باقی رکھی تھی یا نہیں ؎

بیمار

تصور بندھ گیا دل پر سوادِ زلفِ جاناں کا قیامت پر سحر ہوتا رہا شامِ ہجراں کا

شرارِ آہ و شورِ نالہ و دردِ دل و گریہ سماں دکھلا رہا ہے برق و رعد و ابرِ باراں کا

اٹھا اس واسطے وہ جھاڑ کر دامن کو دیکھو تو پہنچتا چاک دامن ہے کس کس کے گریباں کا

شکستِ رنگ و کسرِ استخواں و دم کا اکھڑ جانا بلا کیا کیا نہ لایا توڑنا اس بت کے پیماں کا

کمندِ زلف کے گر یار کھینچے پیچ ہے دل تو آکر طوق ہو جاتا ہے بالا گردنِ جاں کا

جو زخموں پر رفو ہوئے سئے جائیں چڑھیں بخیے تو بچ جاتا ہے گھاؤ خنجر و شمشیر و پیکاں کا

نہ اس جا کام بخیہ کا، نہ ٹانکوں کا نہ مرہم کا جسے کیا خاک زخمی چشمکِ ابرو و مژگاں کا

ناسخ

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

چمکنا برق کا لازم پڑا ہے ابرِ باراں میں تصور چاہیے رونے میں اس کے روئے خنداں کا

جنوں نے ہجر کی شب ہاتھ دوڑایا ہے جب اپنا کیا ہے چاک تا جیبِ سحر اپنے گریباں کا

وہ شوخ فتنہ انگیز اپنی آنکھوں میں سمایا ہے کہ اک گوشہ ہے صحرائے قیامت جس کے داماں کا

تصور نے رکھا زنداں میں بھی فارغ مجھے غم سے سماں ہے خانۂ زنجیر میں بھی بزمِ جاناں کا

(۸) سید محمد جعفر عرف میاں جعفر شاہ شفاؔ (۱۲۹۰ھ) میں زندہ تھے،

(۹) مجتبیٰ خاں محوؔ " "

(۱۰) مہدی علی خاں مہدیؔ " "

(۱۱) سید جعفر شاہ واثقؔ " "

(۱۲) عبد القادر خاں واقفؔ " "

(۱۳) ہدایت علی خاں ساکتؔ متوفی ۱۲۷۹ھ

صاحبزادہ مہدی علی خاں نجفؔ متوفی ۲۷ رمضان ۱۲۸۹ھ کو صاحب (مؤلف تذکرہ شعرائے اردو) نے شاگرد بیمار ظاہر کیا ہے، اور امیر مینائی انتخاب یادگار میں شاگرد ناظمؔ لکھتے ہیں،

رساؔ کے بیٹے سید عابد حسین اوجؔ کہنہ مشق شاعر تھے، اور ان کو رام پور میں مرتبۂ استادی حاصل تھا، شعرائے رام پور کی کافی تعداد نے ان سے فیض اصلاح حاصل کیا، ان کے علاوہ انتخاب یادگار میں ستائیس ۲۷ شاعروں کا ان کے شاگردوں کے زمرے میں حوالہ دیا گیا ہے، ساکتؔ کے علاوہ محمد بشیرؔ بشیر، لالہ چھبیلے لال بہارؔ، مبارک علی خاں عاصیؔ، احمد نور خاں مکدرؔ، حافظ شیخ محمد یعقوب یعقوبؔ بھی ان کے شاگردوں میں تھے،

اسی رامپوری اسکول کا اثر تھا کہ لکھنؤ اور دہلی دونوں اسکولوں کے شعراء غدر کے بعد یہیں جمع ہوئے اور دونوں نے اپنی اپنی انفرادیت کھو کر ایک نیا رنگ پیدا کرکے ملک میں رائج کیا، رامپوری اسکول تفصیل چاہتا ہے، مگر اس موقع پر اشارہ ہی پر اکتفا کی جاتی ہے،

رضا لائبریری رام پور میں ۱۲۴۵ھ کی ایک مکتوبہ بیاض میں ایک شعر فارسی غزل کا حسب ذیل تعارف کے ساتھ ملتا ہے:-

شعر غزل معنی پیچ ندارد من تصنیف شیخ علی بخش متخلص بہ بیمار دام مجدہ ؎

ہمصفیرو ہوش پراں ہیں اڑا جاتا ہے دل   مائل پرواز جب سے گلستاں کا رنگ ہے

سادگی میں پرکاری بیمار کا نمایاں وصف اور ساحرانہ انداز میں عشق و محبت کا بیان ان کا خاص حصہ ہے، اور تمام تذکرہ نویس اس کے رطب اللسان نظر آتے ہیں، مومن خان مومن اور [illegible] بھی اس کوچہ کے رہ نورد ہیں، لیکن بیمار کو اس رنگ کا خاتم کہا جا سکتا ہے، ان اشعار سے کون نہ مسحور ہوگا،

آنکھ نیچی ہوگئی چپکے ہی دم دیتے بنی   موت مانگی دل نے فرقت میں تو جی شرما گیا

اے اجل شام ہجر آ پہنچی   اب تجھے انتظار ہے کس کا
آپ بیمار ہم ہوئے رسوا   سرنگوں راز دار ہے کس کا

غش میں پڑتا ہوں ظالم ہنس کے رو دیتا ہوں میں   مہربانی پر تری دشمن کو نازاں دیکھ کر

مسجد میں پی شراب پڑھی دیر میں نماز   بیمار کو شعور کسی بات کا نہ تھا

کوئی ان کے در تک نہ پہنچا سلامت   لٹے راہ میں کارواں کیسے کیسے

ہر ذرہ پھر جاتے ہیں نزدیک مرے آ کر   کچھ جذب محبت کو لگی ہے نظر ایسی

بیاں ہو عیب طبیعت یہ ہو چکا مجھ سے   خدا کرے کہ نہ پوچھیں وہ مدعا مجھ سے
کیا سفر کا ارادہ جو بزم جاناں سے   کوئی گلے نہ ملا موت کے سوا مجھ سے
دلا تو آنکھ سے مرتا ہوں جس کی گردش پر   یہ کس زباں سے کہوں یار پھر گیا مجھ سے
غریب یار کا شکوہ زباں پہ آ جاتا   بھلا ہوا جو مرے دل نے کی دغا مجھ سے
کھیل سمجھی ہیں یہ نازک مزاجیاں بیمار   کہ اٹھ سکی نہ حسینوں کی التجا مجھ سے

دل دھڑکتا ہے یہ کہتے ہوئے اس محفل میں   یہاں کسی کو خفقان کی بھی دوا آتی ہے

گرمی رنگ ہے زمانے کا   باز آیا میں کفر و ایماں سے

کفن کی جب سفیدی دیکھتا ہوں کنج مرقد میں
تو عالم یاد آتا ہے شب مہتاب ہجراں کا

کسی خورشید رو کو جذب دل نے آج کھینچا ہے
کہ نور صبح صادق ہے غبار اپنے بیاباں کا

آتش

دواں رکھتا ہے خون آنکھوں سے ہجر اک ماہ تاباں کا
شفق آلودہ رہتا ہے ہلال اپنے گریباں کا

چمک جانے سے اس کے بند ہو جاتی ہیں جو آنکھیں
یہ دھوکا برق دیتی ہے تمہارے روئے خنداں کا

خوشحال اس کا جنوں سے جو برہنہ ہے
گریباں گیر ہے کوئی، نہ دامن گیر عریاں کا

گریباں گیر قاتل ہونگے ہم فردائے محشر کو
ہمارا محضر خوں ہے ہر اک پاٹ اپنے داماں کا

پھنسے ہیں بسکہ دل سودا زدوں کے تری زلفوں میں
ہر اک موئے رسا پر اُنکے عالم ہے رگ جاں کا

نشاں تیروں کا آنکھوں کی محبت نے بنایا ہے
اُدھر پھر جاتے ہیں ہم رخ جدھر پھرتا ہے مژگاں کا

عدم کو بازگشت روح ہے اک روز ہستی سے
ارادہ بندہ رہا ہے مصر سے یوسف کو زنداں کا

بلندی مضامین ان کا خاص حصہ ہے، اور وہ اس میں ایسے مضامین شگفتہ اور دلفریب طرز سے ادا کرتے ہیں کہ معاصرین میں اس کی نظیر نہیں ملے گی ؎

کی نسیم صبح نے طرز زلیخائی پسند
یوسف گل چاک تیرا پیرہن ہو جائیگا

قربان جایئے ترے شوق ظہور کے
دے کر فریب خاک میں ہم کو ملا دیا

گر حیا سے خود فروشی کی اجازت مانگتا
وہ دو عالم ایک نظارہ کی قیمت مانگتا

انتظار یار میں ہوتیں اگر آنکھیں سفید
پنجۂ مژگاں ید بیضا سے بیعت مانگتا

کہہ دو خیال نرگس مخمور یار سے
دل خانۂ خدا نہ ہوا میکدا ہوا

رحم اے وحشت بہت بیباک ہے وہ بدگماں
گالیاں دے گا مرا ٹکڑے گریباں دیکھکر

عذاب آتش فرقت سے کانپتا تھا دل
ہزار شکر جہنم ملا سزا کے لیے

خالص لکھنوی رنگ کے دو چار اشعار بھی ڈھونڈھے سے ان کے کلام میں مل جاتے ہیں، گو اس زمانہ میں مذاق بدل چکا تھا، لیکن سودا و میر کے دیوان بھی اس رنگ کے اشعار سے خالی نہیں ہیں مگر بیمار کی زبان کی صفائی نے ان کو بھی بامزہ بنا دیا ہے، چند شعر ملاحظہ ہوں،

موباف سرخ چوٹی سے کیا انکی کھل پڑا — اک صاعقہ سا دل پہ مرے ناگہاں گرا

رونقِ رنگِ مسی گر وہ دہن ہو جائیگا — غنچۂ سوسن پہ گلچیں خندہ زن ہو جائیگا

گر ترا دھانی دوپٹہ دیکھتا وہ سیم تن — چاندنی کا کھیت بھی بارانِ رحمت مانگتا

دل کے ڈسنے کو بن گیا ناگن — نیلا ڈورہ تری کلائی کا

جوں شفق میں نظر آتی ہو کرن سورج کی — نکلے وہ سرخ دوپٹہ پہ مسلسل ٹانکے

اب ایک عام انتخاب دیا جاتا ہے، جس سے ان کے رنگ اور طرز کلام کا اندازہ ہوگا،

کون پرساں ہے حال بسمل کا — خلق منہ دیکھتی ہے قاتل کا

جانکنی عاشقی سے آساں ہے — کام مشکل ہے کاوشِ دل کا

لبِ جو کون سیر کو آیا — موج منہ چومتی ہے ساحل کا

مردنی پھر گئی مرے منہ پر — رنگ بدلا نہ ان کی محفل کا

سانس آہستہ لیجیو بیمار — ٹوٹ جائے نہ آبلہ دل کا

نصیب ہم کو ملا سنگ رہگذر کا سا — کہ ٹھوکروں میں رہا سر کا عمر بھر کا سا

میرے رونے پر نہ تجھ کو مسکرانا چاہیے — شق دلِ پُر درد اے غنچہ دہن ہو جائیگا

اللہ رے اضطراب اسیرانِ دام کا — صیاد حیلہ پیشہ نے دل کو ہلا دیا

نہ بناتا جو دن جدائی کا — کیا بگڑ جاتا تری خدائی کا

مختصر بھی اگر لکھا نہ گیا — حال طولِ شبِ جدائی کا

کس کی طاقت ہے کہ اس در سے اٹھے — ناتوانی کا بھروسا ہے مجھے

کھینچ پردہ پہ تصور سے شبیہ جاناں — ڈال اے چشم وہ پرواز کہ پردا اٹھ جائے

جنت میں حیاتِ ابدی خاک ملے گی — دنیا میں تو مانگے نہ ملی موت خدا سے

دلِ مجروح میں قاتل کی ادا پھرتی ہے — رات دن سامنے آنکھوں کے قضا پھرتی ہے

خدا سے تجھ کو صنم مانگتا تو مل جاتا — مگر ادب نے اجازت نہ دی دعا کے لیے

سن کر معاملے ترے اہلِ نیاز سے — لایا جو تھا وہ بھول گئی التجا مجھے

میر نے یاس و غم کو بہم کرکے بہتر نشتر مہیا کیے ہیں، بیمار کے نشتر ملاحظہ ہوں،

قحط شاید درد الفت کی دوا کا ہو گیا — زہر جو دینا مجھے ان کو گوارا ہو گیا

اب کلیجا منھ کو آتا ہے پھٹا جاتا ہے دل — بس ہجوم یاس دل گھبرا گیا اکتا گیا

کیا یاس کو روئیں کہ نہ تھی چشم تر ایسی — ہچکی نہ لگی رہتی تھی دو دو پہر ایسی

بیمار کو غفلت ہے بہت خیر نہیں آج — ہر چند کہ تھی حالتِ غش کل بھی پر ایسی

بنی ہے جی پہ دم الٹے ترا بیمار بھرتا ہے — پر اس سختی میں بھی تیرا ہی دم اے یار بھرتا ہے

خمریات اگرچہ خمریات کے چند ہی شعر ہیں، مگر کیفیت سے خالی نہیں،

دانت کس کا ہے جام پر ساقی — مے ٹپکتی ہے ابر نیساں سے

محتسب مے کو بتاتا ہے حرام — اس بہکنے کا اچنبھا ہے مجھے

خدا مے کشوں پر بہت مہرباں ہے — دیے ابر کے سائباں کیسے کیسے

انبوہ میکدے میں جو محشر سے کم نہیں — کیا غم ہے خم تو چشمہ کوثر سے کم نہیں

کون دنیا سے بادہ خوار اٹھا — چشم تر ابر نو بہار اٹھا

ابر ہوا ہے آئی ابھر پیشتر کی چوٹ — لا ساقیا شراب کہ سینکیں جگر کی چوٹ

خواجہ عطار اور وحدت الوجود

از جناب ڈاکٹر محمد احمد حسب صاحب صدیقی لکچرار شعبۂ عربی الہ آباد یونیورسٹی

بس اتنے پر ہوا ہنگامۂ دار و رسن برپا
کہ لے آئینہ کیوں آغوش میں تہ و رخشاں کو

مسلمانوں میں ایسے بزرگ بکثرت پیدا ہوئے جنھوں نے عربی و فارسی و اردو میں سرمدی ترانے سے اور کوثر و تسنیم میں دھلی زبان اور ملکوتی لب ولہجہ میں واردات قلبیہ اور جذبات دلی ایسے جوش و وارفتگی سے بیان کیے کہ دوسرے انسان ان کی دلی سوزش و تپش سے متاثر ہوئے، فارسی میں اگرچہ بہت سے شعراء ایسے گذرے ہیں جنھوں نے صرف تصوف و اخلاق ہی کے مضامین بیان کیے ہیں، لیکن جب سے میں نے شیخ مکی کے قلمی رسالہ سے وحدت الوجود کا ٹکڑا شائع کیا ہے اس وقت سے مجھے ایسے شعراء کے کلام کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا جنھوں نے مسئلۂ وحدت الوجود میں ڈوب کر اشعار کہے ہوں اور اس مسئلہ کو اپنا خاص موضوع بنایا ہو، اور اسکے بیان میں شہرت و امتیاز حاصل کیا ہو، ایسے بزرگ دو ہیں، ایک خواجہ فرید الدین عطار اور دوسرے مولانا جلال الدین رومی۔

یوں تو فارسی شعراء میں سعدی، امیر خسرو، خواجہ حسن، خواجہ حافظ، ابوسعید ابوالخیر، اوحدی سنائی، عراقی، مغربی وغیرہ بہت سے شعراء نے عشق حقیقی کا اظہار اپنے کلام میں کیا ہے، اور اس لحاظ سے یہ شاعری کے مشاہیر ہیں، لیکن ہمارا مقصد وحدت الوجود کا موضوع ہے اور اس کے سب سے بڑے شارح و مبلغ یہی دونوں ہیں،

کل تھے رندی کے مجتہد بیمار
آج دعویٰ ہے پارسائی کا

دردِ تنظیم مرگ کو دل میں
شب فرقت ہزار بار اٹھا

بدلی نہ وہ نگاہ زمانہ بدل گیا
تیر قضا وہی ہے نشانہ بدل گیا

تقریر جس گھڑی لب مطلب تک آگئی
بہکا یہ قصہ خواں کہ زمانہ بدل گیا

نغمہ قفس میں نالۂ بلبل نہ ہو سکا
نوحہ سے لاکھ بار ترانہ بدل گیا

قحط شاید درد الفت کی دوا کا ہو گیا
زہر جو دینا مجھے ان کو گوارا ہو گیا

کیا ہی چپکا ہوں نہ راز عشق کہنا تھا مجھے
بت پرستی کا کس و ناکس میں چرچا ہو گیا

امتحاں ان کو لب جاں بخش کا منظور ہے
اب مجھے بھی اپنے جینے کا سہارا ہو گیا

جس کسی نے دل دیا ان کو چھپے چوری دیا
ایک میں کمبخت ناداں تھا کہ رسوا ہو گیا

کھا گئے تھے وہ تو مجھ سے بے نقابی کی قسم
کیوں خداوندا قمر کا رنگ پھیکا ہو گیا

شک نہیں اپنے صنم کی بے نیازی میں نہیں
دل کے لینے کا خدا جانے سبب کیا ہو گیا

ہائے رے شوخی کہ آپہنچا جو وہ گھر تک مرے
پھر گیا دربان سے یہ کہہ کر دھوکا ہو گیا

دل سلگتا نہیں جو اے بیمار
منہ سے نکلا ترے دھواں کیسا

یہ مرا عالم ہے برہم زلف جاناں دیکھ کر
جس طرح کوئی اٹھے خواب پریشاں دیکھ کر

تری نگاہ میں ہیں ہوش و بیخودی دونوں
وہ سحر کیا ہے جو اس چشم فتنہ گر میں نہیں

اب اور آرزو نہ رہی اے خدا مجھے
کیا درد دل دیا کہ سبھی کچھ دیا مجھے

کچھ کچھ سمجھ لیا ہے مگر کوئے یار کو
بے امتیاز جانتے ہیں پارسا مجھے

کہتا ہوں اضطراب میں دل سے میں حال دل
اپنا مآل کار نہیں سوجھتا مجھے

سنکر مقابلے ترے بے اہل نیاز سے
لایا جو تھا وہ بھول گئی التجا مجھے

حضرات صوفیہ نے اس کا دعویٰ بھی کیا، مگر سمجھے کچھ نہ تھے، اس لیے ان بیانات پر کچھ شکوک و شبہات بھی کیے اور بعض نے تو سرے سے انکار ہی کر دیا، اس کے بعد جب اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی گئی تو وہ ذوقی حال، وہ وجدانی کیف اور وہ روحانی احساس ایک علمی اور استدلالی مسئلہ بن گیا اور ایک صاحبِ حال صوفی خانقاہ سے نکل کر مدرسہ کی قیل و قال میں جا پھنسا، پھر جب ایک شعر وہ تصوف سے بہ مراتب کمتر بلکہ اسی اصل کی نقل اور اسی حال کے مقابلہ میں محض قال کی حیثیت رکھتا ہے، طالب علموں میں پہنچکر چیخ اٹھتا ہے کہ "مرا بمدرسہ کہ برد" تو مسئلۂ وحدۃ الوجود جو تصوف کی بھی روح ہے، اور جو حسن و جمال کی طرح تحسین و آفرین (Admiration) کا تو متمنی ہے، لیکن فلسفیانہ عمل جراحی اور منطقیانہ لمس و بیقانی کی تاب نہیں لا سکتا، وہ کیونکر اسے برداشت کرتا، یہ ہے اس کے مشکل بننے کی وجہ سے

شد پریشاں خواب من از کثرتِ تعبیرہا

ہم ذیل میں تقریب فہم کے لیے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تحریر سے اس مسئلہ کا مختصر خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہیں،

۱- صرف حق تعالیٰ کی ذات و صفات و وجود تو اصل اور حقیقی ہیں، ورنہ جملہ کائنات کا اور انسان کا وجود محض عارضی اور عطاء حق ہے اور یہ وجود حق تعالیٰ کا محض ظل و سایہ ہے، ایسے وجود کو "وجود ظلی" کہتے ہیں۔

۲- حق تعالیٰ کے وجود کے سامنے ہم جیسے دنیادار اور بے عقل اپنے وجود کو الگ وجود، اپنی صفت یا کمال کو الگ اور مستقل صفات یا کمال مان لیں تو مان لیں ورنہ انصاف یہ ہے کہ جب نہ وجود اپنا، نہ کوئی وصف و کمال اپنا اور نہ ان کو اپنے اندر باقی رکھنا اپنے بس میں تو آخر کیا عقل کی موت نہیں ہے کہ پھر بھی اپنے وجود کو الگ وجود اور اپنے کسی وصف و کمال کو اپنا مستقل

مسئلہ وحدت الوجود خود کوئی مشکل مسئلہ نہ تھا، بلکہ سرے سے یہ کوئی علمی مسئلہ ہی نہ تھا، یہ تو حقیقت میں ایک وجدانی کیفیت، ایک ذوقی حالت، ایک ایمانی و روحانی احساس ہے، عارف کے قلب و نظر پر جب یہ کیفیت شدت کے ساتھ مستولی ہو جاتی ہے تو وہ "حیرت جلوہ" میں بیخود ہو کر کبھی کبھی اس کا اظہار اور اس کو الفاظ میں منتقل کرنے کی کوشش کرنے لگتا ہے، اول تو محسوسات کو ملفوظات میں منتقل کرنا ہی نہایت مشکل کام ہے، پھر یہ مشکل اس وقت اور بھی سخت ہو جاتی ہے جب وہ بیانات ایسے لوگوں میں پہنچ جائیں جو اس راز کے محرم اور اس شراب کے جرعہ کش نہ ہوں، آپ وجدانی کیفیتوں اور لذتوں کو کسی بچہ کو سمجھانا چاہیں یا کسی نے پھل کا ذائقہ ایک ناواقف کو بتلانا چاہیں تو اس کی صورت اس کے سوا کیا ہے کہ آپ تقریب فہم کے لیے کچھ تشبیہ سے کام لیجئے کہیں استعارہ کا سہارا ڈھونڈھیے، کبھی مجاز کہیے، اور اس قبیل کے ذرائع اختیار کیجئے، اور اتنے پاپڑ بیلنے کے بعد بھی اس کی کیا ضمانت ہے کہ آپ سمجھانے میں کامیاب بھی ہو گئے، اور آپ کا مافی الضمیر بعینہ آپ کا مخاطب سمجھ بھی گیا، پھر اگر مخاطب منصف ہے تو وہ اس کے بعد بھی یہی کہے گا اور اسے یہی کہنا چاہیے کہ "میں ٹھیک ٹھیک تو آپ کا مفہوم نہیں سمجھ سکا، ہاں فی الجملہ ایک دھندلا خاکہ میرے ذہن میں آگیا ہے جسے میں "سمجھ لینا" نہیں کہہ سکتا، اور دوسروں کو سمجھا دینے کا تو وہم بھی نہیں لا سکتا"،

ایسا ہی کچھ مسئلہ وحدت الوجود کو بھی پیش آیا، کسی عارف پر یہ کیفیت مستولی ہوئی، اور وہ اس سے متاثر اور لذت یاب ہوئے تو اس محسوس لذت کو انھوں نے کبھی بیان بھی کر دیا، یہاں تک تو پھر بھی غنیمت تھا، آگے مصیبت یہ ہوئی کہ ان کے بیانات کو وہ لوگ لے اڑے جو اس نشہ سے بے خبر اور اس لذت سے ناواقف تھے، ایسی صورت میں انصاف تو یہ تھا کہ یہ لوگ ان بیانات کو دیکھنے سننے اور پڑھنے کے بعد بھی اپنے عدم فہم کا اعتراف کرتے اور اس کو "سمجھ لینے" کا دعویٰ نہ کرتے

اس نظریہ کے سب سے بڑے مبلغ بلکہ موجد حضرت شیخ محی الدین ابن العربیؒ ہیں۔ البتہ نظریہ وحدت شہود
میں خطرہ بہت کم ہے، بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے اس میں حق تعالیٰ کی عظمت، بندہ کی شان عبدیت اور
شریعت محمدیہ کا احترام سب چیزیں اپنی جگہ پر قائم رہتی ہیں، یہ نظریہ سنت نبوی سے بہت قریب
اور فہم عوام کے لیے زیادہ موزوں ہے، اس نظریہ کے مبلغ حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ
ہیں صحابہ بلکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال بھی اسی نظریۂ وحدت شہود کے مطابق ملتے ہیں شیخ
سعدی نے بوستاں میں جگنو اور بارش کے قطرے کا ذکر اسی وحدت شہود کے متعلق لکھا ہے،
امت محمدیہ میں قائلین وحدت وجود بہت سے گذرے ہیں، مگر اس کے امام تین ہیں، ایک
حضرت شیخ محی الدین ابن العربیؒ، دوسرے خواجہ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ، تیسرے مولانا جلال الدین
رومیؒ اس نظریہ یعنی توحید وجودی میں ان تینوں کے فرق مراتب کے متعلق ایک تمثیل بہت مشہور ہے، اگرچہ
بھونڈی ہے، مگر اس فرق کی تفہیم کے لیے بہت موزوں ہے۔ (نقل) مشہور ہے کہ کسی بزرگ سے لوگوں
نے پوچھا کہ شیخ ابن العربی، خواجہ عطار اور مولانا روم تینوں ہی حضرات توحید وجودی کے دریا میں
غرق نظر آتے ہیں، آخر ان تینوں میں فرق کیا ہے، فرمایا پہلے ایک مثال سنو، تین آدمی ساتھ سفر
کر رہے تھے۔ پیاس لگی تو ایک کنوئیں پر پہنچے، وہاں ایک عورت کو پانی بھرتے دیکھا، ایک نے
کہا "اماں ذرا پانی پلا دینا"، دوسرے نے کہا "اے میرے باپ کی جورو ذرا پانی پلا دینا"، تیسرا بولا "اے
میرے باپ سے ہم بستر ہونے والی ذرا پانی پلا دینا"، دیکھو تینوں آدمیوں نے ماں کی تعبیر کے لیے الگ الگ
الفاظ اختیار کیے، اب جو شخص تینوں تعبیروں کو سنیگا وہ یہی کہے گا کہ پہلی تعبیر نہایت شایستہ، دوسری
نامہذب اور تیسری نہایت غیر مہذب ہے، بس یہی فرق ان تینوں ارباب حال بزرگوں میں
ہے، ماں کہنے والے شایستہ بزرگ مولانا جلال الدین رومی ہیں، جو اس شراب سے پوری طرح
سرشار ہونے کے باوجود بدمست نہیں ہوتے، اور ضبط و احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔

وصف و کمال سمجھے جائیں،

۳۔ ایسی صورت میں صحیح صاحب احساس و ایمان اور صاحب عقل و عدل اشخاص اپنے کو غیر وجود اور حق تعالیٰ کو موجود، اپنے کو لاشے محض اور حق تعالیٰ کو اصل وجود جانا اور مانا، یہی صورت وحدت الوجود کہلاتی ہے کہ وجود کو ایک ذات حق میں منحصر و محدود دیکھا جائے، اسکے علاوہ کسی دوسرے کا وجود تسلیم ہی نہ کیا جائے، اپنے وجود یا کسی دوسرے وجود کا اعتبار ہی نہیں کیا جائے۔

۴۔ لیکن یہ بھی عقل کی بات ہے کہ انسان بالکل معدوم تو ہے نہیں، اس کو جو وجود دیا گیا وہ گو حق تعالیٰ کے مقابلہ میں ظل و سایہ کی طرح ہے، اور اس کے قوی وجود کے سامنے محض مضمحل اور ناقابل اعتبار ہے، پھر بھی کسی درجہ میں تو ہے، جسے اس کا وجود کہا جاتا ہے، اور جس کی بنا پر اس پر احکام شرع کی تکلیف اور امانت احکام کی ذمہ داری ہے، اگر اس لحاظ سے اس وجود کا کچھ اعتبار کیا جائے تو اسی نظریہ کا نام "وحدت الشہود" ہے، ان دونوں نظریوں کو مختلف شعرا نے ادا کیا ہے،

نظریۂ وحدت وجود | من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

ترا جمال ہے تیرا خیال ہے تو ہے مجھے یہ فرصت کاوش کہاں کہ کیا ہوں میں

نظریۂ وحدت شہود | کچھ سمجھ کر ہم نے رکھا ہے حجاب دہر کو توڑ کر شیشے کو پھر کیا رنگ صہبا دیکھئے

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

یہاں یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ نظریۂ وحدت وجود بہت نازک حدود سے گھرا ہوا ہے، اس کے خطرات بہت زیادہ ہیں، جو اکابر صوفیہ اس کے قائل تھے وہ اسکے تمام حدود کی پوری پوری رعایت بھی کرتے تھے، وہ موحد کامل تھے، مشرک نہ تھے، وہ نہ کسی غیر حق کو اہل حق کہتے تھے، نہ اپنے اقوال کو نا جنس بیان کرتے تھے، اس بارہ میں ان کا قول یہ تھا کہ ؎ با مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی

ہر نقش کہ بر لوحۂ ہستی پیداست — ایں عکس کسے کہ ایں ہمہ نقش آراست

دریائے کہن چو بر زند موج نو — موجش خوانند و در حقیقت دریاست

یعنی ہستی اور وجود کے تختہ پر جو نقش بھی ظاہر ہوتا ہے وہ دراصل اسی ذات پاک کا عکس ہے جس نے یہ تمام نقشے سجائے ہیں، دریائے قدیم (ذات واجب وقدیم ہے) سے جو نئی لہر (ذات ممکن وحادث) اٹھتی ہے، اسے اگرچہ موج کہتے ہیں، مگر ہے وہ حقیقت میں دریا،

در عشق چو من تو ام تو من باش — یک پیرہن است گو دو تن باش

یعنی جب عشق کی بیخودی میں میں نے یہ درجہ پالیا کہ میری ذات ختم ہو چکی اور میں تو بن چکا تو اب تو بھی میری ذات بن جا کہ لباس تو ایک ہی ہے اگرچہ جسم دو ہوں،

دریں دریا کہ من مستم نہ من ہستم نہ دریا ہم — نداند ہیچکس ایں سر مگر آں کا چنیں باشد

یعنی اس دریا میں (کیفیت وحدت میں) جس میں میں ہوں عجب حال ہے کہ نہ میں ہوں نہ دریا ہی ہے، اس معمے کو وہی سمجھ سکتا ہے جو اس مقام پر پہنچ چکا ہے،

یعنی یہ مسئلہ (توحید وجودی) کوئی علمی واستدلالی چیز نہیں کہ میں اسے سمجھا سکوں بلکہ یہ تو ایک ذوقی اور وجدانی کشفی اور روحانی لذت ہے، جو اسے پائے وہی جانے ؎

ذوق ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی

یہاں تک تو خواجہ صاحب کے جستہ جستہ غزلیات وغیرہ سے نمونے کے طور پر وہ مثالیں دی گئی ہیں، جن میں خواجہ صاحب نے براہ راست یہ مسئلہ بیان کیا ہے، لیکن ان کا ایک مستقل قصیدہ "دائیہ" ہے، جو عام طور پر "قصیدہ در وحدۃ الوجود" کے نام سے مشہور ہے اور آگرہ یونیورسٹی کے ایم اے کے نصاب میں داخل ہے، اس کا موضوع ہی وحدت الوجود ہے، اس میں (۳۰۲) اشعار ہیں، وہ شروع سے آخر تک اسی رنگ میں رنگا اور اسی کیفیت میں ڈوبا ہوا ہے۔ قصیدہ اور مثنوی میں خواجہ صاحب

اور باپ کی جو ہر و کھنے والے حضرت خواجہ عطار ہیں جو ضبط کرنا چاہتے ہیں اور کچھ ضبط کیا بھی، مگر جذب درونی سے بے قابو ہو کر ان کی زبان سے کچھ نامناسب الفاظ بھی نکل گئے، اور تیسرے بزرگ حضرت ابن العربیؒ ہیں جو یا ان دونوں کے مقابلہ میں طبیعت کے کمزور واقع ہوئے تھے، اس لیے ضبط نہ کر سکے یا عمداً ضبط کو خیرباد کہہ دیا، اور ننگ و نام کی بھی پروا نہ کی، ان تینوں میں مولانا رومی کے اقوال و احوال سنتِ رسول اور سنتِ صحابہ سے زیادہ قریب و مشابہ ہیں، مگر اس وقت ہمارے پیش نظر صرف خواجہ فریدالدین عطار، اور مسئلۂ وحدت وجود پر لکھنا ہے، اس لیے ہماری بحث انہی تک محدود رہیگی

خواجہ صاحب کا ایک شعر ہے

پر شد از دوست ہر دو کون ولیک   سوئے اُو ذرہ اشارت نیست

یعنی دونوں جہاں دوست (حق تعالیٰ کے کرشموں) سے بھرا پڑا ہے، اس کے سوا یہاں کوئی ہے ہی نہیں، مگر اس ظہور اور شہود کے ساتھ غیب اور مستوری بھی اس غضب کی ہے کہ اس کی طرف اشارہ بھی نہیں کر سکتے، فغانی نے اس کو بڑے شاعرانہ انداز میں لکھا ہے گو اسکے خیالات میں بے اعتدالی ہے،

مشکل حکایتے است کہ "ہر ذرہ عین اوست"   اما نمی تواں کہ اشارت باو کنند

یعنی یہ عجیب مشکل ہے کہ یوں دیکھیے تو ہر ذرہ عین حق ہے (نعوذ باللہ) لیکن اس کی جانب اشارہ نہیں کیا جا سکتا، یعنی اس کو اشارہ سے نہیں بتلایا جا سکتا،

تو از دریا جدائی دیں عجب ہیں   نہ تو یک لحظہ ایں دریا جدا نیست

یعنی تو تو دریا سے جدا ہے اور اپنے کو جدا سمجھ رہا ہے، مگر یہ تماشا تو ذرا دیکھ کہ خود دریا تجھ سے ایک لحظہ کے لیے بھی جدا نہیں ہے، خواجہ صاحب نے اس شعر میں وحدت کے مفہوم میں اللہ معکم کے پہلو کو زور دے کر بیان کیا ہے، اس موقع پر کسی شاعر کی ایک بے مثل رباعی توحید وجودی کے مضمون کی یاد آگئی ؎

خدا را جز خدا ایک دوست کس نیست
کہ در خور و خدا ہم اوست کس نیست

یعنی خدا کا دوست بھی صرف خدا ہے کوئی دوسرا نہیں، کیونکہ خدا کے لائق بس وہی ہے، سوا اسکی ذات کے اور کوئی نہیں ہے،

دریں معنی کہ من گفتم شکے نیست
تو بے چشمی و عالم جز یکے نیست

یعنی یہ بات جو میں نے کہی ہے، اس میں کچھ شک و شبہہ نہیں، تمھارے آنکھ نہیں، ورنہ تم بھی کہتے کہ سارا عالم کچھ بھی نہیں، تو بس ایک ذات ہے،

اب قصیدہ ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں:

چشم بکشا کہ جلوۂ دلدار
متجلی است از در و دیوار

یہ شعر قصیدہ کا مطلع ہے اور یہیں سے پورے جوش کے ساتھ دریاے وحدت میں ڈوب کر لکھتے ہیں ذرا آنکھیں کھول کر دیکھ، محبوب حقیقی کا جلوہ در و دیوار سے نمایاں ہے،

نحن اقرب الیہ آمدہ است
دور افتادۂ تو از پندار

کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ تو خود کہہ رہا ہے کہ ہم انسان سے بہت زیادہ قریب ہیں، اب اگر تو اپنے غلط گمان اور پندار کے باعث دور پڑا ہے اور اپنے کو دور سمجھا کرے تو اس کا کیا علاج،

کل شیئ محیط می بینم
آنکہ می بینی از نقش و نگار

تم موجودات کے جو نقش و نگار دیکھ رہے ہو، مجھے ان سب کو حق تعالیٰ احاطہ کیے ہوئے نظر آرہا ہے: یہی مضمون حافظ شیراز کے رنگ تغزل میں ڈھب کر دو آتشہ بن گیا ہے، کہتے ہیں ؎

مرا بکار جہان ہرگز التفات نبود
رخ تو در نظر من چنین خوشش آراست

مجھے اس جہان فانی سے کیا سروکار تھا، صرف تیرے جمال کی جہان آرائی نے اس کو میری نگاہوں میں اتنا جمیل بنا دیا ہے،

کھل کر اپنے عقیدہ توحید وجودی کو ظاہر کیا ہے، اور خیال کا میدان وسیع تھا، اس لیے ان دونوں میں توحید ی وجودی کے مضامین کا ایک عالم نظر آتا ہے، پہلے مثنوی کے اشعار سنیے:

جہاں از تو پُر و تو در جہاں نہ　　　همه در تو گم و تو درمیاں نہ

یعنی اے خدا، اے برحق سارا جہاں تجھ سے بھرا ہوا ہے، مگر تو اس میں محدود نہیں، ہر چیز تیرے اندر گم ہے، لیکن تو بیچ میں نہیں، اصغر مرحوم نے کیا خوب کہا ہے ؎

سارے عالم میں ہے ہنگامہ شورش برپا　　　ہائے اس شوخ کا ہم شکل تمنا ہونا

خموشی تو از گویائی تست　　　نہانی تو از پیدائی تست

یعنی تیری خموشی تیری (غیر محدود) گویائی سے پیدا ہوئی ہے، اور تیری پوشیدگی کا سبب تیرا انتہائی ظہور ہے، اصغر مرحوم کا شعر ہے:

وہ جلووں کی فراوانی، درخشانی و عریانی　　　پھر اس شدت کی تابانی کہ ہم پردا سمجھتے ہیں

ترا با ذرہ ذرہ راہ بینم　　　دو عالم ثم وجہ اللہ بینم

یعنی تجھے راستہ کے ہر ہر ذرہ کے ساتھ پا رہا ہوں، اور میں اس مقام پر ہوں کہ دونوں جہان میں اینما تولوا فثم وجہ اللہ کا مشاہدہ ہو رہا ہے ؎

"جدھر دیکھ کر دیکھ ادھر ذات حق ہے"

دوئی را نیست ره در حضرت تو　　　همه عالم توئی و قدرت تو

یعنی تیرے حضور میں دوئی کی گنجایش نہیں سارے جہان میں بس تو ہی تو ہے اور تیری قدرت ہے۔

نکو گوئی نکو گفته است در ذات　　　که "التوحید اسقاط الاضافات"

یعنی ایک خوشگوار شخص نے ذات کے بارہ میں کیا خوب کہا ہے کہ توحید تو بس اضافتوں کے ختم کر دینے کا دوسرا نام ہے۔

از برائے فریب خود خود گشت | جلوہ در قد و در قدم رفتار
تاب در زلف و وسمہ بر ابرو | سرمہ در چشم و غازہ بر رخسار
رنگ در آب و تاب در یاقوت | بوے در مشک و مشک در تاتار
خود بود طوطی و خود آئینہ | خود بود پیش آئینہ آئینہ دار
حمد خود از زبان می گوید | تاکہ بر خود بود پذیرفتار
من نیم او خود است قافیہ سنج | من نیم او خود است در گفتار
ہست آں یک حیاتِ صرف مدام | بر ہمہ خیر و شر خود ش دوّار

اس کے بعد ایک مختصر سی حکایت لکھی ہے، اب تک تو صرف خود اپنی سرمستی کا اظہار تھا، اب دو اور بزرگوں کی سرمستی کا پردہ فاش کرتے ہیں،

روز آدینہ بر سر منبر | گشت شبلی برائے خطبہ سوار
کرد توحید ایزدی آغاز | کہ یک است او چہ صد چہ ہزار
گر آنجا جنید حاضر بود | گفت اے پاک باز نادرہ کار
آنچہ من با تو گفتہ ام بہ نہفت | تو عیانش ہمی کنی اظہار
گفت ہیہات اے یگانۂ عصر | سخن مشرکانہ را بگذار
من ہمی گویم و ہمی شنوم | نیست کس غیر من بہ ہر دو دیار

یہ قصیدہ آخر تک اسی جوش و سرمستی سے ایسا لبریز ہے کہ انتخاب دشوار ہے، اس لیے خواجہ صاحب کی ایک رباعی پر جو میں نے اپنے استاد مولانا محمد شریف صاحب سے سنی تھی مضمون ختم کیا جاتا ہے، اس رباعی سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب آخر عمر میں وحدت الوجود سے رفیع تر مقام پر پہنچ گئے تھے اور حضرات صحابہؓ اور حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں "عبدیت" کے رمز

اسی مضمون کو اردو کے حافظ شیراز کی زبان میں سنیے،

یہ حسن دوست ہے اور التجائے جانبازی　　تجھے یہ وہم کہ یہ کائنات عالم ہے (صفی)

خواجہ فریدالدین عطار کے قصیدے کے کچھ اور اشعار ملاحظہ ہوں۔

او بپیش تو ایستادہ چو سرو　　سر فرو بردہ تو نرگس وار
سرمۂ گرد نور رب نی بصر　　درکشی در دو چشم پر زنگار
ز اندرون و برون نشیب فراز　　در پس و پیش و از یمین و یسار
شاہد لا الہ الا ہو　　پیش تو پردہ گیرد از رخسار
ثم وجہ اللہ آیدت بنظر　　و ہو معکم نمایدت دیدار
کار و آن "نفخت من روحی"　　بہر راے تو می کشاید بار
ایں تماشا چو بنگری گوئی　　لیس فی الدار غیرہ دیار

اس قصیدے کے ۳۰ اشعار لکھنے اور حیرت جلوہ میں کھو جانے کے بعد کہتے ہیں،

می زند موج ہم دریں معنی　　مطلع ہمچو مطلع الانوار
آں خروشان چو بلبلان بہار　　ویں خموشاں چو طبلۂ عطار
لیک کو غیر تا سخن گوید　　با خمش بر نشیند ای دلدار
خود انا الحق زد از لب منصور　　خود بر آمد ز شوق بر سر دار
رب ارنی بگوش خود خود ریخت　　خود بخود کرد حسرت دیدار
باز خود گفت لن ترانی را　　بہر چیست؟ بہر گرمی بازار
ناظر خود خود است خود منظور　　خود تماشا و خود تماشاکار
عاشق خود خود است و خود معشوق　　خود طبیب خود است خود بیمار

آثار علمیہ و تاریخیہ

مکتوب سید سلیمان ندویؒ

دار المصنفین میں حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کے بہت سے مکاتیب اور ان کے نام ہندوستان اور بیرون ہند کے بہت سے علما و مشاہیر کے خطوط محفوظ ہیں، ان میں سے اہم علمی و تاریخی خطوط کو وقتاً فوقتاً شائع کیا جائے گا، اس سلسلہ میں ان کا ایک تاریخی خط جو ان کے ایک عزیز سید عبد الحکیم صاحب دسنوی کے نام ہے، شائع کیا جاتا ہے، اس میں جس ایڈریس اور وفد کی طرف اشارہ ہے، اس سے مراد وہ وفد ہے جو خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے بارہ میں مسلمانوں کے جذبات اور مطالبات پیش کرنے کے لیے ویسرائے سے ملا تھا،

شبلی منزل، اعظم گڈھ

جناب مکرم السلام علیکم

میں پرسوں شب کو دلی سے واپس آیا، آپ کے پے در پے دو کارڈ ملے، حالات سے واقفیت ہونے سے پہلے حسب وعدہ صرف نہ بھیج سکا، یعنی جاتے وقت بھیجنا یاد نہیں رہا، کل سفر حسب المطلب بھیجدیے ہیں، پہنچیں گے،

میں شب کو خط لکھ کر دوسرے دن براہ کانپور دلی روانہ ہو گیا، اور ۲۰ کی شب کو وہاں پہنچ گیا، وہاں معلوم ہوا کہ جس مقصد کے لیے دعا و اکر کے وہاں آنا ہوا، اس کی تاریخ ۲۰ کے بجائے ۱۵ ر

آشنا ہو گئے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں،

یک چند خدا از خود جدا دانستم چندے ہم خویش را خدا دانستم
عطار را از فیض شیخ رفتہ رفتہ بندہ بندہ خدا خدا دانستم

خواجہ صاحب پر جب ایک زمانہ میں وحدتِ وجود کا عالم طاری تھا تو اس عالم میں ان کی زبان سے یہ نعرہ بلند ہوا تھا،

من نیم او خود است قافیہ سنج من نیم او خود است در گفتار

پھر عبدیت کا عالم طاری ہوا تو اس حقیقت کا اعتراف کیا، ؎

بندہ بندہ خدا خدا دانستم

عبدیت و بندگی کا مقام وہ بلند مقام ہے کہ خود خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم اسی مقام پر فائز تھے، اور یہی آپ کا فخر تھا، علامہ اقبال نے اس مقام کی عظمت کا ان الفاظ میں اظہار کیا ہے،

مقام بندگی دیگر مقام عاشقی دیگر

اطلاع

پاکستان کے خریداران معارف سے گذارش ہے کہ وہ معارف کی سالانہ قیمت مکتبۃ الشرق آرام باغ، کراچی کے پتہ پر بھیجدیں۔

منیجر

بھی لوں گا، دیر تک سادگی، کفایت شعاری اور استقلال ور روحانیت کا وعظ کرتے رہے، میں نے پوچھا کہ فرمایئے ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کو گذشتہ عہد میں کس نے ملایا تھا، بولے میں نہیں جانتا، میں نے عرض کی یوگ اور تصوف نے، فقہاء اور پنڈتوں نے نہیں، اب پھر بھی روحانیت ہی انکو ملا سکتی ہے،" صبح کو خواجہ حسن نظامی صاحب ان سے ملنے گئے، وہ آکر مجھ سے کہتے تھے کہ گاندھی جی کہتے تھے کہ "ان مولویوں میں یہ ندوی ہوشیار ہے" ——— وائسرائے کے ہاں وفد گیا، جواب سنا، ملاقات ہوا، مصافحہ ہوا، زرنگار فرش، مطلا کرسی، تیغ بکف سارجنٹ، زریں کمر غلام، سب کچھ نظروں کے سامنے تھا، مگر کسی رکن پر ایک ذرہ رعب و ہیبت کا اثر نہ پڑا، اللہ رے انقلاب!

وفد کو بڑی بڑی دعوتیں اور پارٹیاں دی گئیں، ان میں سے ایک میں شیخ بحرین کو دیکھا، فصیح عربی بولتا تھا، اوائل فروری میں وفد انگلستان جائے گا، پانچ آدمیوں کی اجازت لی گئی ہے، ان میں سے ایک خاکسار بھی ہے، اگر موقع مل سکا تو جانے سے پہلے ایک دن کیلیے حاضر ہوں گا، دیکھیے مسلمانوں کا حشر کیا ہو، حوصلہ افزا منظر کی تلاش ہے اور وہ عنقا، ولایت جانے کیلیے پابرکاب ہوں، مگر دل امیدوں سے ناآشنا ہیں، ولایت کے مطابق میرے پاس سامان نہیں، بمبئی میں حاصل کیا جائے گا، ۲۵ جنوری کو تار آگیا کہ ۲۷ کو لکھنؤ آؤ، یکم فروری کو بمبئی سے روانگی ہے، افسوس کہ نہیں آسکتا۔ اللہ حافظ!

والسلام

سید سلیمان

۲۴ جنوری سنہ ۱۹۲۰ء

مقرر ہوئی ہے، وفد کے تمام ممبر پہنچ چکے تھے، اکثر حالات تو اخبارات سے معلوم ہو چکے ہوں گے، میں آپ کو زیر پردہ باتیں لکھنا چاہتا ہوں، ۱۷ کا دن تو ملنے جلنے میں صرف ہوا، ۱۸ کو ممبروں کا اجتماع ہوا کہ ایڈریس کا مضمون سن لیں، سکریٹری نے پسند کیا، لیکن گاندھی جی نے نازک بات کہی کہ یہ تمام ایڈریس جذبات اور خطابت کے رنگ میں ہے، واقعات کی صورت میں نہیں ہے، تم دفعہ وار اپنے مطالبات مانگو اور بالتصریح ان کو شمار کرادو، اس پر اختلافات ہوئے، آخر گاندھی جی کی ترمیم منظور ہوئی لیکن وائسرائے نے یہ اضافہ نامنظور کیا، اس کے بعد مشاورت کے مختلف مخفی اور ظاہر، خاص اور عام جلسے ہوئے، میں سب میں شریک رہا، لیکن ہر قدم پر یہ نظر آتا تھا کہ ہمارے علماء ابھی حقیقت سے منزلوں دور، اتحاد مقصد کے لیے اختلاف سے قطع نظر کرنا، ان کی فطرت سے بعید، ہمارے جدید رہنما بھی میدان سیاست میں طفل نوخیز، باتوں اور ولولوں کے دھنی لیکن پختہ مغزی حقیقت شناسی اور حکمت عملی سے تہی، ہندو لیڈر اب پیرانہ سال، کہنہ مشق اور تجربہ کار ہو چکے ہیں، انکی بات سے ہوشمندی ٹپکتی ہے، بیچارہ گاندھی ہمارے ارباب عمائم کے مناظروں اور سرخ ٹوپیوں والوں کے ہنگاموں سے گھبرا گھبرا اٹھتا تھا، علماء میں مولانا ابوالکلام اور رہنماؤں میں حاذق الملک متانت سنجیدگی خیال اور اصابت فکر میں ممتاز نظر آئے، مولانا عبدالباری کا بار بار تند و تیز ہو جانا اور غصہ سے بار بار رائے بدلنے اور مشتعل الطبع ہونے کے وہ مخلص ہیں، بہت سی خوبیاں ہیں، [illegible] ترقی پسند نہیں، ہر شخص کی رائے قبول کرنے کو تیار، خلوص، صداقت شعار۔

حسرت آئے تو گاندھی جی کے ملنے کو آئے [illegible] میں نے کہا جس میں وہ بھی [illegible] گاندھی ہیں لیکن چھوٹا گاندھی ہے، گاندھی جی مسکرائے اور فرمایا کہ بڑا گاندھی میں ہی ہوں [illegible] دفعہ ان سے ذرا عمل کی باتیں ہوئیں، کہنے لگے میں آپ کے بڑے بڑے مولویوں سے مل چکا ہوں، میں نے کہا آپ پرانے مولویوں سے ملے ہیں، ابھی نئے مولویوں سے نہیں ملے، بولے اب ان

تو بہ تعلیمات این انبیاء   تو گواہ انبیاءؑ روزِ جزا
پایۂ خود حیف نشناسی ہمی   تو ز ابراہیم و احمد مسلمی
رحمۃ للعالمین را امتی   در طفیلش خود جہاں را رحمتی!!
"خیر امت اخرجت" درشانِ تو   "ختم امت" زینتِ ایوانِ تو
تو مسلمانی و معبودت یکے   کافرے معبود می دارد بسے
"عبد مومن" بہتر از مشرک بود   دیں عقیدہ (غیر ازیں) مہلک بود
از بریۃ تو بہیں، او بدتریں   زاغ او شہباز تو سدرہ نشیں
تو بہ اخلاقِ حسن، خوفِ خدا   از ملائک بہتری و از سما
در سیہ کاری و ایمانت بدل   ہمچو یاقوتی کہ آلودہ بہ گل
مرد مشرک با عملہائے حسن   لاشش قحبہ زن بہ دیبائی کفن
ایں جہاں قائم بہ ذکر اللہ تو   ظلمتش روشن ز نور ماہ تو
تو بہ طوفِ کعبۃ البیت الحرام   ہاں! توئی "للناس والعالم قیام"
عظمت اسباط را خازنِ توئی   اکنوں" اخترنا علی علم" توئی
"اصطفینا من عباد" شانِ تو   لا الٰہ غیرہ ایمانِ تو
تو بہ شب نجمی و در روزے چو مہر   می درخشی بہر عالم بر سپہر
منصب تبلیغ و ارشاد جہاں   راہ بنما خلق را سوے جناں
مردم ناخواندہ را تعلیم کن   بہر عقبیٰ خیرہا تقدیم کن
تو بہ قیس ایں زماں لیلاستی   تو بہ خلد ایں جہاں حوراستی
گر جہاں خاتم نگیں در وے توئی   گر جہاں سم، انگبیں در وے توئی

ادبیات

"مقام مسلم"

(بہ تتبع حضرت رومی و اقبال علیہما الرحمۃ)

از جناب مولوی محمد سراج الحق صاحب مچھلی شہری

ہاں! یکے دریاب قدرِ خویشتن
گر نمی دانی، بیا، بشنو زمن

تو ادب آموز اقوامِ جہاں
تو بہ اخلاقی امامِ امتاں

نعرہ زن تو تحرزکیفِ دین تو
تا نگ آہن بند از آئینِ تو

معترف افرنگیاں فیضِ ترا
در فنِ الجبر و طب و کیمیا

آریہ در نقلِ تو توحید مست
برہمو از فیضِ تو تقلید مست

تو امامِ جملہ عالم بودہٗ
ہاں! بر آ در سرکہ کیواں سودہٗ!!

اشرف المخلوق، می دانی کہ کیست؟
معنی آں جز بہ مسلم ہیچ نیست

"نائبِ حق" اندریں عالم توئی
بہتریں ذریتِ آدم توئی

چوں بسے اولادِ آدم جاہل است
ذاتِ تو مقصودِ "انی جاعل" است

تو امین استی دُرِ توحید را
نا قد استی تو زرِ توحید را

وارثِ فردوس درعالم توئی
خلفِ صدقِ نوح و ہم آدم توئی

کے مفہوم کی توضیح اور تعیین کرکے حنفی مسلک کی وضاحت کی گئی ہے، اور حسب ضرورت حنفی کتابوں کے حوالے سے مسائل کا بھی جابجا اندراج کیا گیا ہے، اور ان سے متعلق حدیثیں بھی نقل کر دی گئی ہیں، اسکے علاوہ بعض اور خصوصیات بھی جن کا اندازہ اصل کتاب کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، ان خصوصیات نے اس کتاب کا افادہ اور زیادہ بڑھا دیا ہے، حضرت مولف نے یہ کتاب مرتب کرکے فقہ حنفی کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے،

مشاہیر اسلام ۔ تقطیع بڑی، ضخامت ۳۵۴ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت پانچ روپے، پتہ: پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی نمبر ۳۰، نیو کراچی، کواپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی، کراچی۔

ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن استاذ شعبۂ تاریخ فواد یونیورسٹی مصر کے مشہور صاحب قلم ہیں، اسلامی تاریخ پر انھوں نے متعدد کتابیں لکھی ہیں، ان کی بعض کتابوں کا اردو میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے صدر فضل الرحمن صاحب کی فرمائش پر انھوں نے اسکول اور کالج کے طلبہ کے لیے مشاہیر اسلام پر ایک کتاب "اعلام الاسلام" کے نام سے لکھی تھی، اور اس کا اصل مسودہ سوسائٹی کے حوالہ کر دیا تھا، مشاہیر اسلام اسی کا اردو ترجمہ ہے۔ اس میں ایسے انتیس ۲۹ اکابر اسلام کے مختصر حالات درج ہیں جو زہد و تقویٰ، شجاعت و شہامت، تدبیر و سیاست، کشور کشائی و جہانبانی اور سیاسی تنظیم وغیرہ مختلف اوصاف و کمالات میں نمونہ کی حیثیت رکھتے ہیں، ان میں خلفائے راشدین کے علاوہ بعض ایسے اکابر صحابہ اور اموی خلفا حضرت امیر معاویہ، عبد الملک، ولید، حضرت عمر بن عبد العزیز، ہشام، عبد الرحمن الداخل اور مشہور اموی سپہ سالار طارق بن زیاد فاتح اندلس کے حالات بیان کیے گئے ہیں جو زندگی کے مختلف شعبوں میں اسوۂ عمل کی حیثیت رکھتے ہیں، اور طلبہ ان سے سبق حاصل کر سکتے ہیں، اس مقصد کے لیے یہ کتاب مفید ہے، اگرچہ اس میں کوئی نئی بات نہیں ہے، اردو ترجمہ

مطبوعات جدیدہ

زجاجۃ المصابیح حصہ اول و دوم | مولفہ جناب مولانا سید عبد اللہ شاہ صاحب حیدر آبادی تقطیع بڑی ضخامت ۵۹۰ و ۶۰۹ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر

قیمت فی جلد چھ روپے، پتہ مولف حسینی علم جوبلی پوسٹ آفس نمبر ۳ حیدر آباد دکن۔

حضرت امام ابو حنیفہ اور ان کی فقہ پر یہ بہت پرانا اعتراض ہے کہ امام صاحب احادیث نبوی کے مقابلہ میں قیاس و رائے کو ترجیح دیتے تھے، اور فقہ حنفی کی بنیاد حدیث و سنت سے زیادہ قیاس پر ہے، اگرچہ ہزار میں اس کے اتنے جوابات دیے جا چکے ہیں کہ اب اس اعتراض کی کوئی وقعت باقی نہیں رہ گئی ہے، اخیر دور میں مولانا اشرف علی تھانویؒ نے حدیث و سنت سے فقہ حنفی کی تائید میں "اعلاء السنن" کے نام سے دس جلدوں میں ایک کتاب مرتب کرائی ہے، جس میں فقہ حنفی کے ہر مسئلہ کے متعلق حدیث و سنت کا ایک ذخیرہ جمع کر دیا ہے، اور حاشیہ میں اس کا اردو ترجمہ بھی کر دیا گیا ہے، اب مولانا سید عبد اللہ شاہ صاحب جو عالم دین ہونے کے ساتھ ایک صاحب باطن بزرگ بھی ہیں، اسی نقطۂ نظر سے مشکوٰۃ المصابیح کے طرز پر زجاجۃ المصابیح چار جلدوں میں تالیف فرمائی ہے، اس کے ابواب کی ترتیب فقہی ہے، اور ہر باب میں حنفی مسائل کی تائید میں احادیث و سنن اور اقوال و آثار صحابہ و تابعین کا ایک ذخیرہ جمع کر دیا گیا ہے، اسی کے ساتھ ان مسائل کے متعلق حاشیہ میں آیات قرآنی بھی لکھ دی گئی ہیں، جن مسائل میں ائمہ کے اقوال مختلف ہیں، ان میں مفتی بہ قول اختیار کیا گیا ہے، اور اس کی مؤید احادیث نقل کر دی گئی ہیں، فقہ حنفی کے جن مسائل پر اعتراض کیا جاتا ہے ان کا مدلل جواب بھی دیا گیا ہے، اور ان سے متعلق

گئے ہیں جن سے ہندوستان کی گذشتہ تیس پینتیس سال کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے، اس لیے یہ مضامین مصنف کے علمی مضامین کی طرح اپنے متنوع معلومات کے لحاظ سے اصحاب علم کے مطالعہ کے لائق ہیں،

حیات ز، خ، ش - مولفہ انیسہ ہارون بیگم شروانیہ، تقطیع بڑی ضخامت ۲۲۶ صفحات، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت ۳؎ پتہ مہتمم مطبوعات سعود منزل، حمایت نگر، حیدرآباد

ز، خ، ش، یعنی زاہدہ خاتون شروانیہ کا نام نئی نسل کے لیے نامانوس ہوگا مگر وہ بیسویں صدی کے ربع اول کی علمی و ادبی دنیا کی بڑی نامور خاتون تھیں، نواب سرمزمل اللہ خاں مرحوم کی صاحبزادی تھیں، انھوں نے پوری تعلیم گھر کی چار دیواری کے اندر حاصل کی تھی، اور عربی کی متوسط اور اردو فارسی میں ایسی اعلیٰ درجہ کی استعداد بہم پہنچائی تھی کہ اس دور تعلیم و ترقی کی کوئی خاتون بھی ان علوم میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی، وہ اپنے زمانہ کی نامور شاعرہ تھیں، اس زمانہ کا کوئی ادبی رسالہ ان کے کلام سے خالی نہیں ہوتا تھا، اور انکو ہر صنف سخن میں اتنی قدرت حاصل تھی کہ اس زمانہ کے مرد شعراء میں بھی چند ہی ان کے ٹکر کے تھے، نظمیں زیادہ کہتی تھیں، ان کے کلام کا مجموعہ فردوس تخیل کے نام سے عرصہ ہوا شائع ہو چکا ہے۔ فارسی میں بھی خاصہ کہہ لیتی تھیں کبھی کبھی مضامین بھی لکھتی تھیں لیکن ان کے کمال کا اصل میدان شاعری تھا، اس نامور شاعرہ نے عین عالم شباب میں کل ۲۰ سال کی عمر میں انتقال کیا، اتنی عمر میں انھوں نے جو ادبی ذخیرہ چھوڑا ہے وہ ان کی ادبی منزلت کے ثبوت کے لیے کافی ہے، اب ان کی پھوپھی زاد بہن بیگم ہارون خاں شروانی نے ان کی سوانح عمری لکھی ہے، اس میں شروانی خاندان کی مختصر تاریخ اور زاہدہ خاتون کے سوانح اور انکے علمی و ادبی کمالات اور اخلاقی خصوصیات و فضائل وغیرہ کی تفصیل ہے۔ یہ سوانحعمری اس حیثیت سے نئی تعلیم یافتہ خواتین کے لیے سبق آموز ہے کہ ایک مسلمان عورت پردہ میں رہ کر اور اسلامی تہذیب و شرافت کو قائم رکھ کر بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتی ہے۔

نقوش شخصیات نمبر - مرتبہ جناب محمد طفیل صاحب، تقطیع بڑی ضخامت ۸۰۰ صفحات، کاغذ، کتابت

اس سے کہیں زیادہ ناموران اسلام کے مفصل حالات لکھے جا چکے ہیں، تنہا دار المصنفین کی سیر الصحابہ اور تاریخ اسلام میں اس سے زیادہ حالات مل جائیں گے، مصنف چونکہ نئے تعلیم یافتہ ہیں اس لیے کہیں کہیں ان کے قلم سے قابلِ اعتراض باتیں بھی نکل گئی ہیں، لائق مترجم نے حاشیہ میں اس کی تنقید و تصحیح اور کہیں کہیں مصنف کے اجمالی بیان کی تشریح کر دی ہے، ترجمہ صاف اور سلیس ہے۔

یادِ رفتگاں۔ از مولانا سید سلیمان ندویؒ۔ تقطیع چھوٹی، ضخامت ۵۲۰ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد ۔/۱۶ پتہ: مکتبۃ الشرق، آرام باغ، کراچی

حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ ایک دردمند دل اور قدر شناس نگاہ رکھتے تھے، جہاں بھی کمال نظر آتا تھا اس کی قدر کرتے تھے، اور اپنے معاصرین کے کمالات کے اعتراف میں بڑے فیاض تھے، چنانچہ ان کے زمانہ میں جو اکابر اور اصحاب کمال اٹھتے تھے، شذرات میں ان کا ماتم کرتے تھے اور جن سے زیادہ ربط و تعلق ہوتا تھا، "وفیات" کے عنوان سے اس کے مستقل حالات لکھتے تھے، اور اس میں کسی جماعت اور کسی طبقہ کی تخصیص نہ تھی، بلکہ مسلم و غیر مسلم کا امتیاز بھی نہ تھا، انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ ہندو اور یورپین فضلا و اکابر کا بھی ماتم اور ان کے کمالات کا اعتراف کیا ہے، اور اس میں علماء و فضلاء، مشائخ و صوفیہ، مصنفین و اہل قلم، شعراء، ادبا، سیاسی قائدین در ہر طبقہ کے اکابر ہیں، اس لیے ان کے اس قسم کے شذرات اور وفیات اس دور کے اکابر و مشاہیر کا تذکرہ بن گئے ہیں، اور اس سے ان کے حالات کے ساتھ ان کے زمانہ کے بہت سے تاریخی واقعات بھی معلوم ہوتے ہیں، انھوں نے اپنی زندگی ہی میں ان مضامین کو مرتب کر لیا تھا جن کی اشاعت کی نوبت اب آئی ہے، اس میں ۱۹۱۴ء سے لے کر ۱۹۵۲ء تک کے مختلف طبقوں کے ۵۰۰ اصحاب علم و کمال کی موت پر جذبات و تاثرات اور ان کے مختصر مفصل حالات ہیں اور متوفی کے کمالات اور کارنامے کے سلسلہ میں مختلف علمی و مذہبی، قومی و سیاسی حالات اور تاریخی واقعات

نکال کر ایک بڑی علمی و ادبی خدمت انجام دی ہے۔

چراغ راہ مسعود عالم ندوی نمبر - مرتبہ جناب نعیم صدیقی، تقطیع بڑی ضخامت ۲۰۰ صفحات کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت: دو روپے، پتہ: مکتبہ چراغ راہ، کراچی

مسعود عالم مرحوم ندوہ کے لائق ترین فرزند اور ہماری جماعت کے گوہر شب چراغ تھے، مگر افسوس چراغ اپنی روشنی پھیلا کر کل ۴۴ سال کی عمر میں خاموش ہو گیا "خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود" انھوں نے اس عمر میں جس قدر علمی و دینی کام انجام دیے وہ بہت سی بڑی بڑی عمر والوں کیلیے باعث رشک ہیں، ان کے علمی کمالات اور دینی کارناموں سے اصحاب علم واقف ہیں، اس لیے ان کی تفصیل کی ضرورت نہیں، ان میں مسلمانوں کی دینی تجدید و اصلاح کا جذبہ شروع سے تھا، اور اسکے لیے وہ برابر قلمی جد وجہد کرتے رہے، اسی جذبہ کے ماتحت وہ جماعت اسلامی میں شامل ہو گئے اس کے دار العروبہ کے ناظم تھے، ان کی عربیت کی وجہ سے اسلامی ممالک میں جماعت اسلامی کے تعارف میں بڑی مدد ملی، انھوں نے اس تحریک پر عربی اخبارات و رسائل میں مضامین لکھے، اس کی تبلیغ کے لیے عرب وغیرہ کا سفر کیا، جماعت اسلامی کی چند اہم کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا، ہندوستان میں اسلام کی تجدید و احیاء کی تاریخ اور جماعت اسلامی کے مقاصد اور کاموں پر "نظرۃ اجمالیۃ فی الدعوۃ الاسلامیہ فی الہند و الپاکستان" کے نام سے عربی میں ایک کتاب لکھی، غرض وہ جماعت اسلامی کے رکن رکین تھے، اس لیے اس کے رسالہ چراغ راہ نے ان کی یادگار میں یہ نمبر نکالا ہے، اس میں ان کے سوانح، ان کے کمالات، دینی خدمات، اخلاق و سیرت وغیرہ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ان کے احباب، تلامذہ، ارکان جماعت اور دوسرے اصحاب علم کے مضامین اور ان کی موت پر دنیائے اسلام کے متعدد علماء کے تاثرات جمع کر دیے گئے ہیں جس سے صاحب یادگار کے کارناموں کا اجمالی اندازہ ہو جاتا ہے، قریب قریب سبھی مضامین ان کی زندگی کے کسی نہ کسی رخ کو نمایاں کرتے ہیں، لیکن ان میں ان کے رفقا

وطباعت بہتر، قیمت نے رپتہ: ادارہ فروغ اردو نمبر ۱ مال روڈ، لاہور

ادبی رسالوں کے خاص نمبر آئے دن نکلتے رہتے ہیں، مگر ان میں بہت کم ایسے ہوتے ہیں جن کا فائدہ مستقل اور پائدار ہو، عموماً ان میں وقتی تفریح کا سامان ہوتا ہے، اور وہ ایک مرتبہ پڑھنے کے بعد بیکار ہوجاتے ہیں، مگر نقوش کا یہ نمبر ایک مستقل اور مفید تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے، اس میں سرسید احمد خاں کے عہد سے لیکر موجودہ زمانہ تک کے ۷۸ اصحاب علم وقلم ادیبوں مصنفوں اور چند شعرا کے حالات جمع کیے گئے ہیں، جن میں ان کے سوانح کے ساتھ ان کے علمی وادبی کارناموں اور دوسری خصوصیات کا بھی ذکر ہے، اس طرح یہ نمبر انیسویں صدی کے آخر سے لیکر بیسویں صدی کے وسط تک کے ادیبوں اور مصنفوں کا تذکرہ ہے، جو ہمیشہ کام دے گا، اور اس سے آیندہ اردو زبان وادب کی تاریخ لکھنے والوں کو بڑی مدد ملے گی، لائق مرتب نے یہ نمبر نکال کر ایک مفید علمی وادبی خدمت انجام دی ہے، مگر اس میں کچھ خامیاں اور فروگذاشتیں بھی ہیں، بعض فروگذاشتیں ... تو مجبوری کی ہیں، جن کا اعتراف مرتب نے خود کیا ہے، مثلاً اس نمبر میں متعدد اہم شخصیتیں مناسب مضامین نہ ملنے یا دیر میں موصول ہونے کی وجہ سے چھوٹ گئی ہیں جن کی تلافی کا آیندہ وعدہ کیا گیا ہے، اس میں شبہ نہیں کہ تمام اہم اور قابل ذکر شخصیتوں پر اچھے مضامین کا فراہم کرنا آسان نہیں ہے، اور ایک ساتھ سب کی اشاعت بھی دشوار تھی، اسلیے نقوش کی یہ کامیابی بھی معمولی نہیں ہے، مگر بعض اکابر مصنفین کے حالات حاصل کرنے کی نقوش نے کوشش بھی نہیں کی، مثلاً مولانا عبد السلام صاحب ندوی جن کی شعر الہند نے کتنے لوگوں کو ادیب وناقد بنا دیا، یہ صرف ایک مثال ہے، ممکن ہے ایسی اور مثالیں بھی ہوں، شعرا میں صرف چند کا تذکرہ کیا گیا ہے، اور اسی درجہ کے دوسرے شعرا چھوٹ گئے ہیں، اس کے مقابلہ میں بعض ایسے نوآموز افسانہ نگاروں کا تذکرہ ہے جو کسی حیثیت سے بھی ادیبوں کے زمرہ میں نہیں آسکتے، اور مخمل میں ٹاٹ کا پیوند ذوق پر گراں گذرتا ہے، ممکن ہے یہ ذوق اور نقطۂ نظر کے اختلاف کا نتیجہ ہو، مگر ان خفیف فروگذاشتوں سے اس نمبر کی خوبی اور فوائد میں فرق نہیں آتا اور لائق اڈیٹر نے اس کو

مکتبۂ دار المصنفین

سلسلۂ تاریخ اسلام

سلام (حصۂ اول) عہدِ رسالت و خلافتِ راشدہ
اسلام سے لیکر خلافتِ راشدہ کے اختتام تک اسلام
، سیاسی، تمدنی، اور علمی تاریخ، قیمت ؏ر
سلام (حصۂ دوم) (بنی امیہ) یعنی اموی سلطنت
ماند سیاسی تمدنی، اور علمی تاریخ کی تفصیل قیمت، ؏ر
سلام (جلد سوم) (خلافتِ عباسیہ) یعنی ابوالعباس
۱۳۲ھ سے ابو اسحاق متقی اللہ ۳۳۳ھ تک دو
کی سیاسی تاریخ، قیمت: معہ ر
سلام (جلد چہارم) (خلافتِ عباسیہ دوم)
مکفی باللہ کے عہد سے آخری خلیفہ مستعصم باللہ
فتِ عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی تاریخ ہے، اور
یک مستقل باب مین عباسیون کے تمدنی کارنامون
روشنی ڈالی گئی ہے، اس طرح سے یہ جلد پہلی جلدون سے
زیادہ ضخیم اور مکمل ہوگئی ہے،

(از شاہ معین الدین احمد ندوی)

قیمت : ؎ ر

نئی کتابین

تاریخ سندھ، سندھ کی مفصل سیاسی، نظامی، علمی، و تمدنی تاریخ :- قیمت : ؎ ر (چھ روپیے)

اقبالِ کامل، ڈاکٹر اقبال کے سوانح حیات کے علاوہ انکے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارنامون کے اہم پہلوؤن کی تفصیل، ؎ ر

بزمِ تیموریہ، تیموری بادشاہون شاہزادون اور شاہزادیون کے علمی ذوق اور ان کے دربار کے امراء و شعراء اور فضلاء کے مختصر تذکرہ کے ساتھ اُن کے علمی و ادبی کمالات کی تفصیل، قیمت ؏ر

امام رازی، امام فخر الدین رازی کے سوانح و حالات انکی تصنیفات کی تفصیل اور فلسفہ و علم کلام و تفسیر کے اہم مسائل کے متعلق اُن کے نظریات و خیالات کی تشریح قیمت ؎ ر

بزمِ صوفیہ، عہدِ تیموریہ سے پہلے کے صاحبِ تصنیفات صوفیۂ کرام مثلاً شیخ ہجویری، خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ نظام الدین اولیاء وغیرہ کے مستند حالات اور تعلیمات، قیمت ؎ ر

تاریخِ اندلس (جلد اول) اندلس کے عہد بعہد کی مفصل سیاسی تاریخ کیساتھ اندلس کی علمی و تمدنی تاریخ، قیمت معہ ر

اہلِ کتاب صحابہ و تابعین، یہودی و نصرانی اہل کتاب صحابہ و تابعین کا تذکرہ للعہ ر

مولانا سید ابوالحسن علی، مولانا محمد ناظم، ان کے تلامذہ محمد عاصم صاحب، سید مظفر شاہ اور محمد کاظم سابق کے مضامین خصوصیت کے ساتھ زیادہ بہتر ہیں، مرحوم کی وفات پر چند نظمیں بھی ہیں، چراغ راہ نے یہ نمبر نکال کر نہ صرف اپنے ایک ممتاز رفیق کا حق ادا کیا ہے، بلکہ ایک ایسے مجاہد کے حالات جمع کر دیے ہیں جس کی زندگی دوسروں کے لیے سبق آموز ہے،

البلاغ تعلیمی نمبر۔ مرتبہ جناب محی الدین صاحب منیری تقطیع بڑی، ضخامت ۲۳۴ صفحات کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۳ ؎ پتہ: دفتر انجمن خدام النبی صابو صدیق، مسافر خانہ کرناک روڈ، بمبئی نمبر ا۔

انجمن خدام النبی کے ماہانہ رسالے البلاغ نے جمعیۃ العلما، کے دینی و تعلیمی کنونشن منعقدہ بمبئی کی یادگار میں اپنا تعلیمی نمبر نکالا ہے، اس میں دینی تعلیم کے مختلف پہلوؤں پر مشاہیر علماء کے خیالات، مختلف علمی و دینی موضوعوں پر اصحاب علم و قلم کے مضامین اور اس دور کے بعض نامور متوفی علماء اور ہندوستان کی دینی درسگاہوں کے حالات جمع کر دیے ہیں، اس طرح اس نمبر میں دینی تعلیم، اس کے حاملین اور اس کے مرکزوں اور مختلف پہلوؤں پر معلومات کا نہایت مفید ذخیرہ جمع ہو گیا ہے، خصوصاً دینی مدارس کے حالات بہت مفید ہیں، اور آیندہ لکھنے والوں کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوں گے مضمون نگاروں میں مولانا حسین احمد صاحب، مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی، مولانا قاری محمد طیب صاحب، مولانا حفظ الرحمن صاحب، مولانا محمد میاں صاحب، قاضی اطہر صاحب مبارکپوری، اور بہت سے علماء اور اصحاب علم کے مضامین ہیں، البلاغ نے یہ نمبر نکال کر ایک مفید علمی و دینی خدمت انجام دی ہے۔

"م"

نمبر ۱ ۔ ۵ مئی ۱۹۵۵ء

سلیمان نمبر

معارف

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

مطبع معارف اعظم گڈھ

۱۹۵۵ء کی نئی کتاب

بزمِ مملوکیہ

ہندوستان کے تیموری سلاطین کی علم نوازی اور معارف پروری پر ایک کتاب بزمِ تیموریہ کے نام سے شائع ہو چکی ہے، ان سے پہلے کے مسلمان حکمران خاندانوں یعنی غلاموں، خلجیوں، تغلقوں اور لودیوں کے علمی و مذہبی کارناموں اور ان کے درباروں سے متوسل علما، و مشائخ اور ادبا و شعراء کے حالات میں بھی ایک سلسلہ لکھا جا رہا ہے، یہ جلد غلام سلاطین اور امراء اور شہزادوں کے حالات میں ہے، انھوں نے میدانِ جنگ میں اپنی شجاعت و بہادری کے جو جوہر دکھائے، اور اپنی نبرد آزمائی و جنگ آوری کا جو ثبوت دیا، اس کی داستان تو بہت لکھی گئی ہے لیکن انھوں نے شعر و سخن اور علم و ادب کی جو خدمت اور علما و شعراء کی جو قدردانی کی، اس کی تفصیل اس کتاب میں بیان کی گئی ہے، اس میں بہاء الدین اوشی فضلی ملتانی، صغانی، سدید الدین عوفی، نظامی نیشاپوری، مولانا منہاج سراج، فخر مدبر، ناصری، روحانی، تاج الدین ریزہ، شہاب الدین شامی، شمس دبیر، امیر خسرو، اور حسن سجزی وغیرہ جیسے باکمال علما، و فضلا و شعراء کے علمی و ادبی کارناموں پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے، خصوصاً اس دور کے ممتاز مگر آمد روزگار شعراء ریزہ، شہاب اور عمید کو پردۂ گمنامی سے نکال کر اردو زبان میں پہلی بار منظرِ عام پر لایا گیا ہے، اُن کے کلام سے اندازہ ہوگا کہ ان کو شعر و سخن، اور زبان و ادب پر کتنی قدرت تھی، اس میں انھوں نے کیا کیا جدت طرازیاں کیں، اور اپنی قادر الکلامی اور کمالِ فن کا کیا ثبوت دیا، مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمن ایم اے

مآل و مشیئت

اس میں حیاتِ انسانی کے دو بنیادی تصوروں مآل و مشیئت کی فلسفیانہ تحلیل کی گئی ہے، شروع میں ایک مختصر مقدمہ ہے، اس کے بعد انہی دونوں موضوع پر سلسلۂ افکار دو دفتروں میں پیش کیا گیا ہے، آخر میں چند صفحات پوری بحث پر تبصرہ ہے، (از صاحبزادہ ظفر حسین خان صاحب مترجم مقالات روسو)

قیمت عہ

(طابع و ناشر صدیق احمد)

جلد ۷۵ ماہ رمضان المبارک ۱۳۷۴ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۵۵ء عدد ۵

فہرست مضامین

معارف خاص نمبر

سیرت وسوانح

فضائل وکمالات

علمی ودینی کارنامے

شذرات

حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے چند ہی مہینوں بعد سے سلیمان نمبر کی تیاری شروع کردی گئی تھی، مگر مضامین کے حصول میں اتنی تاخیر ہوئی جس کا پہلے تصور بھی نہ تھا، اور خیال یہ تھا کہ خواہ کچھ ہی دیر ہو جائے مگر اس نمبر کو حتی الامکان مکمل ہونا چاہیئے اس لئے اس کی اشاعت میں اندازے سے زیادہ تاخیر ہوئی، مضامین میں کمیت کے بجائے کیفیت کا زیادہ لحاظ رکھا گیا ہے، چنانچہ زیادہ مضامین جمع کرنے کی کوشش نہیں کی گئی اور قریب قریب کل مضامین انہی اصحاب علم کے ہیں جن کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے قریبی تعلق تھا، ان کے جلوے اتنے گوناگوں ہیں کہ ان کو ایک نمبر میں دکھانا مشکل تھا،

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار   گلچینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

ہم اس کی کوشش کی گئی ہے کہ ان کے جمال و کمال کا اجمالی مرقع سامنے آجائے،

شروع میں خیال تھا کہ مختلف پہلوؤں پر الگ الگ مضامین لکھائے جائیں اور کتابی ترتیب پیدا کی جائے، مگر مضمون نگاروں کو موضوع کا پابند کر دینے سے مضامین کے حاصل کرنے میں اور دشواری ہوتی، اس لئے یہ خیال چھوڑ دینا پڑا، بیشتر مضامین کا موضوع اور اس کے مباحث عام ہیں یعنی ایک مضمون میں مختلف پہلوؤں پر تبصرہ ہے اس لئے وہ ترتیب تو نہ ہو سکی جو پیش نظر تھی تاہم مضامین کی حیثیت کے لحاظ سے ایک موٹی سی ترتیب یہ قائم کر دی گئی ہے کہ پہلے سیرت و سوانح کا حصہ ہے پھر حیثیت کے مضامین، اس کے بعد علمی کمالات اور علمی و دینی کارناموں سے متعلق مقالات،

سلوکؒ و تصوّفؒ

متفرق مضامین

قطعاتؒ و تاریخی مادے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سوانحِ حیات

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب

ولادت و وطن | حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت بروز جمعہ بتاریخ ۲۲ر نومبر ۱۸۸۴ء مطابق ۲۳ر صفر ۱۳۰۲ھ میں دیسنہ، ضلع پٹنہ، بہار میں ہوئی، یہ گاؤں پٹنہ کے سب ڈویژن بہار شریف سے مشرق جانب آٹھ میل پر واقع ہے، اور ہمیشہ سے بڑا مردم خیز گاؤں رہا ہے اور یہاں بڑے بڑے اطبار، ڈاکٹر، انجینیر، اور سرکاری حکام کے علاوہ علمار، فضلار، صلحار اور اتقیار پیدا ہوئے،

خاندان | سید صاحب اس گاؤں کے اُس خاندان کے لعلِ بے بہا تھے، جو دینی علوم کے ساتھ دینداری اور تقویٰ میں مدتوں سے ممتاز چلا آتا تھا، ننہال کی طرف سے زیدی اور ددھیال کی طرف سے حسینی سید تھے، اُن کے دادا مولوی محمد شیر صاحب المعروف بہ حکیم میر محمدی اپنے زمانہ کے مشہور طبیب تھے، اور صاحبِ دل صوفی بھی، اُن کی ایک کتاب نورِ محمدی مطبع نول کشور لکھنؤ میں چھپی ہے، جس میں سہروردیہ اور قادریہ سلسلہ کے بزرگوں کے کچھ حالات ہیں، فنِ طب میں انھوں نے دو کتابیں قرابادینِ محمدی اور مخزن الحکمۃ العلیا لکھیں، اُن کی وفات کی تاریخ یہ ہے،

کیا ہوا ثانی بقراط و ارسطا طالیس
۱۳۰۳ھ

سید صاحب کے والد بزرگوار جناب سید ابوالحسن صاحب بھی بڑے حاذق طبیب تھے، زہد و تقویٰ وراثت میں ملا تھا، متانت و سنجیدگی تہذیب و شائستگی، اور نفاست و نظافت کے بھی نمونہ تھے، پٹنہ ضلع کے مشہور قصبہ اسلام پور

پھر سلوک و تصوف کے اور آخر مین متفرق مضامین ہین، اس طرح ایک نوع کی ترتیب قائم ہوگئی ہے،

..........***..........

ان مضامین سے حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی اور ان کے کمالات کے اہم رخ، اور انکے بعض ایسے جلوے بھی سامنے آجاتے ہین، جو عام نگاہون سے مستور تھے، مگر ایک ایسی جامع کمالات ہستی کے حالات کا احاطہ جو تقریباً نصف صدی تک علم و فن کی ہر مجلس مین ضیا بار رہی ہو اور جس کے قلم نے اسلامی علوم و فنون کے وفتر کھنگال ڈالے ہون اور جس کے کارنامون سے دین و ملت کا ہر گوشہ معمور ہو، چند سو صفحات میں دشوار تھا، اس لئے یہ نمبر درحقیقت ان کا کوئی مفصل و جامع تذکرہ نہین بلکہ اس کا ایک اجمالی خاکہ ہے جس کی تفصیل انشاء اللہ حیات سلیمانی میں پیش کیجائیگی، وما توفیقی الا باللہ،

آیندہ مہینہ کا پرچہ شائع نہ ہوگا، اس لئے ناظرین انتظار نہ فرمائین،

بیسیوں آندھیاں آئیں، اور کتنی وفو خیالات کے طوفان اُٹھے مگر اس وقت جو باتیں جڑ پکڑ چکی تھیں اُن میں سے ایک بھی اپنی جگہ سے ہل نہ سکی، علم کلام کے مسائل اشاعرہ و معتزلہ کے نزاعات، غزالی و رازی و ابن رشد کے دلائل یکے بعد دیگرے نگاہوں سے گذرے مگر اسمٰعیل شہید کی تلقین بہرحال اپنی جگہ پر قائم رہی"

بڑے بھائی سے تعلیم پانے کے بعد مزید تعلیم کے لئے اپنے والد بزرگوار کے پاس اسلام پور گئے، وہاں سے ۱۸۹۹ء میں پھلواری شریف پٹنہ آئے، یہاں ایک سال خانقاہ مجیبی میں رہ کر مولانا محی الدین (سجادہ نشین خانقاہ پھلواری شریف) سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، خانقاہ کے بزرگوں کی صحبت میں علم و ادب کا شوق پیدا ہوا، خود سید صاحب اپنی ایک تحریر میں فرماتے ہیں،

"یہاں خانقاہ میں ہر ہفتہ قوالی ہوتی تھی، اُس کے اثر سے اس قصبہ میں شعر و سخن کا چرچا تھا، میں نے بھی اس فضا میں سانس لی، اور یہیں سب سے پہلے مولوی عبدالحلیم شرر کا ناول منصور موہنا دیکھا' اس کا یہ اثر ہوا کہ جس وقت کتاب ختم کی، پھوٹ پھوٹ کر رو دیا"

یہاں کے قیام کے زمانہ میں شاہ سلیمان صاحب پھلواروی سے منطق کے ابتدائی دو چار سبق بھی پڑھے پھلواری سے مدرسہ امدادیہ دربھنگہ بھیج دیئے گئے، یہاں چند مہینے رہے، اور داخلہ کے پہلے ہی ہفتہ میں وہاں کے طلبہ کی انجمن میں "تعلیم نسواں" پر ایک ایسا مضمون پڑھ کر سنایا کہ ہر طرف تحسین و آفرین کا نعرہ بلند ہوا، یہ مضمون پٹنہ کے مشہور اخبار "پنچ" میں بھی چھپا۔

ندوہ میں داخلہ | ۱۹۰۱ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخل ہوئے، یہاں سات سال رہ کر تعلیم کی تکمیل کی، طالب علمی کے زمانہ میں بھی متانت و سنجیدگی، تہذیب و شائستگی، مہر و محبت اور خلق و مروت میں ممتاز تھے یہ اوصاف اُن کو اپنے والد بزرگوار سے ورثہ میں ملے تھے، عمر کے ساتھ یہ اوصاف بھی بڑھتے گئے، اور ندوہ میں اُن کے علمی و ادبی ذوق کی نشو و نما اور ترقی ہوتی رہی، دینی علوم کی تحصیل کے ساتھ شعر و سخن کا ذوق بھی ابتدا سے تھا' چنانچہ کم عمری ہی میں اپنے وطن دیسنہ کی انجمن الاصلاح کے سالانہ جلسہ میں ایک طویل ترکیب بند لکھ کر پڑھا جس کا

کے رئیس چودھری ظہور الحق اپنے زمانہ کے بڑے صاحب ثروت و وجاہت رئیس تھے، اُن کے گھر کے سب افراد حکیم سید ابو الحسن صاحب کا بیحد احترام کرتے، اور اُن کے سامنے مؤدب ہو کر بیٹھتے تھے،

سید صاحب کے بڑے بھائی جناب سید ابو حبیب صاحب بھی فنِ طب مین بڑی مہارت رکھتے تھے اتباعِ سنت کا بڑا اہتمام رکھتے تھے، پوری عمر زہد و تقویٰ مین گذری، مجددی سلسلہ مین حضرت شاہ ابو احمد صاحب بھوپالی سے بیعت بھی تھے،

سید صاحب اپنے بڑے بھائی سے اٹھارہ سال چھوٹے تھے، اُن کی تاریخِ ولادت پر اُن کے دادا صاحب نے ایک قطعہ کہا تھا جس کے دو شعر یہ ہین،

چو جستیم تاریخِ او از خرد ۔۔۔ یکایک سروشے ز تاریخ و سال
بگفتا کہ بے داد شد مصرعے ۔۔۔ شدہ مہر تابان ز بُرجِ کمال

۱۳۰۲ھ

یہ تاریخ ایسی نیک ساعت مین کہی گئی تھی کہ سید صاحب واقعی بُرجِ کمال کا مہر بن کر چمکے، اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہ مہر صوبہ بہار کے ایک گاؤن مین ۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء کو طلوع ہوا، اور اٹھتر سال کے بعد اسی تاریخ یعنی ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء کو کراچی کے اُفق مین غروب ہوا،

ابتدائی تعلیم مکتبی تعلیم پہلے اپنے گاؤن کے ایک معلم خلیفہ انور علی اور پھر مولوی مقصود علی اکھدوی سے پائی، اور فارسی کی ابتدائی کتابین ختم کرنے کے بعد عربی مین میزان و منشعب اپنے بڑے بھائی مولوی ابو حبیب صاحب سے پڑھی، اس زمانہ مین اُن کے بڑے بھائی کو گاؤن کی مسلمان بی بیون کو اسلام کی صحیح تعلیم سے آشنا کرنے کی دھن تھی، اُس کے لئے وہ ہفتہ مین ایک دن اُن کے سامنے اس طرح وعظ و تلقین فرماتے تھے کہ سید صاحب بی بیون کے بیچ مین بیٹھ کر مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی "تقویۃ الایمان" پڑھتے تھے، اور اُن کے بڑے بھائی صاحب مرحوم پردہ کے پیچھے سے اس کی تشریح کرتے، اس طرح بھائی جو کچھ کہتے وہ سید صاحب کے دل مین بھی بیٹھتا جاتا، چنانچہ اپنی ایک تحریر مین فرماتے ہین:

"یہ پہلی کتاب تھی جس نے مجھے دینِ حق کی باتین سکھائین، اور ایسی سکھائین کہ آشنائے تعلیم و مطالعہ مین

بدہ ساقی مے کو بفگند جلباب ظلمانی خرد را نور بخشد از چراغ طور ایمانی

یہ پورا قصیدہ حیاتِ شبلی میں درج ہے، مولانا شبلی میں جوہر شناسی کا خاص مادہ تھا، اس لئے ندوہ میں آتے ہی اس جوہر قابل کو اپنے دامن تربیت میں لے لیا، اُن کے پاس مصر و شام کے مشہور عربی رسائل اور جدید تالیفات آتی تھیں، سید صاحب اُن کا برابر مطالعہ کرتے رہے جس سے اُن میں جدید عربی ادب کا ذوق پیدا ہوا، اور اتنا بڑھا کہ وہ جدید عربی کے بھی اچھے ادیب شمار کئے جانے لگے، ۱۹۰۴ء (جمادی الثانی ۱۳۲۲ھ) میں مولانا شبلیؒ نے ندوۃ العلماء کی طرف سے الندوہ نکالنا شروع کیا، مولانا حبیب الرحمن خان شروانی بھی اس کی ادارت میں شریک تھے، اسی زمانہ میں مولانا شبلی نے سید صاحب سے جرجی زیدان کی کتاب اللغۃ العربیہ کی تلخیص کرائی اور اس کو بہت پسند کیا، اور جنوری ۱۹۰۵ء کے الندوہ میں شائع کیا، سید صاحب نے الندوہ کے لئے پہلا مضمون علم حدیث پر لکھا، جس کی داد مولانا حالی نے مولانا شبلی کو دی، مولانا نے سید صاحب کی علمی صلاحیت دیکھ کر اُن کی طالب علمی ہی کے زمانہ میں الندوہ کی دیکھ بھال کا کام اُن کے سپرد کر دیا،

حدیث | مولانا شبلی کی تربیت میں ایک طرف اُن کی مضمون نگاری کی مشق جاری رہی، دوسری طرف اپنے اُستاد مولانا حفیظ اللہ سے علم حدیث اور ہیئت میں علمی شوق کی تشنگی بجھا رہے تھے، اسی زمانہ میں شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کے رسالہ عجالۂ نافعہ کے پڑھنے سے اُن کو علم حدیث سے دلچسپی پیدا ہوئی، پھر بستان المحدثین کے مطالعہ نے اس کا شوق اور بھی زیادہ کر دیا، اور آخر میں ائمہ محدثین میں سے امام مالکؒ نے اُن کے دل پر قبضہ کر لیا، موطا امام مالک سے بڑی گرویدگی پیدا ہو گئی، پھر حافظ ذہبی کی تذکرۃ الحفاظ اور حافظ ابن حجر کی فتح الباری کے مطالعہ سے محدثین کے کارناموں سے زیادہ واقف ہوئے،

حدیث کے شوق نے رجال کی طرف اور رجال نے تاریخ کی طرف رہنمائی کی، اور اس سلسلہ میں ابن ندیم کی کتاب الفہرست، حاجی خلیفہ کی کشف الظنون اور ابن خلکان کی وفیات کا مطالعہ کرتے رہے، اپنی ایک تحریر میں فرماتے ہیں کہ میں نے ابن خلکان کی کتاب اتنی دفعہ پڑھی کہ اس کے حواشی اور حوالوں سے اس کے اوّل و آخر کے صفحے

ایک شعر یہ ہے :

سچے کانون سے نہین سنتے ہین ارشاد نبی ہین مسلمان بس اتنے ہی کہ کہلاتے ہین

اسی زمانہ مین امیر مینائی سے زیادہ متاثر تھے، ان کا دیوان مرآۃ الغیب برابر مطالعہ مین رکھتے تھے دارالعلوم کے مشاعرون مین امیر مینائی ہی کا روپ بھرتے تھے،

مضمون نگاری کی ابتداء | ان کا سب سے پہلا مضمون ۱۹۰۳ء مین "وقت" کے عنوان سے مخزن لاہور مین چھپا جس کے اڈیٹر اس وقت اردو کے مشہور اہل قلم شیخ عبدالقادر تھے، اسی سال سید صاحب نے اپنے وطن کی انجمن الاصلاح کے سالانہ جلسہ مین "علم اور اسلام" پر ایک بسیط مضمون پڑھا جس کو اہل علم نے پسند کیا، اور جو علی گڈھ کے مشہور رسالہ علی گڈھ منتھلی میگزین مین اڈیٹر کے تعریفی نوٹ کے ساتھ چھپا،

شاہ سلیمان پھلواروی کی پیشین گوئی | اس زمانہ مین ندوہ کے معتمد مولانا سید محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا شاہ سلیمان پھلواروی اس کے رکن تھے، یہ دونون بزرگ سید صاحب کی ذکاوت و ذہانت کی وجہ سے اُن پر بے حد شفقت فرماتے تھے، خود سید صاحب بھی مولانا محمد علی مونگیری کی مذہبی اور دینی زندگی کر بہت متاثر ہوئے، غالباً ۱۹۰۳ء مین نواب محسن الملک دارالعلوم ندوہ تشریف لائے، اور طلبہ کا امتحان لیا، اُن سے اخبارات پڑھوا کر سُنے، اس امتحان مین سید صاحب اول آئے، انھون نے نواب صاحب کی مدح مین اپنا ایک عربی قصیدہ بھی پڑھ کر سنایا، جس سے نواب صاحب بہت محظوظ ہوئے، اس زمانہ کے اخبارات مین مولانا شاہ سلیمان پھلواروی نے اس قصیدہ کا ذکر کرکے لکھا تھا کہ انشاءاللہ ہر زمانہ مین ایک سلیمان بہار کی سرزمین مین علم اور دین کی خدمت کے لئے موجود رہے گا،

مولانا شبلی کا سایۂ عاطفت | ۱۹۰۵ء مین جب مولانا شبلی دارالعلوم ندوہ کے معتمد تعلیم ہو کر لکھنؤ آئے، تو طلبہ نے اس خوشی مین جلسے کئے، تقریرین کین، نظمین لکھین، سید صاحب نے بھی اپنی مسرت کا اظہار ایک فارسی قصیدہ مین کیا جس کا مطلع یہ تھا :

سید صاحب نے بغیر کسی توقف کے فصیح وصحیح عربی میں تقریر شروع کردی، یہ دیکھ کر پورا جلسہ محو حیرت ہوگیا، ہر طرف سے نعرہائے آفرین بلند ہونے لگے، مولانا شبلی نے غایت خوشی میں اپنے سر سے عمامہ اُتار کر شاگرد کے سر پر باندھ دیا، یہ ہندوستان کی عربی تعلیم کی تاریخ میں بالکل نیا واقعہ تھا، اس لئے اس کا غلغلہ سارے ملک میں پھیل گیا،

الندوہ کی سب اڈیٹری سید صاحب ۱۹۰۶ء میں جب ندوہ سے فارغ ہوئے تو مولانا شبلی نے اُن کو الندوہ کا سب اڈیٹر مقرر کیا، اسی سال انھوں نے "علم ہیئت اور مسلمان" "عربی زبان کی وسعت" "طبقات الارض" "بزبان ... کی پہلی" "مسئلہ ارتقا" اور "قرآن مجید" وغیرہ مختلف موضوعوں پر مضامین لکھ کر اپنے جامع الفنون ہونے کا ثبوت دیا، ان مضامین میں اُن کے استاد ہی کے تحقیقی اور ادبی رنگ کی جھلک تھی، جو رفتہ رفتہ اور بھی نمایاں ہوتی گئی، الندوہ کے مضامین سے اُن کی شہرت علمی حلقہ میں بڑھتی گئی، اور اب وہ کبھی کبھی مولانا شبلی کے بجائے الندوہ کے شذرات بھی لکھنے لگے،

۱۹۰۷ء کے الندوہ میں انھوں نے جو مضامین لکھے ان میں "ایمان بالغیب" اور "مکررات القرآن" کی داد مولانا شبلی نے ایک مکتوب میں لکھ کر دی، اور اُن کے تصنیفی سلیقہ پر اظہار مسرت کیا،

ندوہ کی مدرسی ۱۹۰۸ء میں وہ الندوہ میں علم کلام اور جدید عربی ادب کے استاد مقرر ہوئے، اور اس درس و تدریس کے زمانہ میں انھوں نے "دروس الادب" کے نام سے دو عربی ریڈریں لکھیں جو اب تک مقبول ہیں،

۱۹۰۹ء کے الندوہ کے مختلف نمبروں میں اُن کا مشہور مضمون "خواتین اسلام کی شجاعت" شائع ہوا، اس قدر پسند کیا گیا کہ اس کو علیحدہ رسالہ کی صورت میں بھی چھاپا گیا، اور اس وقت سے اب تک اُس کے متعدد اڈیشن نکل چکے ہیں، اور اب اس کا ترجمہ انگریزی میں بھی ہوگیا ہے، اس زمانہ کے دوسرے مضامین میں "اسلامی رصد خانے" کو بھی بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، اور بعد میں اس کا بھی انگریزی میں ترجمہ ہوا،

ندوہ میں لغات جدیدہ فروری ۱۹۱۰ء تک الندوہ کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے، اسی سال

بھر گئے ہین،

منطق، فلسفہ، اور ادب عربی کا ذوق مولانا فاروق چریاکوٹی کے درس مین پیدا ہوا، اور جب مولانا شبلی سے دلائل الاعجاز پڑھی، تو اُس سے بہت متاثر ہوئے، اور اسی سے عربی لکھنے اور بولنے کی مشق پیدا کی جا اور نقد الشعر کے مطالعہ نے اس ذوق پر اور جلا دی اور ان مین عربی نظم کا بھی ذوق پیدا ہوگیا،

فقہ مفتی عبد اللطیف صاحب سے پڑھی علم کلام کا شوق تمام تر مولانا شبلی کی تربیت کا نتیجہ تھا، طالب علمی کے زمانہ مین شہرستانی اور ابن حزم کی الملل والنحل، ابن رشد کی کشف الادلہ اور شاہ ولی اللہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغہ کے مطالعہ نے یکے بعد دیگرے اپنا رنگ دکھایا،

عربی مین مضمون نگاری | دار العلوم ندوہ مین مصر و شام سے عربی اخبارات المؤید اور اللواء وغیرہ آیا کرتے تھے سید صاحب اُن کو بالالتزام پڑھتے تھے، لکھنؤ کے مشہور اخبار اودھ پنچ کے ادارہ نے اُن سے عربی مضامین کے ترجمے بھی کرانا شروع کئے، اس زمانہ مین مولانا عبد اللہ عمادی عربی مین ایک رسالہ البیان نکالا کرتے تھے سید صاحب نے بھی اس مین عربی کے چند مضامین لکھے، اسی زمانہ مین اُن کی تحریرین مصر کے مشہور اخبار المنار مین بھی شائع ہوئین،

خطیبانہ انداز کی پسندیدگی | ۱۹۰۷ء مین ندوہ کے فارغ التحصیل طلبہ کی دستاربندی کا پہلا جلسہ ندوہ لکھنؤ مین ہوا، اس جلسہ کی خصوصیت یہ تھی کہ اس مین جدید و قدیم علوم کے ماہرین دار العلوم ندوہ کے بلند بانگ دعووں کا امتحان کرنا چاہتے تھے، اس سلسلہ مین سید صاحب نے "علوم جدید و قدیم" کے موازنہ پر اردو مین تقریر کی تقریر کے دوران مین کسی نے اٹھ کر کہا کہ اگر یہ عربی مین تقریر کرین تو ندوہ کی تعلیمی کرامات کا ہم یقین کرین، جس سے اسی وقت عربی مین ایسی تقریر کی کہ لوگ حیرت مین آگئے، مولانا شبلی نے کھڑے ہوکر فرمایا کہ یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ یہ تقریر پہلے سے تیار کرکے لائے ہین، اگر کوئی صاحب چاہین تو اسی وقت موضوع مقرر کر دین جس پر کرین گے، حاضرین مین سے خواجہ غلام الثقلین نے یہ موضوع دیا کہ "ہندوستان مین اسلام کی اشاعت کیونکر

سلمانون کے جذبات کا سمندر بھی جوش مین آگیا تھا، ابھی یہ شورِ محشر بپا ہی تھا کہ اگست ۱۹۱۳ء مین کانپور کی مسجد کے انہدام کا واقعہ پیش آگیا جس مین نہتے مسلمانون اور اُن کے معصوم بچّون پر بے دردی سے گولیان چلائی گئین، اس خونی سانحہ نے تمام ہندستان کو پرشور بنا دیا، سید صاحب نے ۱۲ اگست ۱۹۱۳ء کے الہلال مین اپنے خونِ دل سے مشہد اکبر کے عنوان سے ایک دردانگیز مضمون لکھا جس کی ایک ایک سطر اور ایک ایک جملہ مین اُن کی مذہبی حمیت، ملی غمخواری اور قومی درد کا طوفان اُمڈ پڑتا تھا، یہ مضمون الہلال کے جس پرچہ مین شائع ہوا، وہ حکومت نے ضبط کر لیا، الہلال مین انھون نے اور بھی پرزور مضامین لکھے، اُن کے طرزِ نگارش پر بھی ابوالکلام ہی کا رنگ تھا، اور مضمون نگارون کے نام شائع نہین ہوتے تھے، اس لئے بعض مضامین مولانا ابوالکلام کی جانب منسوب ہوگئے، خود سید صاحب نے رسالہ مستقبل کراچی (اکتوبر ۱۹۴۹ء) مین تحریر فرمایا ہے،

> "الہلال مین چونکہ مضمون نگارون کے نام نہین لکھے جاتے تھے اس لئے الہلال کے مضمون کے مجموعون کے شائع کرنے والون نے بلاتحقیق ہر مضمون کو مولانا ابوالکلام صاحب کی طرف منسوب کردیا ہے، حالانکہ یہ صحیح نہین، الحریۃ فی الاسلام، تذکار نزول قرآن، حبشہ کی تاریخ کا ایک ورق، قصص بنی اسرائیل، مشہد اکبر وغیرہ میرے مضامین ہین"،

دکن کالج پونہ کی پروفیسری سیاسی واقعات مین کچھ سکون پیدا ہوا تو سید صاحب پھر مولانا شبلی کے دفتر سیرت مین لکھنؤ آگئے، لیکن جلد ہی ۱۹۱۳ء کے آخر مین مولانا شبلی کے ایما سے بمبئی یونیورسٹی کے ماتحت دکن کالج پونہ مین السنۂ شرقیہ کی معلمی قبول کر لی، اب وہ ملک مین ممتاز اہلِ علم کی صف مین شمار کئے جانے لگے، اس لئے مذہبی اور تعلیمی جلسون مین اُن کی طلب شروع ہوئی،

تدوین ارض القرآن ان مشاغل کے ساتھ پونہ کے قیام کے زمانے مین ایک اہم تصنیف ارض القرآن کی تالیف شروع کی جس مین قدیم عرب کے جغرافیہ، اقوام عرب کی پرانی مذہبی اور تمدنی تاریخ پر محققانہ بحث کی گئی ہے، اور قرآن مجید کے بیانات سے اس کی مطابقت دکھائی گئی ہے جس زمانہ مین وہ دفتر سیرت مین کام کر رہے تھے، اُسی وقت سے

ندوہ کے سالانہ اجلاس دہلی مین طے ہوا کہ عربی کے جدید الفاظ کی ایک ڈکشنری ترتیب دی جائے، یہ کام سید صاحب کے سپرد کیا گیا، جس کو انھون نے دو برس مین پورا کر کے ۱۹۱۲ء کے اجلاس لکھنؤ مین جس کے صدر علامہ سید رشید رضا مصری ایڈیٹر المنار تھے، پیش کیا، یہ ڈکشنری لغات جدیدہ کے نام سے چھپ کر شائع ہوئی جس سے اب بھی عربی مدارس کے طلبہ کو بڑی مدد ملتی ہے،

سیرۃ النبی کی تالیف مین شرکت

۱۹۱۰ء مین جب مولانا شبلی نے سیرۃ النبی کی تدوین و ترتیب کا ایک شعبہ قائم کیا تو سید صاحب اُس کے لٹریری اسسٹنٹ ہوئے، اور اس کام مین استاد کی اعانت کے ساتھ ساتھ الندوہ مین مضامین بھی لکھتے رہے، اگست ۱۹۱۱ء مین الندوہ کی ادارت کا بار بھی ان پر ڈالا گیا، اور وہ یہ خدمت مئی ۱۹۱۲ء تک انجام دیتے رہے، جس کے بعد اس الندوہ کا خاتمہ ہوگیا، جس کے ایڈیٹر مولانا شبلی اور مولانا حبیب الرحمن خان شروانی تھے، اُن کے اس دور کے مضامین مین "اشتراکیت اور اسلام" "اسمائے القرآن" اور "فنائے مادہ" کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی، ۱۹۱۱ء کے وسط مین انھون نے سیالکوٹ کی انجمن شبان المسلمین مین ایک خطبہ دیا، جو "مذہب اسلام اور عقل" کے عنوان سے جولائی ۱۹۱۱ء کے الندوہ مین شائع ہوا،

الہلال کی ادارت مین شمولیت

۱۹۱۱ء مین اٹلی نے جب طرابلس پر حملہ کیا، تو اس سے پورے ہندوستان کے مسلمانون مین ایک شور برپا ہوگیا، اور اُن کی سیاسیات مین اُبال آگیا، سید صاحب بھی اس سے متاثر ہوئے، استاد مولانا شبلی ملکی سیاست مین آزادی کے حامی تھے، اور اسلامی سیاست مین اتحاد اسلامی پر ایمان رکھتے تھے، اسی کا اثر اُن کے شاگردون پر بھی ہوا، چنانچہ سید صاحب خالص علمی مشاغل چھوڑ کر سیاست مین آئے، جولائی ۱۹۱۲ء مین مولانا ابو الکلام آزاد نے جو مولانا شبلی کے صحبت یافتہ تھے، کلکتہ سے الہلال نکالنا شروع کیا، اور اسلامی سیاسیات مین اس کا مسلک وہی تھا جو مولانا شبلی کا تھا، اس لئے مئی ۱۹۱۳ء مین سید صاحب الہلال کے اسٹاف مین شامل ہوگئے، یہ وہ زمانہ تھا جب کہ یورپ کی بڑی سلطنتون کی شہ پاکر بلقان کی ریاستون نے ترکی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا تھا، اور دوسرے اسلامی ممالک کی طرح ہندوستان کے

تاسیس دارالمصنفین مولانا شبلی نے اپنی وفات سے پہلے دارالمصنفین کا ایک خاکہ تیار کیا تھا، لیکن اس کو عملی جامہ پہنا نہ سکے تھے، سید صاحب اُن کی رحلت کے بعد پونہ کی ملازمت چھوڑ کر اعظم گڈھ چلے آئے، اور مولانا مسعود علی صاحب ندوی کے انتظامی تعاون، اور مولانا عبدالسلام صاحب ندوی کے علمی اشتراک سے ۱۹۱۵ء میں دارالمصنفین کی بنیاد ڈالی، یہ گویا بغداد کے دارالحکمت کا تخیل ہندوستان کے ایک شہر اعظم گڈھ کی سرزمین پر نمودار ہوا،

سید صاحب نے اپنی تصنیف ارض القرآن کی پہلی جلد کی اشاعت سے دارالمصنفین کے تصنیفی کام کی ابتدا کی، اور جب وہ اہلِ علم کے سامنے آئی تو اُن کو دارالمصنفین کے علمی کام کی نوعیت اور سید صاحب کی تحقیقات اور اُن کے علم و نظر کی وسعت کا اندازہ ہوا،

انجمن ترقی اردو کی صدارت اسی سال انجمن ترقی اردو کا سالانہ اجلاس پونہ میں ہوا، جس کی صدارت سید صاحب نے کی، اس میں انھوں نے جو خطبۂ صدارت پڑھا، وہ آگے چل کر اردو کی تاریخ پر تحقیق کرنے والوں کے لئے دلیلِ راہ بنا،

سیاسی مشاغل اس علمی و ادبی زندگی کے ساتھ سیاسی مشاغل بھی جاری رہے، ۱۹۱۴ء کے آخر میں جب ٹرکی نے جنگِ عظیم میں شرکت کی، تو ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی جوش پیدا ہوا، اور اُن کے سیاسی لیڈر نظر بند کر دیئے گئے، اس موقع پر جو نیا گروہ اُن کی قائم مقامی کے لئے بڑھا اس میں سید صاحب بھی تھے، چنانچہ [illegible] سے لیکر ۱۹۱۶ء تک انھوں نے مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے ساتھ سیاسی تحریکات میں حصہ لیا،

رسالہ معارف کا اجرا لیکن اب اُن کا عملی مرکز توجہ دارالمصنفین تھا، ابھی تک اس کا کوئی آرگن نہ تھا، اس لئے [illegible] کے رمضان المبارک میں معارف کا پہلا پرچہ اُن کی ادارت میں نکلا، اس کا اجرا ایسے مبارک مہینہ میں ہوا کہ اس کی روشنی سے علمی دنیا آج تک منور ہے، معارف کے پہلے نمبر میں اُن کا مقالہ "روزہ" پر تھا، شروع کے نمبروں میں بیشتر مضامین انہی کے ہیں، رسالہ کی ادارت کے فرائض کے ساتھ استاذ مرحوم کے چھوڑے ہوئے مسودات اور سیرۃ النبی کی ترتیب و تبویب میں بھی مشغول رہتے، رفقا کے لئے علمی لائحۂ عمل تیار کرنے اور دارالمصنفین کے گرد ہمدردوں کا حلقہ پیدا کرنے کا بار بھی اُن ہی پر تھا،

اس کے لئے مواد کی فراہمی شروع کر دی تھی، پونا میں اُس کی پہلی جلد ترتیب دی، اور دوسری جلد کے لئے مواد فراہم کیا، اور یہیں بیٹھ کر الہلال کے لئے "علوم القرآن" کے عنوان سے ایک مضمون بھی لکھا تھا،

رحلتِ استاد پونہ گئے ہوئے ابھی ڈیڑھ سال بھی پورا نہ ہوا تھا کہ ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو مولانا شبلیؒ جنت کو سدھارے مرض الموت میں شفیق استاد نے محبوب شاگرد کو تار دے کر بلوایا، اور جب وہ پہونچے تو مولانا نے معاہدہ کے طور پر شاگرد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا "سیرت (یعنی سیرۃ النبی) میری تمام عمر کی کمائی ہے، سب کام چھوڑ کر سیرت تیار کرو" سعادت مند شاگرد نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا "ضرور ضرور"

وہ شفیق اُستاد اور مُربّی کی وفات سے بہت متاثر ہوئے، اور تاثرات کا اظہار "نوحۂ استاد" میں کیا، جس کا مطلع یہ ہے:

اے متاعِ عزتِ مشکیں کے پچھلے کاروان　　　　آہ وہ بھی مٹ گیا باقی جو تھا تیرا نشان

اخباروں میں یہ نوحہ شائع ہوا تو عزیز لکھنوی، مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی اور مولانا حمید الدین فراہیؒ نے سید صاحب کی سخن وری اور سخن سنجی کی داد دی، لیکن عماد الملک بلگرامی نے اُن کو شعر و سخن کی طرف مائل ہونے سے روکا، اور انھوں نے اُن کی نصیحت قبول کی، کبھی کبھی اشعار کہہ لیتے تھے، لیکن اپنے کو غیر فطری شاعر کہتے گو اربابِ نظر نے اُن کی شاعری کی بھی داد دی ہے، ڈاکٹر اقبال نے اپنے ایک مکتوب مورخہ ۱۲ر نومبر ۱۹۱۶ء میں اُن کو لکھتے ہیں کہ

"آپ کی غزل لاجواب ہے، بالخصوص یہ شعر مجھے بڑا پسند آیا،

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں　　　　وہ ایک قطرۂ خوں جو رگِ گلو میں ہے

مولانا شبلی مرحوم و مغفور نے تاریخی واقعات کو نظم کرنا شروع کیا تھا، اور جو چند نظمیں انھوں نے لکھی تھیں وہ نہایت مقبول ہوئیں، غزل کے ساتھ وہ سلسلہ بھی جاری رکھئے"

شاید اسی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے سید صاحب کبھی کبھی اس قسم کی نظمیں کہہ لیا کرتے تھے،

اس زمانہ میں نظر بند تھے جرأت کے ساتھ لیا گیا، اس سے لوگوں کے دلوں سے انگریزوں کا رعب اُٹھا،

۱۹۱۷ء کے علمی کام — ۱۹۱۷ء کے علمی مضامین میں "اہل سنت والجماعت" بڑا مقبول ہوا، پہلے یہ معارف کے کئی نمبروں میں شائع ہوا تھا، پھر رسالہ کی صورت میں چھپا، اس کا ترجمہ ملیالم، تلنگو اور بنگلہ میں بھی ہوا، اسی سال اُن کی کتاب "حیات امام مالک" شائع ہوئی، اُن کو امام مالک سے خاص عقیدت اور اُن کی موطا صحیحین سے زیادہ پسند تھی گو آخر عمر میں جزوی مسائل میں بھی امام ابو حنیفہ کے مسلک کے پابند ہو گئے تھے، لیکن امام مالک سے عقیدت قائم رہی ۱۹۰۸ء کے الندوہ میں "حیاتِ امام مالک" کے عنوان سے ایک طویل مقالہ لکھا تھا جو کئی نمبروں میں شائع ہوا تھا، اور تقریباً ۱۰۰ صفحے پر مشتمل تھا، اس کو اور زیادہ مکمل کرنے کا برابر ارادہ کرتے رہے، مگر دوسرے کاموں کی مشغولیت نے اس کا موقع نہ دیا، اس لئے اسی مضمون کو رسالہ کی صورت میں شائع کر دیا، یہ کچھ ایسا مقبول ہوا کہ اُس کی مانگ ابھی تک جاری ہے، اور اس کے کئی اڈیشن نکل چکے ہیں،

سیرۃ النبی جلد اول کی اشاعت — ۱۹۱۸ء میں اپنے استاذ مرحوم کی سیرۃ النبی جلد اول کو مرتب کر کے ملک کے سامنے پیش کی جس کے غلغلہ سے ہندوستان کا گوشہ گوشہ گونج رہا تھا، اس کی اشاعت پر سید صاحب نے بجا طور پر لکھا تھا کہ

ع شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

ارض القرآن جلد دوم کی اشاعت — اسی سال اُن کی محققانہ تصنیف ارض القرآن کی دوسری جلد بھی شائع ہوئی جس میں اقوام عرب کے لسانی، مذہبی، تجارتی، اور تمدنی حالات پر بحث ہے، اس سے اُن کی علمی شہرت میں اور بھی زیادہ اضافہ ہوا، ۱۹۳۶ء میں مولوی سید مظفر الدین ندوی ایم اے نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور معلومات میں اضافہ کر کے اس میں انگریزی کے لحاظ سے بعض ترمیمیں اور تغیرات کئے،

۱۹۱۸ء کے معارف میں اُن کے جو مضامین شائع ہوئے، اُن میں "ہندوؤں کی علمی اور تعلیمی ترقی میں مسلمانوں کی کوششیں" کی طرف خاص طور پر لوگوں کی نظر اٹھی، اس میں ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے سے قریب

دارالمصنفین کے فروغ میں جانکاہ کوشش

دارالمصنفین کے قیام کے آغاز سے آخر وقت تک اُن کا معمول یہ تھا کہ فجر کی نماز کے بعد ناشتہ کر کے کتب خانہ میں آجاتے، ۱۲ بجے دن تک دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر کام کرتے، پھر کھانا کھا کر کچھ قیلولہ فرماتے، ظہر کی نماز کے بعد پھر کتب خانہ تشریف لاتے، اور عصر تک کام میں مشغول رہتے، عصر کی نماز کے بعد چائے پیتے، اس وقت رفقائے دارالمصنفین سے علمی مذہبی سیاسی اور تفریحی باتیں کرتے، مغرب کی نماز کے بعد بھی کام کا سلسلہ جاری رہتا، مگر جب کثرت محنت سے صحت خراب رہنے لگی، تو رات کو کام کرنا چھوڑ دیا تھا لیکن دن بھر محنت شاقہ کرتے، جب علمی مذہبی اور سیاسی جلسوں میں شرکت کے لئے سفر میں جاتے تو ان کو علمی ریاضت سے چھٹکارا اور کچھ آرام مل جاتا،

دارالمصنفین کے کتب خانہ، پریس اور دفتر کے تمام کارکنوں سے اس طرح بھری محبت اور لطف و شفقت سے پیش آتے تھے کہ ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ سب سے زیادہ اسی کو محبوب رکھتے ہیں، اور وہ اُن کی خوشنودی اور رضامندی کے لئے بڑی تن دہی اور دلسوزی سے کام کرتا، اُن کی زندگی کا اصلی کارنامہ دارالمصنفین ہی ہے جس کو وہ اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتے تھے،

اُن کے حُسنِ نیت کی وجہ سے دارالمصنفین کا علمی وقار ملک میں جلد ہی قائم ہو گیا، چنانچہ ابھی اس کو قائم ہوئے دو سال بھی نہیں گذرے تھے کہ مہاراجہ بڑودہ کی طرف سے بڑے پیمانہ پر موازنۂ مذہب کا ایک ادارہ ایک فرانسیسی کی نگرانی میں قائم ہوا تو اسلامی علوم و مسائل کی تحقیقات اور رفع شبہات کے لئے دارالمصنفین ہی کا انتخاب قرار پایا،

جلسۂ علمائے بنگالہ کی صدارت

۱۹۲۱ء میں علمائے بنگالہ کلکتہ کے سالانہ اجلاس کی صدارت کی جس میں تمام رہنمایانِ ہند شریک تھے، اسی کے ساتھ کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس بھی اُن ہی تاریخوں میں تھے اس لئے مجلس علمائے بنگالہ کا یہ جلسہ بڑا اہم تھا، اس میں سید صاحب نے جو خطبہ پڑھا، وہ بنگال میں بڑا اثر انداز ہوا، یہ پہلا خطبہ تھا جس میں جنگ کے ہیبت ناک اثرات کے باوجود مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کا نام ج

پڑھنے کے لئے گئے، تو وہاں ایک بزرگ فقہ کا درس دے رہے تھے، سید صاحب نے ان سے مل کر وفد خلافت کی نیت بتائی تو تمام حلقۂ درس جوشِ مسرت سے لبریز ہو گیا، اور سب نے وفد کی کامیابی کے لئے دعا کی، اور جب سید صاحب مسجد سے نکلے، تو لوگوں کا اس قدر ہجوم ہوا کہ وہ بدقت جان چھڑا کر آگے بڑھ سکے، اس وفد کے ارکان نے فرانس اور انگلستان میں ترکی کے حقوق کے لئے زبان و قلم اور دعوت و اشاعت کے ذریعہ لڑتے رہے، لندن میں وزیر اعظم لائڈ جارج، لارڈ فشر اور دوسرے ممتاز لیڈروں سے ملنے کے علاوہ حجاز و شام اور مصر کے وفود سے بھی ملاقات کی، حجاز و شام کے وفد کے سرگروہ نوری سعید پاشا اور حداد پاشا تھے، سید صاحب نے ان سے مل کر خلافت و جزیرۃ العرب کے مسائل اور ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات اور ان کے مذہبی مطالبات بیان کئے، تو وہ سب بہت متاثر ہوئے، اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، اسی زمانہ میں سعد زاغلول پاشا بھی مصری وفد کے ساتھ لندن آئے ہوئے تھے، ان سے بھی مل کر سید صاحب نے ہندوستانی مسلمانوں کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی، سعد زاغلول نے ان کی عربی سے متاثر ہو کر کہا کہ آپ ہم سے بھی اچھی عربی بولتے ہیں، آپ نے وہیں آرنلڈ، براؤن، اسٹوری اور مارگولیتھ سے بھی ملاقات رہی، پروفیسر مارگولیتھ اور ایک اطالوی مستشرق سے مسئلہ خلافت پر علمی نبرد آزمائی بھی ہوئی، اور اس مسئلہ پر مشہور انگریزی مجلہ "فارن افیرز" میں جو مدلل اور جامع مضمون لکھا اس کی تعریف مولانا محمد علی نے بار بار کی، وفد کے سیاسی کاموں کے ساتھ انڈیا آفس، برٹش میوزیم، آکسفورڈ اور کیمبرج کے کتب خانے بھی دیکھتے رہے جس سے ان کا یہ سفر علمی حیثیت سے بھی مفید رہا، لندن سے واپسی کے بعد ڈاکٹر اقبال نے ان کو ایک خط میں تحریر فرمایا:

"مراجعت مع الخیر مبارک" آپ نے بڑا کام کیا جس کا صلہ قوم کی طرف سے شکر گزاری کی صورت میں مل رہا ہے، اور دربارِ نبوی سے نہ معلوم کس صورت میں عطا ہوگا، وزرائے انگلستان کا جواب وہی ہے، جو ان حالات میں ہمیشہ دیا گیا .... تاہم مجھے یقین ہے کہ ہندی وفد کا سفر یورپ بڑے اہم نتائج پیدا کرے گا۔"

لانے کی کوشش کی گئی ہے، ارباب تحقیق کو اس سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ سید صاحب کی نظر تاریخ ہند پر بھی کتنی گہری ہے
اس مضمون کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے،

تحریک خلافت

۱۹۱۹ء کا سال ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے بڑا پرآشوب تھا، پہلی جنگ عظیم کے بعد اسلامی ممالک خصوصاً ٹرکی پر سخت وقت آیا، اس کے حصے بخرے کئے جا رہے تھے، ٹرکی کا سلطان قسطنطنیہ اتحادیوں کے ہاتھوں بے بس ہو رہا تھا، اتحادی فتح کے غرور کے نشہ میں خدا کی خدائی کی شکست و ریخت میں لگے تھے اور ملکوں کی قسمت کا فیصلہ کر رہے تھے، اس وقت ہندوستان کے چند بہادر غیور اور دردمند مسلمان رہنماؤں نے اپنی جانوں پر کھیل کر مجلس خلافت کے نام سے ایک مرکزی مجلس بمبئی میں قائم کی جس کی شاخیں سارے ہندوستان میں پھیل گئیں، اس مجلس میں مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی نے ایسی تنظیمی قوت پیدا کر دی کہ پورا ہندوستان اس کی آواز پر اٹھتا اور بیٹھتا تھا، اس تحریک میں سید صاحب بھی پیش پیش رہے، اس کا پہلا اجلاس لکھنؤ ہوا، تو انھوں نے علما، اور ارباب سیاست کے درمیان حلقۂ اتصال کا کام دیا، اور ایسی پر درد تقریر کی کہ مسند صدارت سے پائین تک ساری مجلس بزم ماتم بن گئی، مولانا عبد الباری فرنگی محلی اور چودھری خلیق الزماں وغیرہ کے سارے اختلافات خس و خاشاک کی طرح بہ گئے، اسی سال انھوں نے سید الاحرار سید فضل الحسن حسرت موہانی کی رہائی کی تقریب میں "نظر بانِ اسلام" کے عنوان سے معارف کے کئی نمبروں میں ایک مضمون لکھا جو بہت پسند کیا گیا،

وفد خلافت میں یورپ کا سفر

فروری ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی کی سرکردگی میں ٹرکی کے معاملات میں انصاف طلبی اور مسلمانانِ ہند کے جذبات کی ترجمانی کے لئے ہندوستان سے جو وفد خلافت یورپ گیا تھا، اس کے تین ممبروں میں ایک ممبر یہ بھی تھے، صدر مولانا محمد علی ارکان سید حسین اور سید صاحب اور سکریٹری حسن محمد حیات تھے، یہ وفد انڈین نیشنلزم اور پین اسلامزم کو متحد کر کے ہندوستان کی آزادی کی جنگ لڑنے چلا تھا، جب یہ لوگ پورٹ سعید پہنچے، اور سید صاحب جامع عباسی میں نماز

کی مجلس عاملہ کے بھی رکن مقرر ہوئے،

دارالمصنفین کی شہرت | ۱۹۲۲ء تک دارالمصنفین کی شہرت میں چار چاند لگ چکے تھے، سیرۃ النبی کی دو جلدوں اور سید صاحب کی تصانیف کے علاوہ مولانا عبدالسلام ندوی کی اسوۂ صحابہ اور سیرۃ عمر بن عبدالعزیز مولوی یونس فرنگی محلی کی روح الاجتماع، مولوی عبدالباری صاحب ندوی کی برکلے، اور "مبادی علم انسانی" اور مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کی مبادی فلسفہ اور مکالمات برکلے، پروفیسر سجاد مرزا کی الاستدلال، تسہیل البلاغت وغیرہ جیسی سنجیدہ کتابوں اور معارف کے بلند پایہ علمی تحقیقی مضامین نے تمام اصحاب علم ونظر کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا، اور اردو زبان کا لٹریچر ایک نئے نہج میں ڈھلنے لگا، ڈاکٹر اقبال نے معارف کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا کہ یہی ایک رسالہ ہے جس کے پڑھنے سے حرارت ایمانی میں ترقی ہوتی ہے، مولانا محمد علی مرحوم کو بھی معارف سے بڑا انس ہو گیا تھا، چنانچہ وہ اپنے ایک مکتوب مورخہ ۲ دسمبر ۱۹۱۹ء میں سید صاحب کو لکھتے ہیں،

"میرے متعدد انگریزی رسالوں کی جلدیں نہیں بندھی ہیں، اور ممکن ہو کہ میرے عزیز دوست اور سارق کتب سید جالب صاحب اُن میں سے اکثر پر قبضہ بھی کر بیٹھے ہوں، یہ شرف خاص معارف کو حاصل ہوگا کہ مجلدات تیار کرائی جائیں گی،"

مولانا ابوالکلام آزاد اپنے ایک خط میں سید صاحب کو تحریر فرماتے ہیں :۔

"معارف کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں صرف یہی ایک پرچہ ہے، اور تو ہر طرف سناٹا ہی بحمداللہ کہ مولانا شبلی مرحوم کی تمنائیں رائگان نہ گئیں، اور صرف آپ کی بدولت ایک جگہ ایسی بن گئی، جو صرف خدمت علم و تصنیف و تالیف کے لئے وقف ہو"

معارف اور دارالمصنفین کی شہرت بیرون ہند میں بھی پھیلتی جا رہی تھی، چنانچہ اسی زمانہ میں ڈاکٹر نکلسن (کیمبرج یونیورسٹی) نے اس کے ناقدانہ مباحث علمی مقالات مستشرقانہ معلومات اور مشرقی و مغربی علوم و خیالات کی آمیزش کی داد دی، اور اس حیثیت سے ہندوستان کی ترقی پر اپنی خوشی کا اظہار کیا، پھر فرانس کے مشہور مستشرق

واپسی پر قصبہ بہار شریف ضلع پٹنہ کی خلافت کمیٹی نے اُن کا شاندار خیر مقدم کیا، انھوں نے اس کمیٹی کے جلسے اجلاس کی صدارت بھی کی، اس میں صوبہ کے اکابر علماء اور زعماء کے علاوہ بابو راجندر پرشاد (جو آجکل صدر جمہوریہ ہند) بھی تھے، جنھوں نے اپنی تقریر میں سید صاحب کی سیاسی بصیرت کو سراہا،

سیرۃ النبی جلد دوم کی اشاعت

لندن جانے سے پہلے استاذ مرحوم کی سیرۃ النبی کی دوسری جلد چھپنے کے لئے دیدی تھی، اس کا دیباچہ لندن ہی سے لکھ کر بھیجا، پہلی جلد نبوت کے پرآشوب عہد غزوات پر مشتمل تھی، دوسری جلد نبوت کے سہ سالہ امن کی زندگی کی تاریخ ہے،

سیرت عائشہؓ

ابھی وہ لندن ہی میں تھے کہ اُن کی کتاب سیرۃ عائشہؓ شائع ہوئی، جس کا آغاز طالب علمی کے زمانہ میں کیا تھا، مگر اسکی تکمیل بعد میں کی، اس کی اشاعت پر بیگم صاحبہ بھوپال نے پانچ سو روپے انعام مرحمت فرمایا، ڈاکٹر سر اقبال نے یہ کتاب پڑھی تو سید صاحب کو تحریر فرمایا کہ

"سیرۃ عائشہ کے لئے سراپا سپاس ہوں، یہ ہدیہ سلیمانی نہیں سرمۂ سلیمانی ہے، اس کتاب کو پڑھنے سے میرے علم میں بہت مفید اضافہ ہوا، خدائے تعالیٰ جزائے خیر دے"

ترک موالات

۱۹۲۰ء کے آخر میں یورپ کے سفر سے واپس ہوئے تو ترکِ موالات کی تحریک ہندوستان میں شروع ہوگئی، اور مجلسِ خلافت اور کانگریس کے پلیٹ فارم مشترک ہوگئے، سید صاحب نے بھی دوسرے علماء اور زعماء کے ساتھ مل کر ترکِ موالات کی تحریک کے سلسلہ میں ملک کا دورہ کیا، اخبارات میں مضامین لکھے، جابجا تقریریں کیں، ۱۹۲۱ء میں مجلسِ خلافت کا جو سالانہ اجلاس میرٹھ میں منعقد ہوا تھا، اسکی صدارت کی، اسی سال خلافتِ عثمانیہ اور دنیائے اسلام اور "خلافت اور ہندوستان" کے عنوان سے دو اہم تاریخی مضامین معارف کے کئی نمبروں میں لکھے، جو علٰحدہ علٰحدہ رسالوں کی صورت میں بھی شائع ہوئے، ان رسالوں سے تحریکِ خلافت کو بڑی مدد ملی، ۱۹۲۱ء کی کانگریس احمد آباد میں منعقد ہوئی، تو اسکی ورکنگ کمیٹی کے ممبر نامزد کئے گئے، اور سال بھر تک خلافت کیساتھ کانگریس کے کاموں میں شریک رہے، جمعیۃ العلماء

ندوۃ العلماء کے کام

یوں تو ندوہ کے معتمد تعلیمات کی حیثیت سے ہمیشہ اس سے دلچسپی لیتے رہے لیکن ۱۹۲۵ء میں ندوہ کی طرف خاص توجہ کی، اور فروری میں اس کا سالانہ جلسہ بڑے اہتمام سے کرایا جس میں علماء اور خواص نے بڑی تعداد میں شرکت کی، ندوہ کو ایک دارالاقامہ کی سخت ضرورت تھی، سید صاحب کی تحریک سے اس جلسہ میں یہ قرار پایا کہ ہندوستان کے ہر صوبہ کی طرف سے دس دس کمروں کا ایک بلاک تیار کیا جائے، مختلف صوبوں کے اکابر نے اس پر آمادگی ظاہر کی، اور اس اجلاس کے بعد سید صاحب نے خود صوبہ بہار کا دورہ کر کے اس مقصد کے لئے ایک گراں قدر رقم جمع کی،

خطبات مدراس

اسی سال اکتوبر اور نومبر میں مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن آف سودرن انڈیا کی دعوت پر سیرۃ نبوی کے مختلف پہلوؤں پر آٹھ خطبے دیئے جو بعد میں خطبات مدراس کے نام سے شائع ہوئے، ان خطبوں کے خلاصے وہاں کے روزانہ انگریزی اخبارات "ہندو" اور "ڈیلی ایکسپریس" میں برابر نکلتے رہے، اور بہت دلچسپی سے پڑھے گئے، یہ اپنے مضامین و مباحث، ادب، انشاء اور زور خطابت کے لحاظ سے اردو لٹریچر کے شاہکار سمجھے جاتے ہیں[1] اس سفر میں بنگلور، وانمباڑی اور تریانور جاکر بھی مختلف مذہبی عنوانات پر خطبے دیئے،

جمعیۃ العلماء کی صدارت

مارچ ۱۹۲۶ء میں جمعیۃ العلماء کا جو اہم سالانہ اجلاس کلکتہ میں ہوا، اس کے وہ صدر منتخب ہوئے، اس موقع پر انھوں نے جو خطبہ صدارت پڑھا، وہ مسلمانوں کی سیاست میں یادگار ہے،

وفد حجاز

اسی سال پھر وفد حجاز کے صدر منتخب ہوئے، اس وقت ہندوستان میں شدھی اور سنگھٹن کا زور تھا، اس تقریب پر دلی میں مجلس خلافت کا ایک خاص اجلاس ہوا، اور حکیم اجمل خان مرحوم کی تحریک پر سید صاحب نے اس کی صدارت کی، اس اجلاس میں انھوں نے ہندو اور مسلمانوں کے تعلقات کی نسبت مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو بڑی وضاحت سے پیش کیا، اس سے فراغت کے بعد وفد خلافت لے کر حجاز گئے، اس کے ممبر مولانا شوکت علی، اور مولانا محمد علی، اور

---

[1] اس کا انگریزی ترجمہ جناب سعید الحق صاحب (فی الحال منیجنگ ڈائرکٹر پاکستان ریڈیو) نے *Living Prophet* کے نام سے کیا ہے،

موسیو لوئر ماسینان نے اپنے ایک لکچر "اسلام مین پیشہ کی اجتماعی حیثیت" کے سلسلے مین دار المصنفین سے تعاون چاہا،

بہار خلافت کانفرنس کی صدارت

سنہ ۱۹۲۳ء مین صوبہ بہار کی خلافت کانفرنس کی صدارت کی، اس کے خطبہ مین جزیرۃ العرب [illegible] کی پوری تاریخی سرگذشت تھی،

سیرۃ النبی جلد سوم کی اشاعت

سنہ ۱۹۲۱ء سے سنہ ۱۹۲۳ء تک اپنی تصنیف سیرۃ النبی کی تیسری جلد کی تدوین مین مشغول رہے، جو سنہ ۱۹۲۴ء مین چھپ کر مشتاق نگاہون کے سامنے آئی، اس مین معجزہ کی حقیقت اس کے امکان و وقوع پر فلسفۂ قدیمہ، علم کلام، فلسفۂ جدیدہ اور قرآن مجید کے نقطہ ہائے نظر سے مبسوط تبصرہ ہے، اور اس کے بعد مکالمۂ الٰہی، وحی، نزولِ ملائکہ، عالمِ رؤیا، معراج اور شرحِ صدر کا بیان ہے، اس کی ترتیب، واقعات کی تفتیش و تلاش اور مسائل و نظریات کی بحث و تحقیق مین جو محنت و کاوش اور دیدہ ریزی کی گئی ہے، اس سے ان کا [illegible] اور بھی بلند ہوا،

وفدِ حجاز کی صدارت

اسی سال یعنی سنہ ۱۹۲۴ء ہی مین ابن سعود اور شریف حسین مین جنگ کا آغاز ہوا، دونون نے مجلسِ خلافت کی طرف ہاتھ بڑھایا، اس وقت مسلمانانِ ہند نے سید صاحب کی قیادت مین ایک وفد حجاز بھیجا تاکہ وہ فریقین کے سامنے مجلسِ خلافت کی تجاویز کو پیش کرے، سید صاحب نے دو ماہ جدہ مین رہ کر مفوضہ فرائض انجام دیئے، اور بڑی دلیری سے شریف حسین اور سلطان ابن سعود کی حکومتون سے حجاز مین مسلمانون کی ایک جمہوری حکومت کے قیام کے مسئلہ پر گفتگو اور خط و کتابت کرتے رہے، ایک جلسہ مین آپ نے پرجوش تقریر کی کہ شریف حسین کے ایک حبشی سنتری نے تقریر کے بعد کہا کہ اگر یہ وفد انگریزون کی پناہ مین نہ [illegible] تو ہم صدر وفد کو گولی مار دیتے، جب وفد کے مشن مین سید صاحب کو ناکامی ہوئی، تو مصر کا رُخ کیا، اور وہان کے علماء و اکابر سے مل کر حجاز کے معاملہ پر گفتگو کی، شیخ ازہر نے انکی تجاویز سے اپنی رضامندی ظاہر کی، یہ اس وفد کی ایسی کامیابی تھی کہ دنیا کے تمام اخبارات نے اس کو نمایان سرخیون سے مشتہر کیا، اس سفر مین سید صاحب نے مصر کے تعلیمی حالات کا بھی گہرا مطالعہ کیا، جس کو مضمون کی شکل مین معارف (مئی سنہ ۱۹۲۵ء) مین شائع کیا،

سید صاحب نے "مسلمان عورتوں کے حقوق" کے عنوان سے اس کی تردید میں ایک طویل مضمون لکھا، اور یہ دکھایا کہ عورتوں کے ساتھ جتنی بے انصافیاں تھیں، ان سب کا خاتمہ آخری ربانی پیغام اور تکمیلی دین نے کیا، اور اُن کے واجبی حقوق دے کر ان کا درجہ بلند کیا،

انجمن حمایت اسلام لاہور میں تقریر

اسی سال کے وسط اپریل میں انجمن حمایت اسلام لاہور کی دعوت پر "عہد رسالت میں اشاعت اسلام" پر تقریر کی جو بہت پسند کی گئی، اس موقع پر لاہور کے تمام اصحاب علم سے ملاقاتیں رہیں، ڈاکٹر اقبال نے بڑی تواضع سے ملنے میں پیش دستی فرمائی، ان کی قیام گاہ پر آئے، اور بڑی گرمجوشی سے ملے، اور پھر اُن کے اعزاز میں جتنی علمی صحبتیں رہیں، ان میں ڈاکٹر اقبال ہی شمع محفل رہے، چنانچہ سید صاحب نے پنجاب کے سفر سے واپسی پر شذرات میں تحریر فرمایا کہ .... "انھوں نے یعنی ڈاکٹر اقبال نے "شمع اور شاعر" لکھا ہے لیکن میں نے تو لاہور میں خود شاعر کو شمع دیکھا، اور قدر شناسوں کو اس پر پروانہ پایا، اُن کی صحبت لاہور کے نوجوانوں کی دماغی سطح کو بلند کر رہی ہے، اُن کے فلسفیانہ نکات، عالمانہ افکار، شاعرانہ خیالات، اُن کے آس پاس کی دنیا کو ہمیشہ متاثر رکھتے ہیں" اس ملاقات کے بعد دونوں میں اور زیادہ گہرے تعلقات پیدا ہوئے،

جنوبی ہند کا سفر

اسی سال کے اکتوبر میں مجلس العلماء کی صدارت کے لئے ترچناپلی تشریف لے گئے، یہ مجلس تامل زبان میں اسلام کی تبلیغ اور اشاعت تعلیم کا کام انجام دیتی تھی، اس سفر میں وشارم، آمبور، عمرآباد، بنگلور، میسور اور حیدرآباد دکن میں بھی تقریریں کیں، اس سفر کا مقصد ندوۃ العلماء کے دار الاقامہ کی تعمیر کے لئے چندہ کا حصول تھا، وہاں سے واپسی کے بعد نومبر میں ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لئے امرتسر گئے، اس جلسہ میں ندوہ کے لئے نواب صاحب بہاولپور نے پندرہ ہزار کی رقم عطا کی، امرتسر سے وہ جمعیۃ العلماء کے اجتماع میں شرکت کے لئے پشاور بھی گئے،

دار المصنفین کی روز افزوں شہرت

۱۹۲۸ء میں خالص علمی کاموں خصوصاً سیرۃ النبی جلد چہارم کی تدوین میں مشغول رہے،

شعیب قریشی تھے، سلطان ابن سعود نے مسئلہ حجاز کے سلسلہ مین تمام دنیا سے مسلمانون کی ایک موتمر مکہ معظمہ مین طلب کی تھی جس مین ترکی، مصر، افغانستان، ہند اور دوسرے اسلامی ملکون کے نمایندے شریک ہوئے، اور چند ہفتون تک برابر اس کے جلسے ہوتے رہے، موتمر کے نمایندون نے سید صاحب کو موتمر کا نائب رئیس منتخب کیا، اور صدر موتمر کی غیر حاضری مین اس کی صدارت بھی کی، اس مین انھون نے جو عالمانہ اور مبصرانہ تقریرین کین، اُن سے ہندوستان کے مسلمانون کی علمی و دینی عظمت شرکاء کے دلون مین قائم ہو گئی، حجاز مین وفد کے کامون کی مشغولیت کے باوجود اُن کا قلم بھی رواں دواں رہا، چنانچہ وہان سے آنے کے بعد "حجاز کے کتب خانے" کے عنوان سے معارف کے کئی نمبرون مین ایک طویل مضمون لکھا،

مارگولیتھ سے علمی معرکہ

اس وفد سے واپسی کے بعد وہ زیادہ تر علمی، مذہبی، اور تعلیمی کامون مین مشغول رہے، ۱۹۲۵ء مین مانچسٹر گارجین کے ایک عیسائی مضمون نگار نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق بعض نامناسب باتین مارگولیتھ کی کتاب کے حوالہ سے لکھین، جو خود مارگولیتھ نے واقدی کے جرمن ترجمہ وطلہاؤسن کے حوالہ سے لکھی تھین، اس پر واقدی کے معتبر اور غیر معتبر ہونے کی بحث چھڑ گئی، سید صاحب نے ۱۹۲۶ء اور ۱۹۲۷ء کے معارف کے متعدد مضامین مین یہ ثابت کیا کہ واقدی کی حیثیت ایک داستان گو سے زیادہ نہین ہے، اور اس کا شمار معتبر مورخین مین نہین ہے، تاریخ و سیرت مین اس کا حوالہ دینا ایسا ہی ہے، جیسے ملکہ الزبتھ کی سوانح عمری مین رینالڈس کا حوالہ دیا جائے، مارگولیتھ کے علاوہ ڈرہم یونیورسٹی کے عربی کے پروفیسر ڈاکٹر گولیم نے بھی اس بحث مین حصہ لیا تھا، سید صاحب نے دونون کو اپنے محققانہ اور فاضلانہ مضامین سے خاموش کیا، ان مضامین کا انگریزی ترجمہ اسلامک ریویو ووکنگ مین بھی شائع ہوا، اور ایک صاحب نے حجاز مین ان کا ترجمہ عربی مین بھی کیا،

زہر کا تریاق

۱۹۲۷ء مین ایک یورپین اہل قلم نے لکھا کہ "مسلمان ارسطو کی گاڑی کے قلی تھے" سید صاحب نے اپنے ایک مضمون مین اس کی فاضلانہ تردید کی جس کا انگریزی ترجمہ حیدرآباد دکن کے رسالہ اسلامک کلچر مین بھی شائع ہوا، اسی سال یہ پروپیگنڈا کیا گیا کہ اسلام کا قانون عورتون کے لئے حد درجہ تنگ اور سخت گیر

مفید معلومات فراہم کئے اسی سال حیدرآباد کے سفر کے موقع پر حضور نظام نے اُن سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی، اور اس کے نتیجہ مین ریاست حیدرآباد سے دار المصنفین کی سالانہ امداد جاری رکھی گئی،

ساردا ایکٹ کے خلاف احتجاج

؁۲۸ء و ؁۲۹ء مین ساردا ایکٹ یعنی نابالغون کی شادی پر پابندی کے سلسلہ مین مسلمانون مین بڑا ہیجان پیدا ہوا، انھون نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا، لیکن اس قانون کے بعض مسلمان حامیون نے فقہ اسلامی مین تحریف کرنے کی کوشش کی، اور نابالغ لڑکیون کے نکاح کو ناجائز بتایا، اور زور استدلال مین حضرت عائشہؓ کی نابالغی کی عمر نکاح سے بھی انکار کر دیا، سید صاحب نے معارف مین نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر پر محققانہ اور فاضلانہ بحث کرکے ایسے تمام لوگون کا منھ بند کر دیا، اور یہ علان کیا کہ نابالغون کا نکاح تو شرعًا جائز ہے، مگر ہر حال مین مستحسن نہین لیکن کسی غیر اسلامی حکومت کو مسلمانون کے نکاح و طلاق کے سلسلہ مین قانون بنانے کا حق نہین، غیر اسلامی حکومتون مین مناسب اصلاحات کو قانونًا نافذ کرنے کی صورت صرف یہ ہو کہ وہ حنفی تصریحات کے مطابق مسلمان والی یا قاضی کے ذریعہ جاری کی جائین، اسی سلسلہ مین انھون نے اس طرف بھی توجہ دلائی کہ سوراج قائم ہونے کے بعد مسلمانون کے پیش نظر جو معاملات ہین، اُن مین ایک مطالبہ یہ بھی ہو کہ آیندہ حکومت مین مسلمانون کے خاص مذہبی اور شخصی قوانین کے تحفظ، ترقی و اصلاح اور استحکام کے لئے ایک علٰحدہ نظام ہونا چاہئے، اور اس کے لئے ایک قابل عمل خاکہ پیش کیا جائے، اس طرح کلچرل اٹونومی کی صدا پہلی بار انھون نے بلند کی اور یہ بھی لکھا کہ اگر آسمان کو دیکھ کر موسم کے انقلاب کی پیشین گوئی کی جا سکتی ہو تو موجودہ حالات کو دیکھ کر مجھکو یقین ہے کہ اگر اس قسم کی تدبیر نہین کی گئی، تو مسلمانون کی ممتاز ہستی اس ملک مین قائم نہین رہ سکتی،

عرب ہند کے تعلقات پر لکچر

؁۲۹ء کے مارچ مین ہندستانی اکیڈمی الٰہ آباد کی دعوت پر "عرب و ہند کے تعلقات" پر لکچر دیئے جن مین ہندو مسلمان دونون کو اُن کا وہ زرین عہد یاد دلایا، جب دونون گوناگون تعلقات کے رشتون مین جکڑے ہوئے تھے، یہ خطبات تلاش و تحقیق، محنت و کاوش، اور حجت و استدلال

دارالمصنفین اب اپنے مذہبی، علمی و ادبی کارناموں کی وجہ سے ہند اور بیرون ہند میں بہت مشہور ہو چکا تھا، فرانس کے علمی رسالہ "دنیائے اسلام" میں اس کا ذکر کئی بار کیا گیا، مصر کے رسالہ الزہرا میں اس پر ایک مقالہ بھی شائع ہوا، ایک ترک نوجوان شہاب الدین آفندی نے جو مولانا روم کے خاندان سے تھے، اپنے ہموطن نادرۂ روزگار مہندس استاذ عیسیٰ اور اُن کے رفقاء کے حالات قلمبند کرنے کے سلسلہ میں دارالمصنفین کی طرف رجوع کیا، امریکہ کے رسالہ مسلم ورلڈ اپریل ۱۹۲۸ء کے دو مضامین میں دارالمصنفین کا ذکر خاص طور پر کیا گیا، ترکی میں الفاروق اور سیرۃ النبی کے حصۂ اول دوم، سیرۃ عائشہ اور سیر الصحابہ کی بعض جلدوں کے ترجمے ترکی زبان میں کئے گئے، اور وہاں کے علماء اور عام شائقین نے ان کتابوں کو توقع سے زیادہ پسند کیا،

اس کی علمی شہرت سے ہندوستان کے سیاسی لیڈروں کی نظریں بھی اس کی طرف اٹھیں، اور وہ ایسا مرکز بن گیا، جہاں مسلمان اور ہندو لیڈر بڑے فخر سے آتے تھے، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، بی اماں، مولانا حسین احمد، چودھری خلیق الزمان، ڈاکٹر محمود کے علاوہ گاندھی جی، مالوی جی، سروجنی نائیڈو، پنڈت موتی لال نہرو، اور پنڈت جواہر لال نہرو سب ہی یہاں آئے، پنڈت موتی لال نہرو یو، پی اضلاع کے دورہ میں جب اعظم گڈھ آتے تو ہمیشہ دارالمصنفین ہی میں ٹھہرتے، شبلی منزل اُن کا بے تکلف مہمانخانہ تھا، پنڈت جواہر لال نہرو کا بھی ہمیشہ یہی طریقہ رہا، وہ جب بھی اعظم گڈھ آئے دارالمصنفین آکر ٹھہرے، گاندھی جی جب اپنے دورہ میں اعظم گڈھ آئے تو اُن کے قیام کا انتظام تو دوسری جگہ تھا، مگر وہ شبلی منزل آئے، اور ایسے وقت آئے کہ اہل دارالمصنفین ایک کھلی جگہ میں مغرب کی نماز پڑھ رہے تھے، یہ دیکھ کر گاندھی جی نہایت ادب اور خاموشی سے کنارے بیٹھ گئے، اور ساتھ والوں کو باادب رہنے کے لئے اشارہ کیا، سید صاحب نے لالٹین کی روشنی میں اُن کو کتب خانہ دکھایا، دارالمصنفین کے ایک رفیق نے اُن کے سامنے دستخط کے لئے اپنی یادداشت کی کتاب پیش کی تو انھوں نے اردو میں دستخط کیا،

۱۹۲۸ء میں سید صاحب نے "ہندوستان اور علم حدیث" کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھا جو دلچسپی سے پڑھا گیا، اس موضوع پر اردو میں یہ پہلا مضمون تھا، اس کی اشاعت کے بعد دوسرے اہل قلم نے بھی اس موضوع پر

سید صاحب نے اس کے خلاف بھی آواز بلند کی جس پر عام مسلمانوں نے اتنی مخالفت کی کہ اڈیٹر نگار کو توبہ نامہ لکھنا پڑا، جو نومبر ۱۹۲۷ء کے معارف میں بھی شائع ہوا،

سیرۃ النبی جلد چہارم ۱۹۳۲ء میں سید صاحب کی مشہور تصنیف سیرۃ النبی کی چوتھی جلد شائع ہوئی جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ نبوت محمدی نے دنیا میں کس عظیم الشان اصلاح کا فرض انجام دیا، اس کی اشاعت سے دار المصنفین کی شہرت میں اور بھی چار چاند لگ گئے،

مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں تقریریں مارچ ۱۹۳۳ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی انجمن اردوئے معلی کی دعوت پر "ہندوستان میں ہندوستانی" پر ایک خطبہ دیا، یہ جلسہ مولانا حبیب الرحمن خان شروانی صدر یار جنگ بہادر کی صدارت میں یونین ہال میں ہوا جو اس موقع پر بھرا تھا، اس میں سید صاحب نے تاریخی حوالوں سے بتایا کہ اردو کا نام دراصل ہندوستانی تھا، انگریزوں کے آنے سے بہت پہلے دسویں صدی میں یہ زبان اسی نام سے پکاری جاتی تھی، اُن کی دوسری تقریر آفتاب ہوسٹل کے طلبہ کے سامنے ہوئی جس میں ان پر یہ اچھی طرح واضح کیا کہ ہماری یہ زندگی جو تمام تر دوسری قوم کی نقالی پر مبنی ہے، ہمارے اندر قومی روح کی سرگرمی نہیں پیدا کرسکتی، اُن کی تیسری تقریر طبیہ کالج کے ہال میں ہوئی، اس میں اسلامی طب کی تاریخ کے ساتھ وہاں کے طلبہ کو نصیحت فرمائی کہ وہ ڈاکٹر بننے کے بجائے طبیب بننے کی کوشش کریں، کیونکہ ہندوستان کی صحت عامہ کا انحصار دیسی طب پر ہے جس کی اکثر دوائیں ہمارے ملک کی پیداوار ہیں، وہ مسلم یونیورسٹی کے کورٹ کے ممبر بھی ۱۹۳۳ء سے ۱۹۴۷ء تک رہے،

تاج محل کے معمار کی تحقیق اپریل ۱۹۳۳ء میں ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور کے پہلے سالانہ اجلاس کی شرکت کے لئے لاہور تشریف لے گئے جس کی صدارت ڈاکٹر سر محمد اقبال نے کی تھی، اس جلسہ میں انھوں نے اپنا ایک مقالہ پیش کیا جس کا عنوان "لاہور کا ایک مہندس خاندان جس نے تاج اور لال قلعہ بنایا" تھا، اس میں اس خاندان کے تقریباً ڈیڑھ سو برس کے علمی کارناموں کی سرگذشت نامعلوم گوشوں سے بڑی تلاش و تحقیق

کے اعتبار سے بے مثل سمجھے جاتے ہیں، ان کا انگریزی ترجمہ جناب سعید حق صاحب ام۔ اے (فی الحال نیوز ایڈیٹر کراچی) نے کیا تھا، جو اسلامک کلچر حیدرآباد میں کئی سال تک شائع ہوتا رہا[1]،

ندوۃ العلماء کے لئے سرمایہ کی فراہمی

سنہ ۳۰ء میں زیادہ تر سیرۃ النبی جلد چہارم کی تدوین میں مشغول رہے، اسی کے ساتھ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی مالی حالت کو درست کرنے کی بھی فکر رہی چنانچہ ان کی تحریک پر مدراس کے مشہور مخیر ساہوکار سیٹھ عبدالحکیم صاحب نے ندوہ کو پانچ ہزار روپے کی رقم عنایت کی،

عربوں کی جہازرانی

سنہ ۱۹۳۱ء کے مارچ میں "عربوں کی جہازرانی" پر بمبئی گورنمنٹ کے شعبۂ تعلیم کی سرپرستی میں چار خطبے دیئے، جو بڑی دلچسپی سے سنے گئے، ان کے اقتباسات بمبئی کے انگریزی اور اردو اخبارات نے شائع کئے، ان میں یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ موجودہ جہازرانی کی ترقی میں عربوں کا کتنا حصہ ہے، ان خطبات کا بھی انگریزی ترجمہ اسلامک کلچر حیدرآباد میں شائع ہوا،

قلمی جہاد

ان کا یہ سال زیادہ تر ان دشمن اسلام عناصر کے خلاف قلمی جہاد میں گذرا، جو مسلمانوں کو اپنی تحریروں سے گمراہ کرنے کی کوشش میں تھے، اسی زمانہ میں انگریزی اخبار اسٹیٹسمین میں ایک مضمون چھپا تھا، جس میں واقعۂ کربلا کا حال ایسے انداز میں بیان کیا گیا تھا، جو مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے قابلِ اعتراض تھا، اس کے خلاف سید صاحب نے سخت احتجاج کیا، اسی طرح پنجاب یونیورسٹی کے نصاب میں ڈاکٹر وائل کی کتاب تاریخ اقوام اسلامیہ اور ڈاکٹر نکلسن کی تاریخ ادبیاتِ عربی داخل ہوئیں، تو انھوں نے وہاں کے اربابِ علم کو اس طرف توجہ دلائی کہ ان دونوں کتابوں میں اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ کے متعلق نہایت گمراہ کن نظریات اور لغو اعتراضات ہیں جن کو ایک مسلمان سننا بھی گوارا نہیں کر سکتا، مسلمانوں کے اخبارات نے بھی احتجاج کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کتابیں پنجاب یونیورسٹی سے خارج کر دی گئیں، اسی طرح جب رسالہ نگار لکھنؤ نے انبیاء کرام علیہم السلام، رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلامی عقائد و اعمال کے متعلق دل آزار مضامین لکھے تو

---

[1] ان سطور کو لکھتے وقت یہ اطلاع ملی کہ یہ انگریزی ترجمہ کتاب کی صورت میں حکومت پاکستان شائع کرنے والی ہے

ہندستانی اکیڈمی الٰہ آباد نے اس پر پانچ سو روپیے کا انعام دیا، ڈاکٹر سر اقبال نے اس کتاب کو پڑھ کر سید صاحب کو ایک مکتوب میں لکھا کہ "عمر خیام پر آپ نے جو کچھ لکھ دیا ہے اس پر اب کوئی مشرقی یا مغربی عالم اضافہ نہ کر سکے گا"۔

سفر افغانستان | اسی سال نادر خان شاہ افغانستان کی طرف سے ایک تعلیمی وعلمی دعوت ڈاکٹر سر اقبال، نواب سر راس مسعود وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی اور سید صاحب کو موصول ہوئی کہ وہ افغانستان آکر کابل یونیورسٹی کی ترتیب و تنظیم اور وہاں کے تراجم و تالیف کے دائرے کو وسیع کرنے کے سلسلہ میں اپنے مفید مشورے دیں، چنانچہ سید صاحب ۲۳ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو ہندوستان سے کابل روانہ ہوئے، پاسپورٹ کے ملنے میں تاخیر ہونے کے سبب وہ اپنے دوسرے رفقائے سفر کے ساتھ نہ ہو سکے، اور کابل ان کے پہنچنے کے بعد پہونچے، سرکاری طور پر وہاں ان معزز مہمانوں کی بڑی پذیرائی ہوئی، علمی انجمنوں نے ان کو سپاسنامے پیش کئے، اور عام لوگوں نے مختلف طریقوں سے اپنی محبت کا اظہار کیا، سید صاحب اور فاضل ارکان سے تو ان سے مسئلہ تعلیم پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ افغانستان کی عربی و مذہبی تعلیم کا نصاب ایسا ہو کہ جس میں موجودہ زمانے کے لحاظ سے سیاسی و اجتماعی اصلاحات کی طرف میلان بھی ہو، اور اس میں مذہبی شیفتگی بھی پیدا ہو، شاہ افغانستان نے اس مشورہ کو پسند فرمایا، سید صاحب نے اسی قسم کے مشورے وہاں کے ماہرین تعلیم کو بھی دیئے جو انھوں نے قبول کئے، وہاں کے قیام کے زمانے میں انجمن ادبی کابل نے ہندوستان کے معزز مہمانوں کو ایک سپاسنامہ پیش کیا تو اس موقع پر افغانستان کے مشہور شاعر جناب قاری عبداللہ صاحب نے خیر مقدم کے عنوان سے ایک نظم پڑھی جس میں سید صاحب کے متعلق یہ اشعار تھے:

سوم سید کہ از ندوہ است　　ز دانش بہ ہندوستان قدوہ است

ز فیض دمش تازہ شد جانِ علم　　در اقلیم دانش سلیمانِ علم

چو گلگشت معنی طرازندہ شد　　خیالاتِ شبلی از و زندہ شد

چو در شاہراہ حقایق شتافت　　معارف از و رونق تازہ یافت

مضامین او جملہ محکم بود　　نگارش بجگلش مسلّم بود

مرتب کی گئی تھی، اور تاریخ میں پہلی دفعہ اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ نادر العصر استاد احمد معمار شاہجہانی لاہوری کے حالات بتائے گئے، اور نہایت مستند شہادتوں سے یہ ثابت کیا گیا کہ تاج کا معمار درحقیقت یہی استاد احمد معمار شاہجہانی لاہوری ہے جو ہندسہ، ہیئت اور ریاضیات کا بہت بڑا عالم تھا، اس حقیقت کے ظاہر ہونے کے بعد وہ تمام دعوے جو تاج کے کاریگروں اور معماروں سے متعلق مشہور تھے، بے سروپا ہو کر رہ گئے،

مغربی ہند کا سفر جولائی ۳۳ء میں سیرت نبوی پر تقریر کرنے کے لئے بڑودہ تشریف لے گئے، اس کا جلسہ [illegible] دیوان بہادر کی صدارت میں بڑودہ کالج میں ہوا، بڑودہ سے بھروچ، بھروچ سے رانڈیر، رانڈیر سے سورت ہوتے سے انکلیشور، اور وہاں سے ڈابھیل گئے، اور ہر جگہ ایک ایک دو دو مذہبی تقریریں کیں،

ضابطہ جنایات قتل و قصاص کی ترتیب اسی سال حکومت حیدرآباد نے دارالمصنفین کو فقہ حنفی کی رو سے ایک ضابطہ جنایات کی ترتیب و تدوین کی خدمت سپرد کی، چنانچہ سابق دولتِ عثمانیہ کی مجلۃ الاحکام کی طرح قانون جنایات بھی دفعہ وار مرتب کیا گیا، اور اس کا مسودہ سید صاحب نے حکومت حیدرآباد کو پیش کیا،

خیام اسی سال اُن کی مشہور و معروف تصنیف خیام شائع ہوئی، انھوں نے خیام پر پہلی دفعہ فروری ۲۶ء کے معارف میں ایک مضمون لکھا تھا، جو دراصل پروفیسر اقبال معلم فارسی اورینٹل کالج لاہور کے اس مقالہ کا جواب تھا جو انھوں نے "شعر العجم اور عمر خیام" کے عنوان سے رسالہ اردو (اورنگ آباد دکن) میں تحریر کیا تھا، اس مضمون کو قلمبند کرتے وقت سید صاحب نے خیام کا ناقدانہ مطالعہ کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دسمبر ۱۹۳۰ء کی اورینٹل کانفرنس منعقدہ پٹنہ میں ایک مقالہ پیش کیا، ارباب نظر نے توقع سے بڑھ کر اس کی قدر کی، تو یہی مقالہ ایک کتاب کی صورت میں منتقل ہو گیا، اس کتاب کی ترتیب میں انھوں نے سنین کی تحقیق، تطبیق، واقعات کی تلاش و تفتیش، ماخذوں اور سندوں کے حوالوں اور خیام کی فلسفیانہ تصانیف کی جستجو میں جو فکر و کاوش کی ہے، وہ ایک اہم علمی کارنامہ ہے، اس سے خیام بالکل ہی نئے رنگ میں ظاہر ہوتا ہے، اس تصنیف کی داد ہندوستان سے لیکر ایران و کابل، اور یورپ تک کے فضلا نے دی، فردوسی کی ہزار سالہ برسی کے موقع پر افغانستان نے ایران کو جو تحائف دیئے ان میں ایک تحفہ خیام بھی

...تاریخ کی تدوین و ترتیب کا ایک خاکہ ملک کے سامنے پیش کیا، مسلمانوں نے ہندوستان کو جو سیاسی، قومی، علمی، تمدنی ...ت سے ترقی دی، اُس کی ایک مکمل اور جامع تاریخ کی ضرورت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی، سید صاحب نے دسمبر ۱۹۳۲ء ...معارف میں یہ تجویز پیش کی کہ ایسی تاریخ پندرہ جلدوں میں لکھی جانی چاہیئے، پورے ملک نے اس تجویز کی تائید کی، ...دارالمصنفین میں بعض اہلِ قلم کی خدمات حاصل کر کے اس اہم کام کو شروع کرا دیا گیا، جو اب تک جاری ہے۔

جامعہ لاہور کا خاکہ

جنوری ۳۵ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کی دعوت پر اس کی طلائی جوبلی میں شریک ہوئے ...نے اس موقع پر ایک اسلامی زنانہ جامعہ قائم کرنا چاہا تو اُس کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی جس کے ایک ممبر سید صاحب تھے، انھوں نے علامہ اقبال کے ساتھ مل کر ایک خاکہ تیار کیا، اس سفر کے سلسلہ میں لاہور، لدھیانہ، سہارنپور، ...دہلی کے علمی و تعلیمی اداروں اور کتب خانوں کی بھی سیر کی۔

قوانین فوجداری حیدرآباد پر نظرثانی

اسی سال ریاست حیدرآباد دکن نے شرعی حیثیت سے وہاں کے ضابطہ فوجداری پر نظرثانی کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی جس میں ایک سابق جج ہائی کورٹ، مفتی ریاست ...اور سید صاحب تھے، اس کمیٹی نے ایک مہینہ میں اپنا کام پورا کیا۔

سیرۃ النبی جلد پنجم

اسی سال اُن کی مشہور و معروف تالیف سیرۃ النبی کی پانچویں جلد شائع ہوئی، اس کا موضوع ...ت ہے، سیرۃ النبی کی جلدیں ہند اور بیرونِ ہند میں بے حد مقبول ہو رہی تھیں، ہندوستان میں اس کی مانگ ...جا رہی تھی، اور ہر جلد کے کئی کئی اڈیشن شائع ہوئے، پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ ترکی میں اس کی تین جلدوں ...مہ ہوا، اور وہاں اُن کی مقبولیت کا اندازہ نواب فخر یار جنگ کے حسبِ ذیل مکتوب سے ہوگا، جو انھوں نے سید صاحب ...ریر فرمایا :-

"...تن کچھ عرصہ ہوا ترکی گیا تھا ...... وہاں ایک بڑی جماعت ایسے لوگوں کی ملی جو سیرۃ النبی مبارک کی بڑی مداح ہے، اور اس کا جو ترجمہ ترکی میں ہو چکا ہے، اس کو وہ بہت شوق سے مطالعہ کرتے ہیں، خود استنبول تو چونکہ مغرب زدہ ہو چکا ہے، وہاں زیادہ لوگ نہیں ملے، لیکن بروصہ میں جو شاہانِ عثمانیہ

کابل سے چل کر غزنین آئے، جہان حکیم سنائی اور محمود غزنوی کے مزار پر حاضری دی، پھر مقر، قلات غلزئی، قندھار، چمن، کوئٹہ اور ملتان کی سیاحت کرتے ہوئے اعظم گڈھ واپس آگئے، رخصتانہ مین نادر شاہ نے افغانستان کے بنے ہوئے چار عمدہ قالین، کچھ پشمینے اور ادنی کپڑے بھی نذر کئے، اس طویل سفر مین اُن کے قلم کا مسافر بھی چلتا رہا، دن اندرات کے مختلف مشاغل کے باوجود سونے سے پہلے وہ سفر کے تمام کوائف قلمبند کر لیتے، چنانچہ آخر مین ایک سفرنامہ مرتب ہو گیا، جو معارف مین شائع ہوا، اور بعد مین سفرنامۂ افغانستان کے نام سے ایک کتاب بھی مرتب ہو گئی، اس سفر مین ڈاکٹر اقبال اُن سے بے حد متاثر ہوئے، چنانچہ ایک موقع پر تحریر فرمایا کہ

"آج سید سلیمان ندوی ہماری علمی زندگی کے سب سے اونچے زینے پر ہین، وہ عالم ہی نہین، امیر العلما ہین، مصنف ہی نہین، رئیس المصنفین ہین، ان کا وجود علم و فضل کا ایک دریا ہے جس سے سیکڑون نہرین نکلی ہین اور ہزارون سوکھی کھیتیان سیراب ہوئی ہین"

جامعہ ملیہ کی توسیعی لکچرز کی صدارت

فروری ۱۹۳۳ء مین ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی دعوت پر ڈاکٹر بہجت وہبی جامعہ ملیہ آئے، یہ حضرت معاذ بن جبلؓ کی اولاد مین سے تھے، مصر کی طبی درسگاہ مین علم تشریح کے استاد رہ چکے تھے، وہان سے سبکدوش ہونے کے بعد یورپ مین گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنے لگے، ۱۹۲۰ء مین سید صاحب سے عرصہ واقع سوئزرلینڈ مین ملاقات ہوئی تھی، اسلامی احوال، جغرافیہ پر اُن کا مطالعہ گہرا تھا، جامعہ ملیہ مین آکر چار خطبے دیئے، ڈاکٹر انصاری کے اصرار پر ان کے پچھلے دو خطبون کے جلسون کی صدارت سید صاحب ہی نے کی،

سفر رانچی

جون ۱۹۳۴ء مین صوبہ بہار و اڑیسہ کے وزیر تعلیم آنریبل جناب سید عبدالعزیز کی دعوت پر عربی مدارس کے ترتیب نصاب کے سلسلہ مین رانچی تشریف لے گئے، ان کے ساتھ اُن کے عزیز دوست مولانا مناظر احسن گیلانی (صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن) بھی تھے، حکومت بہار نے اُن کو کئی بار مدرسۂ شمس الہدی پٹنہ کے پرنسپل کے تقرر کے سلسلہ مین پبلک سروس کمیشن کا اکسپرٹ ممبر بھی نامزد کیا،

تاریخ ہند کی تدوین کی اسکیم

اسی سال کے آخر مین بہت سے ہمدردان علم کے تقاضے اور اصرار پر اسلامی ہند کی

...ی وکالت اور وساطت سے یہ مقدمہ عدالت سے خارج ہوگیا، اور سید صاحب کو عدالت مین حاضر ہونے کی نوبت
...ہین آئی،

...ندستانی اکیڈمی
...کے جلسہ کی صدارت

جنوری ۳۶ء مین لکھنؤ کی نمایش گاہ مین ہندستانی اکیڈمی کی ایک کانفرنس کے شعبۂ اردو کی صدارت کی، اس اکیڈمی کا مقصد ہندوستان کو ادب کی راہ سے ایک کرنا تھا، لیکن اس کانفرنس
...ین اردو اور ہندی کے دو خیمے علیحدہ علیحدہ تھے، ایک کے ادیبنے دوسرے کی صورت تک نہ دیکھی، اس سے سید صاحب
...و بڑا دکھ ہوا، اور اسی وقت اُن کو یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید ہندو مسلمانون کے دل ایک دوسرے سے جدا ہورہے
...ین، جیسا کہ انھون نے فروری ۳۶ء کے **معارف** مین اظہار کیا ہے،

...سلم ایجوکیشنل کانفرنس
...طلائی جوبلی

مارچ ۱۹۳۶ء مین مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی طلائی جوبلی علی گڈھ مین ہوئی، تو اس کے شعبۂ علوم و فنون اسلامی کی صدارت کی، اس مین خطبۂ صدارت کے علاوہ اپنا ایک مقالہ
...رب اور امریکہ کے عنوان سے پیش کیا، جس مین یہ دکھایا کہ کولمبس سے پہلے عرب جہازران امریکہ پہونچ چکے تھے کیونکہ
...ان کو زمین کی گولائی اور اس کے تحتانی اور فوقانی حصون کا علم تھا، اسی لئے ماوراے بحرِ ظلمات تک پہنچنے کی کوشش کی،

...سفر مدراس و حیدرآباد

اکتوبر ۱۹۳۶ء مین جامعہ دارالسلام عمرآباد مدراس کا خطبۂ اسناد دینے کے لئے وہان تشریف
...لے گئے، مدراس کو اُن سے اور اُن کو مدراس سے ذاتی اُنس ہوگیا تھا، مدراس سے حیدرآباد آئے، وہان اُن کی آمد
...کی اطلاع اخبار مین حضور نظام کی نظر سے گذری، تو اُن کے لئے خاصہ بھیجا، اور ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا، اس
...قیام کے زمانہ مین **دائرۃ المعارف** حیدرآباد نے اُن کے اعزاز مین نواب مہدی یار جنگ کی صدارت مین
...ایک جلسہ کیا، جس مین انھون نے اپنا ایک مقالہ عربی زبان مین ابوالبرکات بغدادی اور اُس کی کتاب المعتبر کے
...عنوان سے پڑھا، اسی روز سرمہاراجہ یمین السلطنت بہادر کشن پرشاد نے اپنے یہان مدعو کرکے ایک خلعت عطا کیا،
...اس سفر سے ختم کرکے واپس آئے تو حضور نظام نے اُن کے لئے سو روپئے ماہانہ کا ذاتی وظیفہ مقرر کرکے ان کے علم و فضل
...سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا،

کا فتح استنبول سے پہلے قریب ڈیڑھ سو سال کے دارالحکومت رہا ہے، بہت سے احباب کو سیرۃ النبی کا ذکر دلچسپی سے کرتے سنا، خدا آپ کے مساعی جمیلہ کو بارآور کرے"

فارسی میں بھی سیرۃ النبی کی چند جلدوں کا ترجمہ کابل میں کیا گیا، مکہ معظمہ اور مصر میں اس کے عربی ترجمہ کا خیال ہوا۔

اردو ہندی کا جھگڑا

اکتوبر ۱۹۳۵ء میں مرض ذات الجنب کا شدید حملہ ہوا، کئی مہینے کے بعد شفا ہوئی، تو ڈاکٹروں نے چھ مہینے تک مکمل آرام لینے کی ہدایت کی، تین مہینے دہرہ دون جیسے صحت بخش مقام میں جا کر قیام بھی کیا، اور اس کے بعد اپنے علمی مشاغل پھر شروع کیے، تو اردو ہندی کے روز افزوں جھگڑوں سے ان کو بہت دکھ پہنچا، معارف کے شذرات کے ذریعہ اپنے دردمندانہ خیالات کا اظہار کیا کہ ہندی اور اردو دونوں کیلئے الگ الگ ترقی کی راہیں کھلی رہنی چاہئیں کیونکہ زمانہ یہ فیصلہ کر چکا ہے کہ نہ اردو ہندی کو مٹا سکتی ہے، اور نہ ہندی اردو کو، دونوں اپنی راہیں چلتی رہیں گی، انھوں نے یہی خیالات علی گڈھ میں آل انڈیا اردو کانفرنس میں ظاہر کیے جو اکتوبر ۱۹۳۶ء میں ہوئی۔

فلسطین کانفرنس کی صدارت

یہودیوں اور انگریزوں کی سازش سے فلسطین کا جو نیا نقشہ بننے کو تھا، اس سے ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی بڑا سیاسی ابال اور مذہبی جوش پیدا ہوا، مدت کی سیاسی خاموشی کے بعد سید صاحب نے فلسطین کے مسئلہ میں اپنی آواز بلند کی، اور مولانا شوکت علی اور مفتی کفایت اللہ کے اصرار پر ۹ نومبر ۱۹۳۶ء کی آل انڈیا فلسطین کانفرنس دہلی کی صدارت کی، اس میں جو خطبہ پڑھا، وہ دنیائے اسلام میں بڑا مقبول ہوا، مصر اور شام کے اخبارات نے اس کے ترجمے چھاپے، مجلس اعلیٰ فلسطین کے صدر مفتی سید امین الحسینی نے خاص طور پر تار کے ذریعہ ان کا شکریہ ادا کیا۔

ایک ناخوشگوار واقعہ

وہ فلسطین کانفرنس کی صدارت کر رہے تھے کہ ایک بزعم خود غلط اہل قلم نے ۵ صفحے کا ایک رسالہ "سید سلیمان ندوی کی قرآنی غلطیاں" لاکر ان کے ہاتھ میں دیا جس میں ان کی تصانیف میں سے گیارہ غلطیاں فراہم کر کے یہ الزام لگایا تھا کہ ان کی تحریروں سے الحاد و اہمال کے جراثیم پیدا ہوتے ہیں، دسمبر ۱۹۳۶ء کے معارف میں ان اعتراضات کا جواب شائع ہوا، خود رسالہ کے مرتب نے مطمئن ہونے کے بجائے سید صاحب کو ایک عدالتی نوٹس کے ذریعہ دہلی کی عدالت میں طلب کرنے کی کوشش کی لیکن دہلی کے ایک زمانہ کے مشہور وکیل جناب عبدالرحمن صاحب

غور کرنا پڑا، اسلامیہ کالج پشاور کے سامنے ایک تجویز یہ تھی کہ اس میں ایک ایسا شعبہ کھولا جائے جس میں بعض پڑھے لکھے لانوں کو مختصر عربی، دینیات، اور طب کی تعلیم دیجائے، جو گاؤں میں پھیل کر اپنی روزی بھی کمائیں، اور مسلمانوں کی مذہبی ت بھی کریں، اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے سید صاحب مدعو کئے گئے، وہاں پہنچ کر مجوزہ نصاب کی ترتیب دینے کے و مختلف عنوانات پر کئی تقریریں کیں جن میں وہاں کے نوجوانوں کو یہ تلقین کی کہ وہ مسلمانوں کے اکثریت کے صوبے رہنے والے کی حیثیت سے اپنے کو ایمان وعمل میں اتنا ممتاز بنالیں کہ سارے ہندوستان کے مسلمان اُن کے پیچھے ین پشاور سے لاہور آئے، یہاں کے اصحاب علم نے بڑی پذیرائی کی، مختلف دعوتوں میں علمی و قومی مسائل پر مبادلۂ ل کرتے رہے، لاہور سے بہاولپور آگئے، جہاں کی جامعہ عباسیہ ۱۹۲۵ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ ہی کے طرز پر قائم ہوئی یہاں کے وزیر تعلیم میجر شمس الدین اُس کے نصاب میں مزید اصلاح چاہتے تھے، سید صاحب نے پہنچ کر ضروری اصلاح اسی موقع پر وہاں کے صادق ایجرٹن کالج کی تقسیم اسناد کا جلسہ ہوا، تو خطبۂ اسناد سید صاحب ہی نے دیا، دوسرے ن اسی کالج کے ایک بہت بڑے جلسہ میں خصائص اسلامی پر ڈیڑھ گھنٹے تک تقریر کی، پھر شہر کی جامع جد میں فضائل نبوی پر ایک وعظ میں مسلمانوں کو نسبت نبوی کے شرف کی بنا پر اشرف الامم ہونے کی حیثیت لا رہنے کا شوق دلایا، اور اولاد کو اسی رنگ میں تعلیم دینے کا مشورہ دیا،

رحمت عالم | اسی سال بچوں کے لئے رحمت عالم لکھی جس میں سلیس اور آسان زبان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے، یہ کتاب گو بچوں کے لئے لکھی گئی تھی لیکن جوان اور بوڑھے سب اس سے مستفید ہو رہے ہیں،

مسلم یونیورسٹی کی طرف سے [illegible] | [illegible] کے نومبر میں ان کو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی طرف سے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری ملی، یہ گویا مسلم یونیورسٹی کی طرف سے اُن کے علمی و ادبی کمال کا اعتراف تھا، لیکن اُن کے علمی مان ڈگری سے بہت بلند ہوچکے تھے، اس لئے انھوں نے اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھنا پسند نہیں کیا، وقت اس قسم کے اعزاز کی تلاش تھی، اس وقت یہ ملے نہیں، اب اُن کی کوئی خواہش نہیں، اور [illegible] نام کے ساتھ لکھنے سے کیا فائدہ،

ودیا مندر اور دار دھا اسکیم ۱۹۳۸ء میں سی پی میں ودیا مندر کے نام سے جبری تعلیم کی مہم شروع ہوئی، اس میں اردو اور اسلامی تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا، اس لئے مسلمانوں میں ہیجان پیدا ہوا، تو سید صاحب نے بھی اس کے خلاف احتجاج کیا اور معارف کے ذریعہ یہ اعلان فرمایا کہ مخالفت اور دشمنی کی اسپرٹ سے نہیں بلکہ اپنے صحیح حق کو حاصل کرنے اور ملک میں اپنی پوزیشن بنا کرنے کے لئے اردو زبان سے قطع نظر کرنا ہمارے لئے قطعاً محال ہے، پھر مسلمانوں نے جب کانگرسی وزارتوں کی ودیا مندر کی مخالفت شروع کی تو سید صاحب نے اُن کو بیجا جوشِ عمل کے اظہار سے روکنے کی کوشش کی، اور یہ مشورہ دیا کہ اسلامی صوبوں کی وزارتیں حسب اقتضا اور مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم وغیرہ کی تجویزوں پر غور کریں، اور ان کو عمل میں لائیں تاکہ اس سے غیر اسلامی صوبے بھی اُن کے نقشِ قدم پر چل سکیں" مگر افسوس کہ اسلامی صوبے اس کام کو اب تک انجام نہ دے سکے ہیں،

سیرۃ النبی جلد ششم ۱۹۳۹ء میں اُن کی سیرۃ النبی کی چھٹی جلد شائع ہوئی، اس میں اسلام کی اخلاقی تعلیمات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، یہ سیرت کے سلسلہ کی بڑی اہم جلد ہے، یوں تو تمام جلدیں جدید علم کلام کی اساس ہیں،

نقوش سلیمانی اسی سال اُن کی کتاب نقوشِ سلیمانی بھی شائع ہوئی، یہ ان خطبوں تحریروں اور مقدموں کا مجموعہ ہے جو اردو ادب و زبان سے متعلق اُن کے قلم سے نکلے، یہ گویا پچھلی چوتھائی صدی کی ادبی تحریکوں کا ایک مرقع ہے، اس لئے یونیورسٹیوں کے نصاب میں جلد داخل ہوگئی،

سفر دکن ۱۹۴۰ء کا آغاز ادبی اور علمی سفروں سے کیا، ۲۵ جنوری کو وہ ندوۃ العلماء کے کام سے حیدرآباد دکن گئے، وہاں سے پونہ آئے، اور دکن کالج میں ایک تقریر مسلمانوں کے تحفظ پر کی، اس میں مسلمانوں کو خود یہ تجزیہ کرنے کو کہا کہ اسلامی کلچر کو وہ اپنے ہاتھوں تباہ کر رہے ہیں، یا اُس کو غیر برباد کر رہے ہیں، پونہ سے بمبئی آئے، وہاں کے [illegible] کی مسجد میں جمعہ کی نماز کے بعد ایک تقریر کی جس میں فرمایا کہ دنیا کی قوموں نے جب کبھی ترقی کی ہے تو اُس کی قوت کے دو ہی پر ہوتے ہیں، ایمان اور عمل، ہمارے نوجوان ان دونوں سے بے پروا ہو کر ترقی کا خواب نہیں دیکھ سکتے، اسمٰعیل کالج کے ہال میں ایک دوسری تقریر دکن اور گجرات میں اردو زبان کی تاریخ پر کی،

سفر سرحد و پنجاب اس سفر سے واپسی کے بعد ابھی تکان بھی دور نہیں ہوئی تھی کہ پشاور، بہاولپور اور لاہور کا

ایک تحقیق کے بعد دوسری تحقیق سامنے آئی ہے، اور اپنی غلطی ظاہر ہوئی ہے، تو بعد کے اڈیشن میں اس کے مطابق تبدیل کر دی ہے، مثلاً معراج بحالت بیداری وجسم ہونے پر قرآن پاک سے صحیح استدلال مجھے نہیں مل سکا، لیکن بعد کو اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی توفیق سے صحیح دلیل سمجھا دی تو دوسرے اڈیشن میں اس کو بڑھا کر مقام کی تصحیح کر دی، اسی طرح فنائے نار کے مسئلہ میں پہلے حافظ ابن تیمیہ اور ابن قیم کی پیروی میں کچھ لکھا گیا بعد کو جمہور کی رائے کا اضافہ کرکے دونوں کے دلائل کی تشریح کر دی، اور اب بحمد اللہ کہ اس باب میں جمہور ہی کے مسلک کا حق ہونا سمجھ میں آگیا ہے"

اسی طرح وہ پہلے تصویروں کے کھچوانے کو جائز سمجھتے تھے، اور زیوروں میں زکوٰۃ کے عدم وجوب کے قائل تھے، لیکن اس رجوع کے بعد جمہور علماء کا مسلک اختیار کیا، اس سلسلہ میں تحریر فرمایا،

"یہ باتیں کسی معترض کے خوف سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں اپنی ذمہ داری کو محسوس کرکے لکھ رہا ہوں، اور دعا کرتا ہوں کہ بار الٰہا مجھے صراط مستقیم پر قائم رکھ اور جب کبھی تقاضائے بشری سے مجھ کو غلطی ہو تو مجھے متنبہ اور معاف فرما اور مسلمانوں کو اس کے شر سے محفوظ رکھ اور مجھے راہ صواب دکھا"

اس رجوع و اعتراف کو اُن کے مرشد نے بہت پسندیدگی کی نظر سے دیکھا،

اُن کو مرشد کی طرف سے خلافت بھی عطا ہوئی تھی، جس کے بعد وہ خاص خاص لوگوں کو بیعت بھی کرنے لگے تھے، جولائی ۱۹۴۳ء میں اُن کے مرشد کا وصال ہوا تو بڑے سوز و درد اور غم کے ساتھ "موت العالِم موت العالَم" کے عنوان سے ماتم کیا، اُن کی رحلت کے بعد اُن کی سوانح عمری لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے، لیکن یہ پورا نہ ہو سکا،

اصلاحی کام

جنوری ۱۹۴۶ء میں نواب صاحب چھتاری کی صدارت میں اسلام کے سیاسی اور اقتصادی نظام کی ترتیب کے لیے ایک مجلس بنائی گئی جس کا پہلا اجلاس دار العلوم ندوۃ العلماء میں ہوا، اس کے ارکان سید صاحب کے علاوہ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی، مولانا عبد الماجد دریابادی، مولانا شبیر احمد عثمانی، اور ڈاکٹر ذاکر حسین بھی تھے، اس میں طے پایا کہ مستند علماء اور لائق جدید تعلیم یافتہ اہل علم کی باہمی معاونت سے پہلے اسلامی سیاست و اقتصاد پر ایک

روحانی انقلاب

اسی سال ان مین ایک بڑا روحانی انقلاب پیدا ہوا، اب وہ اپنی زندگی کی اس منزل مین تھے، جہان ہندوستان کیا، بلکہ عالم اسلام کے ایک متبحر عالم، ایک بلند پایہ مفسر، ایک جلیل القدر متکلم، ایک دقیقہ سنج فقیہ، ایک بے مثل ادیب، ایک وسیع النظر مورخ، ایک اچھے سیاسی مفکر، اور ایک زبان آور خطیب کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے، اُن کی نجی زندگی بھی بڑی پاک وصاف رہی، اور اُن کے نزدیک رہنے والون کو یہ کہنے مین تامل نہ ہوتا کہ

ع مانند حرم پاک ہے تو میری نظر مین

لیکن اپنی دینی عظمت اور علمی جلالت کا لحاظ کئے بغیر حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ العزیز کے آستانہ پر جاکر اپنا سر نیاز جھکا دیا، حضرت مولانا کو بھی علم وفن کے ایک شہباز اور گلستان رسالت کے ایک عندلیب خوش نوا کو اپنے سایۂ عاطفت مین لینے مین بڑی مسرت ہوئی، اس تعلق کے بعد سید صاحب کے لیل ونہار ہی بدل گئے، گو اُن کی پوری زندگی، دینداری اور پرہیز گاری مین گذری تھی لیکن بادۂ طریقت سے سرشار ہونے کے بعد ان کی دینداری مین تقوی وتورع کا اور بھی زیادہ گہرا رنگ پیدا ہوگیا، عبادت وریاضت بڑھ گئی، ذکر خفی کے ساتھ ذکر جلی بھی کرنے لگے، تقریر وخطابت نے وعظ وپند کی شکل اختیار کرلی، زیادہ وقت علمی مذاکرون کے بجائے ہدایت مین صرف ہونے لگا، اس انقلاب کے بعد اپنی تمام پرانی تحریرون پر نظر ثانی کی، اور جس مین ذرا بھی جمہور سے اختلاف کا شائبہ یا خلاف احتیاط کوئی بات نظر آئی، اس سے رجوع کیا، چنانچہ "رجوع واعتراف" کے عنوان سے جنوری ۱۹۴۳ء کے معارف مین ایک تحریر شائع کی جس مین فرماتے ہین کہ

"مذہبی مسائل کی تحقیقات مین میرا یہ عمل رہا ہے کہ عقائد مین سلف صالحین رحمہم اللہ تعالیٰ کے مسلک سے علیحدگی نہ ہو، البتہ فقہیات مین کسی ایک مجتہد کی تقلید تمامہ نہین ہو سکی، بلکہ اپنی بساط بھر دلائل کی تنقید کے بعد فقہاء کے کسی ایک مسلک کو ترجیح دی ہے لیکن کبھی کوئی ایسی رائے نہین اختیار کی جس کی تائید ائمۂ حق مین سے کسی ایک نے بھی نہ کی ہو، خصوصیت کیساتھ مسائل کی تشریح مین حافظ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہم کی تحقیقات پر اکثر اعتماد کیا ہے، ایسا بھی دو چار جگہ ہوا کہ

ہسٹاریکل کانگریس کی طرف سے شعبۂ تاریخ ہند از منۂ وسطیٰ کی صدارت کا دعوت نامہ پہنچا تو اُن کے بعض علمی جذبات ابھر آئے، اُن کو عرصہ سے اس بات کا دکھ تھا کہ غیر مسلم اہل قلم ہندوستان کے اسلامی عہد کو بدنام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں چنانچہ تاریخ حقیقت کے اظہار کے لئے یہ صدارت قبول کر لی، کیونکہ اس کے اظہار کا اور کوئی بہتر موقع نہیں ہو سکتا تھا، اپنی خرابیٔ صحت کے باوجود مدراس کا لمبا سفر کیا، اور اپنے خطبہ میں جس حقیقت کا اظہار کیا، اس کو کانفرنس کے سنجیدہ لوگوں نے اچھی طرح سمجھا،

تبلیغی تقریریں

اسی سفر میں مدراس کے دوسرے مقامات میں بھی اُن کی تقریریں ہوئیں، ادیل ویشارام میں تقریر کا عنوان "سنت محمدیہ کی حقیقت" اور دارالسلام عمرآباد میں "عبدیت" تھا، دارالسلام کی مسجد میں دو روز صبح کے وقت قرآن پاک کے درس بھی دیئے، ایریم پیٹ میں بھی فجر کی نماز کے بعد ایک مسجد میں درس ہوا، مدراس سے بمبئی تشریف لے گئے تو وہاں کی جمعیۃ العلماء کی دعوت پر سورۃ الحمد کی تفسیر کے ضمن میں مسلمانوں کے حال پر تبصرہ فرمایا، پھر شہر کی انجمن اسلام ہال میں "اردو" اور صابو صدیق ہال میں "ہندوستان میں علوم عربیہ کی خدمت" اور ایک مخصوص مجمع میں توبہ و انابت کے صحیح طریقے پر تقریریں کیں، بمبئی سے حیدرآباد کا رُخ کیا، وہاں ندوۃ العلماء کی مالی امداد کا کام کرتے رہے،

سفر واردھا

حیدرآباد ہی میں تھے کہ گاندھی جی نے اپنے ہاتھ سے اردو میں سید صاحب کو ایک خط لکھ کر قومی زبان کے سلسلہ میں مشورے کے لئے واردھا بلایا، چنانچہ حیدرآباد سے واپسی میں واردھا اُتر گئے، اور وہاں جو جلسہ ہوا، تو گاندھی جی کے سامنے اپنی تقریر میں ایک ملکی زبان کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے فرمایا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی زبان میں اسی حد تک فرق ہونا چاہئے جس حد تک اُن کے مذہبوں اور تمدنوں میں فرق ہے، اس لئے جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، اُن کی مذہبی تمدنی اصطلاحوں اور لفظوں کا ماخذ عربی و فارسی اور ترکی ہونے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں، اور ایسی ہی اجازت ہندوؤں کو اپنی مذہبی اور تمدنی خصوصیات کے لئے ہونی چاہئے، اس کے بعد لفظوں کی صحت کا مدار لغت کی کتابوں کے بجائے روز مرہ بول چال اور عوام کے رواج پر ہونا چاہئے، اور اس وقت ہماری زبان میں عربی، فارسی، اور ہندی، سنسکرت، اور انگریزی کا جو لفظ جس صورت میں بولا جاتا ہے، اسی کو برقرار رکھنا چاہئے، اس قسم کے خیالات وہ [illegible] سے پیش کر رہے تھے

معتبر کتاب لکھائی جائے اور پھر اس میں اس حصہ کو الگ کیا جائے، جو موجودہ زمانہ میں اور نئے ہندوستان میں قابل عمل ہو، اس تجویز کو عمل میں لانے کے لئے سید صاحب نے اپنے ایک ندوی عزیز سے ایک کتاب بھی لکھوائی، آگے چل کر وہ معارف کے ذریعہ اس کی برابر تلقین فرماتے رہے کہ مسلمانوں کو اپنے اصول حکومت، اصول اقتصاد، معاشرت، معاملات، قانون اور احکام کے متعلق یہ سوچنا نہیں ہے کہ ان کی جگہ پر کیا ہو، کیونکہ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ ان کا دین کیا ہو، بلکہ یہ سوچنا ہے کہ ان کو کس طرح رائج کیا جائے اور نئی مشکلوں کے لئے سلف کے اصول کے مطابق کیا فیصلہ کیا جا سکتا ہے" (معارف جولائی ۱۹۴۶ء)

حیات شبلی | دار المصنفین کی تاسیس کے وقت ہی سے وہ اپنے استاد کو مختلف شکلوں میں خراج عقیدت پیش کر رہے تھے، چنانچہ ۱۹۴۲ء تک مولانا شبلیؒ کے مختلف مضامین، خطبات اور مکتوبات کو جمع کر کے کئی جلدوں میں شائع کیا، کثرت کار کی وجہ سے ان کی صحت خراب رہنے لگی، تو ان پر استاد کی اس وصیت کا خیال غالب رہنے لگا کہ "جب تم اور دنیا کے کاموں سے فارغ ہونا تو تم ہی میری سوانح عمری لکھ دینا" چنانچہ ۱۹۴۰ء میں اس کام کو شروع کر دیا اور تین برس کی جانکاہ محنت کے بعد فروری ۱۹۴۳ء میں ۸۴۶ صفحے کی حیات شبلی لکھ کر اہل نظر کے سامنے پیش کی، یہ ضخیم کتاب ایک شخص کی سوانح عمری ہی نہیں، بلکہ مسلمانان ہند کے پچاس برس کے علمی، ادبی، سیاسی، تعلیمی، مذہبی اور قومی واقعات کی تاریخ بھی ہے، سید صاحب کی یہ آخری تصنیف ہے، سیرۃ النبی کی ساتویں جلد کے کچھ ہی اوراق ابھی لکھنے پائے تھے کہ اس جہان رنگ و بو سے رخصت ہو گئے، ان کی رحلت کے بعد اردو زبان کے دیدہ ور نقاد اور ممتاز ترین ادیب مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی مدظلہ العالی نے ان کے علمی و ادبی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے تحریر فرمایا:

"چھوٹی بڑی، نئی پرانی، دینی، علمی، ادبی، درجنوں کتابوں کے مصنف اور بے شمار مقالات کے راقم کو کوئی اردو خوان بھلانا چاہے تو بھی کیسے بھلا سکتا ہے، اپنی چالیس سالہ تصنیفی زندگی میں ادبیات صالحہ کے اردو کے ذخیرہ کو جتنا مالا مال اس مرنے والے نے کیا ہے اس سے بڑھ کر اور کون کر سکا ہے"

ہسٹاریکل کانگریس کی صدارت | ۱۹۴۶ء کا زیادہ تر حصہ صحت کی خرابی میں گذرا لیکن اس سال کے آخر میں [illegible]

طلبہ کا اعتراف ہے کہ وہ کسی درجہ میں صرف و نحو پر باتیں کرتے، تو معلوم ہوتا کہ سیبویہ اور زمخشری کی روح بول رہی ہے، ادب عربی کی فصاحت و بلاغت پر کچھ کہتے، تو اندازہ ہوتا کہ جاحظ اور جرجانی سامنے ہیں، بوعلی سینا کی مشہور کتاب نجاۃ کبھی پڑھا دیتے تو طلبہ کی آنکھیں کھل جاتیں، اگر بخاری یا مسلم کے درس میں اپنے نکات بیان فرماتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ ساری عمر اسی فن کی تحصیل میں گذاری ہے، فقہ اور اصول میں بھی بڑی عقدہ کشائی کرتے،

قیام بھوپال

ندوۃ العلماء میں اُن کے مستقل قیام کی صورت ممکن نہ ہوسکی، اسی اثنا میں نواب حمید اللہ خان والیٔ بھوپال نے اُن کو دعوت دی کہ وہ ریاست کے دار القضاۃ اور عربی مدارس کو اپنی نگرانی میں لے کر خالص مذہبی اور شرعی رنگ میں کر دیں، ۱۹۳۹ء و ۱۹۴۰ء میں نواب صاحب موصوف نے ریاست کے عربی مدارس کے انحطاط و تنزل سے متاثر ہو کر سید صاحب کی صدارت میں ماہرین تعلیم کی ایک مجلس مقرر کی تھی، جس نے ان مدارس کے لئے ایک نیا نصاب تیار کیا اور ان کی اصلاح و تنظیم کے لئے ضوابط بنائے، اس خاکہ کو عملی صورت میں لانے کے لئے نواب صاحب سید صاحب کو بھوپال برسوں سے مدعو کر رہے تھے، بقول جناب شعیب صاحب قریشی "قاضی ریاست کا عہدہ تو اُن کو اپنی طرف متوجہ نہ کرسکا، لیکن عربی تعلیم کی اصلاح و ترقی کے موقع کو وہ انکار نہ کرسکے" چنانچہ جون ۱۹۴۶ء میں وہ بھوپال کے قاضی القضاۃ اور جامعہ مشرقیہ کے امیر کے عہدہ پر مامور ہوئے، لیکن دار المصنفین اور ندوۃ العلماء سے تعلقات بدستور سابق قائم رہے، جس مقصد کے لئے بھوپال تشریف لے گئے تھے، اس کی تکمیل کے لئے وہاں اکتوبر ۱۹۴۹ء تک قیام کیا، لیکن اگست ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد ریاست کے لیل و نہار ہی بدل گئے، اس اثنا میں وہ معارف کے لئے کوئی مستقل مضمون تو نہ لکھ سکے لیکن وفیات کے عنوان سے اپنے معاصرین کی رحلت پر اپنے غمناک تاثرات کا اظہار کرتے رہے، وفیات لکھنا ان کا خاص کام ہو گیا تھا، چنانچہ اُن کے معاصر جناب عبد الماجد صاحب دریابادی مدظلہ نے ایک موقع پر تحریر فرمایا کہ "سید صاحب وہ معاصر خوش قسمت ہے، جو اُن کے سامنے وفات پا جائے، اور اُن کی ماتم گساری کی دولت اس کے حصہ میں آ جائے"، کبھی کبھی معارف میں شذرات بھی لکھ دیتے، اُن کے آخری شذرات جون ۱۹۵۰ء کے معارف میں شائع ہوکر جس کا آخری ٹکڑا یہ ہے

"ہم ہندو و مسلمانوں کے میل ملاپ اور میل جول پر دل سے یقین رکھتے ہیں، لیکن یہ قطعاً ضروری

چنانچہ ۳۷ء کے اگست میں جب راجندر عبدالحق پیکٹ ہوا تھا تو اس میں یہی طے ہوا تھا کہ ہندوستان میں جو سرکاری زبان ہو، وہ اردو اور ناگری دونوں رسم الخط میں لکھی جانی چاہیئے اور اس زبان میں الفاظ کے انتخاب کا یہ معیار ہو کہ ان کا عام بول چال میں کس حد تک رواج ہے، اسی پیکٹ کے بعد حکومت بہار نے ایک ہندوستانی کمیٹی مقرر کی تھی جس کے ایک ممبر سید صاحب بھی تھے، لیکن بہار اردو اور ہندی دونوں مشترکہ قومی زبان کا مسئلہ حل نہ کرسکے، اور یہ سیاست کے سیلاب کے تیز دھارے میں بہہ گیا،

راندیر اور سورت کا سفر

سید صاحب کا مدراس، بمبئی، حیدرآباد اور داروھا کا سفر دسمبر ۴۴ء میں شروع ہوا تھا اور اپریل ۴۵ء میں ختم ہوا، اُن کی صحت برابر گرتی جارہی تھی، پھر بھی اُن کے عقیدت مندوں کا اصرار ہر جگہ سے ہوتا کہ وہ اپنے قدوم میمنت لزوم سے اُن کے علمی جلسوں اور تعلیمی کاشانوں کو شرف بخشیں، ان کو بھی اپنے دینی اور علمی مشن کو جلد از جلد تکمیل کرنے کی دھن ایسی تھی کہ دور دراز مقامات کا سفر کرنے میں اپنی خرابی صحت کا خیال مطلق نہ کرتے، چنانچہ جولائی ۴۵ء میں راندیر کے جامعہ حسینیہ اور مدرسہ اشرفیہ کی دعوت پر وہاں تشریف لے گئے، اور جامعہ حسینیہ میں "تجدد و اجتہاد تعلیمی المعاش" کے عنوان سے ایک تقریر کی، اور مدرسہ اشرفیہ میں "خشیتِ الٰہی" پر خطبہ دیا، اسی سفر میں کچھ دنوں بمبئی اور سورت میں بھی قیام فرمایا،

شدید علالت

اعظم گڈھ واپس آئے تو حوائی تپ میں ریاحی درد کا سخت دورہ پڑا، اور حالت بہت ہی نازک ہوگئی، شفا ہوئی تو اطبا نے دماغی اور علمی کام چھوڑ دینے کا مشورہ دیا، لیکن عمر بھر کی لگی ہوئی عادت کا چھوٹ جانا مشکل تھا، اس لئے معارف کے صرف شذرات اور ہلکے پھلکے مضامین ہی لکھنے پر اکتفا کیا، معارف کے شذرات کے ذریعہ مسلمانوں کو دینی و ملی احیاء کی تلقین فرماتے رہے، اور اُن کو "فتنہ" اور "تفریق" دونوں کے خطرات سے آگاہ کیا۔

ندوہ میں قیام کی تجویز

صحت کی خرابی کے بعد اُن کا ارادہ تھا کہ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں مستقل قیام کرکے اس کی تعلیمی و مادی حالت درست کریں، وہ تقریباً چالیس سال تک ندوہ کے معتمد تعلیمات رہے، اور اعظم گڈھ سے ندوہ برابر آتے جاتے رہتے، وہاں کے ہر معاملہ کو اپنا ذاتی معاملہ سمجھ کر نپٹانے کی کوشش کرتے، کبھی اساتذہ کی باہمی کشمکش کو دور کرتے، کبھی اس کی مالی اصلاح کے لئے طرح طرح کی تجویزوں کو عمل میں لاتے، کبھی معلم بن کر درس و تدریس کا سلسلہ قائم کرتے، وہاں کے

نقل قیام کے لئے یہاں آجائیں گے، اور وہی اگلی رونق اور چہل پہل قائم ہو جائے گی، اب ان کو مکمل راحت اور سکون کی ضرورت تھی،

ت لیکن کارکنانِ قضا و قدر نے ان کو مسلمانوں کی ایک نوزائیدہ سلطنت کی آخری خدمت کے لئے جون ۵۰ء میں کراچی پہنچا دیا، وہ کراچی گئے، تو ہندوستان میں اپنی ساری چیزیں اور ساری املاک چھوڑ کر گئے، اس ہجرت اُن کو شدید مالی نقصانات پہونچے، رحمۃ للعالمین کے سیرت نگار کو رب العالمین نے سب کچھ عطا فرمایا تھا، ایک ہجرت سعادت باقی تھی، وہ بھی پوری ہوگئی، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح نگار کو اپنے محبوب رسول کی طرح جر ہی بن کر اپنی زندگی کا خاتمہ بخیر کرنا تھا، وہ پاکستان کے شہری بن گئے، تو ۵۱ء میں معارف پر سے نہایت دکھ ساتھ بعض مجبوریوں کی بنا پر ان کا اسم گرامی ہٹانا پڑا، جو اس کے سرورق پر دُرِّ آبدار کی طرح ۱۹۱۶ء سے چمکتا رہا لیکن معارف پر اُن کا نام رہے یا نہ رہے، یہ اُن ہی کی یادگار ہے، اس علمی رسالہ نے ملک کا جو بلند پایہ علمی ذوق یا، اور مضمون نگاروں کو تحقیق و تلاش اور دقتِ نظر سے مضامین لکھنے کا جو سلیقہ سکھایا، پھر مستشرقین یا گمراہ مسلمان اہل قلم نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جب کبھی زہر اگلا، اس کے خلاف اس میں جو تریاق پیش ہوا، وہ سب معارف ہی کے ں میں، اگر وہ کوئی اور علمی کام نہ بھی کرتے تو صرف معارف کی ادارت ہی اُن کو زندۂ جاوید رکھنے کے لئے کافی تھی،

اب وہ دارالمصنفین کے ناظم بھی نہیں رہ گئے تھے اور یہ اس ادارہ کی زندگی کی سب سے بڑی ٹریجیڈی تھی کہ وہ اپنی گی ہی میں اس سے علحدہ ہوگئے، گو وہ اس پر خوش تھے کہ اپنی زندگی ہی میں موت کے بعد اس کا نقشہ دیکھ لیا، لیکن قیقت اس کے جریدہ پر ان ہی کا دوام ثبت ہے، سید سلیمان ہی دارالمصنفین ہیں، اور دارالمصنفین سید سلیمان ہیں، ایک کے دو سمتی اور ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں، وہ ہندوستان میں علوم و فنون کا ایک تاج محل بنا کر پاکستان چلے گئے کے بعد جب کوئی علمی سیاح اس تاج محل کو دیکھنے آتا، تو اس کو دیکھتا تو ضرور، لیکن اُن کی عدم موجودگی میں اس ح کو چودھویں رات کی چاندنی میں دیکھنے سے محروم رہتا۔

پاکستان کی شہرت جب سید صاحب پاکستان کے باضابطہ شہری بن گئے، تو وہاں کے خواص و عوام کو بڑی

نہیں سمجھتے کہ اس غرض کو دین دھرم کا فرق مٹا کر ہی حاصل کیا جا سکتا ہے، بلکہ ہندو ہندو اور مسلمان مسلمان رہ کر بھی اس غرض کو حاصل کر سکتے ہیں جس کی مثالیں انگریزوں کی دی ہوئی تعلیم سے پہلے ہندوستان میں کثرت سے تھیں، اور اب بھی ہیں"

یہ گویا ہندوستان والوں کے نام اُن کا آخری پیام تھا،

سفرِ حج | ۱۹۴۹ء کے اکتوبر میں وہ اپنی اہلیہ اور صاحبزادے سلمان سلمہٗ کے ساتھ حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے جس جہاز سے وہ روانہ ہوئے اس کے امیر بنائے گئے، اور حجاز پہونچکر شاہ ابن سعود کے مہمان خاص رہے، ابن سعود نے کئی بار اُن کو اپنے ساتھ کھانے پر مدعو کیا، حج کے بعد مدینہ منورہ میں ایک مہینہ قیام فرمایا، بارگاہ نبوی میں رسول اللہ کے سوانح نگار نے اپنے درد و عشق، عقیدت و محبت، عجز و نیاز، کیف و سرور کا اظہار ایک نعتیہ غزل میں کیا، اس کے چند اشعار یہ ہیں،

مکی مدنی ہاشمی و مطلبی ہے	آدم کے لئے فخر یہ عالی نسبی ہے
پاکیزہ تر از عرش و سما جنت فردوس	آرامگہ پاک رسول عربی ہے
آہستہ قدم، نیچی نگہ، پست ہو آواز	خوابیدہ یہاں روحِ رسول عربی ہے
بجھ جائے تری چھینٹوں سے اے ابر کرم آج	جو آگ مرے سینہ میں مدت سے دبی ہے

مدینہ منورہ میں عالم اسلام کے علماء کا جب کوئی چھوٹا بڑا اجتماع ہوتا تو اس میں وہ بھی مدعو کئے جاتے، زائرین حج کا بیان ہے کہ وہ تقریر یا گفتگو کرتے تو سب میں ممتاز نظر آتے،

حج سے دسمبر ۱۹۴۹ء میں واپس ہوئے تو بمبئی پہونچ کر علیل ہو گئے، وہاں اعظم گڈھ کے سیٹھ عبدالعزیز صاحب نے بڑے اخلاق و محبت و فیاضی سے اُن کی تیمارداری کی، شفا پائی تو جنوری کے وسط میں بھوپال آئے، اپریل کے آخر میں اپنا تعلق ختم کر دیا، اہل و عیال کو لے کر اپنے بھتیجے کے یہاں [illegible] گئے، وہ اِن سے لکھنؤ ہوتے ہوئے مئی میں اعظم گڈھ آئے، [illegible] اعظم گڈھ آتے جاتے رہے لیکن اس مرتبہ [illegible] تھا [illegible] دارالمصنفین [illegible]

ہم مذہبون پر جو کچھ گذرے مگر وہ اپنے ملک کی اقلیت کی پوری پوری حفاظت کرین، اور اسی طرح دوسرے ملک مین وہ اپنے بھائیون کی مدد کرسکتے ہین، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوئی غیر مسلم اقلیت (معاہد) پر ظلم کریگا تو قیامت کے دن خدا کے سامنے اسکا دامن پکڑونگا اور یہ بھی فرمایا کہ جو اس پر ظلم کریگا وہ جنت کی خوشبو تک نہ سونگھیگا، اس سے اندازہ لگانا چاہئے کہ ایک مسلمان پر غیر مسلم اقلیت کی جان و مال عزت و آبرو کا کتنا بڑا فرض ہے،

علمی و قومی سرگرمیان دہان سے واپسی کے بعد موتمر اسلامی کا جلسہ تھا جس مین انھون نے شرکت فرمائی اس کے بعد ٹنڈو الہ یار مین ایک دینی درسگاہ قائم ہوئی، تو اُس کی تاسیس مین پورا حصہ لیا، اور اس کے سرپرست مقرر ہوئے، جب سندھ یونیورسٹی کا ایک کمیشن مقرر ہوا تو اُس کے ممبر بنائے گئے، نومبر ۱۹۵۱ء مین ملتان مین ایک تبلیغی جلسہ ہوا، اس مین شرکت کی، پھر قائد اعظم کی یادگار مین ایک مجوزہ دارالعلوم کی جو کمیٹی بنی، اس کے بھی رکن بنے، اور اس سلسلہ مین ملتان اور راولپنڈی کا سفر کیا، دستور ساز اسمبلی کے بنیادی حقوق کی سب کمیٹی کے کا ممبر مقرر کئے گئے، اس کمیٹی مین ان کا سب سے بڑا کام یہ ہوا کہ اس کے ارکان کو قرآن اور سنت کے اتباع کی اہمیت واضح کرکے بتائی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو کتاب اور سنت کی جو دو نعمتین عنایت فرمائی ہین، ہدایت الٰہی ان ہی دونون کے اندر منحصر ہے، اب جو بھی ایک کو چھوڑ کر صرف دوسری پر قناعت کرے گا، وہ یقیناً گمراہ ہوگا اور وہ ضلالت کی خودکشی سے کبھی بچ نہین سکتا، سید صاحب نے اس نکتہ کی وضاحت بار بار کی، چنانچہ مذکورہ بالا کمیٹی کے ممبرون کی سمجھ مین یہ بات اچھی طرح آگئی، اور انھون نے اپنی رپورٹ مین یہ دفعہ رکھی کہ کوئی ایسا قانون نہین بنایا جائے گا، جو قرآن پاک اور سنت کے خلاف ہو،

فروری ۱۹۵۲ء مین انھون نے دنیائے اسلام کے تمام علماء کو کراچی مین مدعو کیا، یہ کانفرنس احتفال علمائے اسلام کے نام سے منعقد ہوئی، اس کی کامیابی کے متعلق اپنے ایک مکتوب مین عاجز راقم کو تحریر فرماتے ہین،

"احتفال علمائے الاسلام کی مشغولیت کے سبب سے جواب نہ دیسکا، احتفال کامیاب رہا، گو ازہر کے علماء کی شرکت نہ ہوسکی، تاہم مختلف ملکون کے علماء یکجا ہوگئے، خصوصاً ایران اور نجف کے علماء کی آمد سے سُنی اور

خوشی تھی کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سیرت نگار اور عالمِ اسلام کا ایک متبحر عالم اُن کی مملکت کا باشندہ ہو گیا ہے، حکومت پاکستان نے دستور بنانے کے سلسلہ میں ادارۂ تعلیمات اسلام کے نام سے علماء کا ایک بورڈ قائم کیا تھا، سید صاحب کو اس کی صدارت ڈیڑھ ہزار ماہانہ پر پیش کی گئی لیکن انھوں نے اس کو قبول کرنے سے انکار کیا، اور رضا کارانہ طور پر پاکستان کے مذہبی، قومی، تعلیمی اور علمی کاموں میں لگ گئے،

سنہ ۱۹۵۰ء کے نومبر میں انجمن ترقی اردو پاکستان نے اُن کے اعزاز میں ایک علمی جلسہ کیا جس کی صدارت ڈاکٹر محمود حسین وزیر مرکزی کابینہ نے کی، اور سید صاحب نے اپنا ایک مقالہ "ہندوستان کے نومسلم حکمران" پڑھا، لیکن اُن کے پاکستان جانے کی جو اصلی غایت تھی، اس کو اس عاجز راقم کو ایک مکتوب لکھ کر اس طرح ظاہر فرمایا :

"یہاں اصلی کام دین کی خدمت اور حکومت اور اصحاب اقتدار کو ادھر متوجہ کرنا ہے مسلمانوں میں اس کی اشاعت اور علومِ دین کی حفاظت کا کام مقدّم ہے"

ان ہی باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہ اربابِ حکومت سے ملتے اور موقع بموقع اُن کو تلقین کرتے رہے، پھر اسی خیال سے اپنی قیامگاہ کے قریب ہی زیرِ تعمیر جامع مسجد میں قرآن پاک کا درس دینا شروع کیا، اس جامع مسجد کا نام بھی انہی کے نام پر جامع سلیمانی رکھا گیا، اس درس میں شرکا کی تعداد اتنی بڑھی کہ لاؤڈ اسپیکر لگانے کی ضرورت ہوئی، ان کا ارادہ تھا کہ چاروں طرف درس و تبلیغ کے کمرے، ایک کتب خانہ اور ایک علمی ادارہ بھی بنانے کا خیال تھا، لیکن یہ اُن کی زندگی میں پورا نہ ہو سکا،

سلہٹ جمعیۃ العلماء کی صدارت

جمعیۃ العلمائے اسلام کی دعوت پر جنوری سنہ ۱۹۵۱ء میں ڈھاکہ، چاٹگام اور سلہٹ کا ایک دورہ کیا، سلہٹ کے جمعیۃ العلمائے اسلام کے ایک جلسہ میں ایک پرمغز صدارتی خطبہ بھی دیا، جس میں مذہبی اور دینی خدمت کی ترغیب دینے کے علاوہ پاکستان کی اقلیتوں سے فیاضانہ سلوک کرنے کی بھی نصیحت کی، چنانچہ فرماتے ہیں:

"میں نے جب کبھی پاکستان میں غیر مسلم اقلیت پر کسی زیادتی کا حال سنا، تو بحیثیت مسلمان کے اس پر شرمندگی محسوس کی، مسلمانوں کا فرض ہے کہ خواہ کسی دوسرے ملک میں اُن کے ہم

گو اُن کا کام اب ختم ہو رہا ہے"

یہ معلوم ہو سکا کہ اپنے شرائط پر عہدہ قبول کیا، تو گفتنی الاؤنس لینا پسند فرمایا،

۵۰ء کے آخر میں جمعیۃ العلمائے اسلام کے صدر مقرر ہوئے، اور اُس نے پاکستان کے دستور کو اسلامی بنانے میں جو سعی کی، اس میں اُن کا حصّہ نمایاں رہا،

۵۳ء کے مارچ میں پاکستان ہسٹاریکل کانفرنس کی صدارت کیلئے ڈھاکہ تشریف لیگئے، وہاں خطبۂ صدارت میں اردو اور بنگالی کے تنازع کے سلسلے میں اپنے دردمندانہ خیالات کا اظہار کیا جو وہاں کے ناعاقبت اندیش طلبہ کو پسند نہیں آئے اسلئے جب کانفرنس کا اجلاس دوسرے دن شروع ہوا، تو انھوں نے ہنگامہ برپا کرنے کی کوشش کی جس سے اجلاس کو ملتوی کر دینا پڑا، اور جب سید صاحب موٹر میں بیٹھ کر قیامگاہ کو واپس جانے لگے، تو شرارت پسند طلبہ نے اُن کی موٹر گھیر لی، ناروا الفاظ استعمال کئے، اور تشدد پر آمادہ ہو کر اُن کی اہانت پر اتر آئے، لیکن وہ اُن کی اہانت نہیں کر رہے تھے، بلکہ علم و حکمت، تحقیق و بصیرت، فکر و تدبر، فضیلت و کمالات اور متانت و وقار کی تذلیل کر رہے تھے، مشرقی بنگال کے طلبہ کا یہ شرمناک رویہ اُن کی قومی زندگی میں ہمیشہ کے لئے ایک بدنما داغ بن کر رہے گا، یہ طوفان بدتمیزی ختم ہوا، تو ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے سید صاحب کی قیامگاہ پر اکر اظہار ندامت کیا، اور معافی مانگی، لیکن اُن کی ذات والا صفات ان رسمی باتوں سے بہت ہی بلند تھی، وہ کراچی واپس جانے لگے تو ہندوستان میں اپنے منجھلے داماد جناب سید حسین صاحب، ڈپٹی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ فتح پور کے یہاں اکر ٹھہرے، یہیں دارالمصنفین کا ایک چھوٹا سا قافلہ سراپا محبت بنکر اُن کی قدمبوسی کیلئے حاضر ہوا تو اپنے عزیزوں کو دیکھ کر مسرور ہوئے، بڑے لطف و محبت سے پیش آئے اور وعدہ فرمایا کہ اس سال رمضان المبارک کے بعد دو مہینے دارالمصنفین میں اکر گذاریں گے، جس سے دارالمصنفین میں اُن کی روحانی اولاد بہت خوش ہوئی، اسی سفر میں دارالعلوم ندوہ کی مقناطیسی قوت نے اُن کو اپنی طرف کھینچا، اور وہ ایسے کھنچ کر ندوہ چلے گئے، وہاں کے طلبہ اپنے بچھڑے ہوئے باپ سے بڑے والہانہ انداز سے ملے اور وہ بھی اپنے فرزندوں سے مل کر اشکبار ہوئے، اُن کے اعزاز میں جمعیۃ الاصلاح کی طرف سے جمالیہ ہال میں ایک جلسہ ہوا، تو یہ دیکھا گیا جب سید صاحب نے ہال کے زینہ پر قدم رکھا تو عمارت پر حسرت بھری نگاہ ڈالی، اور دردبھری آواز میں یہ شعر پڑھا

شیعہ علماء کے درمیان توافق بحمداللہ پیدا ہوا ، اور ہم آہنگی ہوگئی ۔"

مارچ سنہ ۵۲ء میں لاہور میں پاکستان ہسٹاریکل کانفرنس کے شعبۂ اسلامی تاریخ کی صدارت کی ، اور اس میں ایک مقالہ بھی "دیبل" کے عنوان سے پیش کیا ، وہاں عربی زبان و ادب کی بھی ایک کانفرنس ہوئی ، اس کی بھی صدارت انھوں نے فرمائی ، پھر اسی مہینہ پنجاب یونیورسٹی میں اُن کا ایک توسیعی لکچر بھی ہوا ،

اسی سال عرب ممالک کی سب سے بڑی علمی اکیڈمی مجمع العلم العربی نے اُن کو اپنا رکن بنایا ، ابو علی سینا کی ہزار سالہ جوبلی کے موقع پر حکومت عراق نے انکو بغداد مدعو کیا ، لیکن اس میں شرکت نہ فرما سکے ،

اپریل سنہ ۵۲ء کا پورا مہینہ ملتان اور راولپنڈی میں گذارا ، یہاں عربی مدارس کے سالانہ جلسے ہوتے رہے ، ان کی تنظیم کے لئے مفید مشورے دیے ، ملتان کو قائد اعظم کے مجوزہ دارالعلوم کیلئے پسند فرمایا ،

کراچی یونیورسٹی قائم ہوئی تو اس کے سینٹ کے ممبر نامزد کئے گئے ، جناب لیاقت علی خان مرحوم کی یاد میں حکومت نے پانچ لاکھ کے سرمایہ سے ایک کتب خانہ قائم کرنا چاہا ، تو اس کی تاسیس و تشکیل کی خدمت انہی کے سپرد ہوئی ،

ان کے ذریعہ پاکستان کے مذہبی و قومی کام تو انجام پا رہے تھے ، لیکن خود ان کے لئے وہاں اب تک کوئی معاشی صورت پیدا نہیں ہوئی تھی ، چنانچہ ایک مکتوب میں اس راقم کو تحریر فرمایا کہ معاشی صورت پیدا کرنے کے لئے ارادہ ہے کہ وہی پیشۂ قدیم کتب فروشی اختیار کیا جائے ، چنانچہ مکتبۃ الشرق کے نام سے کتابوں کی ایک دوکان کھولی ، آئین کے سلسلہ میں وہاں کی حکومت نے ادارۂ تعلیمات اسلام قائم کیا تھا ، اس کی صدارت ان کو برابر پیش کی جا رہی تھی لیکن وہ اس کو قبول کرنے سے انکار کرتے رہے ، لیکن ہجرت کے تقریباً ستائیس مہینے کے بعد یہ عہدہ کچھ شرائط کے ساتھ قبول فرمایا ، وہ اپنے ایک مکتوب مورخہ ۸؍اگست سنہ ۵۲ء میں اس حقیر کو تحریر فرماتے ہیں کہ

"یہ (یعنی عہدۂ صدارت ادارۂ تعلیمات اسلام) دو برس پہلے میرے سامنے پیش کیا گیا تھا ، مگر میں نے بعض شرطیں رکھی تھے ، وہ اب پورے ہو رہے ہیں ، یعنی آئین کے ساتھ قانون رائج کرنے کی اصلاح کا کام اب شروع ہوا ہے ، تو میں نے ۸؍اگست کو قبول کر لیا ، تاکہ پورے مسودہ آئین پر رائے دی جا سکے ۔"

بچپن اور طالب علمی کے کچھ واقعات

از

مولانا ابوظفر صاحب ندوی

علامہ سید سلیمان ندوی کی ولادت ۱۳۰۲ھ میں ہوئی، جیسا کہ اُن کے والد ماجد حکیم سید ابوالحسن مرحوم کے سفینہ میں درج ہے، مقام ولادت صوبہ بہار ضلع پٹنہ کا ایک چھوٹا سا گاؤں دسنہ نامی ہے، جو بہار شریف سے تین چار میل کے فاصلہ پر واقع ہے، جہاں زیادہ تر سادات آباد تھے، اور اس کے باشندوں کی بڑی تعداد تعلیم یافتہ ہونے کے سبب سے اُن کی شہرت دور دور تک تھی، جس گھر میں علامہ کی ولادت ہوئی تھی، وہ گھر آج بھی مسجد سے متصل موجود ہے۔

آپ کا اصلی نام سید ابونجیب ہے کیونکہ خاندانی نام زیادہ تر "ابو" پر ہیں، چنانچہ اُن کے چچا کا نام ابوتراب، اور دوسرے ابویوسف، اور اُن کے بڑے بھائی کا نام ابوحبیب تھا،

آپ کے منجھلے چچا سید ابوتراب دہلی، لکھنؤ وغیرہ کا سفر کر چکے تھے، اور آج سے تقریباً ستر سال قبل جدید تہذیب سے متاثر ہو کر سرسید احمد خان کے ہم خیال ہو گئے تھے، ان ہی نے اُن کا نام سلیمان رکھا تھا کہ جب وہ لندن سے واپس آئے گا، تو لوگ اس کو "مسٹر سلومن" کہیں گے، چنانچہ اسی نام سے اُن کی شہرت ہوئی، اور علامہ موصوف نے خود بھی اسی کو پسند کر کے اپنا نام سید سلیمان قرار دیا،

لطف کی بات یہ ہے کہ واقعی اپنے چچا کی زندگی ہی میں علامہ موصوف لندن گئے، جس پر انھوں نے بڑی مسرت کا اظہار کیا کہ میری پیشین گوئی صحیح نکلی،

آپ کا پدری سلسلۂ نسب امام موسیٰ رضا تک پہنچتا ہے، اور مادری امام زید تک،

میں اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو — میں اپنے آپ کو مانند مہمان لیکے آیا ہوں'

اس کے پڑھنے پر اُن کی طرح اور لوگوں کی بھی آنکھیں اشکبار ہوگئیں، جلسہ کی کارروائی تلاوت قرآن پاک سے شروع ہوئی، قاری نے شروع میں یہ آیت پڑھی،

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ — جب کہ قافلہ چلا تو ان کے باپ (یعنی حضرت

اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَا اَنْ — یعقوبؑ) نے کہا کہ میں یوسف کی خوشبو پاتا ہوں

تُفَنِّدُوْنِ، (یوسف) — اگر تم مجھ کو بیوقوف نہ بناؤ،

اس کو سُن کر تمام حاضرین متأثر ہوئے خود سید صاحب ضبط نہ فرما سکے، بے اختیار اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کا تانتا بندھ گیا ایک طالب علم نے عربی میں سپاسنامہ پڑھا جس کے بعد سید صاحب نے بڑے درد بھرے انداز سے اپنی تقریر شروع کی، پوری تقریر سوز و درد کا مرقع تھی، اس میں پاکستان کی ہجرت کے اسباب بیان فرمائے، اور آخر میں اپنے عزیز طلبہ کو یہ پیام دیا،

سبق پھر پڑھ صداقت کا شجاعت کا عدالت کا — لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

ندوہ کے طلبہ کے نام ان کا یہ آخری پیام تھا جو ان کی مادر درسگاہ کے ہر زمانہ کے طلبہ کے لئے باقی و جاری رہیگا، دارالمصنفین کے خدام رمضان المبارک کے بعد اعظم گڈھ اُن کی تشریف آوری کا انتظار کر رہے تھے کہ پہلے خط میں موانع سفر کے اسباب لکھے، پھر اپنی علالت کی اطلاع دی، آخری خط میں اُن کے روبصحت ہونے کی بشارت تھی لیکن ۱۴ ربیع الاول ۱۳۷۳ھ مطابق ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء کو عشاء کے بعد یکایک ریڈیو سے خبر ملی کہ وہ اللہ کو پیارے ہوگئے اور

عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا،

وہ ہم سے رخصت ہوگئے اور زبان حال سے کہہ رہے ہیں :-

رفتم و از رفتن من عالمے تاریک شد — من مگر شمعم چو رفتم بزم برہم ساختم

مگر عالم بالا میں اُن کو دیکھ کر فرشتے پکار رہے ہونگے ع جگہ خالی کرو مداح آتا ہے محمد کا"

یہ مجھے معلوم نہین کہ علامہ موصوف نے کے برس اس مکتب مین تعلیم پائی، مکتبی تعلیم ختم ہونے کے بعد موصوف کے بڑے بھائی حکیم سید ابو حبیب صاحب نے تعلیم دینی شروع کی، آہستہ آہستہ تھوڑے طلبہ یہان بھی جمع ہوگئے، یہ مکتب بھی کچھ عرصہ تک چلا، اور ایسا یاد آتا ہے کہ اُن کے حج کے لئے جانے کے سبب سے یہ سلسلہ ختم ہوگیا، ان مکاتب کی تعلیم مین بیت بازی بھی تھی، کبھی ایک ہی مکتب کے طلبہ دو جماعتون مین تقسیم ہوکر بیت بازی کرتے، اور کبھی دو مکتبون کا ایک دوسرے سے مقابلہ ہوتا،

علامہ سید سلیمان ندوی کے مکتب مین بھی دو پارٹیان تھین، جہان تک مجھے یاد ہے ایک پارٹی کے امیر علامہ موصوف اور اُن کے مشیر خاص مولوی حکیم سید نجم الہدیٰ صاحب ندوی تھے، اور دوسری کے مولوی محمد قاسم صاحب، یہ دونون آج بھی بقید حیات ہین، اسکا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ علامہ موصوف کو شاعری سے ایک خاص لگاؤ ہوگیا، اور ہزارون اشعار ان کو زبانی یاد ہوگئے، خاکسار بھی باوجود کم سنی کے ان جلسون مین عموماً شریک رہتا تھا،

اسی سلسلہ مین علامہ نے ایک بیاض تیار کی تھی جس کے سرورق کو رنگ سے خوشنما کردیا تھا، اس مین ہزارون منتخب اشعار درج تھے، میرے والد مرحوم کی وفات ۱۹۲۹ء تک یہ بیاض میرے ذاتی کتب خانہ مین موجود تھی، چونکہ بیت بازی مین حریف خود ساختہ اشعار بھی پیش کرتے تھے، اس لئے علامہ موصوف کو تقطیع کی طرف خاص توجہ کرنی پڑی جس سے اُن کو فن عروض پر اس قدر عبور ہوگیا تھا، کہ علماء مین اس کی مثالین کم ہون گی،

علامہ موصوف کو کھیل کود اور اس قسم کے تفریحی مشاغل سے مطلق دلچسپی نہ تھی، اُن کے احباب جب تاش یا شطرنج کھیلتے، تو وہ صرف تماشائی ہوتے تھے، یا اخبار وغیرہ پڑھنے لگتے، اگر کبھی کسی کھیل مین شرکت کی تو وہ کبڈی ہے جس کا رواج ہندوستان کے تمام صوبون مین کسی نہ کسی شکل مین آج بھی موجود ہے،

علامہ صغر سنی مین ایک کھیل اور بھی کھیلا کرتے تھے، آپکے والد، دادا، بھائی، بلکہ خاندان کے بیشتر بزرگون کا پیشہ طبابت تھا، اس لئے گھر مین علاج معالجہ کا چرچا ہر وقت رہتا تھا، اس کی نقل مین کبھی کبھی مختلف قسم کے شیشیون مین پانی بھر کر بچون کا علاج کرتے تھے، اُن کی بڑی ہمشیرہ جب پوچھتین کہ یہ کیا کرتے ہو تو کہتے کہ بیمارون کا علاج کرتا ہون، لوگ کہتے کہ یہ لڑکا آگے چل کر بڑا طبیب ہوگا، لیکن باوجود اُن کے والد کی دلی تمنا کے یہ

ابتدائی تعلیم | آپ کی عمر چار یا پانچ برس کی ہوگی کہ آپ کی بسم اللہ ہوئی، اور وہ مکتب میں بٹھا دیئے گئے، آپ کے پہلے استاد کا نام مولوی مقصود علی تھا، مولوی صاحب موصوف خاکسار کے بھی پہلے استاد تھے، لیکن میں اس قدر کم عمر تھا کہ ان کی علمی قابلیت کا صحیح اندازہ اس وقت نہ لگا سکا، البتہ اس قدر یاد رہ گیا ہے، کہ فارسی کی بڑی چھوٹی سب کتابوں کا درس دیتے تھے،

مجھے ہندوستان کے دوسرے صوبوں کا حال نہیں معلوم لیکن آج سے ستر پچھتر برس قبل، صوبہ بہار کے ضلع پٹنہ کے دیہاتوں میں مکاتب کا نظام میری ابتدائی عمر تک موجود تھا،

گاؤں کا کوئی زمیندار کسی مولوی کو بہت معمولی تنخواہ پر اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے مقرر کرتا تھا، تنخواہ کے علاوہ ناشتے کھانے کپڑے اور دھوبی حجام کے مصارف سب کا بار زمیندار پر ہوتا، ہر موسم میں کچھ غلہ بھی زمیندار ان کو دیتا تھا، اس کے علاوہ گاؤں کے دوسرے بچوں کو بھی اس کے ساتھ تعلیم کی اجازت ہوتی تھی، اُن کے والدین بھی مولوی صاحب کی بھی اپنی استطاعت کے مطابق خدمت کرتے تھے، اس طرح مولوی صاحب کی زندگی خوش حالی سے بسر ہوتی تھی، لڑکوں کی تعداد بیس پچیس سے زیادہ نہیں ہوتی تھی، اور بعض بعض گاؤں میں متعدد مکتب ہوتے تھے،

ان مکتبوں میں ہندو مسلمان دونوں کے بچے پڑھتے تھے، معلم عموماً فارسی داں مسلمان ہوتے اور اردو تعلیم برائے نام ہوتی تھی، سارا زور فارسی ادب پر صرف ہوتا تھا، اس زمانہ میں مسلمان شرفا خطوط بھی فارسی ہی میں لکھتے تھے، نصاب درس میں مندرجۂ ذیل کتابیں ہوتی تھیں،

آمد نامہ، گفتگو نامہ، تعلیم عزیزی، کریما، مامقیما، گلستان، بوستان، یوسف زلیخا، اخلاق محسنی، سکندر نامہ، بہار دانش، اسمہ نثر ظہوری، رقعات عالمگیری، اور انشاء خلیفہ وغیرہ،

تاریخ و جغرافیہ کی تعلیم قطعی نہیں ہوتی تھی، البتہ حساب میں جمع تفریق، ضرب تقسیم تک کی تعلیم ہوتی تھی، خوش خطی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا، طلبہ عموماً ۱۴، ۱۵ سال کے اندر نصاب ختم کرکے شہر چلے جاتے، جہاں عربی یا انگریزی مدارس میں داخل ہو جاتے،

کم و بیش یہی عمر رہی ہوگی

جہاں تک مجھے یاد ہے، اس جلسہ میں شرکت کے لئے علامہ موصوف کے والد حکیم سید ابو الحسن صاحب بھی تشریف لائے تھے، وہ اس جلسہ سے اتنا متاثر ہوئے کہ انھوں نے طے کیا کہ علامہ موصوف کو ندوہ بھیج دیا جائے، چنانچہ دوسرے سال وہ لکھنؤ پہنچ گئے، ان سے پہلے ان کے ہم مکتب مولوی محمد قاسم صاحب ابن حضرت شاہ تجمل حسین صاحب اور مولوی عبد السبحان پہنچ چکے تھے، غالباً موصوف دوسری جماعت میں شریک ہوئے، کیونکہ جب میں ندوہ میں پہلی جماعت میں داخل ہوا تو وہ چوتھی جماعت میں تھے اور شرح وقایہ پڑھتے تھے،

ندوہ میں ورزش کا بھی انتظام تھا، مگر ورزش قدیم طریقہ کی تھی، اور کشتی کے لئے اکھاڑا بنا ہوا تھا، اس کے آس پاس مگدر رکھے ہوتے، ڈھال اور لکڑی کی تلوار بھی تھی، لاٹھی چلانا بھی سکھلایا جاتا تھا، جس کو طلبہ شوق سے سیکھتے تھے، اس زمانہ میں سر مکڈانل اودھ کے لفٹنٹ گورنر تھے، یہ مسلمانوں پر بڑے نامہربان تھے، انھوں نے ستم کی ابتدا اردو زبان کی جڑ کاٹنے سے شروع کی، اودھ کی عدالتی زبان اردو کو بدل کر ہندی کر دی[1]، دوسرا حملہ ندوہ پر ہوا، اور جو تھا علی گڑھ پر، لیکن نواب محسن الملک جیسے سیاست داں نے تو کالج کو بچا لیا، مگر غریب ندوہ چکر میں آگیا، مکڈانل صاحب نے اراکین ندوہ سے دریافت کیا کہ ندوہ میں ڈھال تلوار، مگدر، کشتی کی مشق کیا جہاد کی تیاری کے لئے کرائی جاتی ہے؟ اس سے اہل ندوہ اس قدر گھبرائے کہ سب کھیل بند کر دئے گئے اور پھر ایک عرصۂ دراز کے بعد ورزش کے بجائے فٹ بال، کرکٹ، ہاکی، اور شب جمعہ کو کبڈی کا رواج ہوا، لیکن علامہ موصوف نے کبھی بھی ان ورزشی کھیلوں میں دلچسپی نہیں لی، ورزشی کھیلوں کا وقت عصر سے لیکر مغرب تک تھا، علامہ موصوف یہ وقت رسالہ، اخبار، یا کتب بینی میں صرف کرتے، اور ندوہ دار الاخبار کے جس میں ہندوستان کے اکثر اخبارات اور رسالے آیا کرتے تھے، ناظم مقرر ہوئے، اس سے انھوں نے خود بھی فائدہ اٹھایا، اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیتے تھے، کچھ دنوں کے بعد انھوں نے ایک علمی پارٹی تیار کر لی جس کے تمام ممبر مشہور شاعر

---

[1] معارف: اردو کے بجائے ہندی نہیں کی تھی، بلکہ اردو کے ساتھ ہندی کو بھی عدالتی زبان بنا دیا تھا،

پیشین گوئی پوری نہ ہوئی،

عربی کی ابتدائی تعلیم اپنے برادر معظم حکیم سید ابو حبیب صاحب مجیبی سے حاصل کرنے کے بعد دربھنگہ تشریف لے گئے، ان کے ہم مکتبوں میں سے صرف مولوی سید نجم الہدیٰ صاحب نے ان کا ساتھ دیا، وہاں کچھ عرصہ تک تعلیم پاتے رہے، افسوس ہے کہ ان کے کسی استاد کا نام حافظہ نے محفوظ نہیں رکھا،

علامہ موصوف بچپن سے کم سخن اور خاموش طبیعت کے انسان تھے جس سے ان کے استاد ان کو غبی اور کند ذہن سمجھتے تھے، اور ان کے بجائے ان کے ساتھیوں کو ذہین اور صاحب ذوق سمجھ کر ان کی طرف زیادہ توجہ کرتے تھے، اور پھر حصول فضل و کمال کے بعد دنیا میں ان کی شہرت ہوئی تو ان کی کم سخنی کی وجہ سے لوگ ان کو مغرور سمجھنے لگے، علامہ موصوف کو اس کا اندازہ ہوا، تو انھوں نے اپنے کو شگفتہ بنانے کی بے حد کوشش کی، اور آخری عمر میں تو واقعی اس قدر شگفتہ ہو گئے تھے کہ کسی کی مجلس سے اٹھنے کو دل نہیں چاہتا تھا،

ایک لطیفہ سننے کے قابل ہے، علامہ موصوف اپنی شہرت کے شباب کے زمانہ میں کسی تقریب سے حیدرآباد تشریف لے گئے، اتفاق سے اس وقت دربھنگہ والے استاد وہاں موجود تھے، انھوں نے اخبار میں پڑھا کہ مولانا سید سلیمان صاحب تشریف لائے ہیں، اور فلاں جگہ مقیم ہیں، تو شاہ سلیمان صاحب پھلواروی کو سمجھ کر ان سے ملنے کے لئے آئے، مگر ان کے بجائے ایک دوسرے سلیمان کو پایا، مجھے یاد نہیں کہ خود استاد نے شاگرد کو پہچان لیا، یا تعارف کے بعد پہچانا، تعارف کے بعد استاد نے کہا کہ سلیمان! تو تو بڑا غبی اور کند ذہن تھا، اس قدر بڑا آدمی کیسے بن گیا؟ احباب نے قہقہہ لگایا، اور بات آئی گئی ہو گئی،

دربھنگہ کی تعلیم کے کچھ دنوں کے بعد پھلواری شریف (متصل پٹنہ) کے مدرسہ میں داخل ہوئے، جناب شاہ سلیمان صاحب پھلواروی کے بڑے صاحبزادے شاہ حسن میاں مرحوم آپ کے ہم عمر تھے، اور غالباً ہم جماعت بھی تھے، حسن میاں حسن صورت اور حسن سیرت دونوں میں ممتاز تھے، ندوۃ العلماء کا جو سالانہ جلسہ عظیم آباد پٹنہ میں ہوا تھا، اس میں خاکسار بھی باوجود نو عمری کے شریک تھا، اس وقت حسن میاں کی عمر ۱۴-۱۵ سال سے زیادہ نہ تھی، اور علامہ موصوف کی بھی

بزرگ بقیدِ حیات تھے، لکھنؤ میں گذشتہ ادبی سرگرمیاں پوری طرح موجود تھیں، عشرت لکھنوی کا نام طلبہ میں زیادہ معروف تھا، پیامِ یار، دلی رسالہ طرحی اور غیر طرحی غزلوں کے ساتھ ہر ماہ نکلتا تھا، مرثیہ کی مجلسیں اور مشاعرے بکثرت ہوتے تھے موصوف ان مشاعروں میں اکثر شرکت کرتے، آخر خود بھی شعر کہنے لگے، اور انھیں اپنے احباب خاص طور سے مولوی بنی حسن اور عثمان پاشا کو سنا کر داد لیتے تھے،

علامہ موصوف نے ایک بیاض بھی تیار کی تھی، اس کے ایک جانب عربی اور دوسری جانب اردو اشعار لکھے تھے، اتفاق سے یہ بیاض میرے ہاتھ آئی، اس وقت میں متنبی پڑھتا تھا، اس کو میری بدذوقی سمجھیے کہ اُن کے عربی اشعار پھیکے نظر آئے، متنبی نے جس مضمون کو صرف دو مصرعوں میں ادا کیا تھا، علامہ موصوف نے بہ تغیر الفاظ چار مصرعوں میں کیا تھا، ناظرین اس کا لحاظ رکھیں کہ میں ان دنوں کے اوائل زندگی کا حال لکھ رہا ہوں، میری اس بدمذاقی کا نتیجہ نکلا کہ ان کا ایک عربی شعر بھی مجھے یاد نہ رہا، مگر اُن کے اردو اشعار مجھے بہت یاد ہو گئے تھے، جو اُن کے دیوان میں سے نقل کئے تھے،

وہ اکثر مشاعروں میں شریک ہوتے تھے، اور اپنی غزل بھی سناتے تھے، ایک مرتبہ ایک مشاعرہ کی خبر ملی، رات کو مشاعرہ تھا، غزل کہنے کی کوشش کی، اور صرف ایک شعر کہنے پائے تھے کہ احباب آگئے، اور ان کے ساتھ چل پڑے، اس زمانہ میں وہ ڈاسن کا جوتا، علی گڑھ نما پائجامہ، کرتا، یا کف دار قمیص، شیروانی، چشمہ اور ترکی ٹوپی استعمال کرتے تھے، اور ہاتھ میں چھڑی لیکر باہر نکلتے تھے، اسی شان سے مشاعرہ میں پہنچکر بیٹھ گئے، اُن کی صدارت رہا، پھر غزل کی شمع اُن کے سامنے بھی آئی، پہلے تو بہت پریشان ہوئے لیکن انتقالِ ذہن نے پریشانی دور کر دیا، انھوں نے یہ معذرت کی کہ مجھے مشاعرہ کی مطلق خبر نہ تھی، ابھی احباب نے اطلاع دی، فوراً اٹھ کر چلا آیا، البتہ ایک شعر ذہن میں آیا ہے، وہ عرض کرتا ہوں،

سر سے قدم تلک ہے ردا سے حیا پڑی
حاجت ہی کیا ہے آپ کو صاحب نقاب کی

یہ شعر لکھنؤ کے رنگ کا تھا، خوب داد ملی،

جلیلؔ جانشین امیر مینائی کے صاحبزادے مولوی صدیق حسن صاحب اور عثمان پاشا تھے، جو شیخ پورہ ضلع مونگیر کے باشندے تھے، اسی زمانہ میں ایک ادبی انجمن تہذیب الاخلاق کے نام سے قائم کی جس میں طلبہ کو تحریر اور تقریر کی مشق کرائی جاتی جمعہ کے بعد اس کا جلسہ ہوتا، کبھی مہتمم صاحب اور کبھی کوئی دوسرا مدرس اس کا صدر ہوتا، بعض دفعہ آخری درجہ کا کوئی ہونہار طالب علم اس فرض کو انجام دیتا، اس انجمن کی نظامت، جہاں تک مجھے یاد ہے، اکثر انہی کے ہاتھ میں رہی، وہ بہترین مقررین میں تھے لیکن ان کی تقریر میں جوش و خروش نہ ہوتا اور نہ وہ جذبات کو ابھارنے والی ہوتی، بلکہ زیر بحث مسئلہ کو دلائل اور امثال کے ذریعہ سنجیدگی کے ساتھ دل نشین کرنے کی کوشش ہوتی، ایک مرتبہ محنت پر تقریر کی تھی جس سے یہ خاکسار اس قدر متاثر ہوا کہ اسی دن سے فٹ بال اور کرکٹ کے بجائے کتابوں سے زیادہ دلچسپی لینے لگا جس سے کچھ لکھنا پڑھنا آگیا،

اب علامہ ممدوح نے مضمون نگاری بھی شروع کر دی تھی، اس زمانہ میں مولوی عبد الحلیم صاحب شررؔ لکھنوی کے ناولوں کی بڑی دھوم تھی، اور مشہور رسالہ "دلگداز" ماہوار نکلتا تھا جس میں اس زمانہ کے مذاق کے مطابق تاریخی، علمی اور ادبی مضامین ہوتے تھے، اس قسم کے ایسے رسالے اور ناول وہ بہت پڑھتے، ابتدائے شباب سے اُن کی آنکھیں خراب تھیں، بار بار ڈاکٹروں نے ان کو ترک تعلیم کا مشورہ دیا تھا، وہ ترک تو کیا کرتے، رات کے ایک ایک بجے تک کتابوں کے مطالعہ میں مشغول رہتے،

اس زمانہ کا بہترین اردو رسالہ "مخزن لاہور" تھا جس کے اڈیٹر شیخ عبد القادر بار ایٹ لا تھے، لکھائی چھپائی، کاغذ کی عمدگی کے علاوہ وہ ایک خالص ادبی رسالہ تھا، اور نوجوان طبقے میں بہت مقبول تھا، علامہ ممدوح کا پہلا مضمون اسی رسالہ میں شائع ہوا،

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ ابتدائی تعلیم کے زمانہ میں علامہ ممدوح بیت بازی میں پیش پیش تھے جس سے اُن میں شعری ذوق پیدا ہو گیا تھا، جو لکھنؤ آ کر اور تیز ہو گیا تھا، ندوہ کے طلبہ میں مولوی رکن الدین دانا سہسرامی، سید عبد الغفور شہرۃ بہاری، مولانا فاروق چریاکوٹی کے صاحبزادے طاہر وغیرہ شاعری کرتے تھے، اس زمانہ کے اساتذہ میں داغؔ، امیرؔ، جلیلؔ، ریاضؔ و مضطرؔ

...ابوں کا مطالعہ ہوتا جس میں تاریخ وادب کا حصہ زیادہ تھا، مضامین بھی علمی اور تاریخی ہونے لگے،

استاذ محترم علامہ شبلی نعمانی نے تربیت کے لئے چند ہونہار طلبہ کو منتخب کیا تھا جس میں سید سلیمان، عبدالسلام، ...ا عبدالقد... ، قمرالدین وغیرہ تھے، یہ لوگ بعد عصر وہاں پہنچ جاتے، علامہ شبلی کے پاس عرب کے متعدد اخبارات رسائل المنار، المؤید، الهلال، المقتطف وغیرہ آتے تھے، وہ کسی ایک طالب علم سے کوئی مقالہ پڑھوا کر ...ے پھر ... لیتے، اور فرماتے کہ تم اپنی عربی میں اس کو بیان کرو، جہاں تک مجھے یاد ہے، اس میں علامہ سید سلیمان ندوی صاحب زیادہ ممتاز تھے،

استاذ محترم کی صحبت کا اثر یہ ہوا کہ ان میں تلاش اور تحقیق کا مادہ پیدا ہوتا گیا، اور مضامین میں گہرائی آنے لگی ...کا یہ اثر ہوا کہ متقدمین کی معصومیت کا جو رعب ان پر چھایا تھا، وہ اٹھ گیا، چنانچہ متعدد کتابوں پر تنقید ... سلسلہ میں ہندوستان کے بعض قدیم مشاہیر علماء کی غلطیاں نکالیں جس سے ان کے حلقہ میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا،

... موصوف بہت ذہین تھے، ان کا حافظہ بھی بہت قوی تھا، پشاور سے لیکر چین کی سرحد تک خاک ... ...ہاں اہل علم سے ملنے کا اتفاق ہوا، ان میں مولانا انور شاہ کشمیری دیوبندی (محدث) مولانا ابوالکلام آزاد اور ...سید سلیمان ندوی کو قوت حافظہ میں بے نظیر پایا،

ایک دفعہ میں نے ابن بطوطہ کے سفرنامہ کے حوالہ سے مالابار کے حالات لکھے، نظرثانی کے وقت علامہ موصوف ...نے کہا تم نے غلط لکھا ہے، میں نے سفرنامہ کا اردو ترجمہ لاکر پیش کر دیا، دیکھ کر فرمایا ترجمہ صحیح نہیں ہے، عربی اڈیشن ... اڈیشن کو دیکھ کر فرمایا، دیکھو مترجم نے ضمیر کا مرجع غلط قرار دے کر ترجمہ کیا ہے، غور کیا تو واقعی صحیح تھا،

استاذ محترم شمس العلماء مولانا ابوالفضل حفیظ اللہ صاحب اس جماعت کو جس میں علامہ موصوف تھے، درس قرآن ...دیتے تھے، اسی اثنا میں آنریبل سید شرف الدین جج کلکتہ ہائی کورٹ تشریف لے آئے، اور درجہ میں بیٹھ گئے، وہ وَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ کی ایسی تفسیر کی خواہش کی جس سے لفظ ضالاً سے جو شبہ پیدا ہوتا ہے وہ دور ہو جائے ...کر گئے، درجے اور جماعت میں صرف سید سلیمان ایسے تھے جنہوں نے لغت، محاورہ اور ... کے حوالے سے ایسا ترجمہ

اس زمانہ کا ایک دلچسپ واقعہ قابلِ ذکر ہے، مولانا فاروق چریاکوٹی رحمۃ کی شاگردی کا فخر ندوہ کو بھی حاصل ہی، کچھ ندوہ سے مستعفی ہونے کے بعد نائب کے طور پر جناب مفتی عبداللطیف صاحب مقرر ہوئے، (ندوہ کو ان بھی ندوہ کی نسبت ہی) یہ فقہ حنفی کے بہت بڑے ماہر تھے، اور اس میں اُن کو بڑا غلو اور مزاج میں بے حد تقشف تھا، اُن کو بہت کم کسی نے مسکراتے ہوئے دیکھا، احکام کی تعمیل کرانے میں اس قدر سخت تھے کہ دار الاقامہ جو کچھ باتیں ہوتی تھیں، وہ [illegible] طلبہ ہی میں سے بعض کو انھوں نے جاسوس بنا رکھا تھا جن کے ذریعہ طلبہ کی مخفی باتیں اُن کو معلوم ہو جاتیں، اُن کی حکومت میں معافی کی کوئی دفعہ ہی نہ تھی، وہ شخصی حکومت کا نمونہ تھے، طلبہ اُن کے نام سے تھراتے تھے، بعض طلبہ سمجھتے تھے کہ جن اُن کے تابع ہے، جو طلبہ کے پرائیوٹ حالات اُن کو باخبر کر دیتا ہے، ایک دن معلوم ہوا کہ مفتی صاحب کہیں باہر جانے والے ہیں، یہ خبر سُن کر طلبہ نے ڈرامہ کی تیاری شروع کر دی، اور ان طلبہ کو خاص طور سے شریک کیا گیا جن کی نسبت جاسوسی کا خیال تھا، چنانچہ رات کو کھیل شروع ہوا، علامہ موصوف انگریز جج بنے، اور مولوی ضیاء الحسن علوی اُن کی لیڈی، [illegible] ہوا، ڈرامہ کا تتمہ کچھ یاد نہیں رہا،

ڈرامہ ختم ہونے کے قریب تھا کہ غل مچا مفتی صاحب آگئے، ہر شخص اپنے اپنے کمرہ میں پہنچ گیا، اس ذکر کا منشا یہ ہے کہ اس ڈرامہ میں بھی علامہ موصوف کا انتخاب ایک اعلیٰ عہدہ کے لئے کیا گیا جس کے لئے [illegible] ضرورت تھی، اس انتخاب سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت بھی وہ اپنے ہم عصروں میں اتنے ممتاز تھے کہ سب کی نگاہ اُن ہی پر پڑی، دوسری قابلِ تعریف بات یہ ہوئی کہ مفتی صاحب کو اس کی بھنک لگ گئی تھی، اگر وہ ڈرامہ کو گرفتار کر لیتے، جس کے سرغنہ سید سلیمان تھے،

استاذ محترم علامہ شبلی نعمانی کی تشریف آوری کے بعد ان کا رنگ ہی بدل گیا، دار الاخبار [illegible] سے دست بردار ہوگئے، ہفتہ وار ادبی انجمن میں بھی بہت کم حصہ لیتے، اور اب ان کا زیادہ وقت استاذ محترم کی خدمت میں گذرتا، خصوصاً عصر سے مغرب تک، اردو کی ادبی کتابوں کا شوق سرد پڑ گیا، اب زیادہ تر عربی

پسند نہیں کیا، اس میں شبہ نہیں کہ اگر وہ طب کی تعلیم حاصل کرتے تو بھی اپنی ذہانت اور قوتِ حافظہ کی بدولت بہترین طبیب ہوتے لیکن ضلع پٹنہ کے باشندوں کے علاوہ اُن کو کوئی نہ جانتا، اور عالمِ اسلامی اُن کی بہترین تصانیف سے محروم رہ جاتا،

انھوں نے سب سے پہلی ملازمت ندوہ ہی میں کی، ایک ادیب کی حیثیت سے اُن کا تقرر ہوا، الندوہ کے نائب اڈیٹر بھی رہے، اسی زمانہ میں آسی مدراسی مرحوم کے بڑے صاحبزادے قاری عبدالولی عربی زبان میں ایک ماہوار رسالہ "البیان" نکالتے تھے، علامہ اس کے بھی اڈیٹر تھے، اور ابتدا میں اسی کے ذریعہ حجاز، عراق، شام اور مصر وغیرہ میں اُن کا تعارف ہوا،

ان کی پہلی شادی اُن کے چھوٹے چچا کی لڑکی سے ہوئی تھی جس سے تین بچے پیدا ہوئے، دوسری سے کوئی اولاد نہیں تھی، اور تیسری سے متعدد اولادیں ہوئیں جن میں اس وقت چار لڑکیاں، اور ایک لڑکا سلمان [illegible] [illegible] (تقریباً [illegible]) سال کی عمر میں بمقام کراچی وفات ہوئی، اور ان کی وفات سے نہ صرف ضلع پٹنہ (بہار) کا کوہ نور گیا، بلکہ ہندوستان و پاکستان کی علمی دنیا اس کی ضیاباری سے محروم ہوگئی،

یا تشریح کی جس سے جج صاحب موصوف کو تسکین ہوگئی،

ایک دفعہ پٹنہ میں خدا بخش خان مرحوم چیف جسٹس حیدرآباد سے ملنے کے لئے گئے، خاکسار بھی ساتھ تھا، وہ اپنے مشہور کتب خانہ (پبلک اورنٹیل لائبریری) کے اس سائبان میں بیٹھے تھے جس سے متصل بازار کی سڑک تھی، اس وقت موجودہ بلڈنگ تیار نہیں ہوئی تھی، میز پر کچھ کتابیں تھیں، اور وہ کسی خاص کام میں مصروف تھے، ہم لوگ کرسی پر بیٹھ گئے، اور باتیں ہونے لگیں، اثنائے گفتگو میں آیۃ الکرسی کے متعلق گفتگو ہونے لگی، یہ مجھے یاد نہیں ہے کہ آیۃ الکرسی کی ایک تفسیر خوبیضی کی تھی، یا خود اُن کی تھی، یا کسی مفسر نے کسی کتاب میں لکھی تھی، علامہ موصوف کو سنائی، انھوں نے جو اصلاح دی، یا جو بات کہی، اُسے سن کر جج صاحب پھڑک اُٹھے، اور دیر تک تعریف کرتے رہے،

علامہ موصوف اردو فارسی، عربی کے علاوہ عبرانی زبان سے بھی واقف تھے، وہ جب دکن کالج پونہ میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے، تو ایک یہودی سے اس کو سیکھا تھا، اور ارض القرآن لکھنے میں اس سے مدد لی تھی، انگریزی لکھ اور بول نہیں سکتے تھے لیکن اخبار اور کتابیں پڑھ لیتے تھے،

ندوہ سے فارغ ہونے کے بعد علامہ موصوف بڑی کشمکش میں مبتلا ہوگئے، اُن کے والد اور اُن کے خسر بڑے بھائی کی خواہش تھی کہ وہ خاندانی پیشہ یعنی طب کی تعلیم حاصل کریں لیکن خود اُن کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی، استاذ محترم علامہ شبلی کی بھی یہی رائے تھی کہ طب کی تعلیم کے بجائے وہ علمی کاموں میں مصروف ہوں، چنانچہ انھوں نے استاد سے جب اس کا تذکرہ کیا، تو استاد نے اُن کے خسر کو ایک خط لکھا کہ سید سلیمان کو اُن کی علمی تحقیقات میں مصروف رہنے دو،

پھر اتفاق ایسا ہوا کہ استاذ محترم کسی ضرورت سے پٹنہ تشریف لے گئے، اور مولوی ابو یوسف صاحب (سید سلیمان صاحب کے خسر) اُن سے ملنے گئے، اس مسئلہ پر دونوں کی گفتگو ہوئی، آخر میں استاذ محترم نے فرمایا کہ اُن کے والد سے کہہ دو کہ سید سلیمان کو ہمیں دیدیں، والد کو یہ پیغام ملا تو استاد کی شفقت کو دیکھ کر خاموش ہوگئے لیکن طب اور تصوف دونوں لائنوں سے علاحدہ ہو جانے کو خاندانی روایات کے خلاف سمجھ کر آخر عمر تک

قیمت ۵۵۰ روپیے تھی،

قدیم آبائی مکان کے علاوہ ایک پرفضا مقام پر ایک شاندار بنگلہ بنوا لیا تھا، اُس میں اپنے اہل وطن کے ساتھ بیٹھ کر بڑی راحت محسوس کرتے، زندگی کے آخری دن اسی میں گذارنے کی تمنا اُن کو تھی لیکن مشیت کو کچھ اور ہی منظور تھا،

اپنے ایک ہم مکتب دوست کو ایک مکتوب مورخہ ۱۶ر جون ۱۹۴۸ء میں لکھتے ہیں :-

"خلوت خانۂ حق کے سوا کہیں آرام نہیں ع جز بخلوت گاہِ حق آرام نیست" ....

......دیسنہ کا اس پیری میں قیام کا خیال ہمیشہ سے تھا، اسی نے وہاں سب کچھ لگایا مگر افسوس کہ انقلاب زمانہ نے سارے منصوبے خاک میں ملا دیے، اب تو یہ بھی معلوم نہیں کہ بقیہ ایام عمر کہاں گذریں گے!..."

اہل وطن سے تعلق تمام اہل وطن سے بڑا انس رکھتے تھے، ۱۹۱۵ء میں اُن کے ایک محبوب ہم وطن مظفر امام محمد رحیم ڈپٹی کلکٹر کا انتقال ہوا تو بیحد مغموم ہوئے، ان سے صرف ہم وطنی کا رشتہ تھا لیکن اُن کی وفات پر ایک تعزیہ تحریر فرمایا۔

"آہ! نہ صرف دیسنہ کا چراغ بجھ گیا، بلکہ ہمارے دلوں کا بھی چراغ گل ہو گیا، ہماری زندگی کا نشاط جاتا رہا، وطن کی یاد فراموش ہو گئی، اور اس کی محبت سرد، خدا کی قسم میری زندگی میں یہ سب سے بڑی مصیبت ہو گی، اگر میرے دونوں بچے مر جاتے، تو اتنا غم نہ ہوتا، بس اب ہو چکا

غریبان را دل از بہر تو خون است — دلِ خویشان نمی دانم کہ چون است

۱۹۳۳ء میں دیسنہ کی ایک جوان خاتون کی حسرتناک موت ہوئی، سید صاحب اس وقت وطن ہی میں تھے، مرحومہ سے دور کا رشتہ تھا، لیکن ان کا جنازہ اٹھا تو اس کے پیچھے زار زار روتے جا رہے تھے، اور جب جنازہ کی نماز پڑھانے لگے تو چہرہ آنسوؤں سے بالکل تر ہو گیا،

اخلاق و سیرت کے کچھ جلوے

از

سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب

حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ اخلاق و سیرت کے لحاظ سے خلق عظیم کا نمونہ تھے، اُن کے حسن اخلاق کے جلوے اتنے گوناگون ہیں کہ ایک مختصر سے مضمون میں ان کا احاطہ دشوار ہے، ذیل کی سطور میں صرف اُن کی ایک ایک جھلک دکھانے کی کوشش کی گئی ہے،

حبِ وطن اپنے وطن دیسنہ سے بڑی محبت رکھتے، جب گھر آتے اور یہاں سے رخصت ہونے لگتے، تو اشکبار ہوجاتے، طالب علمی کے زمانے سے آخر عمر تک اس کے اجتماعی کاموں میں سے پوری دلچسپی لیتے رہے، وہاں کے باشندوں نے ۱۸۹۶ء میں اپنی معاشرتی و علمی اصلاح و ترقی کے لئے ایک انجمن قائم کی تھی جس کے ماتحت اردو کا ایک شاندار کتب خانہ بھی ہے، اس کی ترقی میں ہر قسم کی امداد کرتے رہے، انجمن کے سالانہ جلسوں میں کبھی اپنی نظم سناتے، کبھی مقالہ پڑھتے، اور کبھی تقریر کرتے، اس کے بعض جلسوں کی صدارت بھی کی، فرمایا کرتے تھے کہ یوں تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے بہت سی کانفرنسوں کی صدارت کا شرف عطا کیا، لیکن جو لذت وطن کی انجمن الاصلاح کی صدارت میں محسوس ہوئی، وہ کسی اور میں نہیں ہوئی،

انجمن کا سالانہ اور بڑا سے بڑا وقتی چندہ پابندی سے ادا کرتے تھے، اپنے جد بزرگوار کی ایک تصنیف نورِ محمدی اپنے خرچ سے چھپوائی، اور اس کے سارے نسخے انجمن کے کتب خانہ کو دیدیے کہ اس کی فروخت کی آمدنی کتب خانہ کی ضروریات میں خرچ ہو، اسی طرح اپنی تصنیف خطبات مدراس کی پانچ سو جلدیں اس کتب خانہ کو دیں جن کی

متنازعہ فیہ باتوں میں پڑنے سے حتی الوسع پرہیز کرتے، فرماتے کہ قیام وطن کے زمانہ میں جذبات میں تین دور آتے ہیں پہلے دور میں خیال ہوتا ہے، میرے ہم وطن چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھ کر خواہ مخواہ تضیع اوقات کرتے رہتے ہیں، دوسرے دور میں خود ان چھوٹی چھوٹی باتوں کے سننے کا جی چاہتا ہے، تیسرے دور میں نفس ان باتوں میں حصہ لینے کو آمادہ کرتا ہے، اس وقت رخت سفر باندھ لیتا ہوں، جب کسی اہل وطن سے کوئی شکایت ہوتی، تو درگذر کرکے خاموش ہوجاتے اور فرماتے میرا تو یہ مسلک ہے

ع: تو خصم باش و زما دوستی تماشا کن

اہل و عیال سے محبت | ان کی خانگی زندگی شفقت و محبت کے مناظر سے معمور ہے اپنی اہلیہ کے مرض الموت میں بڑی دل سوزی اور تن دہی سے تیمارداری کی، ان کو اعظم گڈھ سے لکھنو علاج کے لئے لے گئے، اور قرض لیکر علاج کراتے رہے مگر وہ تیرہ سال کی رفاقت کے بعد ۱۹۱۵ء میں جنت کو سدھاریں، رفیقۂ حیات کی جدائی پر غیر معمولی اثر ہوا جس کا اظہار ایک نظم فراق یار میں کیا، ان کے غم والم کی خبر الہ آبادی کو ہوئی تو انھوں نے خطوط میں اشعار لکھ لکھ کر ان کو تسلی دی، پہلے خط میں یہ شعر لکھ کر تلقین کی،

اگرچہ تلخ ملا جام عمر فانی کا
مگر محل نہیں ساقی سے بدگمانی کا

دوسرے خط میں یہ رباعی لکھ کر دلجوئی کی،

جس سے میری زندگی تھی مرگیا کیون کرسکا
چرخ نے مجھ پر ستم یارب کیا کیون کرسکا
واقعات جانگزا کا کیون ہوا ایسا وقوع
کیون نہ میری آہ سے قانون فطرت ڈرسکا

پھر اور دوسرے خطوط میں یہ متفرق اشعار تھے۔

صدیون فلاسفی کی چنان اور چنین رہی
لیکن خدا کی بات جہان تھی وہین رہی

ساتھی جو تھے رنج و راحت کے اس موت کے ہاتھوں چھوٹ گئے،

اب یاس گرائے دیتی ہے، سب دل کے سہارے ٹوٹ گئے

جناب سید عبدالحکیم صاحب جو اب بھی بقید حیات ہیں، اُن کے رشتہ کے چچا ہوتے ہیں، عمر میں وہ سید صاحب سے تقریباً بارہ تیرہ برس بڑے ہیں، اُن سے تمام عمر اپنے حقیقی چچا سے زیادہ محبت کرتے رہے، ایک خط مورخہ ۲ اکتوبر ۱۹۳۳ء میں اُن کو لکھتے ہیں :-

"آپ کے دل کو مجھ سے، اور مجھ کو آپ کے دل سے جو لگاؤ ہے، وہ سوال اور استدلال سے باہر ہے، نفستہ آپ نے اپنے دل کو بہت دکھ دیا اور یہاں بھی ہر روز آپ کو خط نہ لکھنے اور آپ کے خط نہ آنے کا خیال رہا"

پھر کراچی سے ۱۵ فروری ۱۹۵۰ء کو اُن کو تحریر فرماتے ہیں :-

"آپ کو اس ناکارہ سے جو رابطہ تعلق ہے، اس کا میرے دل پہ اثر ہمیشہ رہا اور وہ اب تک اسی طرح ہے"

ع حقہ مہربان نام و نشان است کہ بود

.... افسوس ہے کہ وطن کا شیرازہ اور احباب و اعزہ ایسے متفرق ہوئے کہ ان کے دیدار سے محرومی رہے گی، اور اس کا اپنے قلب پر بڑا اثر پاتا ہوں، یہاں کیا آیا کہ دنیا ہی بدل گئی، ہندوستان بھلانے سے بھی نہیں بھولتا، .... خدا جانے چمن پہ کیا گذری"

سید عبدالحکیم صاحب کو بھی اُن سے بڑی شیفتگی رہی، یوں تو وہ عمر میں بڑے ہیں لیکن آخر میں وہ اُن سے روحانی استفادہ بھی کرنے لگے تھے، سید صاحب کی طالب علمی کے زمانہ سے اُن کے آخر عمر تک دونوں میں برابر خط و کتابت قائم رہی جس کو سید عبدالحکیم صاحب نے حرز جان بنا رکھا ہے، یہ خطوط ایسی قیمتی دستاویز ہیں جن سے سید صاحب کے سوانح حیات مرتب کرنے میں بڑی مدد ملے گی۔

آخر زمانہ میں جب کبھی سید صاحب کا قیام وطن میں رہتا تو اُن کا معمول تھا کہ روزانہ فجر کی نماز کے بعد مسجد میں کلام پاک کا درس دیتے، جمعہ کے روز وعظ بھی کہتے، اپنے ایک مکتوب میں سید عبدالحکیم صاحب کو لکھتے ہیں کہ وطن کی ہر ٹھیکری میرے لئے لعل و گوہر سے زیادہ عزیز ہے، حب الوطن من الایمان لیکن اس لگاؤ کے باوجود گاؤں میں

پھیل چکی تھی، گیلانی پہنچ کر دریافت کیا کہ میرے پُرانے ساتھی اور بھائی کھڑا ون انا س کہان ہین، اُن کو تلاش کر کے بڑے اخلاق، محبت اور بے تکلفی سے ملے، سید محمد حنیف صاحب ۱۹۵۰ء مین حج کے لیے گئے تو مکہ معظمہ مین سید صاحب سے ملاقات ہوئی، اتفاق سے سید محمد حنیف صاحب وہان سخت علیل ہوگئے، اُن کی علالت کی خبر سید صاحب کو ہوئی تو عیادت کے لئے گئے، اور ہر طرح اُن کو تسلی دی، سید محمد حنیف صاحب اس واقعہ کو جب یاد کرتے ہین تو یہ کہکر آبدیدہ ہوجاتے ہین کہ کہان مین ایک لاأبالی آدمی جو کس مپرسی مین پڑا ہوا تھا، اور کہان سید صاحب کی ذات والاقدر جن کی تعظیم کے لئے حکومت سعودی کے بڑے بڑے حکام سروقد کھڑے ہوجاتے تھے، وہ میری عیادت کے لئے آئے، اُن تسلی و تشفی سے سرفراز کرتے رہے،

سید صاحب کے ایک دوسرے ہم مکتب مولانا محمد قاسم صاحب دیوبندی تھے، مکتب کی تعلیم ختم کرنے کے بعد کچھ دنون دارالعلوم ندوہ مین تعلیم پائی، پھر دیوبند مین تکمیل کی، مختلف مدرسون مین ملازمت کرنے کے بعد آخر مین مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ مین مدرس ہوئے، سید صاحب ندوہ سے اپنی طالب علمی کے زمانہ مین ان کو دیوبند ایک خط مین لکھتے ہین :-

"دوسرے دن کے نام آپکے خط پر خط آئے اور مین آپکے خط دیکھنے کو ترسون، مجھے یاد نہین کہ آپنے کبھی خط لکھنے مین سبقت فرمائی، صاحب چاہ مشکل نہین نباہ مشکل ہے"

اور یہ بے تکلفی آخر وقت تک قائم رہی، دارالمصنفین کے دور قیام مین اُن کو ایک خط مین لکھتے ہین :-

"اللہ رے نازحسن کہ بولین بھی وہ تو یون ہان وہ کہان ہے در پہ جو میرے پڑا رہا

بھولے دوست اچھے ہیں کبھی نہ یاد آوٴن، آپ کو دارالمصنفین کا خیال آیا، تو غیر سے استفسار کی کیا حاجت تھی شاید وہ سزاوار خطاب نہ تھا"

ندوہ کے ساتھیون مین مولوی ضیاء الحسن علوی ندوی مرحوم کو بہت عزیز رکھتے تھے، ان کی وفات پر بے حد ملول ہوئے، چنانچہ معارف کے ایک مضمون مین اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا،

مرنے والا مرچکا، اور رونے والا رو چکا، وائے بر ہستی اگر مقصود ہستی ہو چکا،

پہلی اہلیہ نے دو اولادیں چھوڑی تھیں، سیدہ مرحومہ، اور ابو سہیل سلمہ اللہ کسٹم آفیسر مشرقی پاکستان، ان ہی سے دل بہلا کر بقیہ زندگی تجرد میں گذار دینے کا تہیہ کیا تھا لیکن اپنے والد بزرگوار کے اصرار پر ۱۹۲۰ء میں دوسرا عقد کیا، یہ اہلیہ بھی مشکل سے ڈیڑھ سال زندہ رہیں، اُن کی وفات پر پرانا غم تازہ ہوگیا، وطن اور اہلیہ ثانی کے گھر کو یاد کر کے مغموم اور بے چین رہتے تھے، چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں،

"دیسنہ اور اس کے مکان کی ایک کوٹھری میرے لئے تاریخی غم کی یادگار بن گئی ہے، اور میرے احساس کو صدمہ پہنچا رہتا ہے"،

تیسرا نکاح، رجنوری ۱۹۲۳ء عیسوی میں ہوا، ان اہلیہ سے ایک لڑکا عزیزی سلمان سلمہ اور چار لڑکیاں ہیں، شمیمہ (اہلیہ ابو عاصم صاحب ایڈوکیٹ کراچی) سعیدہ (اہلیہ سید حسن صاحب، اڈیشنل کمشنر، بری ڈویژن)، اور دو ابھی ناکتخدا ہیں، اپنے تمام بچوں سے بڑی محبت رکھتے تھے، سب سے چھوٹی اولاد کو برابر اپنی گود میں بٹھائے رکھتے، حتی کہ کبھی کبھی سفر میں بھی اس کو ساتھ لے جاتے، ان سب کو آپ ہی کہکر مخاطب کرتے جب ان سے کسی بات پر ناراض ہوتے، تو ڈانٹنے اور جھڑکنے کے بجائے صرف یہ کہتے کہ یہ فلاں حرکت مجھ کو پسند نہیں کئی بچے بچپن ہی میں فوت ہوگئے، ایک داماد اور ایک لڑکی کی جوانمرگی کا بھی غم اٹھانا پڑا، لیکن اُن کی اکلوتی اولاد سید نفیس اشرف سلمہ اللہ (اسٹیٹ بینک پاکستان) کو اپنی آغوش شفقت میں لیکر ان دونوں کا غم غلط کرتے رہے،

ہمدرسوں سے تعلق اپنے مکتب اور درس کے ساتھیوں سے انکو ہمیشہ لگاؤ رہا، انکے ایک ہم مکتب جناب سید محمد حنیف تھے جو تعلیم ختم کرنے کے بعد مختار ہوئے لیکن وارستگی مزاج کی بنا پر مختاری چھوڑ دی، اور اپنے وطن دیسنہ سے منتقل ہو کر اپنی سسرال گیلانی میں سکونت پذیر ہوگئے، وہ نہایت سادگی میں کھڑاؤں استعمال کرتے ہیں، اور ننگے سر برابر رہتے ہیں، ایک بار سید صاحب کو دیسنہ سے گیلانی جانے کا اتفاق ہوا، یہ وہ زمانہ تھا جبکہ انکی علمی شہرت بہت زیادہ

فلسفۂ اسلام کا ترجمان اور کاروانِ ملت کا حدی خوان صدیوں کے بعد پیدا ہوا تھا، اور شاید صدیوں کے بعد پیدا ہو، اس کے ذہن کا ہر ترانہ بانگ درا، اس کی جانِ حزین کی ہر آواز زبورِ عجم، اس کے دل کی ہر فریاد پیامِ مشرق، اس کے شعر کا ہر پرپرواز بالِ جبریل تھا، اس کی فانی عمر گو ختم ہو گئی لیکن اس کی زندگی کا ہر کارنامہ جاوید نامہ بن کر انشاء اللہ باقی رہے گا، امید ہے کہ ملت کا یہ غم خوار شاعر اب عرشِ الٰہی کے سایہ میں ہوگا، اور قبول و مغفرت کے پھول اس پر برسائے جا رہے ہوں گے، خداوندا! اس کے دلِ شکستہ کو جو ملت کے غم سے رنجور تھا، غم خواری فرما، اور اپنی نوازشوں سے اس کے قلبِ حزین کو مسرور کر"

مرحوم شیخ عبد القادر سے بھی متاثر تھے، ان کو پہلی دفعہ ۱۹۱۵ء میں پٹنہ میں ندوۃ العلماء کے جلسہ میں دیکھا تھا، اس موقع پر انھوں نے ایسی دلچسپ تقریر کی تھی جس سے حاضرینِ جلسہ کے ساتھ سید صاحب بھی محوِ حیرت ہو گئے، ان کے بیان کے مطابق اس کا یہ اثر ہوا کہ

"دل میں ایسی ہی تقریر کرنے کا جذبہ پیدا کر دیا جس کی مشق بعد کو ہوئی"

بعد میں ان سے اچھے خاصے مراسم پیدا ہو گئے تھے، اور جب ان کا انتقال ہوا، تو ان کی یاد میں لکھا،

"مرحوم کی شخصیت گوناگون اوصاف کی حامل تھی اور ہر مجلس و محفل میں ان کی یکساں قدر و منزلت تھی، وہ نیک طینت، نرم مزاج، متواضع اور ملنسار تھے، ان کی مختلف النوع خدمات میں میرے نزدیک سب سے بڑی خدمت ان کی ادبی خدمت ہے، اور وہ بھی خاص طرح کی یعنی لکھنے والے تو بیسیوں ہیں، مگر ان کا کارنامہ یہ کہ انھوں نے بیسیوں کو ادیب، انشاء پرداز، اہلِ قلم، مصنف، اور شاعر بنا دیا، اور حق یہ ہے کہ انھی نے ہندوستان کو اقبال بخشا"

سیاسی دوستوں میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری سے قلبی تعلق رکھتے تھے، ۱۹۳۶ء کے موسم گرما میں دہرہ دون میں تھے، ۹ مئی کی شام کو وہاں کی ایک سڑک پر دور سے ڈاکٹر انصاری کو موٹر پر جاتے دیکھا، صبح ان کی تیاری گاہ کی

"افسوس کہ میرے رفیق قدیم اور صدیق حمیم مولوی ضیاء الحسن صاحب علوی ندوی نے ایک مختصر علالت کے بعد ۱۴ رجون ۱۹۴۵ء کو الٰہ آباد میں جہاں وہ عربی مدرسوں کے انسپکٹر اور مشرقی امتحانوں کے رجسٹرار تھے ستاون برس کی عمر میں وفات پائی، اس حادثہ کی اطلاع مجھے ۱۸ رجون کو لکھنؤ میں اسی مدرسہ میں ملی، جہاں میں اور مرحوم مل کر ایک جان دو قالب تھے، افسوس کہ ایک قالب خالی ہوگیا، اور دوسرا نیم جان موجود ہے، مرحوم مجھ سے عمر میں تقریباً پانچ برس چھوٹے گو تعلیم کے درجہ میں دو ایک سال بڑے تھے، اس لئے بظاہر یہی امید تھی کہ ان ہی کو میری جدائی کا صدمہ برداشت کرنا پڑے گا، مگر تقدیر یہی تھی کہ مجھے اُن کے فراق کا غم سہنا پڑے گا، اسی لئے امید غلط ثابت ہوئی، اور تقدیر کا فرمان نافذ ہو کر رہا،

ع: اکنون چہ توان کرد تقدیر چنین بود"

مولوی ضیاء الحسن مرحوم تعلیم میں اُن سے دو ایک سال سینیر تھے، اس لئے آخر وقت تک سید صاحب کو "تم" کہہ کر مخاطب کرتے تھے، ایک بار ضیاء الحسن صاحب مرحوم اُنکو اپنی ایک تحریر پڑھ کر سنا رہے تھے، سید صاحب نے اُن کو ایک جگہ ٹوکا، وہ بولے "سلیمان! تم اردو کیا جانو" اس فقرہ سے سید صاحب بہت محظوظ ہوئے، اور کئی بار اپنی نجی صحبتوں میں اس کا ذکر کیا،

معاصرین سے محبت اپنے معاصرین اہل علم میں ڈاکٹر اقبال سے بڑا گہرا لگاؤ رکھتے تھے، نجی مجلسوں میں کہا کرتے کہ عالم اسلام میں ایک عرصہ کے بعد ڈاکٹر اقبال جیسا متفکر نظم پیدا ہوا ہے، ان کو توحید خالص، رسول کا شیدائی، دین حق کا علمبردار فلسفہ اسلام کا ترجمان، اور تجدید ملت کا طلب گار کہا کرتے، جب اُن کی رحلت کی خبر ملی تو معارف میں اسکا بڑا دردناک ماتم کیا، جس کے بعض ٹکڑے یہ ہیں:-

"صفر کی انیسویں اور اپریل کی اکیسویں کی صبح کو عمر کی اکسٹھ بہاریں دیکھ کر اور شاعری کی دنیا میں چالیس برس چہچہا کر یہ بلبل ہزار داستان اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا، وہ ہندوستان کی آبرو، مشرق کی عزت اور اسلام کا فخر تھا، آج دنیا ان ساری عزتوں سے محروم ہوگئی، اور ایسا عارف فلسفی، عاشق رسول شاعر

اُن کے صاحبزادے مولٰنا سید شاہ غلام حسین صاحب پھلواروی کو ایک خط مورخہ ۱۹ اگست ۳۳ء میں لکھا:

"شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو مجھ ذرہ بے مقدار کے ساتھ جو شفقت تھی، وہ مجھے ہمیشہ یاد رہی،

......بنارس کے جلسۂ ندوہ میں شاہ صاحب نے مولانا شبلی کی تحریک پر مجھ کو اپنی ایک عبا بطور امتحان

و انعام دینا منظور فرمایا تھا، میں ہمیشہ اس کا تقاضا کرتا، اور اس تقاضے میں اب بھی، اور اس عمر

میں بھی، مجھے کیا لطف آتا تھا، ایک دفعہ میں نے جب ہنوز عمر کی پختگی اور عقل کی تکمیل نہیں ہوئی تھی

ایک عریضہ لکھا اس میں جدید انشا پردازی کی پیروی میں السلام علیکم نہیں لکھا تھا، اس پر اُن کی

بزرگانہ ڈانٹ مجھے اب تک یاد ہے۔"

مولٰنا سید محمد علی مونگیری قدس سرہ العزیز سے بھی بہت متأثر تھے، جس زمانہ میں وہ ندوہ میں تعلیم پاتے تھے، مولٰنا مرحوم ندوہ کے ناظم تھے، ایک روز انھوں نے سید صاحب کو بلا کر پوچھا تم کو کس فن سے ذوق ہے؟ سید صاحب نے جواب دیا عربی ادب اور منطق سے، پھر پوچھا کیوں؟ سید صاحب نے کہا کہ اس لئے کہ یہ دونوں اصل مقصود یعنی علوم کے خادم اور ذریعہ ہیں، مولٰنا نے فرمایا کہ آخر ان اصل علوم کی طرف کب توجہ ہوگی، سید صاحب نے کہا کہ جب ان میں کمال پیدا ہو جائے گا، یہ سُن کر مولٰنا نے فرمایا تو اسی خادم اور ذریعۂ علوم میں تو ہمارے علما کی پوری عمریں بسر ہو جاتی ہیں، اور اصل مقصود کی نوبت نہیں آتی، اس کے بعد انھوں نے یہ حکایت بیان کی کہ ایک صاحب کو تصنیف کا شوق پیدا ہوا، تو وہ قلم بنا بنا کر رکھنے لگے، یہاں تک کہ تمام کمرہ قلموں سے بھر گیا، کسی نے ان سے پوچھا کہ حضرت یہ آپ نے قلم بنا بنا کر کیوں رکھ رہے ہیں، تو متانت سے بولے کہ میرا ارادہ تصنیف کا ہے۔ پوچھنے والے نے کہا کہ پھر وہ کب شروع ہوگی، جواب دیا جب ان قلموں سے فرصت ملے گی، یہ تمثیل اس بات کی تھی، کہ عربی نصاب کا بڑا حصہ دینی علوم کی تمہید اور ذریعہ کے طور پر پڑھایا جاتا ہے، مگر ہوتا یہ ہے کہ یہ ذریعۂ تعلیم اصل تعلیم کی جگہ لے لیتا ہے، سید صاحب کا بیان ہے کہ مولٰنا کی یہ حکایت میرے لئے اس درجہ موثر ہوئی کہ میں نے پھر تمام عمر ذریعۂ علوم اور مقصدِ علوم کے درمیان کبھی مغالطہ نہیں کھایا، اور عین وقت پر میری ایسی رہبری ہوئی کہ جس نے میرے خیالات کی دنیا پلٹ دی،

تلاش کی کوشش کی، معلوم ہوا کہ وہ رات ہی دہلی چلے گئے، اور شام کو اطلاع ملی کہ وہ راستہ ہی میں جنت کو سدھار گئے یہ خبر سن کر سید صاحب کا دل دھڑکنے لگا آنکھیں اشکبار ہوگئیں، سینہ سے آہوں کے شعلے اٹھنے لگے، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُن کے صبر و تمکین کی ساری متاع جل کر خاکستر ہو رہی ہے، ڈاکٹروں نے اُن کو لکھنے پڑھنے کی ممانعت کی تھی لیکن اُن کی طبیعت نہ مانی، اور ڈاکٹر صاحب کا ماتم لکھنا شروع کر دیا جس کا آخری ٹکڑا یہ ہے:

"طرابلس اور بلقان کے ہنگاموں نے ہمارے چند جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کو دفعتہً سوتے سے بیدار کر دیا تھا، محمد علی مرحوم اس قافلہ کے سالار تھے، اور ڈاکٹر انصاری اس کے سب سے پرجوش رہبر تھے، افسوس کہ ان دونوں دردمندوں نے دل ہی کے آزار میں وفات پائی، دل کا درد مجاز بن کر نمودار ہوا، اور اُن کی قومی زندگی کا باعث ہوا، اور وہی حقیقت بن کر اُن کی موت کا سبب ہوا"

محمد علی نے داغِ مفارقت دیا، ہم اب

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی — اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

صلحاء و علماء کا احترام | مکتبی تعلیم ختم کرنے کے بعد اپنے وطن دیسنہ نکلے تو کچھ دنوں جناب شاہ محی الدین صاحب پھلواروی کے سامنے بھی زانوے تلمذ تہ کیا تھا، ان کی قدر و منزلت سید صاحب کے دل میں آخر وقت تک قائم رہی، ایک تحریر میں فرماتے ہیں:-

"مجھے خانقاہ میں خاص حضرت شاہ محی الدین صاحب مرحوم کے قرب قیام کی، اور ایک ساتھ طعام کی، اور زیر درس کتابوں میں شاگردی کی سعادت حاصل ہوئی، مجھے اس نسبت پر فخر، اور انھیں اس پر مسرت تھی"

جناب شاہ سلیمان صاحب پھلواروی سے ان کا کوئی رشتہ تو نہ تھا لیکن سید صاحب کے والد مرحوم اُن کے پیر بھائی اور اُن کے خسر کے مرید تھے، اس لئے سید صاحب ان کو اپنا بزرگ سمجھتے رہے، اور خود شاہ صاحب ان کو اپنے عزیز سے کم نہیں سمجھتے تھے، جب شاہ صاحب کا وصال ہوا تو سید صاحب نے

کا ہاتھ پکڑ کر مولانا اشرف علی کے سامنے پیش کر کے فرمایا: "ان کو میری طرف سے قبول فرمالیں" اسی خواب کے بعد وہ مولانا تھانوی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوگئے۔

وہ اپنی زندگی کے آخر زمانے میں بقول ان ہی کے روح کی بھوک میں مبتلا ہوگئے، اور اسی سے نجات کے لئے حضرت مولانا اشرف علی کی طرف رجوع فرمایا تھا۔ اس انقلاب کے بعد ان کے پاس بہت سے خطوط آتے کہ آپ کے جیسے فاضل اجل اور محقق کو ایک پرانے طرز کے عالم کے سامنے سر جھکانے کی کیا ضرورت تھی، اس کے جواب میں اکثر بڑی محبت میں فرماتے تھے کہ یہ لوگ مجھ کو زبان سے فاضل اور محقق کہتے ہیں، مگر درحقیقت مجھ کو بے عقل جانتے ہیں، آخر اس بات پر کیوں نہیں غور کرتے ہیں کہ ان کے خیال کے مطابق اگر واقعی محقق اور علامۂ دہر ہوں، تو کیا وجہ میں نے مولانا تھانوی کا دامن تھاما؟ ان لوگوں کو سمجھنا چاہئے کہ میں نے اپنے اندر کوئی کمی پائی جس کی تکمیل کے لئے وہاں گیا۔ اسی سلسلے میں ایک خط میں ۱۹۳۸ء میں سید ضیاء الحکیم صاحب کو لکھتے ہیں:

"آپ کی محبت ہے مجھے سب کچھ سمجھتے ہیں لیکن میں خوب جانتا ہوں، دائم علماء پر نفس کا بار عام مسلمانوں سے زیادہ ہے، اس لئے اگر وہ درست نہ ہوں تو ان پر عذاب دوسروں سے زیادہ ہے، معاملہ زبان کا نہیں، قلب سلیم اور قلب منیب کا ہے، نفس کا نہیں روح کا ہے، میری تمام زندگی چند دنوں میں گذر گئی، اب کچھ اس زندگی کے لئے بھی کرنا چاہئے جو باقی ہے، علم اور قوم کی خدمت بہت کچھ ہو چکی، ..... ابھی میری منزل مقصود بہت دور ہے، ..... صرف تسبیح اور مراقبہ سے کچھ نہیں ملتا، جب تک دل کا تعلق سب سے نہ ٹوٹے، ہم تو بندوں کی رضامندی اور ناراضی میں گرفتار ہیں، مالک کی رضامندی اور ناراضی کی کس کو فکر ہے، دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے صحیح راستہ پر چلائے۔"

وہ فرائض کے پابند اور بدعات سے نفور تو شروع زندگی سے رہے لیکن آخر میں متقیانہ و متصوفانہ رغبت سے ان الفاظ میں "علاج دل" و "حصول اخلاص" کے خواستگار ہوگئے تھے۔

انکسار — طبیعت میں انتہا درجہ کی متانت و سنجیدگی تھی، اس لئے دور سے دیکھنے والے ان کی خاموشی و کم آمیزی کو

مولانا حمید الدین فراہی بی اے کا بھی بہت احترام کرتے تھے چنانچہ فرماتے ہیں "ان سے قرآن پاک اور فلسفۂ
جدید کے سبق تو کم ہی پڑھے مگر صحبت بار بار اٹھائی، اور مشکلات میں مشورے بار بار کئے، سیرت کی تیسری جلد میں جو
معجزات پر ہے، اُن ہی کے فلسفہ کی تقلید کی ہے"

مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے اخلاق جود و سخا تواضع و انکسار، ارشاد و ہدایت، وعظ و نصیحت اور اُن کے
مطالعہ اور قومی درد کے بیحد مداح تھے، سیاسی کاموں میں ایک عرصہ تک اُن کے ساتھ رہے، اور جب ۴۸ سال
کی عمر میں اُن کی وفات کا دردناک حادثہ پیش آیا، تو اُن کے اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرمایا "جدید تعلیم یافتوں
کی سیاسی جدوجہد کو مذہبی تحریک بنا دینا، ان ہی کا کارنامہ شمار کیا جائے گا، اس لیے اُن کی یہ غیر متوقع موت
صرف فرنگی محل کا نہیں بلکہ اسلام کا سانحہ ہے، اور بنا بریں اُن کی جوانا مرگی ہمیشہ کے لیے تاریخ اسلام کا ایک دردناک
واقعہ شمار کیا جائے گا"

مولانا سجاد نائب امیر شریعت بہار کی رحلت کی خبر پائی، تو بے حد ملول رہے، ایک نجی خط میں اپنے
ندوی عزیز مولانا مسعود عالم کو لکھتے ہیں:-

"ہاں بھائی! تمھارے دونوں خطوں میں مولانا سجاد مرحوم کے تاثرات کا عکس تھا ع اک تیر تھا
جو ہائے کلیجہ کے پار تھا، ۲۰ دسمبر کو شب سے اطلاع ملی دو دن سے اور آج بھی دن سے کہ کوئی رات ان کی
یاد اور تصور ذہنی سے خالی نہیں، معارف میں ماتم لکھنے بیٹھا تو زبان و قلم نے ساتھ دینے سے انکار کیا بمشکل
چار سطریں لکھ کر چھوڑ دینا، ہمارا صوبہ خالی ہو گیا، اور کیا کہوں ع اک عالی دماغ تھا نہ رہا،

مولانا حسین احمد صاحب مدنی سے بھی بڑی عقیدت رکھتے تھے، جب ان میں تصوف و سلوک کا ذوق پیدا
ہوا، تو پہلے مولانا حسین احمد ہی کے جانب اُن کا میلان ہوا، اور ان ہی سے بیعت کا ارادہ رکھتے تھے لیکن ایک دن
خواب میں دیکھا کہ ایک پلنگ پر حضرت مولانا اشرف علی تھانوی تشریف فرما ہیں، اور اسی کے پاس ایک دوسرے
پلنگ پر وہ خود مولانا حسین احمد صاحب کے ساتھ بیٹھے ہیں، یکایک مولانا حسین احمد اپنی جگہ سے اٹھے اور سید صاحب

تو سید صاحب نے اس کے جواب مین یہ رُباعی لکھ کر بھیجی۔

مجہ تو اسیر زلف احسان کردی | وندر ورسخن دلم درخشان کردی
منت بہ غریب شہر خندان کردی | کان مور ضعیف را سلیمان کردی

لینت ومروت طبیعت مین لینت ونرمی اور حلم ومروت اس قدر غالب تھی، کہ کسی معاملہ مین سختی ودرشتی جانتے ہی نہ تھے حتی کہ گھر کے ملازمون اور بچون پر بھی سختی نہ کر سکتے تھے، اُن کی زبان کبھی کسی درشت کلمہ سے آلودہ نہ ہوتی، اُن سے کبھی کسی کو کوئی نقصان نہین پہونچا، اور نہ کسی کی دل شکنی کی، اگر کسی بات سے ان کے شاگردون کو آزردگی ہو جاتی تھی، تو طرح طرح سے اس کی تلافی کی کوشش کرتے تھے، اس وصف کا یہ نتیجہ تھا کہ جو شخص ان پر حاوی ہو جاتا، وہ اُن سے جو کام چاہتا لے لیتا تھا اور بعض اوقات اپنی طبیعت کے خلاف ایک کام کرنے پر مجبور ہو جاتے،

تحمل اور برداشت کے پہاڑ تھے، دوسرون کی تلخ سے تلخ باتون کو پی جاتے، اور ناگوار سے ناگوار واقعات مین ان کے برداشت کا پیمانہ لبریز نہ ہوتا تھا، اس راہ مین انھون نے اپنی ہستی فنا کر دی تھی، اُن کے دل پر کچھ بھی گذر جائے، مگر زبان پر کبھی شکوہ نہ لاتے تھے، انھون نے مظلوم بننا گوارا کر لیا، مگر ظالم بننا گوارا نہ کیا، وہ نسلاً سید تھے ہی عملاً بھی سید تھے،

وہ اپنی سیاسی زندگی مین بھی شرافت اور مروت کے پیکر ہی بن کر کام کرتے رہے، کسی سے سبقت لے جانے کی کوشش کو بھی اچھی نظر سے نہین دیکھتے تھے، چنانچہ ایک مکتوب مورخہ ۲۳ رجنوری [illegible] مین ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوے سید عبد الحکیم صاحب کو تحریر فرماتے ہین،

"............مین نے بعد کو مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی دونون سے الگ الگ کہا کہ مجھے چھوڑ دیجئے، مجھے دوسرے کو دھکا دے کر آگے بڑھنا پسند نہین لیکن دونون نے نامنظور کیا"

سنہ ۱۹۲۶ء مین ہندوستان کی طرف سے جو وفد حجاز گیا تھا، سید صاحب اس کے صدر، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، اور شعیب قریشی اس کے ارکین تھے، سلطان ابن سعود کی بادشاہت کے بارہ مین سید صاحب کی راے دوسرے ارکین سے مختلف تھی لیکن انھون نے کھلم کھلا اختلاف کرنے کے بجاے سیاسیات ہی سے کنارہ کشی اختیار

اُن کے غرور اور پندارِ علم پر محمول کرتے تھے، ایک بار دہلی کے ایک رسالہ نے اُن کے خلاف کچھ لکھنا شروع کیا، اس رسالہ کے اڈیٹر سے منشی ذکاء اللہ مرحوم کے نامور فرزند جناب عنایت اللہ صاحب (سابق ناظم دارالترجمہ حیدرآباد دکن) کے بھی مراسم تھے، سید صاحب نے عنایت اللہ صاحب کو لکھا کہ رسالہ مذکور کے اڈیٹر سے دریافت فرمائیں کہ مجھ سے اُن کو کیا شکایت ہے جو میرے پیچھے پڑ گئے ہیں، عنایت اللہ صاحب نے اڈیٹر مذکور کو ایک خط لکھا، انھوں نے جواب دیا کہ مولوی سید سلیمان بڑے مغرور آدمی ہیں، اُن کے غرور کو توڑنا چاہتا ہوں، عنایت اللہ صاحب نے اپنی طرف سے اُن کو جواب دیا کہ میں بھی سید صاحب سے ملتا رہا ہوں، اُن کو کسی حال میں مغرور نہیں پایا، البتہ عالم ہیں اور بہت بڑے عالم ہیں، اپنے علم کے پندار کو قائم رکھنا چاہتے ہیں، تو یہ تو اُن کا بڑا وصف ہے،

وہ تحریر میں بھی مغرور نہ تھے، معارف کے شذرات لکھتے وقت برابر یہ خیال رکھتے کہ کہیں سے انا کی بو نہ آئے، اکثر ایسا ہوا کہ اگر کہیں میں لکھ جاتے تو اس کو کاٹ کر اڈیٹر معارف یا خاکسار یا ہیچمدان بنا دیتے، اپنے نام کی رعایت سے ہیچمدان ہی لکھنا زیادہ پسند کرتے تھے، اپنی تحریر کے مسودے اکثر اپنے شاگردوں کو نظر ثانی کرنے کے لئے بلا تکلف دیدیتے، اور اُن کے مشوروں کو قبول کرنے میں مطلق تامل نہ کرتے، نجی صحبتوں میں دوستوں اور شاگردوں سے بہت بے تکلف رہتے، اگر ذہن میں کوئی اچھا فقرہ آجاتا، تو بلا تکلف کہہ ڈالتے، بعض اوقات ان فقروں سے اُن کے شاگردوں کو آنکھیں نیچی کرنی پڑتیں،

ان کے فطری انکسار کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا کہ ایک بار حیدرآباد دکن تشریف لے گئے، تو وہاں کے مشہور شاعر جناب امجد صاحب حیدرآبادی سے ملنے اُن کے مکان پر گئے، امجد صاحب نے اس کے شکریہ میں یہ اشعار لکھ کر بھیجے،

کردوں شکر کس منہ سے تیرا خدایا — سلیمانِ اعظم میرے گھر میں آیا
از جلوۂ حسن خویش حیران کردی — کافر دل را مگر مسلمان کردی
بنواختی از قدم خود امجد را — این مور ضعیف را سلیمان کردی

وَالسَّلَامُ اِلیٰ یَوْمِ الْقِیَام،

پروفیسر محمود شیرانی مرحوم سے برابر علمی چشمک رہی لیکن اُن کی وفات پر بھی بہت ملول اور افسردہ ہوئے، اور اُن پر ایک مستقل مضمون معارف میں شائع کیا، اور اُن کے اوصاف کا ذکر ان الفاظ میں کیا،

"مرحوم نیک مزاج، کم آمیز، سادگی پسند اور خاموش طبع تھے، اُن کی طبیعت میں تلاش، محنت، تحقیق و تدقیق کا مادہ بدرجۂ اتم موجود تھا، .... مرحوم کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کی شاندار روایات کا بڑا اثر تھا، ...... حافظ قرآن تھے، یہ خود ایک بڑی نعمت ہے، اور وسیلۂ مغفرت"

وہ کسی کے متعلق بھی بُری رائے نہ رکھتے، اُن کا قول تھا کہ جب میں کسی سے ملتا ہوں تو اس کو اچھا ہی سمجھتا ہوں، اور اس وقت تک اچھا سمجھتا رہتا ہوں جب تک کہ وہ خود اپنے کو بُرا نہ ثابت کردے، اپنے ایک ندوی عزیز کو ایک مکتوب میں لکھا کہ

"محبت، اعتماد، اور مسامحت میرا دستور العمل ہے، چنانچہ اس وقت تک اس میں کامیابی ہوئی ہے، جس دن یہ بات نہیں رہے گی، میں نہیں ہوں گا" (مورخہ ۹ اپریل ۱۹۴۱ء)

اشتعال انگیزی | البتہ مذہب اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب کوئی اہل قلم گستاخانہ اور ناروا حملہ کرتا، تو اُن کے اشتعال اور رنج کی کوئی حد نہ ہوتی، اور اس کے جواب میں اُن کی جو تحریر نکلتی، وہ بہت ہی زہرناک ہوتی، ایسے موقع پر فرماتے کہ میرے قلم میں ایسا زہر بھی ہوتا ہے کہ سات سمندر کا پانی بھی اس کے زہریلے اثرات کو دور نہیں کر سکتا،

کشادہ دستی | دارالمصنفین میں اُن کی زندگی سو روپے ماہانہ وظیفہ سے شروع ہوئی جو ۳۰ سال کی خدمت کے بعد ۷۵ روپے سے زیادہ نہ بڑھ سکا، آبائی جائداد سے آخیر عمر میں فائدہ اٹھانے لگے تھے، اس سے ساٹھ ستر من غلہ سالانہ آجایا کرتا تھا، لیکن اسی محدود آمدنی میں اللہ تعالیٰ نے اتنی برکت عطا فرمائی تھی کہ بڑی صاف ستھری زندگی بسر کرتے تھے، ضرورت کا ہر سامان اُن کے پاس موجود تھا، متعلقین کو اچھا کھلاتے اور پہناتے، بعض اوقات معاشی تنگی تو ضرور محسوس ہوئی لیکن کبھی کسی قسم کی تکلیف اٹھانے کی نوبت نہیں آئی، اعزہ و اقربا کی امداد بھی کرتے

کی، مولانا محمد علی جوہر نے اس سلسلہ میں بعض ایسے مضامین لکھے اور بیانات دیئے جن سے سید صاحب کو اتفاق نہ تھا لیکن ان کا جواب دینے کے بجائے وہ خاموش رہے، اسی زمانہ میں وہ دہلی تشریف لے گئے، تو مولانا جوہر سے ملاقات ہوئی، سید صاحب نے اثنائے گفتگو میں اُن سے کہا کہ آپ چاہے جیسے بھی مضامین لکھیں یا بیانات دیں میں تو خاموش ہی رہوں گا، مولانا محمد علی کی حاضر جوابی تو مشہور ہے انھوں نے برجستہ کہا کہ یہ مضامین اور بیانات تو آپ کو خاموش کرنے ہی کے لئے شائع کئے جا رہے ہیں، اس حاضر جوابی سے سید صاحب خود بھی محظوظ ہوئے، اور کئی بار اپنی نجی صحبتوں میں اس کو دہرایا، لیکن اختلاف رائے کے باوجود مولانا محمد علی کے بے حد مداح اور بڑے گرویدہ تھے، اور جب اُن کے انتقال کی خبر ملی، تو دیر تک آبدیدہ رہے، اور نہایت اضطراب میں تحمل و سکون پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے، اور معارف میں اُن کا بڑا درد انگیز ماتم کیا جس کے بعض ٹکڑے یہ ہیں،

"افسوس! وہ پُر درد آواز جو ۱۹۱۱ء سے ۱۹۳۱ء تک ہندوستان اور دنیائے اسلام کے ہر گوشہ سے فریادِ ساز و صدائے صور بن کر بلند ہوتی رہی، ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی، وہ بیقرار دل جو مسلمانوں کی ہر مصیبت کے وقت بے تاب ہو جاتا تھا، اور دوسروں کو بیتاب کرتا تھا، دنیا کے تمام ستمگروں کے لئے ساکن ہو گیا، وہ اشکبار آنکھیں جو دین و ملت کے ماتم میں آنسوؤں کا دریا بہاتی تھیں، حسرت ان کی روشنی ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی، وہ متحرک لب جو ہر بزم میں شعلہ نوا بن کر چمکتے تھے، اُن کے ترانے اب ہمارے کان نہ سنیں گے، وہ آتشیں زبان جو ہر بزم میں شمع بن کر چمکتی تھی، اس کی تابش اب کسی معرکہ میں ہماری آنکھوں کو نظر نہ آئے گی، وہ پرجوش سینہ جو ہمت و صبر کے پہاڑوں کو سیلاب بن کر بہائے جاتا تھا، اس کا تلاطم ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ختم ہو گیا، وہ ہمہ تن زور دست و بازو جو شب و روز ملت کی خدمت گذاری اور معرکہ آرائی میں مصروف تھا، وہ اب ہمیشہ کے لئے پھر نہ اٹھیں گے، افسوس کہ شکست خوردہ فوج کا وہ آخری سپاہی جو اعداء کے نرغہ میں تنہا لڑ رہا تھا، آخر زخموں سے چور ہو کر گر گیا کہ پھر کھڑا نہ ہو گا، الوداع

امارت شرعیہ دس روپیے، انجمن تبلیغ الاسلام اسبالہ دس روپیے، انجمن تبلیغ صوبہ متحدہ چھ روپیے،
ان چندوں کے علاوہ وطن کی انجمن الاصلاح کو عے اور وہاں کی مسجد کو بھی عے رسالانہ مستقل دیتے تھے،
اس کے علاوہ عارضی چندے بھی دیتے رہتے تھے،

دارالمصنفین کی ۳۲ سال کی خدمت کے بعد جب بھوپال تشریف لے گئے تو ایک ہزار تنخواہ مقرر ہوئی، وہاں
تقریباً چار سال رہے لیکن اس زمانہ کی آمدنی کا بڑا حصہ بعض اعزہ کی شادی انجام دینے، متعلقین کی خاص خاص ضروریات
پوری کرنے اور اہل و عیال کے ساتھ سفر حج کرنے مین صرف ہوا،

استغنا و بے نیازی دارالمصنفین کے قیام کے زمانہ مین جب اُن کے فضل و کمال کا شہرہ ہوا تو مختلف جگہون سے
بڑی بڑی تنخواہون کی ملازمتین اُن کے سامنے پیش ہوئین، مگر انھون نے ہمیشہ اُن کے قبول کرنے سے انکار کیا، ۱۹۱۶ء
مین ڈاکٹر اقبال نے پنجاب یونیورسٹی مین ایک جگہ پیش کی، اس کو قبول کرنے سے بھی معذوری ظاہر کی، اس پر ڈاکٹر
اقبال نے ان کو لکھا کہ

"مجھے یہ معلوم تھا کہ آپ ملازمت کوئی قبول نہ کرین گے لیکن سنڈیکیٹ کے بعض ممبرون کی تعمیل
ارشاد مین آپ کو لکھنا ضروری تھا، کسی قدر خود غرضی کا شائبہ بھی میرے خط مین تھا، اور وہ یہ کہ مین
چاہتا تھا کہ جس طرح پنجاب والون کو صوبہ متحدہ کے علماء و فضلاء سے بیشتر فائدہ پہونچا ہے اب بھی
وہ سلسلہ آپ کے یہان رہنے سے بدستور جاری رہے......"

تقسیم ہند کے بعد پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات کی صدرنشینی جس کی تنخواہ ڈیڑھ ہزار ماہوار تھی پیش ہوئی،
اس کو بھی قبول نہ کیا، اور دوسرون کے لئے سفارش کر دی،

ایک بار مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے شعبۂ دینیات کی پروفیسری قبول کرنے کے لئے اصرار کیا گیا، تو فرمایا کہ پھر
دارالمصنفین کو کیا کرونگا، بعض ذمہ دار اشخاص نے تجویز کیا کہ یہ ادارہ بھی وہان منتقل کر دیا جائے، سید صاحب نے جواب
دیا کہ "پھر استاذ مرحوم کا مزار کس کے حوالہ کرونگا"

رہتے تھے، اُن کے ایک عزیز چار سو روپیے کے مقروض تھے، قرضدار کا بڑا سخت تقاضا تھا، انھون نے اپنی پریشانی کا حال سید صاحب کو لکھا، اُن کا خط پڑھ کر بہت متاثر ہوئے، اور حسب ذیل جواب دیا،

"آپ کا لفافہ ملا جس سے آپ کی پریشانیون کا حال معلوم ہوا، دل مضبوط رکھیے، اور خدا پر بھروسہ کیجئے...... اس مین امداد کے لئے مین حاضر ہون، چار سو قرض ہین، یہ قرض آپ مجھ پر سمجھین، مجھ سے جہان تک ہو سکے گا، اس کی صورت نکالون گا، اگر سو روپیے سال وہ لینا منظور کرین تو مین آسانی سے انشاء اللہ دے سکون گا، اور اگر وہ چار سو اسی وقت لینے پر مصر ہین، تو یہ بھی بفضل خدا ہو سکتا ہے، مگر اچھا ہو کہ اکتوبر کی تعطیل تک آپ مہلت لین، یہ اس لئے کہ ڈاک سے بھیجنے مین، لوگون کو معلوم ہو جائے گا، اور یہ کچھ اچھا نہین،

اور جب یہ قرض ادا ہو گیا تو وہ بے حد مسرور ہوئے، ایک بار ان کے ایک عزیز نے وطن کے قیام کے زمانہ مین اُن سے کچھ قرض لیا، اور ایک دوسرے صاحب کو لکھا کہ یہ رقم اُن کو ادا کر دی جائے، جب وہ دینے لگے تو فرمایا یہ رقم قرض کے خیال سے دی ہی نہین گئی تھی جس کی واپسی کا سوال ہو اور اس کے لینے سے انکار کر دیا،

ایک عزیزہ کی لڑکی کی شادی تھی، وہ خرچ کی کمی محسوس کر رہی تھین، سید صاحب کو معلوم ہوا تو چپکے سے دو سو روپیے اُن کے پاس بھجوا دیئے، شادی ہو جانے پر ان عزیزہ نے اپنے بعض اعزہ سے اس رقم کا ذکر کیا، صاحب بند کو معلوم ہوا تو اس سے اُن کو بڑی آزردگی ہوئی،

قومی چندے پابندی سے ادا کرتے رہے، ایک مکتوب مورخہ ۲ مئی ۱۹۳۰ء مین سید عبد الحکیم صاحب کو تحریر فرماتے ہین:-

"اب میرے سالانہ چندون کی فہرست سنیئے، جو سالانہ ادا ہوتے ہین، اور امسال ہو چکے ہین، بہ وظائف سالانہ ندوہ سو روپیے، مدرسہ سرائے میر دس روپیے، مدرسہ اسلامیہ اعظم گڈہ بارہ روپیے، انجمن امداد غربا اعظم گڈہ بارہ روپیے، ڈگینٹ ندوہ پانچ روپیے، ڈگینیت ایجوکیشنل کانفرنس پانچ روپیے،

مروجہ اسلامی نہ بنائے جائیں گے تنہا دستور سے کوئی مملکت اسلامی نہیں بن سکتی ہے، اور جب اُن کو مروجہ قوانین پر نظر ثانی کرنے کی اجازت ملی، تو عہدہ قبول فرمایا، لیکن اس کی مدت ایک سال سے کچھ ہی زیادہ رہی، اس سے پہلے سوا دو سال تک متوکلانہ زندگی بسر کی، اور معاشی صورت پیدا کرنے کے لئے بقول انہی کے اپنا پیشۂ قدیم کتب فروشی اختیار کیا اور اسی لئے مکتبۂ اشرق قائم کیا،

دارالمصنفین سے لگاؤ: دارالمصنفین کے لئے انھوں نے جیسی قربانیاں کیں اُن کی مثالیں اس زمانہ میں کم ملیں گی، اگرچہ حالات نے اُن کو آخر میں دارالمصنفین سے جدا کر دیا تھا لیکن اس کے ساتھ اُن کی قلبی وابستگی آخر دم تک قائم رہی، اس کی تشویش پر بے چین ہو جاتے، اور اس کے ازالہ کی تدبیریں بتاتے، اور اس کی فلاح و بہبود کیلئے مفید مشورے دیتے رہتے وہ ہندوستان ہی میں تھے کہ جون ۱۹۴۶ء میں بھوپال چلے گئے، دارالمصنفین سے ان کا ہٹنا کم اہم واقعہ نہ تھا، مگر بھوپال کے زمانۂ قیام میں وہ بدستور دارالمصنفین کے ناظم رہے، وقتاً فوقتاً اس کی دیکھ بھال کے لئے آتے، اور ہدایتیں بھیجتے رہتے جس سے اُن کی کمی محسوس نہ ہوتی لیکن وہاں کے قیام کے دوران میں شاہ معین الدین صاحب ندوی نے دارالمصنفین کے مستقبل کے بارہ میں اپنی کسی تشویش کا اظہار کیا تو اس کے جواب میں دسمبر ۱۹۴۸ء میں ارقام فرمایا:

"میں دور ہوں مگر حالات سے قیاس کرتا ہوں کہ دارالمصنفین کا مستقبل خطرہ سے خالی نہیں ہے، معلوم نہیں اس کو کیا پیش آئے، یہ ظاہر ہے کہ اس کی تباہی میری تباہی ہے، اور مجھے اس سے کتنا رنج ہوگا، آپ کا یہ کہنا کہ اگر آپ واپس نہیں آئے تو میرے لئے بھی کہیں فکر کیجئے، مناسب نہیں کیونکہ دیر سویر ایک ضعیف العمر کو اس خاکدانِ فنا کو چھوڑنا ہی ہے، اور آپ لوگوں کو بہرحال اس ادارہ کو چلانا ہے" [1] یہی عزم ہونا چاہئے [2]

وہ جب کراچی چلے گئے، تو وہاں سے اپنے شاگردوں کو تحریر فرمایا گیا کہ

"پہلے دارالمصنفین ایک شخص، مولانا شبلیؒ کی یادگار تھا، اب اس کو دو کی یادگار سمجھ کر زندہ رکھو"

پھر علیحدہ علیحدہ خطوط لکھ کر شاگردوں کو تلقین کی کہ

ایک بار علماء کے ایک اجتماع میں شرکت کے لئے پشاور تشریف لے گئے، نواب زادہ سر عبد القیوم نے تمام علماء کو اپنے یہاں مدعو کیا، اور دعوت کے بعد ہر ایک سے علیحدہ علیحدہ ملاقات کی، جب سید صاحب رخصت ہونے لگے، تو مصافحہ کرتے وقت سو روپیہ کا ایک نوٹ اُن کے ہاتھ میں دیدیا، مہمان نوازی کا یہ اخلاق سید صاحب کو پسند نہ آیا، لیکن مروت میں خاموش رہے، اور نوٹ واپس نہ کر سکے، مگر لکھنؤ آ کر یہ رقم دار العلوم ندوہ کو دیدی، اور اس کی باضابطہ رسید سر عبد القیوم کے پاس بھجوا دی،

۳۵ء میں ذات الجنب کے مرض میں مبتلا ہوئے، تو کئی مہینے تک علیل رہے، علاج میں آٹھ سو روپے کے مقروض ہو گئے، دار المصنفین کی طرف سے یہ تجویز پیش ہوئی کہ علاج کے سارے اخراجات ادارہ کی طرف سے دئے جائیں، لیکن انھوں نے اس کو گوارا نہ کیا، اور خود ہی قرض ادا کیا،

پاکستان ہجرت کی تو آبائی مکانات، شاندار بنگلہ، باغ، جائداد، گھر کا سارا سامان حضور نظام کا وظیفہ اور بھوپال کے پراویڈنٹ فنڈ کی رقم سب سے منھ موڑ لیا، اور مہاجرت کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے جولائی ۵۱ء میں اس راقم کو لکھا کہ مہاجرت کی شان بہت بلند ہے، مہاجر صحابہ کی قدر اب معلوم ہوتی ہے، نہرو لیاقت پیکٹ سے ہمارے مہاجروں کو بہت کچھ سہولتیں دی گئیں، اُن سے فائدہ اٹھانے کے لئے بار بار اُن کی خدمت میں گذارش کی گئی لیکن غایت استغناء میں ۱۰ اگست ۵۲ء کو تحریر فرمایا :

"ہندوستان چھوٹنے پر جائداد و مکان کی محبت دل سے نکل گئی اور بقولِ شاعر

جس نے آشیانہ چمن سے اٹھا لیا　　　اس کی بلا سے بوم رہے یا ہما رہے

سلوک کی وہ منزل جو تصوف کی راہ سے شاید برسوں میں طے ہو سکتی ہے، اس مہاجرت میں دم کے دم میں طے ہو گئی"

پاکستان پہونچے تو ادارۂ تعلیمات اسلام کی صدارت پیش کی گئی، اس عہدہ کی بڑی تنخواہ تھی، یہ ادارہ دستور سازی میں مدد دینے کے لئے قائم کیا گیا لیکن پورے دو سال تک اس کو یہ کہکر قبول کرنے سے انکار کرتے رہے کہ جب تک قوانین

سیرۃ السیدؒ کے کچھ نمونے اور سبق

از

جناب مولانا عبدالباری صاحب ندوی

حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ "سید سلیمان" نام کے ایک طالب علم کی حیثیت سے دارالعلوم (ندوہ) میں ۱۳۱۸ھ کے آخر (غالباً ذی الحجہ) میں داخل ہوئے، اور راقم ہذا دوسرے ہی سال ۱۹ھ کے شوال میں، اس طرح بچپن اور نوعمری کے ابتدائی سالوں کو چھوڑ کر اُن کی پوری زندگی کے ہر دور کو دور و نزدیک سے دیکھنے جاننے اور سمجھنے کے مواقع حاصل رہے، آخری دور۔ قیام پاکستان — میں بھی دو مہینے کے قریب بہت قریب سے چشم و گوش دونوں کو دید و شنید کی سعادت میسر رہی، ڈھائی ہفتے تو کراچی میں خود اُن کا مہمان رہا، ملتان میں خیر المدارس کے سالانہ جلسہ دستاربندی میں یک جائی کا شرف حاصل رہا، اور پانچ ہفتے کے لگ بھگ حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب مدظلہ[1] کی خدمت میں لاہور میں حاضری رہی، تو اس دوران میں کئی بار یونیورسٹی کی کمیٹی اور جامعہ اشرفیہ کے سالانہ اجتماع کے سلسلہ میں تشریف لائے، اور خواجہ تاشی کے رشتہ سے مستقل حضرت ممدوح کے وہ بھی مہمان ہوئے

ندوہ میں نہ صرف طالب علمانہ معیت و رفاقت رہی، بلکہ جب استاد مقرر ہوئے تو شاگردی کی دولت بھی ملی، استاذ مرحوم و محترم علامہ نعمانی کی مجالس میں سالہا سال اُن کے پیچھے صفِ نعال میں شریک رہا، سب سے طویل دور اُن کا دارالعلوم (ندوہ) اور دارالمصنفین کی معتمدی و نظامت کا رہا، اس کم و بیش چوتھائی صدی کے دوران میں دونوں

---

[1] حضرت مفتی صاحب مجدد تھانوی علیہ الرحمۃ کے اجل خلفاء میں ہیں، متعنا اللہ بطول بقائہ۔

"........ آپ اسکو (یعنی دارالمصنفین) کو اپنی زندگی کا کام بنائیں، ورنہ لاکھوں کا سرمایہ اور عمروں کا حاصل تباہ ہوجائے گا"

اور جب دارالمصنفین کے پرانے نظام میں تبدیلی ہوئی، اور جناب شاہ معین الدین صاحب ندوی کو شعبۂ علمی کی نظامت سپرد کی گئی تو بڑی مسرت واطمینان کا اظہار فرمایا، چنانچہ مارچ ۱۹۵۱ء کے ایک مکتوب میں اُن کو تحریر فرماتے ہیں:

"دارالمصنفین میں آپ لوگوں نے جو کچھ طے کیا، اس پر میں راضی اور درگاہِ الٰہی میں داعی ہوں کہ اس کو دارالمصنفین کے حق میں نافع فرمائے

سپردم بتو مایۂ خویش را   تو دانی حسابِ کم و بیش را

آپکے ہونے کو میں اپنا ہی ہونا سمجھتا ہوں اور مجھ کو آپ کی قائم مقامی سے ویسی ہی خوشی اور طمانیت ہے جو کسی روحانی اور جسمانی خلف الصدق کی جانشینی سے ہوسکتی ہے خدا کا شکر ہے کہ میں نے اپنی زندگی ہی میں اپنی موت کے بعد کا نقشہ دیکھ لیا، اب آپ سے جہاں تک ہوسکے دین وملت کی خدمت سمجھ کر اس کام کو انجام دیں اور ساتھ ہی اپنے رفقار کی تیاری میں مصروف رہیں تاکہ ایک چراغ سے دوسرا چراغ جلتا رہے، اور استاد مرحوم کا سلسلہ قائم رہے، الحمدللہ آپنے معارف اور شذرات کے معیار کو قائم رکھا، اور "س" اور "م" میں شاید ہی کسی کو فرق محسوس ہوتا ہو، وللہ الحمد"

خدا رحمت کند این عاشقانِ پاک طینت را

تفصیلات ذہن مین ڈھونڈھے نہین ملتین، زیادہ تر بس ایک معنوی، وہ بھی دھندلا سا خاکہ دماغ مین رہ جاتا ہے، خود سید صاحب مرحوم کا قلم دینیات مین جیسی تاریخ وار جزئیات کے ساتھ متوفی کی صورت فرمایا کرتا تھا، کسی مرتبہ پاکستان ہی مین بڑی حیرت سے مین نے پوچھا کہ حضرت یہ آپ کے حافظہ کی کرامت ہے، یا کوئی یادداشت روزنامچہ اس اہتمام سے ضبط فرماتے رہتے ہین، ؟ جواب مین اُن کا محبوب مسکرانا تو یاد ہے لیکن جواب کیا ملا، یا سرے سے کچھ ملا بھی؟ یہ بالکل یاد نہین آرہا،

ایسی صورت مین دوستون کے حکم پر معذرت و ندامت کے سوا پیش ہی کیا کرسکتا تھا، البتہ دارالمصنفین مین حضرت مرحوم کے مسند نشین برادر عالی قدر شاہ معین الدین سلمہ کو یہ جیتے جی مرحوم خدا جانے کیسے اتنا یاد آگیا کہ اُن کے حکم پر حکم کا تار نہین ٹوٹ رہا ہے، آخر جب یہان تک نوبت پہنچی کہ سید صاحب کی بارگاہ مین آپ کا مضمون نہایت ضروری ہے، خواہ اس کے انتظار مین پرچہ کی اشاعت مین تاخیر کرنا پڑے، تو ذہن پر دباؤ زیادہ پڑا، اور ان سطرون تک پہنچ ہون، والاتمام من اللہ،

سید صاحب کے علمی و عملی کمالات مین سب سے اونچا مقام اُن کی تصنیفی و قلمی یا ذہنی و دماغی خدمات کو حاصل ہے ذہن و ذہانت مین اُن کی طالب علمی کے متعدد رفیق[1] و معاصر شاید ان سے بڑھ چڑھ کر تھے، اور کہا جاتا تھا کہ اُن کے سامنے سید صاحب کا چراغ جلنا مشکل ہے، لیکن ہر وصف کا کمال اس کا نقطۂ اعتدال ہوتا ہے، شدید بھڑکتے ہوئے ذہنون کے علوم و انکار کو اکثر جھلس ہی جاتے دیکھا، ذہن کا کوئی متوازن تخلیقی کارنامہ ذہانت کی نرم و معتدل آنچ ہی چاہتا ہے، مرحوم کا سبق آموز ذہنی کمال اُن کا ذہنی توقد نہین توازن تھا، جیسا اُن کا ذہن اُن کے جسم کی طرح متانت ہی کی چال تھا، لیکن پڑتا ہر قدم مضبوط و ہموار زمین پر، بہت زیادہ ذہین، وذکی آدمی ہضم کم کرتے ہین البتہ ذہانت کے زور سے اُگلتے زیادہ اور جلد ہین،

سید صاحب کو طالب علمی ہی کے زمانہ سے پڑھنے اور کتب بینی کرنے اپنے ساتھیون کے مقابلہ مین زیادہ

---

[1] مثلاً سید ظہور احمد چشتی شاہجہان پوری،

اداروں کے گوناگوں معاملات سے باضابطہ و بے ضابطہ خاکسار کو بھی تعلق رہا۔ "سیرت سلیمان" کے جلی و خفی نمایاں اور بنیادی نقوش سب سے زیادہ اسی عہد میں ثبت ہوتے رہے، مکاتبت میں مرحوم زیادہ مستعد نہ تھے، پیش قدمی تو بلا ضرورت شاذ شاذ ہی فرماتے، جواب بھی بارہا ہفتوں میں مرحمت ہوتا، خود مجھکو اپنے قلبی تغیرات کی بنا پر حفاظت مکتوبات کا بھی ہمیشہ اور پورا اہتمام نہیں رہا، پھر بھی وفات کے بعد پرانے کاغذات جو الٹے تو "تسید المکاتیب" کا ذخیرہ بھی ڈھائی سو سے زیادہ ہی نکلا

نصف صدی سے بھی زیادہ روابط کے اس تسلسل اور تنوع کی بنا پر اس میں شک نہیں کہ "سیرت السید" کا بڑا کثیر مستند سرمایہ اس بے مایہ کے پاس ہونا چاہئے تھا، اسی توقع میں ہندوستان و پاکستان کے بعض ارباب رسائل کا حکم وہم ہوا کہ اُن کے رسالوں کی خصوصی اشاعتوں اور مستقل سیرت کی تالیف میں کوئی بڑا اور خاص حصہ لے سکتا ہوں،

لیکن اس حسن ظن کے بدلنے پر اُن کو کس طرح آمادہ کروں، اور کیونکر یقین دلاؤں کہ خود زندگی کے جس عالم سے گذر رہا، بلکہ جس پر زندگی ختم کر رہا ہوں، وہ بجھی ہوئی آگ کے ایک ڈھیر سے زیادہ نہیں خصوصاً جب سے اپنی نا سمجھی کی سمجھ میں یہ آگیا ہے کہ اسلامیت اور انسانیت کسی کا بھی بیڑا کاغذ کی ناؤ سے پار نہیں لگ سکتا، اور زبان و قلم کی رائج الوقت وبا سے ملک و ملت کے کاموں میں فلاح سے زیادہ فساد ہی کا مشاہدہ دن رات ہوتا رہتا ہے، اس وقت سے یقین فرمائیں کہ گو خود بھی اس وبا کے تعدیہ سے پوری طرح محفوظ نہیں تاہم مسلمان اور انسان دونوں کے دن پر دن بگاڑ کو بناؤ سے بدلنے کی تدبیر اس کے سوا نظر نہیں آتی کہ خود مسلمان جن پر ساری دنیا کی ہدایت و امامت کی ذمہ داری ہے، وہ زبان و قلم کم چلائیں، اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے چھوٹے بڑے شعبوں میں مسلمان بن بناکر زیادہ دکھلائیں، یہ حقیقت اس بذات خود سراپا ناکارہ کے لئے دن دوپہر کے سورج سے بھی بڑھکر اتنی روشن و یقین ہو چکی ہے کہ لکھنا بولنا یونہی کیا آتا ہے، رسمی مواقع پر اور بھی زبان گنگ اور قلم کند ہو جاتا ہے خصوصاً تکلف و آورد سے ایک سطر بھی لکھنا پہاڑ ہوتا ہے،

اس کے علاوہ واقعاتی و تاریخی حافظہ پیدائشی طور پر حصہ میں بہت کم پڑا اور اب تو ناپید ہونے کے برابر ہے، لفظی روایت کسی بات کی گھنٹہ بھر بعد بھی مشکل ہی سے کر سکتا ہوں کسی گذشتہ واقعہ و معاملہ کی جزئیات

گیا، نی کی ترغیب و تعریب سے کئی بار حضرت ممدوح سے ملے، اور ان کے "حال" سے کافی متاثر ہوئے،

میں نے مولانا کی وجودیت کو سمجھنے کے لئے سید صاحب کو قرآن مجید کی اُن آیات کی طرف خاص طور سے توجہ دلائی جن میں خلق و خلاقیت کو علم کے ساتھ غیر منفک طور پر وابستہ ٹھہرایا گیا ہے، مثلاً اَلَا یَعلمُ من خلق بلٰی وھو الخلاق العلیم وغیرہ، اور کچھ جدید فلسفیانہ و عقلی نظریات و رجحانات سے بھی اس کی تشریح کی، بڑی توجہ و دلچسپی سے سنا، پھر کچھ دن بعد فرمایا کہ بھائی ان آیات سے تم لوگوں کی وحدۃ الوجود تو ابھی سمجھ میں نہیں آتی لیکن تھا، ری گفتگو کے بعد سے علم و خلق کی وابستگی کی آیات پر غور کرتا رہا، اس میں شک نہیں ہے کہ دونوں کا ربط بہت غور و تدبر کے لائق ہے، (او کما قال)

حصول طالب علمی سے لے کر علمی شہرت و عظمت کے اوجِ کمال تک (شبلی ص ۱۰ و کتابوں دونوں سے کھلے دل و دماغ کے ساتھ خود استفادہ کا یہی کمال کہنا چاہیے کہ اُن کو زندگی بھر لفظاً و معنیً سچا "طالب علم" بنائے رہا، لوگوں کو عادت میں وہبی صلاحیتوں سے بہت زیادہ کسبی طور پر ان صلاحیتوں سے زیادہ سے زیادہ کام لینے کو دخل رہا، فطری ذہانت و ذکاوت، طباعی وجودت والے دنیا میں کم نہیں ہوتے، ندوہ میں سید صاحب سے پہلے اُن کے ساتھ اور بعد ایک سے ایک بڑھ کر ذہین و طباع داخل و فارغ ہوتے رہے، لیکن سید سلیمان ندوی ان میں سب سے آگے رہے، بڑا راز اس کا اُن کے کسبِ طلب کا کمال ہی تھا، اُن کی طالب علمانہ اور عالمانہ زندگی و سیرت کا یہ بڑا قیمتی سبق ہے،

علمی ذوق و شوق کی عام فضا ندوہ میں استاذِ محترم (علامہ نعمانیؒ) کے دور میں پیدا ہوئی لیکن سید صاحب جہاں تک دیکھا سنا، اس سے پہلے بھی کتاب کے کیڑے تھے، کھیل کود میں کوئی نمایاں شرکت تو قطعاً یاد نہیں آتی نہیں چول، اور سیر و تفریح کی زیادہ عادت بھی یہی رنگ طبیعت کا آخر تک رہا کہ خاص تعلق کے لوگوں تک بھی وہ بمشکل ہی پہنچ پاتے، گویا یکسوئی ان کا طبعی امر تھا، جو علم و عمل کی ہر راہ میں کسب کمال کی شرط ہے،

ہر طرح کی چیزیں پڑھتے اور ایسا معلوم ہوتا کہ خوب چبا چبا کر ہضم کرتے، طلسم ہوش ربا تک کو اس توجہ سے پڑھا تھا کہ چند وہ کے ایک وفد میں ساتھ تھا، یاد نہیں کیا صورت پیش آئی کہ کئی میل پیدل چلنا پڑا، غالباً کچھ پانی بھی برس رہا تھا، اس عالم میں وہ طلسم ہوش ربا اس طرح سناتے جا رہے تھے، جیسے کتاب پڑھ رہے ہوں راستہ تفریح کی سفر بن گیا، شاگردی کی سعادت کے بعد سے خدمت میں حاضری زیادہ ہونے لگی تھی، جب حاضر ہوتا، کچھ نہ کچھ پڑھتے لکھتے ہی پایا، آخر تک یہ رنگ دیکھا کہ کوئی معمولی اخبار و رسالہ یا کوئی گری پڑی کتاب بھی سامنے آگئی تو اسی وقت اٹھا کر دیکھنے لگتے، ذرا بھی کوئی بات دلچسپی کی پاتے تو ایسا معلوم ہوتا، کہ خالی وقت گذاری کے طور پر نہیں توجہ کے ساتھ پڑھ رہے ہیں۔

طبیعت اخاذ بہت تھی، ہر ادنیٰ و اعلیٰ کتاب و رسالہ اور ہر کہ و مہ کی باتوں سے مطلب کی بات اخذ کر لیتے، وہ حسب موقع کام میں لاتے، فوراً قابل قبول نہ نظر آتی، تو غور فرماتے پھر جب جتنا جز بھی کسی کی بات کا ان کا دل و دماغ قبول کرتا، تو قبول ہی نہیں، اعتراف بھی بڑی کشادہ دلی سے فرماتے، ایک آدھ مثال خود اپنے تجربہ کی یاد آگئی میں کہا کرتا ہوں کہ یقینی موت ہے یا زندگی؟ زندگی تو اتنی غیر یقینی کہ یقین پل بھر کا نہیں اور موت اتنی یقینی کہ بن آئے نہ رہے" تیاری یقینی چیز کے لئے زیادہ کرنی چاہئے، یا غیر یقینی کے لئے؟ فرمایا کہ یہ بات تمہاری ایسی جی کو لگ گئی کہ اس سے کام لیتا رہتا ہوں، حیدر آباد میں وجودی رنگ کے ایک بڑے صاحب حال و قال بزرگ حضرت مولانا محمد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے، شیخ اکبر کے مسلک پر مخلوقات کی توجیہ معلومات الٰہیہ کی تجلیات نمود و ظہور سے بڑے جوش و خروش سے فرماتے، نئے پرانے دونوں طبیعتوں کے اہل علم بہت متاثر ہوتے جن میں مولانا گیلانی اور ڈاکٹر میر ولی الدین جیسے مشہور و معروف اصحاب علم و قلم تک داخل ہیں، بلکہ دونوں ماشاء اللہ مجاز و خلیفہ ہیں علما و مشائخ فرمانے کے خصوصاً بڑے حریص تھے اور چھاپہ تمام تر آیات و احادیث ہی سے مارتے، سید صاحب کا میلان ایک تو ابتداء میں اہل حدیث کی طرف زیادہ رہا، دوسرے زیر تربیت اپنے مجددی مسلک کے بڑے بھائی کے رہا، اس لئے وجودیت کے نام ہی سے چوکنا ہوتے تاہم جب آخری مرتبہ حیدر آباد تشریف لے گئے، تو وہ بھی اپنی اخذ و استفادہ کی طلب عالمانہ صفت و سیرت کی بنا پر خاکسار اور مولانا

یہی حال دیکھا سنا، مولانا عبدالحمید فراہی رحمۃ اللہ علیہ جید عالم اور اپنے رنگ کے یگانہ مفسر ہی نہ تھے، بڑے صاحبِ تقویٰ و تقدس بزرگ تھے، اُن کے چھوٹے بھائی نے خود اپنی اور مولانا ممدوح کی اس "سستی" کی بڑی دلچسپ اور مزہ دار توضیح سنائی کہ ہم دونوں بھائیوں کے دو اصول ہیں، ایک کا یہ کہ جو کام کل ہو سکے، آج نہ کرو، اور دوسرے کا یہ کہ جو دوسرے سے ہو سکے، خود نہ کرو، مزاج کی سنجیدگی بھی کچھ نہ کچھ سست روی کا رنگ اختیار کر لیتی ہے، سید صاحب کی غیر معمولی سنجیدگی اُن کا بڑا نمایاں وصف تھا، جلد بازی سے کسی کام میں بھی ذہن و جسم کسی سے بھی کام لینا گویا جانتے ہی نہ تھے اسی کی برکت تھی کہ ندوہ میں اعمال کے ساتھ عقائد کی سستی کا جب ایک تیز سیلاب آیا، تو سید صاحب اپنی جگہ سے اس سیلاب کی طغیانی زد میں ہو کر بھی زیادہ نہ ہلے، راقم اس روشن خیالی میں اپنے کو اُن سے بہت آگے پاتا، نقل کی کوئی بات عقل کی کسوٹی پر پوری اترے بغیر مان لینا گویا بے عقلی جانتا تھا، پھر بھی سید صاحب کے علم و تقویٰ کا قائل تھا، اپنے شکوک و شبہات اُن ہی کے سامنے پیش کرتا، ایک ترجمہ چہرہ قدرت کے متعلق [illegible] اور ان کی تفہیم و توجیہ سے خوب تشفی ہو گئی، گو بعد میں شرح صدر [illegible] اللہ سے نصیب ہوا [illegible] ندوہ کے روشن خیال و عقل پرستی میں بھی نقل پر [illegible] کبھی نہیں ہوئے۔

نقد ہر سود رجیب زبان انداختہ" گر عقل و دیانت کی سستی و کمزوری سے [illegible] کوئی [illegible] ندوہ میں علم و تعلم کا ذوق و شوق [illegible] اس ذوق شوق کی [illegible] دینداری کے جذبہ سے اخلاقی مفاسد کا زور بھی کم ہوا، جن میں کچھ بھی صلاحیت ہوتی تقریر و تحریر، ادب و انشاء اور ان دونوں کے میدان میں اتر پڑتا، بعض غریب صلاحیت و عقل دونوں سے کورے کچھ نہیں تو کم از کم [illegible] لوگ پھولی نیز کرسی خرید کر دو زانو قلم کاغذ لے کر بیٹھ ضرور جاتے اور بوزنہ صفت نقالی ہی سے اپنی تشفی کرتے، دنیا جن تاریخ اور ادب کا تھا، دونوں کی صلاحیت و مناسبت سے قطعاً محروم ہونے کے باوجود کبھی نہ جا کر اپنی [illegible] غلطیاں خود میں بھی بوزنہ وار ہی دیکھا کرتا، عربی میں زبردستی مقرر بننے میں اتنی کامیابی حاصل کی کہ ایک دن استاد محترم (علامہ نعمانی) نے خود اپنے سامنے تقریر کرائی، اور پسند فرمائی، تقریر کا موضوع بھی عجیب

اعمال و اخلاق کے اعتبار سے ایک دینی درسگاہ کے شایانِ شان تو دارالعلوم (ندوہ) کا کوئی زمانہ نہیں کہا جا سکتا، لیکن سید صاحب کی طالب علمی کا زمانہ خصوصیت کیساتھ بڑا مسموم تھا، طلبہ کیا بعض اساتذہ تک کی اخلاقی حالت کچھ اچھی نہ تھی، طلبہ کا کمروں میں چھپ چھپ کر تاش کھیلنا، راتوں کو پھاٹک پھاند کر تھیٹر جانا معمولی باتیں تھیں، پھر رات دن ساتھ رہنے والے طالب علموں میں ایک کا حال دوسرے سے کب تک چھپتا ہے باین ہمہ سید صاحب کی اس زہریلے ماحول سے تاثر کی کوئی بات دیکھنا کیا سننا بھی قطعاً یاد نہیں، بس ایک ہی بات کی شہرت تھی کہ پیالہ اُن کو زیادہ پسند رہتا، مراد بکرے کا گوشت، اور گھی کے تار والا پیالہ ہے، جو اس زمانہ میں پانچ روپیہ ماہوار میں مستطیع، و غیر مستطیع سب ہی طالب علموں کو دو وقت ملتا تھا کسی کے پیالہ میں تار نہ ہوتا تو دستر خوان ہی پر صدائے احتجاج بلند ہوتی، نماز کی غیر حاضری پر منتظمین نے سب سے کارگر سزا اس عزیز پیالہ کا بند کر دینا ہی قرار دے رکھی تھی، اور مسجد بہتوں کو اس تار والے پیالہ کی کشش ہی پہنچاتی۔

ایک اور اصطلاح "پوستین" یعنی کاہل کی چلی ہوئی تھی، غالباً بہار سے درآمد کی ہوئی، اور بہاری طالب علموں ہی کی چلائی ہوئی۔ بے تکلف احباب غریب سید صاحب پر اس کو خوب چست کرتے، اُن کے پیالہ کی قربانی کا زیادہ زیادہ تر اسی کو خیال کیا جاتا۔ یہ چیز زندگی کی آخر عادتوں میں کم و بیش زندگی بھر اُن کی رفیق رہی، خطوں کا مہینوں جواب نہ دینا، کہیں جانے آنے یا سفر کا ارادہ کر کے بار بار پورا یا وقت پر پورا نہ ہونا، اکثر اسی طبعی خصوصیت کا مظہر ہوتا، "پوستینی" اور کتب بینی میں بھی کچھ طبعی مناسبت معلوم ہوتی ہے، جس کا تجربہ راقم "پوستین" کو خود اپنی آخر زندگی میں خصوصاً ہو رہا ہے، اپنے مذاق کی کتابیں وغیرہ تو صبح سے رات تک پڑھتا رہ سکتا ہوں، کتاب و مضمون کی صورت میں کچھ لکھتا بھی رہ سکتا ہوں لیکن عجیب بات ہے کہ خط کا ایک کارڈ بھی طبیعت پر جبر کر ہی کے لکھا جاتا ہے جگہ سے حرکت کرنا، اس کا تو یہ حال ہو گیا ہے کہ صبح یا شام مشی کی عادت کم و بیش چالیس سال سے جاری ہے وہ تو عادت ہی کی بدولت چلی جاتی ہے، باقی کسی سے ملنے یا کسی اور کام سے کہیں جانا ہوتا ہے تو دونوں ہفتوں نہ بار ہا مہینوں ٹالتا رہتا ہوں، اس ناکارہ کا تو ذکر ہی کیا، سید صاحب کی طرح بعض دوسرے اکابر علم و قلم کا بھی

اور خاص طور پر عام مجلس کے علاوہ اپنے مضامین کی اصلاح وغیرہ کے سلسلہ میں دوسرے اوقات میں بھی سب سے زیادہ حاضر ہونے والوں میں وہی تھے۔

ملک میں چھوٹی بڑی سیکڑوں دینی درسگاہوں کے ہوتے ندوہ نے ایک نیا دَارُالعُلُوم قائم کرکے دینی تعلیم و تربیت کے جن نئے مقاصد کا بیڑا اٹھایا تھا، ان میں سب سے نمایاں وقت کا ایک اہم دینی مطالبہ ایسے علماء کا پیدا کرنا تھا، جو عصری تقاضوں اور علوم و فنون سے آگاہ ہوں، اور ان کے مقابلہ میں دین کی علمی و عملی خدمت کا حق ادا کر سکیں، اس مقصد تعلیم خصوصاً جدید علوم و فنون کی تعلیم کے لئے جیسا سامان و سرمایہ درکار تھا، ندوہ کو کبھی میسر نہ آیا، بے سروسامانی کے دیکھتے اس نے طلبہ میں نفس مقصد کی روح پھونکنے میں جتنی کامیابی حاصل کی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ظاہری ساز و سامان بھی اگر کسی معتد بہ درجہ میں فراہم ہوتا، تو اسلامی نقطۂ نظر سے دینی ہی نہیں، دنیوی یا سیاسی و قومی قیادت کا مرکز ہندوستان کیا شاید سارے عالم اسلام کا آج ندوہ ہی ہوتا۔

پھر بھی بہت سے مقاصد پورے نہ ہونے کے باوجود روح سے چونکہ ذاتی شوق و شغف اور کوششوں سے بڑی حد تک ندوہ کے مقصد کو پورا کرنے کے لئے کیا اور جماعتی حیثیت سے ندوی قلم نے جدید طبقات میں جو اعتبار پیدا کیا اور کمیت و کیفیت دونوں طرح جو خدمات انجام دیں کسی دوسرے مدرسہ و ادارہ میں اس کی مثالیں شاذ و نادر افراد ہی تک ملتی ہیں، وہ بھی اعتراف کرنا چاہئے کہ ندوہ ہی کی آواز بازگشت ہے، دارالمصنفین جیسے ایک مستقل و مستند تصنیفی ادارہ اور تربیت گاہ کو ندویوں ہی نے وجود بخشا، اور کون نہیں جانتا کہ اس وجود کا آغاز و انجام سید صاحب ہی کی ذات تھی، محض کتب فروشی یا کتب سازی کے علاوہ اب خالص تحقیقی و تصنیفی ذوق یا اس کی تربیت و تعلیم کے جو کچھ بچے کھچے آثار رہ گئے ہوں، ان کو اسی ذات والا صفات کے باقیات صالحات میں شمار کرنا چاہئے۔

راقم سطور نے کسی کتاب کے دیباچہ یا مقدمہ میں مرحوم کے اس مرتبہ و مقام کے تذکرہ میں ان کو دارالمصنفین کا سیدالطائفہ[1] لکھا تھا، لیکن آج جب ماضی و مستقبل کی طرف نگاہ جاتی ہے، تو ان کی ہستی دارالمصنفین ہی نہیں ندوہ

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ آئندہ (۵)

و غریب — اب بالکل سمجھ میں نہیں آتا، کہ کیوں — میونسپلٹی اختیار کیا تھا، مگر صلاحیت کے خلاف زبردستی کے دن چل سکتی تھی، نہ مورخ بن سکا، نہ ادیب نہ مقرر، نہ عربی کا نہ اردو کا، طبیعت کو نسبتہً عقلیات سے کچھ لگاؤ پایا، وہ بھی زیادہ عقلیات جدیدہ سے، جس کی شدبد عربی رسائل خصوصاً المقتطف — سے شروع ہوئی، دین مذہب کا جوڑ عقلیات میں کلامیات سے زیادہ لگتا ہے، اور جب حضرت الفاروق اور القرآن کا مصنف تاریخ پسندوں کا آئیڈیل بنا، اسی طرح الکلام، اور علم الکلام کا مصنف اس عقل کے دیوانہ کا بن گیا تھا۔

ہمارے سید العلم کی قلمرو سے ماشاء اللہ کلامیات و عقلیات کی تعلیم بھی باہر نہ تھی، ضابطہ کا شاگرد تو نہیں بھی ان کا ہو چکا تھا کہ استاذ مقرر ہونے پر میری جماعت کا بھی ایک گھنٹہ ان سے متعلق تھا یا ادب کی کسی کتاب کا ساتھ ہی اس زمانہ میں جب وہ مدرسہ سے باہر مع اہل و عیال ایک چھوٹے سے مکان میں جو ندوہ مرکز دعوت و تبلیغ کے قریب ہے قیام فرما تھے، تو میری حاضریاں زیادہ ہونے لگی تھیں، ان حاضریوں میں کس نوع کا استفادہ ہوا کرتا تھا، یہ بالکل یاد نہیں، اپنی اس وقت کی طلب و ذوق کو دیکھتے قرین قیاس یہی ہے کہ کلامی و عقلی چیزوں میں ہی مستفید ہوتا ہوں گا،

ندوہ کی تاریخ کا یہی وہ دور ہے جس میں ایک طرف علامہ شبلی نعمانی جیسے صاحب علم و قلم کی تربیت میں ہونے والے علامہ سید سلیمان ندوی کے علم و قلم کے دھنی کیسے جوہر پروان چڑھ رہے تھے، اور دوسری طرف حرف شناس راقم ہذا کی نیاز مندیاں بھی اسی زمانہ سے سید صاحب کی خدمت میں بڑھیں،

اس عہد میں مرحوم سے متعلق دہرانے والا یہی سبق برابر ملتا رہا کہ ذہنی وہبی صلاحیتوں والے اور بھی ندوہ میں ان کے برابر کے یا بڑھے ہوئے موجود تھے لیکن کسب طلب، اخذ و استفادہ کی دھن اور لگن میں ان کا ہمسر کوئی معلوم نہیں، جب ان کے قیام گاہ کے چھوٹے سے بیرونی کمرہ میں حاضر ہوتا، فرش پر لیٹے بیٹھے کتاب یا قلم ہی سے مشغول پاتا، یا کبھی کبھی کسی بچہ کے ساتھ پدری شفقت کا حق ادا کرنے میں، شبلوی مجالس میں اور بھی بہت سے طلبہ و اساتذہ ہوتے تھے لیکن سید صاحب کا شاید ہی کسی مجبوری میں کوئی دن ناغہ جاتا ہوگا

اس کو نصیب ہوگا، جو اس کی رضا و جزا یا آخرت کی فوز و فلاح کے سوا نام و نمود مال و منال وغیرہ تمام ناپاکیوں سے پاک و صاف دل لے کر حاضر ہوگا، اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ۔

تصوف کے نام کو بہت سے اچھے خاصے اہل علم افراد و جماعتوں نے محض کسی خاص تعصب و توہم یا فرط جی غلطی و توہّب کی بنا پر اپنی چڑھ بنالی ہے، "ندویت" بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، حالانکہ تصوف کے اسم و عنوان کا مسمیٰ و مضمون قلب کو "قلب سلیم" بنانے یعنی اس کی صحت و سلامتی یا باطنی رذائل سے صفائی کے سوا کیا ہے، قلب کی اسی تصفیہ و تزکیہ سے تقویٰ کی زندگی اور اللہ تعالیٰ سے احسانی نسبت پیدا ہوجاتی ہے، جب تک قلب دنیا کی ہوا و ہوس کا بت خانہ بنا ہوا ہے، اس وقت تک سچ یہ ہے کہ کفر و شرک ہی نے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا، اخلاق و باطنی رذائل کفر و شرک ہی کے چھپے ہوئے شعبے ہوتے ہیں، آخر خود قرآن ہی نے "ھویٰ" کو بھی "الٰہ" یا معبود کہا ہے، مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ — تو ہوا پرستی کے ساتھ خدا پرستی کیسے جمع ہوسکتی ہے، اگر ریا و نفاق کا روزہ نماز، روزہ نماز نہیں تو تحریر و تقریر، تالیف و تصنیف کی نام نہاد دینی خدمات کی تہ میں بھی خدانخواستہ جاہ و جلال یا نفس و نفسانیت کے جذبات شریک ہوں، تو خدا و رسول کی راہ میں یہ شرک کے سوا کیا ہوگا؟

دین کے معروف و مسلّم خدمت گذاروں تک کو دیکھا جاتا ہے کہ جب ان کا قلم کسی مسئلہ و معاملہ میں ایک دوسرے کی تردید و تنقید پر چلتا ہے، تو شاید ہی کوئی قلم باہمی بغض و حسد میں تنقیص و تحقیر کی ذاتیات تک نہ اترتا ہو، بلکہ اس نمک مرچ کے بغیر قلم میں زور ہی نہیں آتا، حال ہی میں دیکھا کہ ایک دینی ہی جماعت کی کسی کتاب میں دوسری جماعت کی خدمات کا ذکر و اعتراف نہ تھا، اس پر قلم میدان میں آگیا، کیسی چھوٹی اور اوچھی باتیں دونوں طرف سے بہت سے نئے پرانے اہل قلم کو جاننے پہچاننے کا موقع ملتا رہا، مگر اس طرح کی نفس و نفسانیت کے مظاہروں سے پاک ایک مثال بھی ذہن میں نہیں، تھوڑی بہت اگر ہے تو انہی کی جنھوں نے ع

"ہیچ مرد کاملے پامال شو"

کی تھوڑی بہت ہمت پائی، ورنہ عام طور پر تو خالص دینی مقاصد کے نام پر رسالے نکالنے والوں، مضامین لکھنے والوں

اور ندویت کی پوری ۶۰ سالہ تحریک و تاریخ کی سید الطائفہ نظر آتی ہے، ماضی میں تو ظاہر ہے کہ "ندویت" کے نام وکام میں اس مقام تک رسائی کسی نے نہیں پائی، مستقبل میں بھی امید بخش آثار و علائم نہیں، زبان خلق کا "یہ خدائی نقارہ" بھی معلوم ہوتا ہے کہ مطلق "علامہ ندوی" یا "مولانا ندوی" سے "ندویت" کا یہ فرد فرید "سید الطائفہ" مراد و مفہوم ہوتا رہے گا، بظاہر آیندہ ندوہ میں "سلیمان" کے نقش ثانی کے ابھرنے کی توقع نہیں، والغیب عند اللہ

اسلام کی علمی و قلمی خدمات کا سب سے عظیم الشان و عالی مقام کارنامہ سید صاحب کا بالکل بجا طور پر سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قرار دیا جاتا ہے لیکن حضور کی سیرت کی خدمت (حضور کے دشمنوں نے بزعم خود بڑی سے بڑی داد تحقیق دی ہے) تو ان دشمنوں کو جانے دیجئے، دوستوں یا مسلمانوں کے متعلق سوال ہے کہ دین کی کوئی چھوٹی بڑی خدمت اگر دل کے اخلاص اور ایمان کے قلبی داعیات و محرکات کے ساتھ انجام نہ دی گئی ہو، تو اسلام کے ترازو میں اس کا کیا وزن ہوگا؟ وہاں تو ہر چھوٹے بڑے عمل کی قیمت اسی حساب سے لگے گی جس حساب سے وہ شرک و ریا و نفاق، مال و دولت، جاہ و شہرت کی گندگیوں اور آلایشوں سے پاک دل و دماغ سے کیا گیا ہو؟ خود اسلام کی کتاب نے حصر کے ساتھ اسی کا تو مطالبہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول صرف

(بقیہ حاشیہ گذشتہ) لے سعیدیہ یاد آگیا، دار المصنفین کی کسی صحبت میں "سید الطائفہ" کے جوڑ پر مولانا مسعود علی صاحب کے لئے "شیخ الطائفہ" کا خطاب تجویز ہوا تو قدرۃً ایک تیسرے رکن رکین کے لئے اس وزن کی فکر ہوئی، مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا "مطلق طائفہ"!

لے مولانا علی میاں سلمہ کی غیر معمولی شخصیت کی بدولت دار العلوم (ندوہ) ان کے خاص رنگ و حال کے ایک دار المبلغین میں تبدیل ہو رہا ہے، اور تبلیغ کی خدمت بجائے خود دین کی ساری علمی و عملی خدمات کا مرکزی مقصد ہی نہیں بلکہ حضرات انبیاء کی بعثت کا واحد مقصد ہے، اور ندوہ کے خاص مقصد کے لئے اگر ایک ادارہ کی ضرورت ہو تو اس کے لئے کی، تاہم اگر ندوہ کی خصوصی تحریک بھی وقت کی کوئی قابل بیان دینی خدمت تھی یا ہے، تو دونوں ایک ہی مرکز میں مخلوط کر دینے سے طلبہ و اساتذہ سب میں ایک ذہنی خلط و انتشار زیادہ مشاہدہ میں آ رہا ہے والعلم عند اللہ

نظر اشرف "صرف تھانہ بھون" میں نظر آئی، اور آخر اپنے اسی مرض "خیر خواہی"[1] سے مضطر ہو کر دھیرے دھیرے ادھر متوجہ کرنا شروع ہی کر دیا، ابتداءً غالباً تھانہ بھون ہی کی کسی حاضری کے دوران میں ہوئی، ذہن میں یہ تقاضا قلب میں تیز ہو گیا تھا کہ ہمارے جیسے بے علموں سے زیادہ، اور بہت زیادہ یہ آستانہ سید صاحب جیسے اکابر علم و قلم کے استفادہ کا ہے کہ ان کے افادات کا سونا یہاں کی ایک آنچ میں انشاء اللہ کندن ہو جائے گا، الحمد للہ ایسا ہی ہوا،

بہتوں کو حیرانی رہی کہ مرحوم نے ایک ہی جست میں "ندوہ" سے "دیوبند" تک کا فاصلہ کیسے طے فرمایا، راز سمجھنے والے نے اور سبق لینے کا ہے، سید صاحب ماشاء اللہ صوفی پیدا ہی ہوئے تھے، خدا رسی سے مانع، کفر کے بعد بلکہ کفر کا بھی جڑ کبر ہے، ابلیس کو یہیں یاد دلایا گیا ہے ... مستکبر و کان من الکافرین، خصوصاً جو کبر علم سے بڑھ کر قلم کے زعم سے پیدا ہوتا ہے، اس کے حجاب اکبر کی مثالیں ایسی ایسی خود مشاہدہ میں آئیں کہ بس اللہ اپنے علم و قلم سے پناہ میں رکھے، اسی سے سمجھ میں آتا ہے کہ حضرات صوفیہ کے یہاں اس شیطانی خودی و خودرائی کے مٹانے پر اتنا زور کیوں ہے، حضرت حکیم الامت بھی فرمایا کرتے تھے کہ اس راہ کا حاصل بس خود کو مٹا دینا ہے، خدا و بندہ کے درمیان سب سے بڑا حجاب "خودی" ہے۔

ع تو خود حجاب خودی حافظ از میان برخیز

مرحوم معصوم نہ تھے لیکن ان کی زندگی کا جو نقشہ طالب علمی سے لے کر آخر تک کم و بیش ہر نوع کے سابقہ میں سب سے زیادہ معصوم نظر آیا وہ یہی کہ خود نمائی و خود پسندی دور دور نظر نہیں آئی، طالب علمی میں ان کا شمار رہتا اور آگے چل کر ممتاز ترین طلبہ میں رہا لیکن تحریر و تقریر و درس کے مقابلوں میں کیا تھا کبھی کسی برتاؤ میں کوئی امتیاز ظاہر نہ ہوتا، عام طور پر دوسرے طلبہ ہم چشموں میں کچھ بھی امتیاز رکھتے تو اس کے دبا نہ سکتے، چند دنوں میں بارہا سابقہ ہوا رہا، خود سید صاحب ہی ہوتے، مگر یاد نہیں کہ کسی موقع پر کسی طور و طریق سے بھی دوسرے رفقا پر اپنا امتیاز ظاہر ہونے دیتے،

---

[1] ظاہر ہے کہ اس سراپا مریض میں اس مرض کی تشخیص بھی حضرت علیہ الرحمۃ ہی کی تھی،

اور کتابیں تصنیف کرنے والوں کے دل میں تو یہ سوال بھی شاید پیدا ہوتا ہوگا کہ کسی خدمت و عمل کے دینی یا مقبول ہونے کی پہلی شرط مقصد و ارادہ یا قلب و نیت کی سلامتی و صحت ہے، صحیح نیت کے بغیر دین کی نگاہ میں کسی عمل کا اعتبار نہ درجہ نہیں "اِنَّمَا الاَعمَالُ بِالنِّیات" بخاری شریف کی پہلی حدیث ہے۔

قلم والوں کا بڑا دعویٰ اپنے علم و فہم کا ہوتا ہے لیکن دین کی فہم بھی تقویٰ ہی سے پیدا ہوتی ہے، اور تقویٰ کا سرچشمہ قلب ہی ہے، حضور نے قلب ہی کی طرف اشارہ فرما کر کئی بار اصرار کے ساتھ فرمایا کہ تقویٰ یہاں ہے تقویٰ یہاں ہے، اَلتَّقویٰ ھٰھُنا اَلتَّقویٰ ھٰھُنا، خود قرآن مجید نے اپنے سے ہدایت پانے کی (کہ وہی صحیح فہم قرآن ہے) شرط پہلے قدم ہی پر جو لگائی وہ نہ قلم کا مرد میدان ہونا، نہ کتابوں کا حافظ ہونا، بلکہ متقی ہونا ھُدًی لِّلْمُتَّقِین۔

ایک طرف اپنے علم و نظر کی حد تک ایک "اتقی" [illegible] کے علم و عمل، فہم و فراست کو سالہا سال دیکھ کر یہ حقیقت دل میں بیٹھ چکی تھی کہ دین خالی کتاب و قلم سے ہرگز نہیں پیدا ہوتا، نہ علم میں نہ عمل میں، دوسری طرف اس مرض کا شدید مریض ہوں کہ کسی شے یا شخص کی کوئی خرابی و خامی چھوٹی ہو یا بڑی دیکھی نہیں جاتی، راستے میں اگر کوئی نل کھلا اور پانی ضائع ہوتا دیکھتا ہوں، تو جب تک اس کو بند نہ کر دوں، قدم آگے بڑھایا نہیں جاتا، تو پھر گھر باہر، عزیزوں دوستوں، ملنے جلنے والوں میں دین و دنیا کی کوئی کمی و کوتاہی دیکھ کر کیسے رہا جا سکتا ہے، خود علم و عمل، ظاہر و باطن ہر طرح کے نقائص و مآثم کا مجسمہ ہوں، اور اُن کی دینی و دنیوی مضرتوں کو دن رات محسوس کرتا رہتا ہوں، اس لئے اور بھی ہمدردی کا احساس تیز ہو گیا ہے، بالکل جس طرح دمہ کا کم و بیش چالیس سال سے مریض ہوں، اور اس کی تکلیف میں راستہ چلتے بھی کسی کو مبتلا دیکھ لیتا ہوں تو یہاں تک ہوا کہ گھر لوٹ آیا اور عارضی افاقہ کی جو مشہور مجرب دوا ہمیشہ پاس رہتی ہیں، لے جا کر پہلے کھلا دیا، جب چین پڑا۔

اپنا یہ مرض اس لئے عرض کر دینے کی ضرورت پڑی کہ سید صاحب کے علمی و قلمی کمالات ہی نہیں، بہت سے نظر کے وہبی اخلاقی و قلبی فضائل کا زندگی کے مختلف حالات و معاملات میں جو تجربہ سالہا سال ہوتا رہا تھا، اُن میں بس ایک ہی آنچ کی کسر نظر آتی کہ کسی مردِ کامل صاحبِ نظر تک پہنچ جائیں، ایسے صاحب علم و فضل کے لئے

تو بے تاب ہو کر قدموں میں گر جانے کا جی چاہتا تھا، غالباً دارالمصنفین ہی کے کسی معاملہ میں میری نسبت کچھ غلط فہمیاں اُن کو پیدا ہو گئیں، اُن سے ایسا متاثر ہوئے کہ خود مدعیٰ علیہ کو صفائی کا موقع دیئے بغیر ایک بڑا طویل شکایات نامہ تحریر فرما دیا، ذرا تاثر کے بعد نظر ثانی پر واللہ اعلم کیا محسوس فرمایا، اور کتنے بے قرار ہوئے کہ میرے جواب کا انتظار بھی نہ فرما سکے، معذرت نامہ نہیں اُن کی اخلاقی کرامت کا یہ سراپا دوسرا "کرامت نامہ" ہے،

"پرسوں ترسوں میں نے آپ کو ایک طویل خط لکھا تھا، مقصود یہ تھا کہ مدت سے میرے دل پر ایک بوجھ تھا، وہ ہلکا ہو جائے، مگر دیکھتا ہوں کہ اس خط کے لکھنے کے بعد دوسرے قسم کا بوجھ بڑھ گیا، میں نے رات اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ میرے دل میں کسی مسلمان کی طرف سے غبار نہ پیدا ہو، بایں وجہ جو کچھ میں نے لکھا تھا، اس کو ایک راز سربستہ کی طرح دفن فرما دیجئے، اور مجھے معاف کیجئے کہ میں گو اپنے جانتے صرف اخلاص سے آیندہ کے لئے حسن معاونت کی خاطر لکھا تھا، مگر میرا دل مجھے ملامت کرتا ہے کہ مجھ سے آخر صبر نہ ہو سکا، اب اس کی تلافی یہی ہے کہ آپ مجھے معاف کر دیں، اور میری اس تحریر کو بھی میرے گذشتہ اعمالِ بد کا ایک جزو ہی سمجھیں، اس وقت مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں، اس وقت کا احساس یہی ہے، کوشش کروں گا، اور اللہ تعالیٰ سے دعا کروں گا کہ میرا یہی احساس قائم رہے"

اس "مجرمانہ اعترافِ گناہ" کے بعد بھی "سید القلوب" کو چین نہ آیا، آگے فرماتے ہیں کہ

"میں بے چینی سے آپ کے لطف آمیز و محبت آمیز خط کا انتظار کروں گا، آپ کا یہ بڑا بھائی کم ہمت ہے، اپنی کم ہمتی سے ایسا کر گزرا ہے، اور شاید عمر میں اس کا پہلا قصور ہے، آپ کا بڑا احسان ہوگا، اگر آپ اس تحریر کو نسیاً منسیا سمجھیں، ......آپ کا مجھ پر بڑا کرم ہوگا"

اب یاد کیا آسکتا ہے کہ اس سراپا کرامت "کرامت نامہ" کا جواب کیا عرض کیا، مگر اپنے نفس کو ٹٹولتا ہوں تو اسی ناکارہ کو تاہی سے خیال یہی ہوتا ہے کہ بہت زور لگانے اور تکلف و تصنع سے کام لینے پر بھی جواب میں اُن کی

طالب علم سے جب استاد ہوئے تو خود اپنا ایک ایسا تجربہ سناتا ہوں کہ آج بھی اس کی شرم سے گڑ جاتا ہوں ایک سبق میری جماعت کا بھی اُن سے متعلق ہوا، اب میرا شمار بھی کچھ اچھے طلبہ میں تھا، غالباً اسی کا غرور تھا کہ سبق میں جانا چھوڑ دیا کہ کل تک جس سے طالب علمانہ ہمسری کا دعویٰ تھا آج اس کی استادانہ برتری کیسے قبول کرلوں، سید صاحب اس کم ظرفی کے جواب میں ضابطے سے کام لیتے تو سزا دلوا سکتے تھے، سرکشی سوار رہتا تو مدرسے نکلوا دیتے مگر اُن کی عالی ظرفی نے اس سب کے بجائے کس طرح کہوں کہ کیا کیا، نئے استاد نہیں پرانے طالب علم بھائی بن کر اُلٹے خود ہی سمجھا بجھا کر کسی طرح منا لیا، مرحوم کی شفقت و محبت کا یہ پہلا بیج تھا، جو دل میں پڑا، پھر آخر تک بحمداللہ پھلتا پھولتا ہی رہا، وحسن ... میں اُن ہی کی بے نفسی کو زیادہ دخل رہا،

آگے چل کر دارالمصنفین اور دارالعلوم ندوہ کے جب تک وہ ناظم و معتمد رہے، اور میری رکنیت یا ضابطہ کا کچھ تعلق رہا، ایک واقعہ بھی خیال میں نہیں کہ اپنے مزاج و مذاق کے خلاف بات کو بھی پوری توجہ سے سنا اور سمجھ میں آتے ہی بے تامل قبول نہ فرما لیا ہو، حالانکہ بعض دوسرے حضرات جو ہر طرح مرحوم کے خورد نہیں [illegible] عمر میں بہت کم، اُن کے مقابلہ میں کوئی بات میری مان لینا چاہتے، تو دیکھا کہ کبھی کبھی میرے ساتھ اُن کو بھی بگڑتے اور بگڑ کر جواب دیتے بعض بڑے ساتھی اور بہت کم عمر دوستوں بلکہ کبھی کے شاگردوں تک کا یہ تجربہ ہوا کہ تعالیٰ نے اُن کو کوئی علمی و قلمی یا جماعتی و تحریکی بڑائی عطا فرما دی، تو اپنی رائے و رنگ کے خلاف بات کا قبول کرنا کیا سننا بھی توجہ سے گوارا نہیں کرتے،

جواب جاہلان باشد خموشی

کا زبان حال سے اعلان کرتے ہیں، باقی اپنی کسی رائے سے خوشدلی سے رجوع کرتے، یا کسی کوتاہی کا برملا اعتراف واعتذار اس کا تجربہ تو آج کے مشاہیر علم و قلم سے شاذ ہی ہوتا ہے،

لیکن سید صاحب کی روح ایسے مواقع پر کیسی بے چین ہو جاتی تھی، اس زیر تحریر مضمون ہی کے لئے ایک کچھ پرانے محفوظ خطوط دیکھنے لگا، اُن میں ایک ایسا معذرت نامہ ملا کہ آج اُن کی روح عالم آب و گل میں [illegible]

"میں آپ کا ممنون ہوں کہ مجھے برو قت صلاح نیک دیتے رہے، آخر وہ وقت آیا کہ دس بارہ برس سے جو چیز نظری طور سے سمجھ میں نہ آتی تھی، وہ عملاً سمجھ میں آگئی، اور اب تلافی مافات میں مصروف ہوں، لعل اللہ یرزقنی صالحاً"

اس دوراز صلاح کی "صلاح نیک" کا تعلق زیادہ تر عملی قدم اٹھانے ہی کی طرف ملتفت کرنے سے رہا تھا، بھون کے دوران حاضری میں قدرۃً اس کا خیال زیادہ ہوتا، جولائی و اگست ۳۳ء کی حاضری میں کچھ طویل قیام کی سعادت حاصل تھی، تو ذرا کھل کر اور اصرار سے لکھا کہ بس اب میری اس حاضری کے زمانہ میں ہمت فرما کر آہی جائیں، اصرار کی وجہ خصوصیت کے ساتھ یہ تھی کہ حضرت علیہ الرحمۃ کا سلسلۂ علالت طول پکڑتا جا رہا تھا، ڈر تھا کہ کہیں یہ آفتاب ارشاد و تربیت لب بام ہو، مقامی ڈاکٹروں کے علاج اور معالجوں سے کوئی نمایاں نفع نہ ہو رہا تھا، بالآخر علاج کی غرض سے لکھنؤ آنا طے پایا، ۱۰ اگست کو تھانہ بھون سے روانہ ہو کر رات کو سہارنپور میں قیام فرمایا، اور دوسرے دن لکھنؤ تشریف فرما ہو گئے، زندگی میں پہلی اور آخری دفعہ ریل کے ایک ہی ڈبہ بلکہ ایک ہی بنچ پر معیت سفر کی سعادت بھی نصیب ہو گئی، آداب نو کے کتنے اور کیسے سبق ملے!

سید صاحب کی خدمت میں اس دفعہ میرا عریضہ خاص طور پر تفصیل و اصرار کا ضرور تھا، پھر بھی قبول کی امید کم تھی، لیکن قلوب جس کے ہاتھ میں ہیں، اس کو بیٹھے کیا دیر لگتی ہے، تھانہ بھون پہونچ ہی گئے، البتہ ایک دن بعد، ذوق طلب کو کچھ اور تیز ہونا تھا،

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک   آتش عشق تیز تر گردد

میرے عریضہ کا جواب بھی تھانہ بھون ہوتا ہوا لکھنؤ میں ملا کہ

"لفافہ ملا۔ میں آپ کے حرف حرف سے متفق ہوں، کل صبح، انشاء اللہ علی گڑھ کے لئے روانہ ہوتا ہوں، خوشی ہوئی کہ آپ ۲۵ اگست تک وہاں (تھانہ بھون) میں رہیں گے، میں انشاء اللہ شاہدرہ لائن ریلوے سے ۱۱ اگست کی شام کو پہنچتا ہوں، دو روز ٹھہرونگا اور بقدر ظرف فائدہ

"بے نفسی" کا مقابلہ ہرگز نہ ہوسکا ہوگا، اپنی نالائقیوں اور کوتاہیوں کی معافیاں اُن سے اور دوسروں سے مانگنے کی توفیق، الحمدللہ بارہا ملی، اور ملتی رہتی ہی لیکن شکستگی اور فروتنی کے اس بلند مقام تک رسائی چھوٹوں کیا کسی بڑے کے مقابلہ میں بھی یا دنہیں سن و سال، علم و فضل، جاہ و مرتبت ہر لحاظ سے بڑے سے بڑے اور استاذ تک ہو کر اپنے "کم ہمت بڑا بھائی" ہونے کا جس طرح اظہار فرمایا ہے، ذرا کوئی چھوٹا سے چھوٹا بھی یہ ہمت کر کے دیکھے، تو حضرت مرحوم کی قدر و کرامت معلوم ہو۔!

سید صاحب کی "بے نفسی" کا بھی وہ فطری جوہر تھا جس نے اس راقم "بے بساط" جیسے کی توجہ دلانے پر علم و فضل کی ساری "ندوی" شہرت و عظمت کو ایک "خانقاہ نشین دیوبندی کے قدموں پر بے تکلف نثار کر دیا، کچھ غیبی کشش پہلے سے بھی تھی جس کا ایک والا نامہ میں اس طرح اظہار فرمایا کہ

"مولانا گیلانی نے مجھے لکھا کہ شاہ آپ نے بھی ایک دیوبندی کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا، ذرا میں لکھنے والا تھا کہ ہاتھ تو اب کسی کو دیا ہو یا نہ دیا ہو مگر دل تو اس کو دس بارہ برس پہلے دے چکا تھا پھر مجھے فخر یہ ہے کہ آپ لوگوں نے مولانا تھانوی کو اپنی طرف کھینچا، اور مجھے خود مولانا تھانوی نے بار بار اپنی طرف کھینچا۔ (معالم دریا)"

اس بیعت وارادت کی خود حکیم الامت کو اُن کو ذی علم بیعت تھی نہ میں نے کبھی "اصلاح نیک" کے سلسلہ میں اس کی طرف کوئی اشارہ کیا، اشارہ و تصریح دو ہی باتوں کی بار بار کرتا رہا، ایک تو یہ کہ "فہم دین" بھی محض کتابی تعلیم و تعلم سے پیدا نہیں ہوتی، دوسرے یہ کہ بظاہر بڑی سے بڑی خدمتِ دین کا بھی صحیح معنی میں "خدمتِ دین" یا عنداللہ مقبول ہونا قلب و نیت کی سلامتی کے بغیر مشتبہ ہی رہتا ہے، اور تزکیہ باطن کی یہ دولت کسی "مزکّی" کی صحبت و تربیت کے بغیر میسر آنا الشاذ کالمعدوم ہے۔

سید صاحب ماشاءاللہ علمی و نظری طور پر اس حقیقت کی تصریح و تفصیل کے محتاج نہ تھے، منقولہ بالا والا نامہ ہی میں ہے کہ

"برادر مکرم! میری عمر اب ساٹھ کے قریب آگئی ہیں دنیا کو نہ چھوڑوں، دنیا خود مجھے چھوڑ رہی ہے، اب نہ دار المصنفین سے زیادہ دلچسپی ہے نہ ندوہ سے اور نہ علمی مقالات وتصانیف سے چونکہ میری روزی قلم سے وابستہ ہے، اور گھر میں اثاثہ بھی نہیں، اس لئے ناچار پڑا پھرتا ہوں خدا تعالیٰ ہمت دے کہ ترک تعلق کر سکوں، آپ بھی میرے لئے دعا فرمائیں۔"

دار المصنفین میں میں تو فکر لوگوں کو اب غالی مصنف بنانے کی ہیں، احقر کی اس بارے میں ایک درخواست کے جواب میں رقم ہوکہ

"میں پوری کوشش کر رہا ہوں کہ رفقا میں وہ فضا پیدا ہو جس کی تمنا آپ کو ہے، گو غم ہوتا ہے کہ مجھی میں کیا ہے جو دوسروں پر اثر ہو۔ حضرت کی باتیں ان کو سناتا ہوں، اور ان کی تصنیفات کی طرف متوجہ کرتا رہتا ہوں۔"

ہر بہانہ سے حضرت علیہ الرحمۃ کی کتابوں کی طرف رفقاء کو مائل فرمانا چاہتے ہیں، ایک ذرا آزاد مزاج رفیق قدیم کا ذوق حضرت کی ادبیت کا ذائقہ چکھا کر اس طرح بدلنا چاہتے ہیں کہ اب وہ ادبیت کی تلاش میں ان حضرت کی تصنیفات پڑھنے لگے، وہ ممکن نہیں کہ بیر بالواسطہ مطالعہ اُن کے دل کے اندر گھر نہ کر جائے کیسے دردِ دل کی آواز ہے!

"برادرم! بصمیم قلب سے دعا کیجئے کہ دار المصنفین کی یہ چھوٹی سی برادری صراطِ مستقیم کو پاکر صحیح قائم رہے، تم لوگوں کی عمر بھر کی محنت ہمارے لئے وبالِ آخرت بننے کے بجائے باعثِ برکات وخیرات ہو۔"

یہ چھوٹی سی برادری حضرت مرحوم کی پوری وفاداری کا حق جب ہی ادا کر سکتی ہے کہ ان کی سب سے بڑی زندہ یادگار دار المصنفین میں ایمان واخلاص کی وہی روح اپنے تمام نجی تعلقات، درد دل کی صدائیں پیدا کرے جس کے خود حضرت مرحوم آخر تک جو بھی تیام میں ساعی ذہنی تھے، قلب و باطن کی صلاح و سلامتی کی روح کے بغیر جب خالص علمی اعمال تک جو دماں، ریا ونفاق وغیرہ سے آلودہ ہو کر خالص دنیا طلبی سے زیادہ ناپاک ہو جاتے ہیں، تو پھر علم و قلم کی ندہر اس سے تلی خدمات بھی اس روح کے بغیر محض دین کی چھاپ لگا دینے سے وبالِ آخرت کے سوا کیا بن سکتی ہیں،

اٹھاؤں گا۔"

تھانہ بھون میں "مطلوب" کو نہ پاکر سیدھے لکھنؤ کی راہ لی، ایک ہی آنچ کی تو کسر تھی، چار ہی دن میں رُخ پلٹ گیا، واپسی پر تحریر فرمایا کہ

"لکھنؤ میں چار ہی روز صحبت رہی، مگر مولانا کی شفقت میری عقیدت کو بڑھاتی رہی، اور آخر اُن کی ہدایت کے بموجب، اور آپ کا مشورہ تو پہلے سے یہی تھا، باب مکاتبت وا ہے، اور اب تو وہی وہ ہیں،

ع آتے ہیں نگاہوں میں خیالوں میں دلوں میں

معاینہ سے بڑھ کر تصور میں مکالمہ تک نوبت آتی ہے،

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

"بہرحال اب اپنی طرف سے سفر شروع کر دیا ہے، منزل پر پہنچانا جس کا کام ہے وہ پہنچائے گا دعا کیجئے......"

مولانا کے مواعظ اور رسائل پڑھتا ہوں، اکثر علمی مسائل بھی اپنے ہی مذاق کے مطابق پائے، اور احوال وکیفیات میں اُن سے نئی نئی گرہیں کھلتی ہیں، افسوس کہ اتنے دنوں کیوں غافل ومحروم رہا"

زیادہ تر یہی افسوس راقم کو بھی اپنے خورد و نہ حدود سے تجاوز کرکے بار بار عرض واصرار کا باعث ہوتا رہا یہ بے علم وعمل نامہ سیاہ جو ہر تنکے کا سہارا ڈھونڈھتا ہے اپنے حق میں اس کو رحمت حق کا ایک بڑا سہارا جانتا ہے کہ حضرت مرحوم کی زندگی بھر کی خدمات علم وعمل کو مقبول ومقبول تر بنانے والا ان شاء اللہ اُن کی زندگی کے قلبی انقلاب کا یہی آخری دور یا حسن ختام ثابت ہوگا،

صد کتاب وصد ورق در نار کن　　جان ودل را جانب دلدار کن

کے عالم میں ایک اور مکتوب میں فرماتے ہیں،

اور اس کے اعلان کا ایما فرمایا، میرے نفس نے تو خود الحمد للہ مطلق کشمکش نہیں کی، اور معارف میں اشاعت کے لیے سید صاحب کو ایک تحریر بھیج دی،

وہی ایک آنچ کی کسر اپنی اس علمی بےنفسی کے باوجود جس کا اپنا ہی تجربہ ابھی اوپر ہی عرض کر چکا ہوں، اس کے شائع کرنے میں لیت و لعل فرماتے رہے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دار المصنفین خصوصاً سیرت کے علمی و تصنیفی وقار کا استخفاف محسوس فرما رہے ہیں، بالآخر میرے اصرار پہ فرمایا کہ ایسا ہی ہے، تو دوسرے اڈیشن میں نظر ثانی کر لینا، میں نے عرض کیا کہ اس کی نوبت خدا جانے کب آئے، اور حضرت کا منشا فوری اصلاح و اعلان کا معلوم ہوتا ہے، تب بادل ناخواستہ وہ بھی میری خاطر سے شائع فرمایا،

حضرت کے ہاں اہل قلم کا یہ ایک بڑا امتحان ہوا کرتا تھا کہ اپنی قلمی غلطیوں یا لغزشوں کے اظہار میں نام نہاد علمی وقار شان تو مانع نہیں ہوتی، نیز شیخ کے مقابلہ میں اپنی رائے کے فنا کرنے پر کہاں تک آمادگی ہے، آج کل کلام مجید کی تحریفی تفسیروں کی جیسی گرم بازاری ہے، خصوصاً سیاست اور معاشیات کے مسائل میں، ایک ایسے ہی شیخ التفسیر اور تعبیری مصنف جو اپنی تربیت و اصلاح کے لئے مکاتبت شروع بھی کر چکے تھے، اس امتحان ہی کے سلسلہ میں نکل بھاگے، عام طور پر تو فنا کو آخر مقام کہا جاتا ہے لیکن حکیم الامت کی حکیمانہ رائے میں فنا ہی اول مقام تھا، نقشبندیہ میں عارف روم کا یہ شعر پڑھا کرتے،

ہیچ کس را تا نہ گردد او فنا   نیست رہ در بارگاہ کبریا

کوئی شخص مریض طبیب معالج کی تشخیص و تجویز کے مقابلہ میں اپنی رائے لگانا اور چلانا چاہے تو اس کا علاج شروع ہی کیسے ہو سکتا ہے، اور "آخر مقام فنا" ہونے کی حکیمانہ توجیہ یہ فرماتے تھے کہ اس سے مراد باطنی امراض کا فنا ہونا ہے کہ وہ علاج کے بعد آخر ہی میں فنا ہوتے ہیں، بہرحال حضرت کے ہاں اس راہ میں مجنون ہونا شرط اول قدم تھا،

سید صاحب ایک تو فطری طور پر خودرائی سے بہت دور تھے، دوسرے اس حقیقت کو خوب سمجھ لیا تھا کہ

اعاذ نا اللہ منہ،

الحمدللہ کہ سید صاحب رحمہ اللہ کے اس انقلاب حال کی برکت سے دارالمصنفین کے بہت سے حضرات نظری طور پر قلب و قالب دونوں کی صلاح و فلاح کی اہمیت سے خوب آشنا ہو چکے ہیں لیکن عملی طور پر نفس و شیطان سے زندگی کی آخری سانس تک بھی مامون و مطمئن نہ ہونا چاہئے، یہ غفلت انتہائی ہلاکت تک پہنچا دے سکتی ہے، ہر عمل و حرکت میں قلب کی نگرانی مرتے دم تک جاری رہنا ضروری ہے، پھر علم و قلم کی خدمت تالیف و تصنیف سے لے کر طباعت و اشاعت تک کے ہر چھوٹے بڑے خادم کے لئے "وبال آخرت" کے بجائے انشاء اللہ تمامتر باعث خیر و برکت ہی ہوگی اور خود حضرت مرحوم کی ایسی خیر جاری یادگار جو ان کی روح کے لئے ابدی سرور و سکون کا سرمایہ ہوگی،

سید صاحب "بطنی سید" ہی نہیں ماشاء اللہ بڑے "بطنی سعید" تھے، بظاہر ان کی روزی قلم سے وابستہ "ضرور رہی" تاہم انھوں نے خالص روزگار بنا کر قلم شاید ہی کبھی چلایا ہو بطنی سعادت ہی کی بدولت علمی کبر و غرور کا بھی کوئی شائبہ ان میں مشکل ہی سے نظر آتا تھا، انتہا یہ کہ راقم الحروف کی علمی خصوصاً علوم دین کی بے بضاعتی سے ناواقف نہ تھے، پھر فن سیرت میں کسی فنی و علمی بصیرت سے اور بھی محروم ہی رہا، چہ جائیکہ خود سید صاحب جیسے اس فن کے مسلم ماہر و محقق کے سامنے، مگر سیرت کی پانچویں جلد نکلنے پر خصوصیت کے ساتھ کیا تحریر فرمایا کہ

"آپنے سیرت کی پانچویں جلد پڑھی بھی، آپ لوگوں سے اس لئے نہیں پوچھتا کہ تحسین مقصود ہے بلکہ اس لئے کہ میں محسوس کروں کہ غلط نہیں چل رہا ہوں، سہارا چاہتا ہوں، تعریف نہیں،"

جب تھانوی علم و عمل کی روشنی میں اس بے علم و عمل کی آنکھوں پر سے بھی "جہل مرکب" کے کچھ پردے ہٹے تو نہ صرف ظاہری و باطنی گوناگوں علمی و اخلاقی بیماریاں علاج طلب نظر آئیں، بلکہ "ندویت" اور "روشن خیالی" کے عہد کا ایمانی و اعتقادی اضمحلال بھی سامنے آیا، تو بعض ایسی تحریریں جن کا تعلق کچھ دینی مباحث سے تھا حضرت علیہ الرحمۃ کی خدمت میں اس درخواست کے ساتھ خود ہی پیش کر دیں کہ ضلال و اضلال دونوں کی ممکن تلافی و تدارک کی ہدایت فرمائی جائے، سیرت ہی کی تیسری جلد میں معجزات پر میرا ایک مضمون شریک تھا، جس میں کوئی بات حضرت کو اصلاح و رجوع کی نظر آئی

تصنیفات کے ہزاروں صفحات کی نظر ثانی پر تل گئے ، ۱۱ رمضان مبارک ۱۳۶۳ھ کے والانامہ میں فرماتے ہیں ،

" دورہ جب سے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کا ایما ہوا تھا جس سے متعلق اشعار معارف میں چھاپ دیئے

یہ خیال غالب رہا ہے کہ اپنی تصنیفات پر نظر ثانی کر کے رکھ جاؤں ، پھر جب چھپیں ، چنانچہ سیرت جلد اول کی

پر نظر ثانی آدھی سے زیادہ ہو گئی ہے اور وہ چھپ بھی رہی ہے "

اس سے بڑھ کر یہ کہ سیرت کا وہی احقر کا حصہ جس کی چند سطروں کے تغیر و تبدل میں تامل تھا ، اب اس

کی نظر ثانی کی گئی تاکیہ پتا کیا ہوا ہو کیوں نہ ہو کہ اب تقوی کی نظر مصنف اور امت دونوں کی

آخرت پر تھی :

" اس سلسلہ میں سیرت کی تیسری جلد معجزات والی بھی آتی ہے ، اس میں جو حصہ آپ کا ہے

اس کو تنک آپ بھیجیں مولانا ندوی کی کہہ چکا ہوں .... آپ مہربانی فرما کر اس پر نظر

ثانی فرما کر بھیج دیں ، بہت دنوں یا حوالہ غفلت نہ کریں "

اس کے بعد لکھنے کی بات اس غفلت سے بچانے کی وجہ ہے کہ " اس میں آپ کا فائدہ ہے ، اور امت کا بھی "

کی خدمت پر نظر رہ مصنف خدا نخواستہ اپنے اور امت کے ضلال و اضلال کا باعث نہ بنا رہے ،

یہ بات کہ سید المصنفین کی خود ہی تصنیفی و علمی کایا پلٹ کی ایک جھلک تھی ، کچھ عام قلبی انقلاب کا بھی نظارہ ہو جائے

---

۱۵ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ " مرشد کے ارشاد سے بلا بحث سے معتقدات سے رجوع کیا ، اور اس وارفتگی سپردگی سے کیا کہ نا جانا ہے

حضرت تھانوی سید صاحب کی اس والہانہ انداز عقیدت پر وجد کیا کرتے تھے "

یہ شہادت عام ہے ۔ جناب مولانا عتیق الرحمن صاحب عثمانی سلمہ نے تازہ برہان (رجب ۱۳۷۳ھ) میں ادا فرمائی "

ان کے علم میں نہ تھی آگے ۔ بس نا سلمہ خود اپنی نسبت لکھتے ہیں کہ حضرت سید صاحب کی جگہ میں ہوتا تو شاید اتنے بڑے

سکنے تیار نہ ہوتا اور کیا کسی سکہ سے بھی اپنے زعم علم سے ایسی دست برداری آسان نہیں اسی سے تو مرشد تھانوی کے

الفاظ اتنی قدر و قیمت تھی :

شیخ کا مقام نبی کے وارث "قائم مقام" کا ہے اگر وہ نبی کی طرح معصوم نہیں ہوتا تاہم اگر علم و عمل زہد و تقویٰ فہم فراست، خوف و خشیت میں اس کا درجہ طالب سے بلند اور بہت بلند ہے، تو لازماً طالب کے مقابلہ میں خطا و لغزش سے محفوظ بھی زیادہ اور بہت زیادہ ہوگا۔

جب کسی کو ہم نے اپنے سے علم، درستی و صحیح جان اور مان لیا، تو پھر اس کی رائے کو اس وقت تک نہ ماننا جب تک کہ خود ہماری رائے کے موافق نہ ہو خود اپنی ہی رائے پر اصرار کے سوا کیا ہے، اسی کا نام خودرائی ہے، ورنہ پھر مذموم "خودرائی" کا مصداق ہی کیا رہتا ہے۔ حضرت کے نزدیک تو اس خودرائی کا ازالہ پھر بھی باقی رہتا، کا بہانہ تھا، پھر دین کے مسائل و معاملات کا تعلق تو بواسطہ یا بلا واسطہ تمام تر عالم غیب کے غیبیات سے ہے دنیا کے معاملات جن کا تعلق اسی عالم شہادت کے مشاہدات و تجربات سے ہے، ان میں بھی اگر زیادہ علم و بصیرت والے کے مقابلہ میں آدمی کو اپنی ہی رائے پر اڑے رہنے کا حق دے دیا جائے، تو غالباً زندگی کا سارا کارخانہ معطل و تہ و بالا بلکہ درہم برہم ہو کر رہ جائے۔

اس ذرا طویل جملہ معترضہ کا مدعا یہ ہے کہ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں قلب و باطن کے تزکیہ و ترقی کا بڑا قیمتی فطری جوہر ان کی یہی خوبی تھی کہ بڑوں کیا چھوٹوں کی بات کو بھی قبول کرنے کی آمادگی میں جتنا ان کا ظرف کشادہ پایا، اتنا کم ہی کے ظرف کو پایا، بڑی حد تک اسی استعدادی کمال نے ان کو کہنا چاہئیے کہ مرید ہوتے ہی پیر بنا دیا، اجازت و خلافت کے لئے ان کے پیر کا مسلک یہ تھا کہ خاص صورتوں میں بالفعل کمال کے بجائے متوقع کمال یا قوی استعداد ہی کو کافی تصور فرماتے تھے، اس راہ میں قدم رکھتے ہی حضرت مرحوم جو اس تیزی سے چل پڑے، اس کا بڑا راز یہی تھا کہ شیخ کے مقابلہ میں ان کو خودرائی یا انانیت کی ایک ٹھوکر بھی شاید ہی لگی ہو۔

اندازہ فرمائیے کہ کہاں تو سیرت میں خاکسار کے صرف ایک غلطی بتانے کی، صرف چند سطروں کے رد و بدل اور ترمیم و تصحیح میں جھجک تھی، اور کہاں مرشد تھانوی تک پہنچتے ہی ایسے ہو گئے کہ حضرت کے اشارہ ہی سے اپنی

والدہ کا ولد کا ونفسہ[۱] (او کما قال) اس کا عکس شیخ کے ساتھ معاملہ میں بھی ہونا چاہئے

آپ نے حضرت عمرؓ والی روایت خوب لکھی، آپنے کہاں دیکھی"[۲]

اس گرامی نامہ کی پشت پر اپنے اس حال کا کچھ تازہ قال دو غزلیں بھی نقل فرمائی ہیں، ایک کا عنوان "ذوق شیخ" ہے، اور دوسری کا "انتظار جواب" اہل ذوق شریک کیف ہوں،

دن میں کیا کیا آرزوئے دید ہو | مومنوں کو انتظار عید ہے
بتکدہ مسجد میں یاد آ یا کیا | روز افسروں نشۂ توحید ہو

حضرت "جامع المجددین" علیہ الرحمۃ کی تجدیدی جامعیت تو ایک دن دوپہر کا واقعہ ہے آج بھی جو چاہے حضرت کے کارناموں کو کتابی صورت میں مطالعہ کر کے خود معلوم کر سکتا ہے، پھر بھی بعض قلوب پر "جامع مجددین" کا عنوان گراں تھا، وہ حضرت سید صاحب جیسے دین کے دیدہ ور کی زبان سے اسی غزل میں خاتم مجددین ہونے کی شہادت سن لیں،

اس سے پایا روحانیت نے فروغ | ختم اس پر دورۂ تجدید ہے"

"انتظار جواب" کا پورا لطف اُن کو آئے گا جن کو خاتم المجددین کی خدمت میں مکاتبت کی کچھ سعادت حاصل رہی ہے،

دن گنے جاتے ہیں قاصد کیلئے | انتظار نامۂ محبوب ہے،

شعر کی شعریت تو شعر و شاعری والے جانیں لیکن واقعیت کا اگلا شعر فقط حکایت ہی نہیں بلکہ ہر مشکل ہی سے کوئی علمی و عملی اشکال یا ظاہری و باطنی مرض کا سوال ہوتا ہو گا، جس کا جواب تیر بہدف "نسخۂ اکسیر"

---

[۱] کوئی شخص تم سے ایمان (کا حق ادا کرنے والا) نہ ہوگا، جب تک وہ مجھ کو اپنے والد اولاد، اور خود اپنی ذات سے زیادہ دوست و محبوب نہ رکھے،

[۲] یاد نہیں آرہا کہ یہ روایت تھی، شاید اس کا تعلق نبی کی اتباع و محبت ہی سے رہا ہو گا،

باطنی انقلاب نمایشی نہیں ہوا کرتا، اس کا اثر سب سے زیادہ ذاتی وخانگی زندگی پر پڑا کرتا ہے...... اچھے اچھے خاندانی علما ومشائخ کو دیکھا کہ اپنی اولاد کے معاملات میں دنیا کے سامنے دین کو بے تکلف نظرانداز کرجاتے ہیں، لڑکی لڑکوں کا رشتہ تلاش کرنے میں بھی نظر دین سے زیادہ کیا کہنا چاہئے کہ تمام تر دنیا ہی پر رہتی ہے لیکن حضرت مرحوم کا دل بدلنے کے ساتھ نظر بھی ایسی بدلی کہ اپنی صاحبزادی سلمہا کی نسبت کی خبر دیتے ہوئے سب سے پہلی خوشخبری یہ سناتے ہیں کہ "آپ یہ سُن کر خوش ہوں گے کہ میں اپنی منجھلی لڑکی کی نسبت ایک ایسے نوجوان صالح سے کر رہا ہوں جو حضرت مولانا تھانوی کے متوسلین میں ہیں"، پھر اس سلسلہ میں نکاح ورخصتی وغیرہ سے فراغت اور وطن (دسنہ) سے اعظم گڈھ واپسی کے ارادہ پر ارقام ہے،

"تھانہ بھون کا بھی قصد ہے، حضرت میرے ہر معاملہ حتی کہ ذاتی معاملہ سے بھی خبردار ہیں، یہ میرا جوشِ محبت ہے کہ والد شفیق کی طرح اُن کو ہر معاملہ لکھے بغیر چین نہیں ملتا"

حرف بحرف ان نازک کی ترجمانی فرمادی، اس کا بھی حضرت کی زندگی پر یہی حال رہا کہ ذاتی وخانگی معاملات کی چھوٹی سے چھوٹی...... باتوں کی بھی اطلاع دیئے بغیر نہیں رہا جاتا تھا، دیکھا کہ کبھی ہمشیرہ مسترانی نے اسٹرائیک کردی تو وہ بھی لکھ بھیجا، پھر جس معاملہ میں جو ایما وارشاد ہوتا تھا، اس کے خلاف ایک قدم اٹھانے کا جی نہ چاہتا، پورے انشراح کے ساتھ اتباع کی توفیق ملتی، اس کا راز بھی سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے رازشناس سے معلوم کریں،

"میرا مذاق یہ ہے کہ شیخ وقت تام مقام نبی ہے، ان امور میں جو مختص بالنبوۃ نہیں"

سیرت نبوی کے مسلّم محقق وماہر ورازشناس سے بڑھ کر وقت کے قائم مقام نبیؐ کو پہچاننے کا دعوی کون کرسکتا ہے، یاد رہے کہ مرحوم صرف اپنا شیخ نہیں، شیخ وقت فرمارہے ہیں، پھر تمام ذاتی وخانگی امور تک میں جو اتباعی وجذبی وابستگی ہے، اس کی وجہ بیان فرماتے ہیں کہ

"جس طرح نبی کی یہ شان ہے کہ لا یومن احدکم حتی اکون احب الیہ من

باقی نجی زندگی میں تو اس سادگی کا رنگ یہاں تک دیکھا کہ ایک رفیق کی سالہا سال رفاقت میں لباس اور رہن سہن میں کچھ تکلف وتنعم آگیا تھا، وہ بھی اب اتنا ختم ہو گیا تھا کہ لاہور میں ایک بڑی محبت والے عزیز شاگرد دوست نے میری دعوت کی، سید صاحب بھی لاہور میں موجود تھے (میرے ذریعہ) وساطت سے ان سے درخواست کی گئی کہ ان سے کوئی بے تکلفی کیا شاید شان سادگی ہم نہ تھی، تو جب وہ بیٹھے آئے، تو جس طرح محض کرتے ٹوپی میں بیٹھے تھے اسی طرح بے تکلف ساتھ ہو لئے ورنہ عادت تھی ایسے موقع پر صافہ وشیروانی پہن لیا کرتے تھے، اور بھی کرتے وا جبہ وغیرہ میں اس سے زیادہ تکلف کے مواقع جلسہ وغیرہ تک میں ان کی ذاتی زندگی نمود ونمائش آرائش وزیبائش سے دور رہ کر بے تکلفی کی تھی، بلکہ بعض دوسرے علم ودین کا نام لینے والوں میں جاہی و نمائشی عادت و تکلفات دیکھ کر بے حد تکلیف ہوتی تھی کہ یہ نہ علم کی شان ہے نہ دین کی، پاکستان بن جانے سے شروع شروع میں پہنچ جانے والوں کو جہاں ملازمت اور معاشی کاروبار وغیرہ کے اموال غنیمت ہاتھ آئے وہاں بعض مولاناؤں کو لیڈری کی دولت ہاتھ لگی، ایسے ہی ایک "مولانا لیڈر" کا بہ سبیل تذکرہ کسی سفر میں منافقت کا خود اپنا یہ تجربہ نہایت تاسف کے ساتھ بیان فرمایا کہ ریل میں پہلے صبح صبح بعد غسل روزانہ لباس تبدیل کر لیتے، تب اسٹیشن پر منتظر استقبال ومشتاق دید مجمع میں نمودار ہوتے، علم ودین کا نام لگا کر دنیا طلبی کی یہ ادا کتنی بڑی شرمناک معلوم ہوتی ہے، علما کو تو طالب علمانہ وضع ہی زیب دیتی ہے۔

بات وہی ہے کہ نفس کا تزکیہ [illegible] "یزکیہم" کتابی تعلیم وتعلم پر بھی مقدم ہے، اور یہ کسی ایسے "مزکی" مزکی وارث نبی کی صحبت وتربیت کے بغیر ناممکن ہے جو خود "مزکی" یا تربیت یافتہ نہ ہو، بلا ایسی صحبت وتربیت کے نفس ونفسیات کی بیماریوں کا علاج کب ہوگا، ان کو بیماریاں سمجھنے والے ہی نام نہاد علما ومشائخ تک میں کتنے ملتے ہیں، تعجب کی بات ہے حقیقت نفس ونفسانیات کا [illegible] نہیں، بلکہ تزکیہ وتربیت سے غفلت کا عوام میں نہیں خواص تک میں عموم ہے، خالص علمی ودینی ہی نہیں، دینی وسیاسی خدمت گذاروں کے لئے بھی دوسروں کی خدمت سے پہلے اور ساتھ ساتھ خود اپنی اصلاح اور تزکیہ نفس کی فکر ناگزیر ہے، ورنہ [illegible] کا مشاہدہ ہے کہ

ثابت نہ ہوتا"

نسخۂ اکسیر و داروے شفا　　　تیرے ہاتھوں کا لکھا مکتوب ہے

بقول مولانا دریابادی سلمہ کے بس جی چاہتا تھا کہ لکھنے والے کی انگلیاں چوم لے" ایک اور شعر "اہل المجالس" کے بادہ خواروں کے لئے،

مہر ہو یا قہر ہو جو کچھ بھی ہو　　　ہر ادا محبوب کی محبوب ہے

سب سے آخر کے شعر "ان کوئی سالک ہے" کے نیچے اس بدنام کا نام معہ ایک نشان کے ساتھ تحریر ہے،

اندر دن خلعت پیر مغان　　　کوئی سالک ہے کوئی مجذوب ہے
(کیا عبد الباری؟)

۲۴ مارچ کو اس میخانہ (تھانہ بھون) میں ایک عشرہ کی سرمستیوں کے بعد واپسی کی اطلاع ایک کارڈ پر صرف اس شعر سے فرمائی،

من تنہا درین میخانہ مستم　　　جنید و شبلی و عطار شد مست

راقم سطور کو علامہ ندوی نہیں بلکہ جنید و شبلی کے "اس میخانہ" کی مستی کے کچھ یہ دکھانا سبق سنانا دینا منظور تھا، یہ نشہ ان کی علمی و تصنیفی زندگی سے لے کر خانگی و ذاتی معاملات تک پر بھی جس درجہ چھا گیا تھا اس کا ہر سبق مستقل درس ہے، اور سب سے بڑھ کر بڑا درس علم و قلم والوں کے لئے،

علامہ ندوی "نہ صرف عام علوم دین کے علامہ بلکہ فن سیرت کے خاص طور پر وقت کے سب سے بڑے علامہ تھے جن کی "سیرۃ النبیؐ" کا کوئی جواب تو کیا ہوتا، اس کے بعد سے سیدالاولین والآخرین علیہ التحیۃ والتسلیم کا کوئی چھوٹا بڑا سیرت نگار اس سے مستغنی نہیں رہ سکا، اور نہ آئندہ رہ سکتا ہے، پھر سوچنے کی بات ہے کہ جنید و شبلی والے میخانہ میں پہونچ کر کوئی تو بات ان کو ایسی ملی کہ اپنے سارے تصنیفی دفتر کے ساتھ اس سیرت تک کو لفظاً بھی مستغنی نہ پا سکے،

ہیں ہے۔

حال ہی کے کسی صدق میں صاحبِ صدق نے ایک بڑی سچی بات کہہ ڈالی "تلخ ہو یا شیریں لیکن جو حقیقت یہ کہ پورے بارہ سال سے سید صاحب خالص ندوی رہے تھے، مگر اس اخلاق ندوی کی سمجھ میں تو ان ہی ۱۰ سال میں سید صاحب پورے ندوی بنے، ندوہ کے اصل بانیوں نے خادم دین کا ایک نیا دارالعلوم اس لیے تجویز نہیں کیا تھا کہ اس کے علماء کی تقریر و تحریر خطابت و صحافت میں وہ کمال پیدا ہو کر ایمان و عمل صالح کی طرف سے غافل زندگی میں ضعف و اضمحلال پیدا ہو جائے اور دین کا سارا زور سمٹ سمٹا کر زبان و قلم میں آجائے بلکہ مقصد اس کے ساتھ اعمال کی تحسین بھی تھا،

سید صاحب نے اپنی زندگی کے آخری ۱۰، ۱۲ سال میں "ندویت" کی اس خلا و نقص کی تلافی و تدارک فرمایا اور ندوی بھی اگر چاہے سب سے بڑے فرزند ندویت "بھائی" کے اسوہ پر نگاہ رکھ کر انقلاب باطن سے سبق لے تو اس کی زندگی دار مخلوق سے ہٹ جانے کے بجائے لیکن خالق سے انتشار ربط بھی پورا حل کر رہے گی۔ وہیں امر ہی اس باطنی انقلاب کا ہے کہ انہوں نے باطنی و عملی انفرادی و اجتماعی کاموں میں نظر مخلوق و دنیا سے ہٹ کر خالق و آخرت پر جما دی۔ وہ کہ سید صاحب نے یہ نظر پیدا کر کے "ندویت" ہی کی تکمیل نہیں فرمائی، بلکہ دین کا نام لینے والے تمام دوسروں کو سب سے بڑا سبق دے کر گئے ہیں۔ اسلام اپنی تعلیمات کی خالی زبان و قلم سے اشاعت زبان سے بڑھ کر دلوں کو بدلنے یا قلب سے، وہ قلب کے انقلاب کی دعوت دیکر اس کی عمارت اکبر نے زبان و قلم کی اس بے روح پر اپنے رنگ میں کس لطف و خوبی کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

داد قرآن کی نہ دو بھائی عمل اس پر کرو

پیش درگاہِ خدا داد کی حاجت نہیں

زبان و قلم سے تو اپنی فاسد تعلیمات کی داد دیتے ہیں اہل باطل بھی خصوصاً آج کل کے ہم سے پیچھے نہیں

دین و دنیا دونوں کے "خیر جامع" مصلحین کے ہاتھوں اصلاح سے کہیں زیادہ افساد کی خدمات انجام پاتی ہیں

دین کی بنیادی حقیقت "یوم دین" یا آخرت کا ایمان و یقین ہے، آخرت کو پیش نظر رکھے بغیر دل کے کسی انفرادی کمال یا اصلاحی خدمت کا دین کی میزان میں قطعاً کوئی وزن نہیں، وہاں پوچھ نہ تہذیب و تمدن کی ترقیوں کی ہوگی، نہ حکومت و سیاست کی ہنگامہ آرائیوں کی، نہ علوم و فنون کی دقیقہ رسیوں کی، نہ خطابت و تقریر کی زبان آوریوں کی، نہ انشا و قلم کی زور آزمائیوں کی اور نہ تصنیف و تالیف کے انبار کی، وہاں تو ہر ہر فرد کے ظاہر و باطن کے ہر ہر قول و عمل، ہر ہر جنبش و نظر، ہر ہر ارادہ و نیت کے متعلق بس یہی پوچھا اور دیکھا جائے گا کہ اس میں خدا کی رضا و آخرت کا کیا اور کتنا حصہ تھا، وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ۝

علامہ سید سلیمان کو آخر میں جس فکر و نظر نے حضرت سلیمان بنایا، وہ "یہاں" کی نہیں "وہاں" کی تھی، حقیقت دین کی یہی یافت ان کی ساری علمی و عملی یادگاروں کو قابل یادگار بنا سکتی ہے، اس کو بھولنا اُن کی ہر یادگار کو بھلا دینا نہیں بھلانا ہوگا، اس یافت کو خود اُن ہی کے اس "یادگار انقلاب" کے سیدھے سادے دو مصرعوں میں یاد رکھیں،

یہاں جیسے رہے یا کہ ویسے رہے،
وہاں دیکھنا ہے کہ کیسے رہے،

یہاں کے ساتھ بیان کے لیے بھی جو بات سب سے زیادہ یاد رکھنے کی ہے، آگے ہی وہ بھی سُن لیں کہ کُن فی الدنیا کانک غریب

جہاں تھے دو دن درد و غم کا کیا پیش و غم | سفر کا بھی کیا جیسے تیسے رہے

بس اللہ تعالیٰ اُن کے اس حال و قال کو اُمت کے عوام و خواص کا بھی حال و قال بنا دیں، اسی میں دین و دنیا دونوں کا بناؤ ہے، اور یہی اُن کی علمی و عملی زندگی کے آخری انقلاب کا سب سے گرانقدر

"متانت ہر انداز پر غالب رہتی کبھی ٹھٹھا مار کر ہنستے نہ تھے، بے تکلفی میں ظرافت سے باز نہ آتے، اس میں بھی متانت قائم رہتی، کوئی ناگواری ہوتی تو اس کی غمازی چشم و ابرو ضرور کرتے، مگر زبان پر قابو رہتا"

آپ نے دیکھا کہ نوجوانی اور طالب علمی کے اس چند سطری آئینہ میں خد و خال کی وہی جھلک موجود ہے جو آگے چل کر پوری سیرت کے قد آدم آئینہ میں ابھر کر گھر باہر اپنے پرائے سب کے سامنے جلوت و خلوت میں آتی رہی

اللھم صل علی سیدنا محمد و علی آلہٖ علیٰ سیدنا سلیمان بارک وسلم،

آگے اور اتنے آگے ہیں کہ اس محاذ پر اُن سے بازی لے جانا ناممکن ہی ہے، اسلام کا اصل محاذ عمل صالح کی زبان ہے جس کے سامنے قلم کی زبان کا کوئی طلسم نہیں ٹھہر سکتا، اور عمل صالح "صالح" جب ہی ہوتا ہے جب کہ اس کا سرچشمہ قلب باطن کی طہارت ہو، اگر قلب صالح درست نہیں تو پھر عمل صالح کی ہر چیز سرگرمی فساد ہی فساد ثابت ہوتی ہے، "اذا فسد فسد الجسد کلہ" دلوں کے اس فساد کا آج سے بڑھ کر ہمہ گیر فسادات کی صورت میں دنیا کی تاریخ نے شاید ہی پہلے کبھی ثبوت فراہم کیا ہو،

> استیلام دل بزد ر مسخر نمی شود
> این فسخ بے شکست میسر نمی شود

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کا حکم تھا کہ مرحوم کی سیرت کے سلسلہ میں اُن کی طالب علمی کے رنگ روش کی تفصیل خصوصیت کے ساتھ کروں، اپنی نالائقی اس معاملہ میں ابتدا ہی میں عرض کر چکا ہوں اتفاق سے اسی زمانہ میں مولوی جواد علی خان صاحب [illegible] کے قریب ہی ٹھہرے ہوئے تھے، وہ سید صاحب کے نہ صرف ہم مدرسہ بلکہ بہت سے مضمون میں ہم درس اور ہم سبق رہے ہیں، تعلیم میں بھی کچھ قدم ساتھ چلے، پھر

او بجو [illegible] وما درکو چہار [illegible]

بہرحال مولانا دریابادی کی فرمائش میں نے اپنے پورے اصرار کے ساتھ خان عالی کی طرف منتقل کر دی وہ پورا حق ادا کر سکیں گے، مگر جواب ان کا بھی اس عنوان کے تحت بہ اس عذر ہی کا آیا کہ مرحوم و مغفور کے متعلق حافظہ کی معذوری سے سوچ بچار کے باوجود کوئی مواد حاصل نہ کر سکا، بجز ان معمولی باتوں کے کہ

"اگر کوئی ہم سبق کبھی سختی سے گفتگو کرتا، تو اس کا جواب نرم الفاظ میں دیتے اور خاموش ہو جاتے، کبھی سخت کلام یا لب ولہجہ سخت نہ ہوتا، درسی کتابوں کی تکرار میں لب ولہجہ ذرہ برابر البتہ ہوتا، اور بیان کی قوت و روانی سے شرکا کے دل پر متکلم کا رعب بیٹھ جاتا،

اس طرح پوچھا کہ اُس کی سُرخی کچھ ڈاڑھی مونچھوں پر رہ گئی، اور کچھ ہتھیلی پر آئی، اور وہاں سے اس بچّے کے کرتے پر نقل ہوئی جو پہلو میں بیٹھا ہوا تھا، لوگوں نے شور مچایا، تو بولے ارے یہ کہاں سے آ گیا میں تو سمجھ رہا تھا کہ منشی جی مقدمہ کے کاغذات رکھ گئے ہیں!

شام کو مولانا کے ہمراہ شبلی منزل گیا، سید صاحب سے ملاقات ہوئی، سہیل صاحب نے تعارف کرایا، شبلی منزل میں اور احباب و بزرگوں سے بھی ملاقات ہوئی، سید صاحب بڑی شفقت سے ملے، ان کی لطف و مرحمت کی باتیں ذہن میں ہیں، کہیں سہیل صاحب نے کوئی دینی یا فقہی مسئلہ چھیڑ دیا، جیسے معارف کے اوراق میں کبھی دیکھ چکے تھے، سید صاحب نے ان ہی میں بات ٹال دی، شبلی منزل میں کسی اور کی ہمت نہ ہوئی کہ مولانا سے الجھے، مولانا کو دلائل سے زیر کرنا ناممکن تھا، ان لوگوں میں ہم سب کا طریقہ یہ تھا کہ بحث کی آخری منزل پر پہنچتے پہنچتے مولانا سے زیر بحث نکتہ پر کچھ ترمیم کر کے چپ ہو جاتے، اور مولانا سے ہی اور سے کہتے کسی اور طرف چلے گئے!

اس دن کے بعد سے آخر زمانہ تک جب وہ پاکستان تشریف لے گئے، اور پھر جب جنت میں پہنچ گئے، سید صاحب سے ملنے اور اُن کی محبت و مروت سے بہرہ مند ہونے کے بے شمار مواقع ملے، علی گڑھ آنا ہوتا، تو ہمیشہ میرے ہاں قیام کرتے، میرا، میرے بچوں کا، میرے عزیزوں دوستوں کا بڑا خیال کرتے تھے، اتنا خیال کہ کبھی کبھی میں اُن سے شرمندہ ہونے لگتا، یونیورسٹی کورٹ کا معرکہ کا کوئی جلسہ ہونے والا ہوتا تو عمائد قوم کا اچھا خاصہ اجتماع ہو جاتا، ایسے موقع پر یونیورسٹی کے طلبہ یونین میں کوئی مباحثہ یا مشاعرہ منعقد کرتے، علی گڑھ میں اکابر شعراء مجتمع ہو جاتے، دو ایک دن بڑی رونق کے گذرتے، میرے ہاں مختلف الخیال حضرات یکجا ہو جاتے، مثلاً سید صاحب، اصغر صاحب، ذاکر صاحب، مولانا عبد الماجد صاحب، سید الطاف حسین صاحب، ان میں کچھ ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم کی حمایت میں تشریف لاتے تھے، کچھ ذاکر صاحب کا ساتھ دینے کے لئے،

میرے ہاں وہ مسائل نہیں چھیڑے جاتے تھے، جو کورٹ میں پیش ہونے والے ہوتے، اس لئے کہ شریک ہونے والوں میں کوئی ایسا نہ تھا، جو پہلے سے رائے قائم نہ کر چکا ہوتا تھا، اس وقت کورٹ ڈائی رنگ تھا، آ

گنجِ گرانمایہ

از

پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی

"رشید صاحب نے اس مضمون کا کوئی عنوان نہیں لکھا تھا، اور اس کو میری رائے پر چھوڑ دیا تھا، مجھے ان کے مجموعہ مضامین گنجہائے گرانمایہ کی مناسبت سے جو انھوں نے ذاتِ گرامی پر لکھے ہیں گنجِ گرانمایہ زیادہ مناسب معلوم ہوا" (م)

سید صاحب سے پہلے پہل اعظم گڈھ میں ملاقات ہوئی تھی، مولانا شبلی کو مرے ہوئے بہت دن ہوئے، شاید ۲۰-۲۲ برس، تعطیلوں میں تفریحاً مولانا اور دو ایک عزیزوں دوستوں سے ملنے اعظم گڈھ گیا تھا، سہیل صاحب کو مولانا شبلی مرحوم سے بڑا شغف ہے، شبلی کے سامنے وہ سب کو بے حقیقت سمجھتے ہیں، صحبت کبھی کبھی اپنے آپ کو بھی کبھی کبھی، یوں کہ اس بارہ خاص میں مولانا کے بیانات میں اکثر تضاد رہا ہے!

فرمایا علامہ کو حضرت مرحوم کے جانشین سے ملاؤں، میں نے کہا مولانا آپ کے ہوتے کون جانشین ہو گیا، یہ آپ کی عالی ظرفی ہے کہ آپ کسی اور کو مرحوم کا جانشین مانتے ہیں، آپ اپنے جانشینوں کا ایمان کیوں بگاڑتے ہیں جو آپ کو حضرت مرحوم کا صدق دل سے جانشین سمجھتے آئے ہیں اور اس پر یقین رکھتے ہیں کہ آپ کے بعد حضرت مرحوم کا کوئی جانشین رہے گا، اور نہ خود آپ کا!

مولانا اس پر مسکرائے اس طور پر کہ پان کی پیک جو دہن کے گوشہ سے باہر سرک آئی تھی، اس کو ہاتھ

ابوبکر محمد شیث فاروقی صاحب جونپوری ناظم دینیات تھے، جن کے سید سلیمان صاحب سے بڑے پرانے اور مخلصانہ تعلقات تھے، اور خود مولانا سلیمان اشرف صاحب مولانا ابوبکر صاحب کی بڑی عزت کرتے تھے، اور اُن سے بڑی محبت سے پیش آتے تھے،

سید صاحب کا مزاج مولانا سلیمان اشرف کے مزاج سے بالکل مختلف تھا، سید صاحب کو کوئی مشتعل نہیں کرسکتا تھا، وہ کسی حال میں برہم یا بے اختیار نہیں ہوتے تھے، سید صاحب خود علامہ شبلی سے طبعاً مختلف تھے، میں نے علامہ شبلی مرحوم کو نہیں دیکھا لیکن اُن کی تصانیف پڑھی ہیں، جن لوگوں نے ان کو قریب سے دیکھا تھا اُن سے ملا ہوں، خود شبلی پر جو کچھ لکھا گیا، اُس سے بھی تھوڑا بہت آشنا ہوں، علامہ شبلی جتنے ذہین اور جذباتی تھے ذہین اکثر جذباتی ہوتے ہیں، شعر کہنے اور پرکھنے کا جیسا ملکہ ان میں تھا، اُن کی شاعری، اُن کی نثر اُن کے خطوط سب میں حسن طبعیت اور سوز دروں کی جیسی دل آویز مثالیں ملتی ہیں، اور دنیوی معاملات میں جس سوجھ بوجھ سے وہ کام لیتے پائے گئے تھے، سید صاحب ان سب سے عاری تھے،

سید صاحب کی جس بات کا میں گرویدہ تھا وہ ان کا علمی تبحر ہی نہیں، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ علمی دیانت بھی تھی، وہ کبھی علم کو کسی ادنیٰ مقصد کے حصول کے لئے کام میں نہیں لاتے تھے، علم نہایت ہی خطرناک چیز ہے کم ذی علم ایسے پائے گئے ہیں جنھوں نے علم سے لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے ساتھ ہی نقصان نہ پہنچایا ہو، جس کی ایک مثال مذہب کا غلط استعمال ہے، میں بطور کلیہ تو کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن اپنی ہوش کی زندگی میں اب تک یہی دیکھتا آیا ہوں کہ جہاں کہیں لوگوں کو اپنے ادنیٰ مقاصد میں کامیابی نظر نہ آئی، انھوں نے مذہب کو آڑ بنا لیا، اور پھر جو آفتیں نازل ہوتی ہیں، وہ سب جانتے ہیں، میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ علم، مذہب اور آزادی باوجود بہترین نعمت ہونے کے نااہل سوسائٹی میں بڑے خطرناک عناصر ہیں،

بات کہاں پہنچی کہنا یہ شروع کیا تھا کہ سید صاحب کا علم کیا تھا، اور کیسا تھا، وہ علم ہی سے واقف نہ تھے علم کی برگزیدگی کا بھی احساس رکھتے تھے، اور اس کو کبھی ہاتھ سے نہ دیتے، اکثر ایسے عالم دیکھے گئے ہیں، جو صرف

وہ دو مختلف گروہوں میں بٹ گئی تھی، البتہ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ ڈاکٹر صاحب کا کوئی عزیز قریب یا حکومت کا کوئی بڑا عہدہ دار زیادہ سرگرمی دکھانے کے لئے مرحوم کی حمایت میں بحث کرنے آجاتا، یہ موقع بڑا پر لطف ہوتا تھا ڈاکٹر صاحب بھی موجود ہوتے تھے، اور ڈاکٹر صاحب کے حمایتیوں کے دلائل اس سنجیدگی اور ہمدردی سے سنتے، اور کہیں کہیں ہمت افزائی کے طور پر ایسا لقمہ دے جاتے کہ بولنے والا اور بڑھ بڑھ کر باتیں کرنے لگتا، ڈاکٹر صاحب مرحوم کے سمجھدار ساتھی بڑی دقت میں مبتلا ہوجاتے، اور چاہتے کہ یہ بحث کسی نہ کسی طرح ختم ہوجائے،

سید صاحب کا مسلم یونیورسٹی سے بڑا پرانا اور گہرا تعلق رہا، جہاں تک میرا خیال ہے مرحوم ۲۴،۲۳ء سے علیگڈھ آنے جانے لگے تھے، کورٹ کے مسلسل ممبر رہنے کے علاوہ مرحوم ان کمیٹیوں اور شعبوں کے ممبر منتخب یا مقرر ہوتے رہے جو علوم مشرقیہ یا مذہبی اور ادبی مسائل سے متعلق ہوتے، یہ سلسلہ تقسیم ملک تک قائم رہا، تقسیم کے پہلے یونیورسٹی پر طرح طرح کے دور آئے، سید صاحب کسی نہ کسی حیثیت سے برابر ارباب یونیورسٹی کے شریک کار رہے، اور اکثر اہم موقعوں پر سید صاحب کی اصابت رائے سے یونیورسٹی کو بڑا فائدہ پہنچا،

سید صاحب اور مولانا سلیمان اشرف صاحب ہم وطن تھے، دونوں کے سیاسی معتقدات جداگانہ تھے بعض مذہبی امور میں بھی ذہنی یگانگت نہ تھی، مولانا سلیمان اشرف صاحب بڑے طنطنے کے آدمی تھے جس کے بارہ میں جو خیال رکھتے تھے، اس کا اظہار برملا کرتے تھے، اور کوئی جھگڑا آن پڑے تو مفاہمت کرنے پر مشکل ہی سے آمادہ کئے جاسکتے تھے، علامہ شبلی مرحوم کے کچھ زیادہ قائل نہ تھے، دارالمصنفین کے بھی کچھ ایسے معترف نہ تھے جس کسی کو اپنی طبیعت کا نہیں پاتے تھے، نہ اس کے قریب جاتے تھے، نہ اسے قریب آنے دیتے تھے،

لیکن سید صاحب جب کبھی علی گڈھ آتے تو مولانا سلیمان اشرف صاحب کے ہاں ضرور جاتے، دونوں ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوتے، اور نہایت خلوص اور بے تکلفی سے گفت گو کرتے، اور میں جانتا ہوں کہ اس میں اس کا مطلق کوئی دخل نہ تھا کہ سید صاحب سلیمان اشرف کے ہم وطن یا دارالمصنفین کے کرتا دھرتا تھے یا ملک میں اُن کی بڑی مان دان تھی، ان دونوں بزرگوں کے باہمی خوشگوار تعلقات کا موجب ایک طرح پر مولانا

کہ اسلامی عقائد اور شعائر سے متعلق اتنی اچھی اور مختصر کتاب شاید اسلامی ممالک میں بھی نہیں لکھی گئی ہی نہیں بلکہ اکثر یہ خیال بھی ہوتا ہے کہ اسلام اور اسلامیات سے متعلق جتنی مفید اور معیاری تصانیف ہندوستان کے مسلمان ارباب فکر و نظر نے پیش کی ہیں، اسلامی ممالک میں اس پایہ کی کتابیں شاید نہیں تصنیف ہوئیں، دور جانے کی ضرورت نہیں صرف دارالمصنفین اعظم گڈھ کی گذشتہ چالیس سال کی مطبوعات کا جائزہ لیا جائے، تو اس بات کا آسانی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے! یہ گمان اور قوی ہو جاتا ہے، جب ہم اس امر کو بھی مدنظر رکھیں کہ دارالمصنفین جیسے چھوٹے بڑے ادارے ہندوستان میں اور بھی ہیں!

یہاں ایک واقعہ یاد آگیا۔ دس بارہ سال ہوئے یا شاید اس سے بھی زیادہ، ایک بار سید صاحب سے اس مسئلہ پر گفتگو آئی کہ مذہبی، اخلاقی اور ذہنی اعتبار سے ہندوستان کے مسلمانوں کا ہندوستان سے باہر کے مسلمانوں سے موازنہ کیا جائے، تو کیا نتیجہ نکلے گا، سید صاحب نے بتایا کہ تینوں اعتبار سے ہندوستان کے مسلمانوں کا پایہ باہر کے مسلمانوں سے بلند ملے گا، اثنائے گفتگو میں یہ بھی فرمایا تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہئے، باہر کے مسلمانوں کی عام حالت بحیثیت مجموعی ایسی نہیں ہے جس پر یہاں کے مسلمان بھروسہ یا اُن کے رہن سہن اور طور طریقوں کی تقلید کریں۔

خیام کے بارے میں مغربی مصنفین نے جو کچھ لکھا تھا اور اُن کی دیکھا دیکھی یا سُنی سنائی ہم ہندوستانی جو کچھ کہنے لگے تھے، وہ میرے پیش نظر تھا، لیکن خیام پر سید صاحب کی تصنیف سامنے آئی تو دل باغ باغ ہو گیا کہ معرکہ کی ایک تصنیف اردو میں دیکھنے میں آئی، جو کسی زبان کے بڑے سے بڑے تحقیقی کارناموں کے ساتھ رکھی جا سکتی ہے، اس کتاب کی تصنیف میں سید صاحب کے حیرت انگیز طالب علمانہ شغف، مورخانہ ژرف نگاہی، ادبی پرکھ اور عالمانہ بصیرت کا پورے طور پر اندازہ کیا جا سکتا ہے، معمولی سے معمولی دعویٰ کو مستند سے مستند ماخذوں سے مستحکم کیا ہے، ماخذات کے لئے کس کس بے کنار ریگستان اور دشوار گذار جنگل اور گھاٹیوں سے گذرنا پڑا ہوگا تب کہیں جا کر کسی رہرو کے نقش قدم ملے ہوں گے، اور جادۂ و منزل کے متعین کرنے کا امکان پیدا ہوا ہوگا، معلوم نہیں

علم کا ہو یا ریا ہو یا رکرنا جانتے ہیں ۔ علم کا مفہوم میرے نزدیک جاننا پہچاننا ہی نہیں ۔ جاننے پہچاننے کی ذمہ داری بھی ہے ، جب تک کوئی متعلم علم کی برگزیدگی کو ماننے اور منوانے کی اہلیت نہ رکھتا ہو ، اس کو علم کا کاروبار نہ کرنا چاہئے ۔ آج کل دنیا میں جو ہلچل ، افراتفری یا بے دلی ، اور بیزاری پھیلی ہوئی ہے ، اس کا ایک بڑا سبب میرے نزدیک یہ بھی ہے کہ علوم اور ان علوم کو پھیلانے کے وسائل تو بہت بڑھ گئے ہیں لیکن اچھے معلم تقریباً ناپید ہیں جس کی وجہ سے علم اور زیادہ خطرناک بن گیا ہے ، دنیا میں ہر مرض کی تیر بہدف دوائیں کیوں نہ ایجاد کر دی جائیں اگر اچھے اطبّا میسر نہ ہوں تو یہ دوائیں خطرہ کا موجب بن سکتی ہیں ، یہی حال علوم کا ہے !

سید صاحب جن علوم سے بہرہ مند تھے ، ان پر ان کی نظر پیشہ ورانہ نہ تھی تاجرانہ بھی) ، وہ محض فنی اصول پر کسی مسئلہ کو ناپ تول کر ختم نہیں کر دیتے تھے ، بلکہ اس کی کوشش کرتے تھے کہ اس مسئلہ کے رد یا قبول میں دماغ اور دل دونوں متفق ہو جائیں ، سید صاحب نے اسلامی عقائد اور اسلامی مسائل سے (خواہ وہ معاش سے متعلق ہوں یا معاد سے) طرح طرح سے بحث کی ہے ، لیکن مجھے کوئی ایسا موقع نہ ملا ، جہاں یہ محسوس ہوا ہو کہ مصنف نے اپنی بات دھونس دھکی سے یا خطابت اور شاعری کے زور سے یا منطق اور فلسفہ کا چکر دے کر یا جلی کٹی سنا کر یا رو پیٹ کر منوانے کی کوشش کی ہو جیسا کہ بعض نام کے مولوی اور اشتراکی بالعموم کیا کرتے ہیں ، سید صاحب نے ہمیشہ بات متانت اور دیانت سے کہی نپی تلی کہی ، اور اس طرح کہی اور اس لئے کہی کہ ان کو ایک بیش بہا بات معلوم ہوئی تھی جس پر انھوں نے بڑی محنت قابلیت اور وقت صرف کیا تھا ، اور چاہتے تھے کہ اسے ان لوگوں تک پہنچائیں ، جو اس سے فائدہ اٹھا سکتے تھے ، علم کا معلم سے یہی تقاضا ہے !

سید صاحب کی تصانیف میں سے جس تصنیف نے مجھے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ متاثر کیا ، وہ ان کے خطبات مدراس ہیں ، میرا خیال ہے کہ شاید سب سے پہلے میں نے ہی سید صاحب کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ ان خطبات کا اچھی انگریزی میں ترجمہ ہو جائے ، تو بہت مفید ہوگا ، سید صاحب نے اس تجویز کو پسند کیا تھا بعض عزیزوں نے اس پر کچھ کام کرنا شروع بھی کر دیا تھا لیکن پھر کیا ہوا مجھے اس کا علم نہیں ، مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے

یہان سید صاحب کی تصانیف اور مقالات پر تبصرہ مقصود نہین ہے ، یہ کام بڑا طویل اور مشکل ہے اور ایک آدمی کے بس کا بھی نہین ، کہنا یہ ہے کہ علمی تدقیقات کے جدید طور طریقون سے ناآشنا ہونے کے باوجود اس کے آداب سید صاحب اپنی تصانیف مین بڑی خوبی اور پابندی سے ملحوظ رکھتے تھے ، کتنے مستند حوالے کہان کہان سے فراہم کرتے تھے ، اور تقسیم ابواب اور ترتیب مضامین مین کس سلیقہ سے کام لیتے تھے کہ معمولی سے معمولی طالبعلم بھی پوری تحقیقات سے پورے طور پر آشنا ہو جاتا تھا ،

سید صاحب کا حافظہ بڑا قوی اور ذہن بڑا مرتب تھا ، اُن کے ذہن مین تنقیحات بڑی واضح اور مکمل ہوتی تھین ، کام کی باتین ضخیم سے ضخیم کتاب اور پیچیدہ سے پیچیدہ بحث سے بہت جلد اخذ کر لیتے تھے ، اور اُن کو اُن کا صحیح مقام دینے مین خاص ملکہ رکھتے تھے ، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنے ذخیرہ معلومات کی ذہنی فہرست اتنی ہی واضح اور مکمل رکھتے ہون جتنی کسی اچھی لائبریری کی فہرست کتب جو جدید ترین اصولون پر مرتب کی گئی ہو ، مین نے سید صاحب کو مطالعہ کرتے یا کتاب لکھتے نہین دیکھا ہو ، لیکن اُن کی تصانیف پڑھنے اور اُن سے بعض مسائل پر گفتگو کرنے سے جن باتون کا اندازہ لگا سکا ہون ، وہ بیان کر دی ہین ، ممکن ہے استنباط نتائج مین مجھ سے غلطی سرزد ہوئی ہو !

حسب نسب ، علم و فضل ، اخلاق و عادات ، خدمت ملک و ملت کے اعتبار سے سید صاحب کا درجہ بہت اونچا اور پورے طور پر مسلم ہے ، جہان تک میری معلومات ہین ، سید صاحب کی تعلیم و تربیت پرانے طریقون پر پرانے استادون ، اور بزرگون کے سایۂ شفقت اور پرانی فضاؤن مین ہوئی تھی ، جدید علوم و فنون سے براہ راست انھون نے کسی سے استفادہ نہین کیا تھا ، لیکن نئے افکار اور نئے طور طریقون سے انھون نے اپنے آپ کو اس خوبی اور خاموشی سے آشنا کر لیا تھا کہ وہ کہین اجنبی نہین معلوم ہوتے تھے ، چاہے وہ اہلِ علم کا حلقہ ہو ، چاہے ارباب سیاست کی مجلس ، خواہ طالب علمون کی جماعت ہو ، خواہ عامۃ الناس کا اجتماع ، جدید افکار ، ان کے رجحانات سے کوئی کتنا ہی آشنا کیون نہ ہوتا ، سید صاحب سے تبادلۂ خیال کرنے مین اُسے کبھی یہ محسوس نہ ہوتا

اس تصنیف پر سید صاحب کو کیا داد ملی حکومت سے، قوم سے یا کسی اکیڈمی سے، میں سمجھتا ہوں کہ کسی ملک کی بڑی سے بڑی یونیورسٹی یا اکیڈمی سید صاحب کو اس کتاب پر بڑے فخر اور خوشی سے اعلیٰ علمی ڈگری دے سکتی ہے،

سید صاحب کو اپنے استاد علامہ شبلی مرحوم سے بڑی عقیدت تھی، سیرت شبلی لکھ کر سید صاحب نے اس کا حق بھی ادا کر دیا ہے، اس کتاب میں جہاں کوئی کمی ملتی ہے، وہ سید صاحب کے فنی شعور کی کوتاہی کے سبب اتنی نہیں ہے جتنی اس شغف کے بنا پر ہے، جو ایک نہایت درجہ شریف اور سعید شاگرد کو اپنے شفیق اور محترم استاد سے ہو سکتا ہے، یہ وہ مقام ہے جہاں مصنف اپنے ہیرو میں کوئی خامی دیکھنا نہیں چاہتا، یہ بات ٹھیک یا نہیں سمجھ میں آسانی سے آجاتی ہے!

باوصف اس عقیدت کے سید صاحب کی شخصیت اور ان کا اسلوب تحریر بھی شبلی سے مختلف ہے، شبلی کے قلم میں بڑی رعنائی اور برنائی ہے تخیل میں رنگینی اور جذبہ میں حرارت اور تلملاہٹ ملتی ہے، جذباتی اور تخیلی فن کار کے یہ خاص صفات ہیں، یہ صفات فنون لطیفہ کے لئے جتنے کارآمد ہو سکتے ہیں، تاریخ تحقیق یا تنقید کے لئے نہیں! شبلی کی طرح سید صاحب کو بھی تاریخ سے بڑا لگاؤ تھا بہت زیادہ لگاؤ، کوئی مسئلہ ہو سید صاحب اس کے موجود کو اس کے ماضی میں تلاش کئے اور پرکھے بغیر نہیں رہتے تھے، سید صاحب کی کسی قسم کی تحریر ہو تاریخ کے حوالے اس میں ضرور ملیں گے، اور شاید یہ اسی کا فیضان تھا کہ واقعہ کچھ ہو شخصیت کسی کی ہو سید صاحب کا قلم اکثر و بیشتر چلتا تھا، اپنے ہی راستہ پر، اور اپنی ہی رفتار سے! جس میں ثابت قدمی اور ہمواری ملتی ہے،

سید صاحب تاریخی دیانت و امانت کا اس درجہ لحاظ کرتے تھے کہ ان کو اپنی تصانیف میں شاعری کرنے کی بہت کم فرصت یا مواقع ملتے تھے، وہ تحقیق اور تنقید میں جتنی احتیاط برتتے تھے، اور محنت کرتے تھے، اتنی ہی مطالعہ کرنے والے کے جذبات یا تخیل کو بے ضرورت تہمیز کرنے سے پرہیز کرتے تھے، تصانیف میں شبلی کا انداز مشرقی ہے، سید صاحب کا مغربی، دونوں کی ادبی شخصیت میں بھی یہ امتیاز نمایاں ہے بحیثیت طالب علم میں شبلی سے متاثر ہوا، اور بحیثیت معلم سید صاحب سے!

سید صاحب سے درخواست کی کہ موصوف کلب میں تشریف لاکر کسی موضوع پر تقریر فرمائیں، اسٹاف کلب اس طرح کی فرمائش کسی سے بہت کم کرتا ہے، تقریر کا موضوع غالباً فنِ تاریخ پر مسلمانوں کا احسان یا اس سے ملتا جلتا کوئی اور موضوع تھا، سید صاحب نے سوا گھنٹہ سے اوپر تقریر فرمائی، وہ لوگ جن کو اس موضوع سے خاص ذوق تھا، بیان کرتے تھے کہ سید صاحب کی نظر اس موضوع پر جتنی وسیع اور واضح ہے، اور جتنے متنوع اور مستند ماخذ سید صاحب کے علم میں ہیں، اتنے شاید ہی کسی اور کے علم میں ہوں، جس طرح بچے آٹوگراف لینے مشاہیر پر گرتے ہیں، اسی طرح سید صاحب سے لوگوں نے ماخذات نوٹ کئے۔

سید صاحب تقریر کرنے میں چہرہ باندھنے یعنی تمہید اٹھانے یا کسی نہ کسی معذوری کے بیان کرنے میں مطلق وقت نہ صرف کرتے جیسا کہ عام طور پر پیشہ ور مقرروں کا دستور ہے، کچھ گلے اور سینے کی تکالیف، کچھ سفر کی صعوبت، کچھ ملک وملت کی ابتری یا اپنی نااہلی کا تذکرہ کیا، اس کے بعد تقریر شروع کی۔ سید صاحب کبھی اس طرح کی باتیں نہ کرتے، اپنی جگہ سے اٹھے تقریر کرنے کی جگہ پر آکھڑے ہوئے، سلام علیکم کہا مذہبی موضوع ہوا تو بسم اللہ پڑھی، کلام پاک کی کوئی آیت نہایت سادگی اور احترام سے تلاوت فرمائی، اور تقریر شروع کر دی۔

آواز میں اتار چڑھاؤ نہ ہوتا، چہرے پر جذبات کی دھوپ چھاؤں نہ طاری ہونے دیتے، ہاتھ پاؤں نہ پٹخنے نہ پھینکتے، کوئی بلند یا بلیغ فقرہ کہہ کر اس کے متوقع نہ رہتے کہ حاضرین سے شور تحسین اٹھے، جیسا کہ اکثر لوگ کرتے ہیں، باتیں بڑی واضح کہتے، الفاظ وعبارت کی دھوم دھام نہ ہوتی، البتہ کبھی کبھی ایک آدھ فقرے رعایت لفظی کے ساتھ کہہ جاتے، لیکن یہ رعایت لفظی صرف تفریح ہی نہ ہوتی، بلکہ اس کے پیچھے کوئی بھید ہوتا، سید صاحب جس بات کو چھپا کر اجاگر کرنا چاہتے تھے، یا اجاگر کو چھپا کر کہنا چاہتے تھے، وہاں اس طرح کی مناسبات لفظی سے کام لیتے، سید صاحب کو رعایت لفظی سے تفریح ضرور ہوتی، بے تکلف اور مخلص لوگوں کی صحبت میں بڑی دیر تک ضلع جگت کا التزام رہتا، یہ مشغلہ رعایات اور مناسبات سے بھی بڑھنے لگتا، تو اور زیادہ ظلوظ ہوتے!

کہ وہ ایک ایسے شخص سے گفتگو کر رہا ہے جس کی معلومات روایتی ہیں، یا جس کا ذہن بندھے ٹکے خانوں میں اسیر ہو یا جس کے فکر و نظر کا دائرہ تنگ ہے۔ علی گڑھ میں جدید ترین افکار و اطوار سے مسلح اور مرصع نوجوانوں کو میں نے دیکھا کہ خالص علمی اور ذہنی سطح پر مولانا کی ہمسری نہ کر سکتے تھے، اور ہمیشہ یہ ہوا کہ وہ سید صاحب سے کچھ سیکھ کر ہی واپس گئے،

نوجوانوں کے ذہنی رجحانات کے بارہ میں ایک بار سید صاحب سے مفصل گفتگو آئی تھی، فرمانے لگے کہ ان مذہبی ماخذات پر عام نوجوان طالب علموں کو عبور نہیں، ان ماخذات سے متفرق و نامکمل باتیں جو یورپ میں تصانیف میں نظر آجاتی ہیں، وہ ان کو غلط راستہ پر لگا دیتی ہیں۔ یہ نوجوان ذہین اور اپنے افکار کے اعتبار سے مخلص ہوتے ہیں، یہ قیاس صحیح نہیں ہے کہ وہ طبعاً دین کی باتوں سے بیزار اور تاریخ و روایات سے بیگانہ ہوتے ہیں، لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ ان کو صحیح ماخذ، صحیح مفہوم اور صحیح سیاق و سباق بتانے والا کوئی نہیں، بات کچھ اور آگے بڑھی تو فرمانے لگے، اس صورت حال کی ذمہ دار ایک تاریخی حقیقت بھی ہے،

بات یہ ہے کہ صلیبی محاربات نے مغرب میں مسلمانوں کے خلاف ہر طرح کی قوتوں کو ابھارا، سیاسی تعصبات کی اور اخلاقی اعتبار سے یورپ میں تا حال مسلمانوں کو جس جس طرح مطعون و مغلوب کیا گیا، وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے، اس کے ساتھ ساتھ یورپ کے اہل فکر و نظر بالخصوص وہ جن کی ذہنی دنیا مذہبی تھی انھوں نے اسلامی تصانیف سے جہاں تہاں سے ایسے اقتباسات لئے جو ان کے تبلیغی تصنیفی پروگرام کے لئے مفید تھے، ہر کسان علوم کی ابتدائی تاریخ تقریباً یکساں رہی ہے، یعنی مذہبی طبقہ تصنیف و تبلیغ کا اجارہ دار رہا ہے، اور یہ مصنفین کا یہ طبقہ اکثر دانستہ اور کبھی کبھی نادانستہ طور پر اپنی غرض کو زیادہ پیش نظر رکھتا ہے، حقیقت کو کم، پھر کچھ عرصے سے رہا ہے کہ کس طرح کے اقتباسات کہاں سے لے کر کس طرح کے نقشے اٹھائے جا سکتے ہیں، یا اٹھائے گئے ہیں، اور انگریزی سلطنت اور انگریزی زبان کے عروج کے ساتھ یہ غلط بیانیاں کہاں کہاں پہنچیں، اور کیا رنگ لائیں،

ایک بار کسی کمیٹی یا شعبہ کی میٹنگ میں شرکت کرنے تشریف لائے تھے، یونیورسٹی اسٹاف کلب کے ممبروں نے

کیوں اور کیسے سید صاحب نے کچھ دنوں کے لئے دارالمصنفین سے علحدہ ہو کر بھوپال میں ملازمت کر لی جو باعث سید صاحب خود ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس کو ان کے سامنے میں کسی شکل میں نہیں چھیڑتا تھا، نہ اس ٹوہ میں رہتا کہ کیا ہوا، اور کیوں ہوا، میرے روبرو سید صاحب کی کے معاملات میں اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ بھی تمام عمر رہا تا وقتیکہ مجھے اس کا یقین نہ ہو جاتا کہ وہ اپنی دشواری میرے سامنے اس لئے نہیں پیش کرتے تھے کہ ان کے خیال میں اس سے میرے تردّدات میں اضافہ ہونے کا امکان تھا۔ ایسی صورت میں ان کے فکر و پریشانی کا پتہ لگانے کی ضرور کوشش کرتا ہوں

سید صاحب بھوپال تشریف لے گئے تو وہاں سے ایک خط لکھا جس میں اس کا بالکل تذکرہ نہیں کیا تھا کہ انھوں نے دارالمصنفین کیوں چھوڑا، اور بھوپال کی ملازمت اختیار کرنے کا باعث کیا ہوا، بلکہ کچھ اس طرح کی باتیں تھیں کہ بھوپال میں وقت کس طرح کٹتا تھا، کام کرنے کے امکانات کیا تھے، آیندہ کا پروگرام کیا ہوگا، وغیرہ البتہ یہ بات ظاہر ہوتی تھی کہ بھوپال میں زیادہ دنوں قیام کرنے کا ارادہ نہ تھا۔

عرصہ ہوا میں نے ایک بار سید صاحب سے عرض کیا تھا کہ وہ کسی طرح علی گڈھ آ جائیں۔ جہاں ان کی بڑی ضرورت تھی چنانچہ جب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب وائس چانسلر ہو کر علی گڑھ تشریف لائے تو موصوف بھی اس کے کوشاں ہوئے کہ سید صاحب علی گڑھ آ جائیں لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب سید صاحب ارادہ کر چکے تھے کہ وہ پاکستان ضرور چلے جائیں گے بھوپال کے قیام کے دوران میں میں نے عرض کیا تھا کہ جس طرح یا جس لئے سید صاحب نے اپنی پوری زندگی دارالمصنفین کے لئے وقف کر دی تھی، وہ مسلم ہے لیکن مسلم یونیورسٹی میں رہ کر کام کرنا اور اس کی شہرت میں اضافہ کرنا، اس نصب العین کے خلاف نہ تھا جو ان کے سامنے تھا، کام کی نوعیت دونوں جگہ تقریباً یکساں تھی، علی گڑھ میں قیام کا فائدہ یہ تھا کہ نوجوان طالب علم ان کی تصنیفات ہی سے نہیں ان کی شخصیت سے بھی بہرہ مند ہوتے۔

ملک کی فضا ان دنوں کچھ ایسی ہو رہی تھی کہ سید صاحب کا بھوپال میں زیادہ دنوں تک قیام نہیں ہو سکتا تھا، میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ جب میکدہ چھٹا تو پھر حرج کیا ہے، مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو، لیکن سید صاحب نے لکھا، یوں تو ہوتا وہی ہے جو اللہ کی مرضی ہوتی ہے لیکن یہ بات دل میں بار بار آتی رہی کہ سید صاحب

سید صاحب تقریر کرنے میں کہیں اٹکتے نہ تھے۔ اچھے سے اچھے مقرر بھی کبھی کبھی جملہ میں مبتدا اور خبر کو مربوط نہیں کر پاتے تو ذرا دیر اٹکتے الجھتے ہیں، سید صاحب کی تقریروں میں شاید کبھی کوئی ایسا موقع آیا ہو، ایسا معلوم ہوتا جیسے پوری تقریر قلم بند ہو جیسے وہ اطمینان و اعتماد سے دہرا رہے ہوں، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ سید صاحب کی تقریر کب ختم ہوگی کسی قدر لمبی تقریر کرتے تھے، تقریر کے کچھ ایسے ماہر بھی نہ تھے لیکن تعجب یہ ہے کہ اُن کی تقریر سے دل اکتاتا نہ تھا، ہر مجمع میں کچھ نہ کچھ ایسے بے شکرے ضرور ہوتے ہیں جو زیادہ دیر تک خاموش اور سنجیدہ نہیں بیٹھ سکتے، کوئی جادو بیان مقرر ہو اور موضوع دلچسپ تو مجمع دیر تک خاموش رہ سکتا ہے، اور لطف اندوز بھی ہوتا ہے لیکن سید صاحب یقیناً مقرروں کے اس زمرہ میں نہیں آتے تھے جن کو جادو بیان تو کیا غیر معمولی بھی کہا جا سکے، وہ تقریر کے فن و فسون سے بے نیاز تھے لیکن ان کی باتوں میں اثر ہوتا تھا اور ذہن کے کسی نہ کسی حصہ میں اتر جاتی تھیں۔

ان تقریروں میں بڑا خلوص، بڑا وزن اور بڑی سادگی ہوتی تھی، سننے والوں کو اس پر اعتماد ہوتا کہ سید صاحب کوئی ایسی بات نہ کہیں گے جس کے ثبوت میں قوی سے قوی سند نہ پیش کر سکتے ہوں، سید صاحب سے اختلاف کرنا بڑا مشکل تھا خواہ معاملہ ہو علمی یا اجتماعی ہو، وہ بڑی جچی تلی اور شریفانہ رائے دیتے تھے، مجھے تقریر سننے کا بالکل شوق نہیں لیکن بعض لوگوں کی تقریر ضرور سنتا ہوں اس لئے کہ اس کا یقین ہوتا ہے کہ یہ کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور کہیں گے جس سے میں فائدہ اٹھاؤں گا ان میں سے سید صاحب ایک تھے۔

مذہب کی بات ہو یا سیاست کی، علمی مسائل ہوں یا کوئی اور بحث، سید صاحب بڑی سنجیدگی سے اظہار خیال کرتے تھے، اور دوسروں کا نقطۂ نظر سننے میں بڑے تحمل سے کام لیتے تھے، بحث میں وہ کبھی جز بز نہ ہوتے، بلند آواز سے گفتگو نہ کرتے، کسی کی بات نہیں کاٹتے تھے، کوئی پھبتی، فقرہ یا دل آزاری کی بات نہ کہتے، گفتگو میں کوئی کتنا ہی ناواجب لب و لہجہ کیوں نہ اختیار کرتا، سید صاحب کے رکھ رکھاؤ میں ذرا فرق نہ آتا تھا۔

سید صاحب کا تعلق دار المصنفین سے تقریباً ۳۰-۳۲ سال تک رہا، ان کی قیادت میں اس ادارہ کا یہ زمانہ نہ صرف علمی اور کارگزاری کے اعتبار سے بڑا شاندار رہا، مجھے یقین نہیں ہے کہ مستقبل قریب میں دار المصنفین کو یہ درجہ حاصل ہو سکے گا

ذمہ داریون کو بھی سمجھنے اور نباہنے کی توفیق نہین رکھتے، دنیا و عقبیٰ زمان و مکان کے اعتبار سے کتنے ہی مختلف ہون لیکن یہ دونون انسانی زندگی ہی کے دو رُخ ہین اور انسان کے نتائج اعمال ہی کا نام عقبیٰ ہے، اس لئے ایک مسلمان کے لئے دنیا کا مرحلہ عقبیٰ سے بھی زیادہ سخت ہے، اور جو شخص دنیاوی ذمہ داریون سے خوش اسلوبی سے عہدہ برآ نہین ہوسکتا، وہ عقبیٰ مین بھی کامیاب نہین ہوسکتا،

اس بحث کو مین پھیلانا نہین چاہتا کہنا صرف یہ چاہتا تھا کہ ادھر کچھ عرصہ سے ہمارے طبقہ مین جس نا اہل کو نفع یا نمود کی کہین گنجایش نہین نکلتی وہ اس مقصد کے لئے مذہب کو آلہ بنا کر ملک و ملت کا محسن بن جاتا ہے، سید صاحب کس درجہ مذہبی آدمی تھے لیکن کس طرح ان باتون سے دور تھے، اس کا خیال کرتا ہون تو اُن کی یاد سے دل تر و تازہ اور روح بالیدہ ہوجاتی ہے،

مذہبی معاملہ مین سید صاحب کا رویہ نہایت شریفانہ، دانشمندانہ اور عالمانہ ہوتا، اُن کی ذاتی قومی تصنیفی، مذہبی زندگی اس پر گواہ ہے، کہ انھون نے اسلام اور اسلامی زندگی کی حفاظت و حرمت مین اپنی بہترین صلاحیتین بے دریغ صرف کین لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھون نے جہان تک بن پڑا، مذہب کو خود غرض لوگون کے ہاتھون مین کھلونا بننے نہین دیا، مجھے جس بات پر سب سے زیادہ حیرت ہوتی ہے، اور اسی اعتبار سے سید صاحب کی وقعت بڑھ جاتی ہے، وہ یہ کہ باوجود اس کے کہ سید صاحب کی تعلیم و تربیت کسی ماڈرن یونیورسٹی مین نہین ہوئی تھی، بلکہ کلیتہً قدیم طور طریقون پر ہوئی تھی مگر وہ یونیورسٹی کے مقصد، معیار اور وقار کا کتنا احترام کرتے تھے[۱]! تفصیلات مین جانا نزاکت سے خالی نہین لیکن اتنا کہنے مین مضائقہ بھی نہین کہ انھون نے اکثر مواقع پر یونیورسٹی اور اس کے خدمت گذارون کی آبرو بڑی دلیری اور قابلیت سے بچائی!

یونیورسٹی مین رہ بس جانے کے سبب سے مین نے مسلمانون کی گذشتہ ۲۰-۲۵ سال کی سیاسی اور مذہبی سرگرمیون کا مشاہدہ بڑے اطمینان سے کیا ہے، اطمینان سے یون کہ مجھے ازل سے ایمان، عقل، آرٹ وغیرہ

[۱] دارالمصنفین تشریف لانے سے پہلے سید صاحب دکن کالج پونا مین پروفیسر تھے۔

آگئے ہوتے تو بحثیت مجموعی اس سے بہتر ہوتا جو بعد میں پیش آیا!

سید صاحب بڑے سمجھدار شریف اور محبت کرنے والے انسان تھے، اُن کی خدمت و خاطر کرتے میں مجھے بڑی لذت اور بڑائی محسوس ہوتی تھی، کسی ذاتی معاملہ میں میرا ان کا کبھی سابقہ نہ ہوا، ہوتا تو مجھے اپنے اوپر تو اعتماد نہیں لیکن سید صاحب کے بارہ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ میری خاطر وہ سب کر ڈالتے جو شاید اپنے لئے نہ کرتے، سید صاحب اپنی بڑائی اشارۃً یا طرفۃً کبھی نہیں بیان کرتے تھے، اور دل کھول کر کسی اور کی بڑائی بھی کم ہی کرتے تھے!

فطرۃً سید صاحب خاموش، قناعت پسند اور عافیت جو تھے، وہ اپنے بچوں اور ساتھیوں کے ساتھ ہنس بول لینے میں زندگی کی تفریح پا لیتے تھے، اور خوش ہونے کے لئے کسی بڑی تقریب کے منتظر رہتے تھے، چھوٹی خوشیوں میں بڑی خوشیاں ڈھونڈھ لیتے اور پا لیتے، یہ بہت بڑی صفت اور نعمت ہے، اور بہت کم لوگوں کے حصہ میں آتی ہے!

میں نے اکثر یہ بھی محسوس کیا جیسے سید صاحب کسی قدر حزیں رہتے ہوں، کیوں اور کیسے یہ نہیں بتا سکتا، یہ میں نے کبھی اُن سے پوچھا بھی نہیں لیکن یہ حزن، ان میں طبعی نہ تھا، اس لئے کہ جب کبھی ملول نہ ہوتے تو صاف معلوم ہوتا کہ طبعاً شگفتہ مزاج ہیں، سید صاحب کے ہنسنے کا انداز ایسا تھا، اور اس آسانی سے وہ ہنس پڑتے تھے کہ اُن کو کوئی الم پرست، خشک مزاج، یا کم آمیز نہیں کہہ سکتا تھا، ممکن ہے یہ زندگی کے آخری دور کے تغیرات کا نتیجہ ہو!

مذہب کا بہ پابندی کرنے والوں سے میں ذرا کم ہی یا واللہ رکھتا ہوں، ایسے لوگوں کو میں نے بالعموم احساسِ کمتری کا شکار پایا، اور یہ احساس انسان کے خصائل کو ایسا مسخ و ماؤف کر دیتا ہے کہ شرافت وشجاعت، درگذر، دردمندی اور اس طرح کی دوسری انسانی صفات جو مذہب و اخلاق کی روح ہیں اکثر ان لوگوں میں نہیں پائی جاتی ہیں، جو اپنے آپ کو مذہب کا اجارہ دار بتاتے ہیں، اور ان اخلاقی خرابیوں میں ان کو مبتلا پایا جن سے مذہب نے روکا ہے،

میرے ذہن میں اکثر یہ بات آتی ہے کہ مذہب بالخصوص اسلام جیسے مذہب کی پیروی کے لئے جس احساس ذمہ داری، اور احترامِ انسانیت کی ضرورت ہے وہ ایسے لوگ کیسے پورا کر سکتے ہیں، جو زندگی کی نہایت درجہ معمولی

نظر آتے ہیں!

ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مرنے والوں کے سوانح زندگی کو سید صاحب کسی بیاض میں بڑی پابندی اور احتیاط سے قلم بند کرتے رہے ہوں، اور وقت آنے پر اُن کو معارف میں نقل کر دیتے ہوں، سید صاحب میں یہ بات مجھے نہایت غیر معمولی نظر آئی، یعنی اُن کا حافظہ کتنا قوی اور کس درجہ مرتب تھا کہ ۳۰۔۴۰ سال کے واقعات بقید سال و ماہ و مقام بے تکلف اس طرح لکھتے جاتے، جیسے اُن کے سامنے وقوع میں آ رہے ہوں، میں اسلئے کہہ رہا ہوں کہ مجھے اس کا یقین ہے کہ مرنے والے کا وہ بہی کھاتہ نہ رکھتے ہوں گے، بلکہ ساری باتیں اُن کے حافظہ میں نقش کی طرح محفوظ ہوں گی!

ان مضامین کے لکھنے میں سید صاحب بہت زیادہ احتیاط ملحوظ رکھتے تھے، بہت کم ایسا ہوا ہے جہاں وہ واقعاتی حدود سے بے اختیارانہ تاثرات کے حدود میں چلے گئے ہوں، ان مضامین کے بارہ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں سید صاحب وہ فضا نہیں پیدا کر سکے یا پیدا نہیں ہونے دیتے تھے جس کے بغیر یہ مضامین اتنے موثر نہیں ہوتے، جتنا ہونا چاہئے، اور جس کا اس طرح کے مضامین تقاضا بھی کرتے ہیں، اس نوعیت کے مضامین کی حیثیت تاریخی دستاویز کی اتنی نہیں ہوتی، جتنی ایک طرح کی نذر عقیدت کی، تاریخی دستاویز میں ذاتی تاثرات کا دخل نہ ہونا چاہئے لیکن جہاں ایک اعتبار سے نذر عقیدت پیش کی جا رہی ہو، وہاں ذاتی تاثرات کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے، ان مضامین کو جہاں تاریخی دستاویز ہو کر نہ رہ جانا چاہئے، وہاں خالص شاعری کے رنگ میں رنگا بھی نہ ہونا چاہئے، یہ تاریخ اور شاعری کے درمیان کی ایک چیز ہے، جو تاریخ نہ ہونے کے باوجود تاریخ کی جگہ لے سکتی ہے، اور شاعری نہ ہونے کے باوجود شاعری کے تقاضے پورا کرتی ہے،

یہاں میں ایک بار پھر اپنی عقیدت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ سید صاحب کا حافظہ کتنا قوی ذہن کتنا مرتب [illegible] کتنا بیدار اپنے اور بے گانوں سے تعلقات کتنے شریفانہ اور ان کی شخصیت انسانیت کا کیسا اچھا نمونہ تھی کہ وہ اتنے پاکیزہ اور متوازن مضامین وفیات کے تحت لکھتے تھے!

کا جو حصہ ارزانی ہوا تھا، وہ ذرا دلچسپ ہی تھا، اس لئے کوئی تحریک یا ہنگامہ کہیں اٹھتا، کیا ہی اٹھتے، مین اپنا بہرہ کو بچائے رکھنے کی فکر کرتا تھا، یعنی نہ ان تحریکوں اور ہنگاموں سے کبھی آنکھ چرائی کی، نہ زور آزمائی، نتیجہ یہ ہوا کہ عقل صحت آبرو سب بحال رہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ قومی تحریکون مین بیشتر سیاست دانون نے عوام علماء اور طلبا کو آنکھ بند کرکے اور جی کھول کر اپنے اغراض کے لئے استعمال کیا، پھر یہ ہوا کہ پانسہ پلٹا اور عوام علما، اور طلبا کے بھی دن پھرے، اب انھون نے سیاست دانون کی خبر لینی شروع کر دی ہے، کہین اور کا مجھے علم نہین لیکن ہندوستان اور پاکستان مین یہی دیکھنے مین آرہا ہے، کہین کم کہین زیادہ۔

سید صاحب نے شروع سے سیاست مین حصہ لیا، اور جنگ بلقان سے لیکر تقسیم ہندوستان تک ہر کی سیاسی اور قومی تحریکون کی نیچ اونچ مین شریک رہے، کم خوش نصیب ایسے ہون گے جنھون نے سید صاحب کی طرح سیاست مین مسلسل حصہ لیا ہو، اور سیاست کی آلائشون سے پاک رہے ہون، سیاست کے وسیلے کسی منصب پر پہنچنے کے کبھی درپے نہ ہوئے، انھون نے اپنے لئے جو بلند سطح چند دن اختیار کر لی تھی، اسی پر آخر دم تک قائم رہے، یہ سید صاحب کا بہت بڑا کارنامہ ہے، انھون نے تمام عمر رائے عامہ کو صحیح تربیت دینے مین صرف کی معمولی طریق پر نہین، بلکہ اپنی بلند پایہ تصانیف اور تقریرون سے اور اپنی سیرت کی پختگی اور پاکیزگی سے سید صاحب ہماری قومی زندگی مین کس درجہ دخیل رہے ہین، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہین ہے، اس کے ساتھ ساتھ یہ کتنی بڑی بات ہے کہ اس [illegible] سے تعلق رکھتے ہوئے [illegible] رکھتے تھے، سید صاحب کی تحریر و تقریر یا تصنیف سے کوئی فتنہ نہین کھڑا ہوا۔

کچھ عرصہ سے سید صاحب نے وفیات کے عنوان سے معارف کے صفحات پر اہم شناسا شخصیتون کی وفات کا تذکرہ تفصیل سے لکھنا شروع کر دیا تھا، یہ مضامین ہر اعتبار سے بڑے [illegible] اہم ہوتے تھے، اور ہر حلقہ مین بڑی وقعت کی نظر سے دیکھے گئے، سید صاحب کو تاریخ اور سیرت مین جیسی بصیرت تھی، اس کی بڑی اچھی جھلک ان تحریرون مین ملتی ہے، کس حسن ترتیب اور تفصیل سے ان مرحومین کی زندگی کے واضح نقوش ان صفحات پر [illegible]

شکل صورت، وضع قطع، چال ڈھال بات چیت ہر اعتبار سے سید صاحب کی شخصیت بڑی دل آویز اور
قابل احترام تھی، اُن کو دیکھ اور پاکر ایک طرح کی تقویت محسوس ہوتی تھی کہ وہ شفقت کریں گے، رسوا نہ کریں گے؟
ہمیشہ ساتھ رہیں گے، زندگی میں بڑائی اور حلاوت محسوس ہوگی، جیسے وہ اپنی طرح طرح کی ذمہ داریوں کا
احساس رکھتے ہیں، اپنی ہی سنیں، ہماری ذمہ داریوں کا بھی احساس، وہ ہمیشہ صاف ستھرے رہتے تھے، ظاہری
اور باطنی دونوں اعتبار سے؛

لباس، بستر، ساز و سامان صاف ستھرا، اور سجل رکھتے تھے، اور ہر ایک میں کوئی نہ کوئی نفاست بھی ہوتی
تھی، بندکا کبھی میلا کچیلا بڑا اجڑا نہ ہوتا، ہینڈ بیگ چمڑے کا پرانا لیکن ستھرا اور پالش کیا ہوا تکیہ کا غلاف اور
اور نہایت صاف اوڑھنے بچھانے کا سامان آرام دہ اور خوشنما، لوٹا گلاس، ناشتہ دان صابون دان سب
صاف ہوا، تولیہ لمبا چوڑا، بڑا اور بہت صاف دھلا ہوا، سفر کتنا ہی مختصر ہو بکس میں پہننے اوڑھنے بچھانے کا کافی
سامان رکھتے تھے، کلام پاک اور اوراد و وظائف کی کتاب بڑے ستھرے اور خوبصورت جزدان میں ہوتی، عبادت
سے چھپ کر کرتے، جس کے مہمان ہوتے، اس کے لئے تحفہ ضرور لیجاتے، تشریف لاتے تو نام بنام سب کی خیریت
پوچھتے، اور چونکہ وہ میرے ہی دیار سے آئے ہوتے، اس لئے میرے تمام دوستوں، عزیزوں اور بزرگوں کی خیریت
سے کسی کا پیغام سناتے کسی کا تحفہ اور کسی کی فرمایش پہنچاتے، فرمایش ساتھ کر دیجاتی، تو بڑی خوشی کے ساتھ
لے، اور بڑی حفاظت سے پہنچا دیتے!

سفر میں نوکر ہمراہ نہ ہوتا، ہر کام خود کر لیا کرتے تھے، جہاں ٹھہرتے وہاں ہر شخص ہر خدمت کے لئے حاضر
ہوتا، میں نے یا تو ہمیشہ سپید عمامہ میں دیکھا، یا آج کی صحبت میں سفید دو پلیہ ٹوپی میں جو مجھے سید صاحب پر خاص
طور سے بڑی دلکش نظر آتی، کپڑا ہمیشہ بہت اچھا سلا ہوا پہنتے، اور دوسرے ہی دن شاید بدل دیتے تھے، اس
زمانے میں سید صاحب کے جسم پر میلا تو درکنار کبھی ملگجا لباس بھی نہیں دیکھا، موزہ بالعموم پہنتے، جو ہمیشہ صاف و شفاف
اور رومال نہایت صاف رکھتے تھے، اور بہت جلد بدل دیتے تھے،

ایک زمانہ سید صاحب پر ایسا آیا، جب ان پر دامانگی سی طاری رہنے لگی تھی، ذہنی اور جسمانی دونوں۔ اس زمانہ میں علی گڈھ بہت کم تشریف لائے۔ علی گڈھ سے باہر بھی کبھی ملاقات ہوئی۔ تو میں نے ان کو تھکا تھکا سا پایا۔ غالباً یہی دور تھا جب وہ حضرت مولٰنا اشرف علی صاحب مرحوم و مغفور کے آستانہ مبارک پر اکثر حاضر ہوتے تھے، حضرت مرحوم سے شیفتگی بے اندازہ بڑھ گئی تھی، زیادہ وقت اوراد و وظائف اور عزلت میں گزرنے لگا تھا، ممکن ہے یہی یا اس کے آس پاس کا وہ زمانہ بھی رہا ہو جب سید صاحب کو دل کی کچھ تکلیف ہوئی تھی، یہ بھی یاد آتا ہے کہ یہ زمانہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں بڑے انتشار کا تھا، مجھے سید صاحب کے اس رجحان سے بڑا تردد ہوا، میں نے ایک موقع پر سید صاحب کو غالباً انہی کا ایک فقرہ یاد دلایا تھا کہ آپ کیا کر رہے ہیں، جب جہاد کی صف کو مرتب اور مضبوط کرنے کا وقت آیا تو آپ خانقاہ کی آبادی بڑھانے لگے۔

سید صاحب میرے اس طرح کے فقروں یا خطوط کا جواب نہیں دیتے تھے، دوستوں اور عزیزوں سے اُن کی خیریت دریافت کرتا تو یہی معلوم ہوتا کہ بے دلی اور افسردگی کا وہی عالم ہے، پھر خط لکھتا، کبھی کبھی لہجہ خفگی کا بھی ہو جاتا، لیکن سید صاحب کے ہاں سے کوئی جواب نہ آتا، ایک دفعہ علی گڈھ آ گئے، طبیعت بحال تھی، میرا جی چاہا کہ اپنے پچھلے خطوط کی یاد دلاؤں، سید صاحب نے خود اس قصہ کو چھیڑا، میں نے اپنے رویہ کی معافی مانگی، کہنے لگے نہیں نہیں، باتیں سب ٹھیک تھیں، لیکن آپ کو کیا معلوم کہ مجھ پر کیا عالم گذرا، پھر مسکرا کر فرمایا

"دیوانگی ہم عالمے دارد"!

میں بھی ہنس پڑا اور سید صاحب کو کسی قدر شگفتہ پا کر عرض کیا، سید صاحب ایک بات آپ سے کہے بغیر نہ رہوں گا وہ یہ کہ جو لوگ آپ کے منصب کو پہنچ چکے ہیں، اُن پر کچھ ہی کیوں نہ گذر جائے، وہ کسی حال میں اپنی پسپائی کا اظہار یا اعلان میرے جیسے گئے گذرے لوگوں کی طرح اور اُن کے سامنے نہیں کر سکتے، آپ کو تو اسی جگہ کھڑا رہنا ہے جہاں آپ کی اُمت آپ کو کھڑا دیکھنا چاہتی ہے! سوال یہ نہیں ہے کہ آپ پر کیا گذرے گی، سوال یہ ہے کہ آپ کی اُمت کدھر جائے گی، سید صاحب نے بات ہنسی میں ٹال دی،

ہوں جو دسترخوان کے آداب سے واقف ہوں اور ان کو برت سکتے ہوں، کھانے پر کھانے سے یا کھانے والوں کے ساتھ تخریب حالت یا بے تکلفی برتنا بڑی کم سمجھی کی بات ہے جس کو لوگ بے تکلفی سمجھتے ہیں، وہ بڑا نازک مرحلہ ہے اس نزاکت کو سمجھنا اور نباہنا بڑا مشکل کام ہے، بے تکلفی کا تعلق فن سے نہیں تہذیب سے ہے! کھیل میں کھانے پر اور سفر میں ہر شخص کا عیب و ہنر کھل جاتا ہے، خواہ وہ اس کے چھپانے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرے، میں نے سید صاحب کو میزبان اور مہمان دونوں حیثیتوں سے برتا ہے، اور دونوں اعتبار سے وہ میری میزان پر پورے اترے ہیں، سید صاحب کی جو بڑائی میرے دل میں ہے، اس میں سید صاحب کی اس خوبی کا خاصہ اونچا درجہ ہے!

سید صاحب نے دارالمصنفین کا کام غالباً ۱۹۱۵ء میں سنبھالا، اس وقت سے لیکر تقسیم ملک تک کم و بیش ۳۲ سال وہ اس ادارہ میں یا یہ ادارہ سید صاحب میں اس طرح گھلے ملے رہے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے تمیز کرنا مشکل تھا، دارالمصنفین کا خیال کیجئے تو ذہن خود بخود سید صاحب کی طرف منتقل ہوتا تھا، اور سید صاحب کو دیکھئے تو دارالمصنفین سامنے آجاتا تھا، کسی ادارہ کی روایت و شخصیت اسی طرح وجود میں آتی اور برگ و بار لاتی ہے!

شبلی منزل ایک خالص علمی ادارہ ہونے کے علاوہ زندگی کی بہت سی دوسری اعلیٰ و صحت مند سرگرمیوں کا بھی گہوارہ تھا، کتنے دانایان سیاست، ارباب فضیلت، اور شیدایان شعر و ادب یہاں سے نسبت رکھنا اپنے لئے امتیاز سمجھتے تھے، جن دوستوں کو شبلی منزل میں قیام کا اتفاق ہوا ہے، اور جنہوں نے وہاں کی مدارات و مہمان نوازی رفقا کا آپس کا میل محبت اور کام کرنے کا شغف دیکھا ہے، وہ بتا سکیں گے کہ اعظم گڈھ کا یہ مختصر سا خطہ جو کسی طرح ایک اوسط درجہ کے باغ کے رتبہ سے زیادہ نہیں ہے، شمالی ہند کی روایتی تہذیب و دانش و بینش کی نہ صرف نمائندگی کرتا رہا، بلکہ اس میں خاطر خواہ اضافے کرتا رہا!

کوئی مہمان عزیز آجاتا تو دارالمصنفین کے سارے لوگ ایک دسترخوان پر کھانا کھاتے، کھانے متنوع اور بہت اچھے پکے ہوتے، نیچے پایہ کی ہموار اور یکساں چوکیوں پر نہایت تکلف سے اعلیٰ درجہ کا سفید دسترخوان بچھایا جاتا جس پر بڑے خوبصورت اور ستھرے برتنوں میں یہ کھانے چنے جاتے، لوگ حسب مراتب قالین اور چاندنی پر

کھانا بڑے سلیقہ سے کھاتے تھے، اور دسترخوان کے آداب اس خوبی اور نفاست سے برتتے تھے کہ دل خوش ہو جاتا تھا، جو چیز جتنی چمچے میں آجاتی، اتنی ہی پلیٹ میں رکھ لیتے، کھانا کتنا ہی لذیذ یا ان کا مرغوب کیوں نہ ہوتا، تھوڑا ہی، جی چاہتا تو تھوڑا سا دوسری بار بھی لے لیتے، جو چیز پسند آجاتی اس کی بڑے شگفتہ اور شریفانہ انداز سے تعریف کرتے، دسترخوان پر زیادہ سے زیادہ آدمیوں کو مخاطب کرکے نرم لہجہ میں لطف و محبت کی باتیں کرتے، جن دوستوں نے شبلی منزل کی صحبتیں اور وہاں کی مہمان نوازی دیکھی ہے، وہ جانتے ہوں گے کہ دسترخوان پر سید صاحب کا رکھ رکھاؤ کوئی نئی یا تعجب کی بات نہ تھی!

سید صاحب میں ایک خوبی ایسی تھی جس کی میں دل سے قدر کرتا ہوں یعنی مہمان ہو کر وہ میزبان کے فرائض غصب کرکے اپنی ضیافت و حکم برداری میں نہیں لے لیتے تھے، جیسا کہ اکثر نہایت درجہ سرگرم اور مخلص مہمان کیا کرتے ہیں یعنی خود ہر کھانا میزبان کے سامنے پیش کرنا، اور اصرار کرنا کہ وہ ضرور کھائے اور نہ کھائے تو یہ بتائے، اور وجہ بتائے تو یہ تعزیت کا رزولیشن پاس کریں، یا کوئی چورن تجویز کریں!

اس طرح کی باتیں بیان کرنا ضروری نہ تھا لیکن میں کسی آدمی کی سیرت اور شخصیت کا اس سے بھی اندازہ لگاتا ہوں کہ وہ میزبان یا مہمان کی ذمہ داریوں سے کس طرح عہدہ برآ ہوتا ہے اور کس حد تک دسترخوان کے آداب ملحوظ رکھتا ہے، میں اپنے مہمان سے خواہ ان میں محترم خواتین ہی کیوں نہ ہوں، حتی الوسع اصرار نہیں کرتا کہ وہ فلاں چیز ضرور کھائیں، یا کتنی کھائیں، کھانا سامنے ہے، اور انہی کے لئے ہے، بڑے شوق اور اخلاص سے پیش کیا جا رہا ہے، اب اگر وہ اس درجہ شرمیلے شاندار اور سادہ لوح واقع ہوئے ہیں کہ بغیر قول قسم یا منت سماجت کے کچھ نہیں کھانا چاہتے، تو ذمہ داری اُن کی ہے، میری نہیں، میں مہمان کا خیر مقدم کرتا ہوں، اس لئے کہ میں اُس کی طرح طرح سے خدمت اور خاطر کروں گا، اور اپنے طور پر اپنے لئے خوش ہونگا اس لئے کہ مہمان کو کھانا کھلانے سے ثواب ملتا ہے، اور عاقبت سنورتی ہے!

میں سمجھتا ہوں کہ ہم میں بہت کم لوگ ایسے ہیں خواہ وہ کتنے ہی پڑھے لکھے یا ملک و ملت میں مقتدر کیوں نہ

ان نمبر
ہوار ہو جاتی ہے، پھر فرمانے لگے ہمارے ہاں بچوں کو تعلیم دینے اور ان کا اخلاق سدھارنے کا کام یا تو ماسٹر کے رہے یا ملاؤں کے، اور دونوں ایسی معاشی زبوں حالی اور اس کے عواقب میں مبتلا ہوتے ہیں کہ وہ ایسی اہم خدمات کانے سے انجام نہیں دے سکتے، جہاں سب سے زیادہ ذمہ داری کا کام سب سے معذور ہاتھوں میں دیا جائے گا، وہاں اح و فلاح کی کیا صورت نکل سکتی ہے،

یہ رات مجھے خاص طور پر یاد رہ گئی ہے، وقت زیادہ گذر گیا تھا، اور سید صاحب تہجد کی تیاری کرنا چاہتے تھے، میں اٹھ کھڑا ہوا، تو فرمانے لگے،

"رشید صاحب! شب آخر گشت و افسانہ از افسانہ می خیزد"! زندگی کا بھی عجیب ڈھنگ ہے جب کچھ باتیں قابو میں آنے لگتی ہیں، اور حوصلہ ہوتا ہے کہ اب انھیں پیش کریں گے تو رخصت ہونے کا پیغام آجاتا ہے جس شوق اور محنت سے جو کچھ دیکھا سیکھا پڑھا تھا، اب وہ برگ و بار لانے والا تھا کہ عمر کا آفتاب غروب ہونے لگا، اس برگ و بار کا کیا ہوگا، جب سے تمدن کا آغاز ہوا، اور جب تک دنیا کا کارخانہ قائم رہے گا، اس طرح کے کتنے حسرتناک سانحے پیش آتے رہے ہیں، اور آتے رہیں گے،!!"

میں گھبرا سا گیا، سید صاحب کے اس موڈ (کیفیت ذہنی) سے میں خود بچنا چاہتا تھا، اور سید صاحب کو بھی بچانا چاہتا تھا، میں نے کہا سید صاحب آپ کے دل میں جو بات آئی ہے کون ایسا شریف اور صاحب علم و فن ہے جس کے دل میں نہ آئی ہوگی، عظیم شخصیت اور عظیم فن کار اس کیفیت میں مبتلا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا لیکن آپ تو اللہ کی مشیت و مصلحت کے مجھ سے زیادہ قائل ہیں، یہی نہیں بلکہ مجھے اس کا بھی یقین ہے کہ آپ بہتوں سے زیادہ اس کے مقرب بندوں میں ہیں، آپ اس کا غم کیوں کریں کہ آپ جتنا دیکھتے تھے، وہ نہ سکے، غم اسے ہو جس نے ایسا ہونے نہ دیا!

جب تک ارادہ اور عمل آپ کے بس میں رہا، آپ نے فرائض کے ادا کرنے میں کوتاہی نہ کی، بلکہ فرض سے زیادہ کر دکھانے کے آرزومند رہے، جب آپ کو یا مجھے کار آمد و کارآفریں رکھنے کے بجائے معطل و معزول کر دیا گیا (موت

چوکیوں کے گرد بیٹھ جاتے، سید صاحب میزبانی کے فرائض انجام دیتے، یہ تقریب اس طرح کی تقریب محض کھانے پینے کی نہ ہوتی، بلکہ اس سے آدمی کی بہت سی ذہنی گتھیاں سلجھ جاتیں، اور زندگی کی جد وجہد میں حصہ لینے کا حوصلہ پیدا ہو جاتا :

مل جل کر بیٹھنے کھانے پینے اور بات چیت کرنے کے فوائد کا اندازہ بہت کم لوگ کر سکتے ہیں، علی گڈھ کی جن خصوصیات اور خوبیوں کو متفقہ طور پر سراہا گیا ہے، ان کو بروئے کار لانے میں علی گڈھ کی اس روایت کو بڑا دخل ہے کہ یہاں ساتھ کھانا کھانے اور دسترخوان کے پورے آداب برتنے کا خاص طور پر التزام رکھا جاتا ہے :

رات میں میرے ہاں جب کھانا ختم ہو لیتا اور سید صاحب کے معتقدین اپنے گھروں کو چلے جاتے تو بعض مسائل پر اطمینان سے دیر تک گفتگو ہوتی، کوئی اور نہ ہوتا، اس لئے سید صاحب سے بات کرنے میں میں ذرا بے تکلفی، "بے باکی کو بھی دخل دے جاتا، سید صاحب بڑی توجہ سے تمام باتیں سنتے، کبھی کبھی کوئی فقرہ بڑے لطف کا" کبھی ایک آدھ بڑی حسرت سے کہہ جاتے :

ایک رات زیادہ دیر تک اسی طرح کے مسائل پر گفتگو ہوتی رہی، سید صاحب نے ان تمام تعلیمی طریقوں کا ذکر کیا، جو گذشتہ عہد کے مسلمانوں میں رائج تھے، پھر موجودہ حالات پر تبصرہ کرتے رہے، سید صاحب کی اس رات کی گفتگو بڑی عالمانہ اور دلنشین تھی، وہ رہ رہ کر اس پر زور دیتے کہ جب تک تعلیم بطور شرف و سعادت حاصل نہ کی جائے گی، معاشرہ کا قوام اعتدال پر نہ آئے گا، محض روٹی کمانے یا دولت جمع کرنے کی نیت سے تعلیم دینا یا تعلیم حاصل کرنا ہمیشہ بے برکتی کا موجب ہوگا،

میں نے عرض کیا سید صاحب آج کل معمولی سے معمولی کام بھی مخصوص تعلیم و تربیت حاصل کئے بغیر اختیار نہیں کیا جا سکتا، اور دنیا میں کاموں کی نوعیت اتنی بڑھ گئی ہے، اور تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے کہ اب محض تعلیم کی خاطر تعلیم کون حاصل کرے، یہ تو نہ ممکن ہے نہ مناسب، سید صاحب نے اس سے اتفاق کیا، لیکن فرمایا کہ اُن کا مطلب تعلیم کے ابتدائی مدارج سے تھا، مثلاً آٹھویں نویں جماعت تک جہاں پہنچ کر بچوں کی اخلاقی بنیاد ایک حد تک

سید صاحب پر کیا گذرتی ہے ،

سید صاحب پاکستان گئے تو ، دنون خبر نہ آئی ایک دن اخبار مین پڑھا کہ اردو کے مسئلہ پر تقریر کرنے کے دوران مین ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبہ نے سید صاحب کو تکلیف پہنچائی ، بڑا قلق ہوا ، سید صاحب کے نہ ہونے کہ کس منزلت کا آدمی زبان جانے کس بنا پر رسوا ہوا ، اور طلبہ کے لئے یون کہ طالب علم بالخصوص یونیورسٹی کے طالب علم سے بڑھ کر قیمتی متاع کسی قوم اور ملک کی کیا ہوگی ، اس نے یہ سلوک سید صاحب سے کیا جن کی علمی، مذہبی، قومی، تہذیبی خدمات اس صدی مین اتنی زیادہ اور اتنی گرانمایہ تھین کہ کسی ایک شخص کی نہ تھین ، پھر علماء کی رسوائی سلاطین کے ہاتھون تو سنی تھی ، طلبہ کے ہاتھون کبھی سننے مین نہین آئی تھی ،

اگر ایک عالم کی موت عالم کی موت ہے تو ایک عالم کی بے حرمتی کیا ہوتی ہوگی !

واقع ہوئی) تو ہمارا کیا قصور، اور جب ہمارا قصور نہیں تو انجام کچھ ہی ہو، زندگی کی مہم میں فتح ہماری ہی رہی،!

سید صاحب مسکرائے لیکن یہ مسکرانا کسی اور سبب سے اتنا نہ تھا جتنا شاید میرے اظہار قابلیت یا طلاقت لسانی پر، لیکن میں بھی نہ جھجکا، بلکہ دل ہی دل میں کسی قدر جھنجلا کر بولا، سید صاحب مایوسی اور مصائب کا علاج منطق فلسفہ الٰہیات وغیرہ میں ڈھونڈنے سے علامہ لوگوں کو مل جاتا ہو، تو مل جاتا ہو اس خاکسار کو تو آج تک نہیں ملا" سید صاحب نے میرے لہجے کی تلخی یا بے باکی کو غالباً محسوس کر لیا تھا، مسکرا کر بولے، اور کیوں جناب آپنے "علامہ اور خاکسار" میں کوئی خاص رعایت تو مدِ نظر نہیں رکھی ہے،! مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی، میں نے کہا سید صاحب جب تک آپ کا ذہن ایسے موقعوں آپ کا ساتھ دیتا رہے گا، آپ کو اپنی طرف سے اطمینان ہو یا نہیں، مجھے آپکی طرف سے اطمینان رہے گا،!

پھر میں نے کہا سید صاحب آپنے جو بات کہی وہ مجھ سے اٹھائے تو نہیں اٹھتی لیکن مجھے تو اس سپاہی جنرل کی ادا پسند آئی جس نے یہ عہد کر لیا تھا کہ جہاں تک خشکی ملے گی، وہ خدا کے نام پر فتح کرتا چلا جائے گا، فتح کرتے کرتے خشکی کا حصہ ختم ہو کر سمندر آگیا، تو اس نے گھوڑے کو پانی میں ڈال دیا، اور کہا بارخدایا خشکی ختم ہوگئی، میرا عہد ختم ہوتا ہے، تو سید صاحب اللہ کے ساتھ اس کے سپاہیوں کا یہی معاہدہ ہوتا ہے، اس کے بعد نام اللہ کا،!

سید صاحب پھر مسکرائے اور فرمایا، اب جا کر آرام کیجئے، آج بڑی دیر ہوگئی!

بالآخر یہ ہوا کہ سید صاحب پاکستان تشریف لے گئے، میں یہ جانتا تھا کہ سید صاحب جائیں گے ضرور، گو معلوم نہیں کیوں یہ بھی محسوس کرتا تھا کہ سید صاحب وہاں خوش نہ رہیں گے، تقسیم ملک کے بعد سید صاحب سے ایک بار کسی قدر اطمینان کی ملاقات ہوئی، اثنائے گفتگو میں فرمایا، رشید صاحب عجب بے بسی کا عالم ہے، بن بیاہی لڑکیاں اور بوڑھے ماں باپ تو یہاں رہ گئے نوجوان پاکستان چلے گئے، کیا کیا جائے کیا ہوگا، اس طرح کی بعض دوسری مصیبتوں کا ذکر بھی بڑی مایوسی سے کیا، سید صاحب کی اس گفتگو سے میرا دل بھر آیا، اس لئے اور کہ سید صاحب اس طرح کی باتیں اکثر نہیں کرتے تھے معلوم نہیں کیوں اور کیسے، میرے دل میں وسوسہ سا پیدا ہوا کہ دیکھئے آئندہ

عزاسمہ پر ایک اجمالی مگر غائر نظر) تھا، جو گو ہم نے پڑھا، مگر پلے کچھ نہ پڑا، ایک مضمون شاید مولانا عبدالعزیز میمن کا بھی تھا، وہ بھی ہماری استعداد سے بلند تھا، مگر اس کے باوجود بڑے ذوق و شوق سے رسالے کا حرف حرف پڑھا گیا، اور اڈیٹر کی وقعت و عزت دل میں گھر کرتی گئی، اور دو چار نمبر دن کے بعد تو اُن کے علم کا سکہ دلوں پر بیٹھ گیا، یہ تاثر راقم اور اس کے اکثر احباب کا تھا،

اس کے بعد **معارف** کے علاوہ مدیر معارف کی ایک دو کتابیں اور پڑھیں، ان میں خطبات مدراس کی یاد تازہ ہے، بڑے ذوق و شوق اور عقیدت کے ساتھ پڑھی گئی، اور مصنف سے ملنے کا خیال دل میں چٹکیاں لینے لگا، پھر قدرت کا کرنا کچھ ایسا ہوا کہ ۲۷ء کے اکتوبر میں مصر کے کچھ عربی رسالے نظر سے گذرے اور ایک دوست[1] کی عنایت سے الہلال (مصر) کی متعدد جلدیں مل گئیں، راقم بے سوچے سمجھے اُن کی تلاوت میں لگ گیا، ان دنوں الہلال میں طٰہٰ حسین کے مضامین اکثر شائع ہوتے تھے، یہ ناآشنائے کوچۂ ادب پہلے پہل اُن سے بہت متاثر ہوا اور جی میں آنے لگا کہ مصر چل کر ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیجئے،

اس خام خیالی میں ایک اور دوست[2] بھی ہم نوا تھے، انھوں نے تو راست خط و کتابت بھی شروع کر دی، راقم نے مولانا سید سلیمان ندوی (یہ اس وقت کی زبان نقل کر رہا ہوں) سے مراسلت کی طرح ڈالی، پہلا خط گھنٹوں کی محنت کے بعد ٹوٹی پھوٹی عربی میں غالباً میری زندگی کا یہ پہلا عربی خط تھا، اعظم گڈھ کے پتہ پر لکھا، اتفاق سے مولانا رمضان گذارنے کے لئے دیسنہ آئے ہوئے تھے، جواب وہیں سے ملا، اور بہت حوصلہ افزا، مصری درسگاہوں کے متعلق استفسار کے جواب میں ارشاد ہوا، "بہتر ہوگا کہ تم سال دو سال کے لئے ندوہ میں داخلہ لے لو"، جواب سلیس اور سادہ عربی میں تھا، زبان دل کو لگ گئی، پڑھتے پڑھاتے خط ازبر ہوگیا، اب کیوں چوکتا؟ دوسرا خط فوراً ہی دیسنہ کے پتہ پر حاضر کیا، اس کا جواب بھی بروقت ملا، اس میں حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ طٰہٰ حسین اور اس کی ذریات پر سخت تنقید بھی تھی، غالباً راقم نے خط میں اس کی ثنا خوانی کی تھی، ساتھ ہی ساتھ یہ خوشخبری تھی، "میں دوسری

---

[1] حکیم حافظ قاری یوسف حسن خان صاحب، بہار شریف (پٹنہ) [2] جوان مرگ ابو یوسف ندوی مرحوم (ف ۱۹۳۲ء)

استاذ مرحوم
(نقوش اور تاثرات)

از مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم

"دنیا کی بے ثباتی اور ناپائداری کا یہ منظر بھی کس قدر عبرت آموز ہے کہ شفیق و محبوب استاد کی یادگار میں ایک عزیز اور سعادتمند شاگرد کا مضمون اس وقت شائع ہو رہا ہے، جب وہ خود دوسروں کے لئے یادگار بن چکا ہے، جب یہ مضمون لکھا گیا ہے، اس وقت کس کو یہ گمان ہو سکتا تھا کہ اس کی اشاعت سے پہلے ہی شاگرد خود استاذ کے حضور میں پہنچ جائے گا،" "م"

ٹھیک ٹھیک یاد نہیں پڑتا کہ پہلے پہل نام کب سنا؟ حافظہ پر زور دینے سے اتنا خیال آتا ہے کہ ایک مرتبہ اپنی طالب علمی کے آغاز میں، غالباً گیارہ بارہ سال سے زیادہ عمر نہ ہوگی۔ ایک ہم سبق دوست، محمد شمیم[1] دسنوی کے گھر پہنچا تو دیکھا وہ ایک اردو کتاب پڑھ رہے ہیں، پوچھا کیا پڑھتے ہو؟ بولے "تم نہیں جانتے؟ مولوی سلیمان صاحب کی سیرۃ النبی ہے"۔ یہ ۲۲ء کا ذکر ہے، اس کے کچھ ہی دن بعد ہمارے مدرسہ[2] میں اردو اخبارات اور رسالوں کا چرچا ہونے لگا، ایک انجمن قائم ہوئی اور رسالے اور اخبار جاری کرائے گئے، اسی سلسلہ میں پہلی مرتبہ رسالہ المعارف کا نام سننے میں آیا، بڑی ردوکد کے بعد جاری ہوا، تو وہ المعارف کے بجائے **معارف** نکلا، سب سے پہلا پرچہ جو ہماری نگاہوں سے گزرا وہ نومبر ۲۵ء کا شمارہ تھا، اس کا سپید غلاف اب تک نگاہوں کے سامنے ہے، اس میں ایک مقالہ ارتقاء ہستی

---

[1] ڈاکٹر سید محمد شمیم ام، بی، بی، ایس [2] مدرسہ عزیزیہ، بہار شریف پٹنہ،

الہلال کے مقابلہ میں راقم اس کا داعی اور ثنا خوان بن گیا، انہی دنون سیرۃ عائشہؓ پر الزہراؓ میں اس کے پختہ مغز صاحب علم اڈیٹر محب الدین خطیب کے قلم سے ایک شاندار ریویو نکلا، اس سے علامہ ندوی کی وقعت دل میں اور بڑھ گئی، "الله الله! مصر کے رسالون مین ان کی تعریف چھپتی ہے" دوستون سے کہتا اور اپنے ہونے والے استاذ مخدوم کے گن گایا کرتا،

(۲)

آخر یہ عقیدت و محبت ندوہ لے گئی، اور اس طرح لے گئی کہ وہین کا ہو کر رہ گیا، پہلی نسبتین معدوم ہو گئین، جولائی ۱۹۲۸ء کو لکھنو پہنچا، آٹھوین جماعت (جو اس وقت دار العلوم کی آخری جماعت تھی) مین داخلہ ہوا، بڑے انہماک کے ساتھ اپنے کام مین لگ گیا، پورا سال تعلیمی انہماک مین گذرا، سید صاحبؒ تبلہ معتمد تعلیم کی حیثیت سے ہر ماہ تشریف لاتے، عام طور پر نواب علی حسن خان صاحب طاہر ناظم ندوۃ العلماء کے ہان قیام ہوتا، ہم لوگ وہان پابندی کے ساتھ حاضر ہوتے، اور حضرۃ الاستاذ کے متنوع سوالات کا بوجھ سب مل کر برداشت کرتے، سید صاحب طلبہ سے سوال بہت کیا کرتے، اس لئے بعض طالب علم اُن کی خدمت مین حاضر ہونے سے جھجکتے تھے، مگر ہم لوگ، اس شرم و ندامت کے باوجود، جو معقول جواب نہ دینے پر محسوس ہوتی، برابر حاضر ہوتے اور استفادہ کا موقع کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے، یہ سلسلہ سال بھر جاری رہا، اس دوران مین ایک بات قابلِ ذکر پیش آئی، سیرۃ النبی جلد دوم مین مولانا شبلیؒ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف (قبل تحریم) شراب پینے کی نسبت کی ہے، اور کچھ اپنی طرف سے نہین، بلکہ ابوداؤد کی ایک روایت کی بنا پر خلفائے راشدین (مؤلفہ حاجی معین الدین مرحوم) چھپی تو حاشیہ مین سید صاحب قبلہ نے اسکی تردید کردی، اس پر ہم لوگون مین چہ می گوئیان رہین، اور آخر عبد السلام صاحب قدوائی کے مشورہ سے (جو اس وقت ساتوین جماعت مین پڑھتے تھے) راقم نے سید صاحب کو ایک خط لکھا جس مین اس تردید پر اپنے عدم اطمینان

---

[۱] غالباً محب الدین خطیب کی نظر سے سیرت عائشہ کا ترجمہ گذرا ہوگا [۲] الزہرا، ہر لحاظ سے معارف یا معارف کا ثانی تھا [۳] ندوہ پہنچ کر اس محبوب لقب سے کان آشنا ہوئے،

شوال کو اعظم گڑھ جا رہا ہوں"، بس، پھر کیا تھا، دن گننے لگا، روانگی تو بہر حال بہار شریف ہی کے اسٹیشن سے ہوگی، یہ تو کیوں ضائع کیا جائے؟ یہ دوسرا مکتوب بھی اُسی سہل ممتنع زبان میں تھا، یہ بھی دوستوں کو پڑھتے پڑھاتے یاد ہو گیا اور آج ۴۲ سال گذرنے کے بعد بھی یہ دونوں خط اب تک حرف بحرف یاد ہیں، نوجوانی کا شوق اسی کو کہتے ہیں۔

یہ اپریل ۱۹۲۶ء (رمضان ۱۳۴۴ھ) کا ذکر ہے،

۲ شوال ۴۴ھ کو وقت سے پہلے اسٹیشن پہنچ گیا، ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو ایک وجیہ نورانی چہرہ نظر آیا، سفید براق عمامہ، قاعدے کی سلی ہوئی شیروانی، ہاتھ میں ایک خوبصورت چھڑی، اور پاؤں میں گوہ کے چمڑے کا سادہ لیکن نفیس جوتہ، ہو نہ ہو یہی علامہ سید سلیمان ندوی ہیں، یقین تھا، پر کسی سے تصدیق کر لوں تو آگے بڑھوں، حسن اتفاق سے قریب ہی پٹنہ کے شہر کے طبیب حکیم عبدالقیوم صاحب ڈیانوی پر نظر پڑ گئی، اُن سے ڈرتے ڈرتے اپنے خیال کی تصدیق کی، پھر آگے بڑھ کر سلام و مصافحہ کی سعادت حاصل کی، فرمایا "میں نے تمھیں نہیں پہچانا"، عرض کیا: خاکسار کا یہ پہلا موقع ہے۔" پھر اپنے خطوط کا ذکر کیا، دریافت کیا "کیا پڑھتے ہو، اور کس سے پڑھتے ہو؟" پھر ارشاد ہوا: "درسی کتابوں کے علاوہ کیا پڑھتے ہو؟" الہلال اور دوسرا الہلال کے ہفتہ وار اخباروں کا نام سن کر فرمایا "یہ کیا پڑھنے کی چیزیں ہیں؟ مقدمہ ابن خلدون اور المثل السائر (ابن اثیر) پڑھا کرو۔" مقدمہ ابن خلدون اور المثل السائر تو اس وقت میرے بس کی نہیں تھیں، پر الہلال کے متعلق مولانا کا ارشاد نہیں بھولا،

دوسرے دن مدرسہ پہنچا، تو اپنے ہم چشموں کو اسٹیشن کی داستان مزہ لے لے کر سنائی، ہمارے مدرسہ کے ادیب مولانا نورالحق ندوی اعظمی مرحوم، دیوبند کے فارغ اور بڑے ذہین آدمی تھے، جدید مصری ادب میں الہلال کا ان پر گہرا اثر تھا، میں نے جب علامہ ندوی کی رائے سنائی تو وہ جھنجھلا کر بولے: **معارف** میں بھی الہلال کے ترجمے کے سوا کیا ہوتا ہے؟ ایک تو علامہ کا علمی رعب، دوسرے معارف پر اپنے استاد کی نا روا تنقید نے مجھے اُن سے بدگمان کر دیا، آخر تین سال سے میں بھی معارف پڑھتا ہوں، الہلال کا ترجمہ کہاں ہوتا ہے؟ مولوی صاحب یقینی تعصب سے کام لے رہے ہیں۔" یہ خیال میرے دل میں جاگزیں ہو گیا، رسالہ الزہرا بھی قاہرہ سے آنے لگا تھا،

"لوگ اس سے (میری طرف اشارہ کرتے ہوئے) مٹھائی مانگ رہے ہیں، یہ اپنی جماعت میں اول آیا ہے"

ان فقروں سے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی توجہ ہوئی، اور عجیب اتفاق کہ مولانا فراہی کی مجلس میں یہ میری پہلی اور آخری حاضری تھی، مگر اس کی یاد اب تک باقی ہے،

ستمبر ۱۹۲۹ء اور اس کے بعد کا ذکر ہے، اب میں درجۂ تکمیل ادب کا طالب علم ہوں، یوں تو تکمیل کے پہلے سال میرے باقاعدہ استاذ مولانا عبدالحلیم صدیقی، (استاذ تفسیر و ادب دار العلوم ندوۃ العلماء) تھے لیکن مشورہ سید صاحب سے ضرور کرتا، اور مراسلت بھی ہوتی، مگر بسا اوقات جواب زبانی ملتا، یہ تحریر لکھنے بیٹھا ہوں تو اس زمانے کی بھولی بسری باتیں یاد آرہی ہیں، ایک آدھ بات تو بیان کر ہی دیجائے، راقم اور محمد ناظم صاحب[1] (جو اس وقت چھٹی جماعت میں پڑھتے تھے، مگر ادبی استعداد بہت بلند تھی) کو عربی کا جنون تھا، ندوہ میں بعض طلبہ جو اپنی اصطلاح میں شعوبی یعنی عربی کے مخالف تھے اور وہ اردو میں کمال پیدا کرنا ہی اپنا منتہائے نظر سمجھتے تھے، ہماری ان کی کشمکش رہتی تھی محمد ناظم صاحب اپنی ذہانت اور اعلیٰ استعداد کے باوجود عزم کے کمزور ہیں، ان پر کبھی کبھی شعوبیوں کے طعنے کا اثر ہو جاتا، ایک شام کو ہم لوگ سید صاحب قبلہ کے ساتھ لال باغ[2] سے موتی محل کے پل کی طرف آرہے تھے کہ محمد ناظم صاحب نے کہا:-

"عربی پڑھتے تو ہیں مگر یہاں اس سکے کی کیا قیمت؟"

سید صاحب نے یہ سن کر بڑی تسلی دی اور فرمایا:

"میرا بھی یہی خیال تھا، مگر جب وفد خلافت میں یورپ جانا ہوا، تو یہ عربی کام آئی، اور اس وقت دار العلوم کی ابتدائی مشق کا فائدہ معلوم ہوا، مولانا محمد علی نہ عربی بول سکتے تھے، نہ فرنچ، اور عرب ملکوں کے وفود عربی بول سکتے تھے، یا فرنچ ____ ایسے تمام اہم موقعوں پر میری عربی کام آئی،

---

[1] مولانا محمد ناظم ندوی، شیخ الجامعہ، جامعہ عباسیہ، بہاولپور [2] لال باغ لکھنؤ کا ایک محلہ ہے، جہاں نواب محسن خان صاحب مرحوم کی کوٹھی تھی،

کا انتظار تھا جواب ڈاک کے بجائے زبانی ملا، اور ان الفاظ میں،

"تو کار زمین را نکو ساختی — کہ با آسمان نیز پرداختی"

اور پھر یہ لطیف فقرہ: "آخر تمہیں حضرت علیؓ کے خلاف معرکہ آرائی کی ضرورت کیا پڑی تھی؟" مولانا عبدالودود صاحب جیراج پوری، مدرس دارالعلوم (جو اس وقت سید صاحب کے ساتھ تھے) بولے: "جی ہاں! سادات کرام تو طبعاً مائل بہ اہل بیت ہوتے ہی ہیں"، ان فقروں کے بعد پھر تحقیقی طور پر اس روایت کی اصلیت[1] واضح کی،

اسی دور کا ایک اور واقعہ بھی نہیں بھولتا، مئو ناتھ بھنجن ضلع اعظم گڈھ عربی مدرسوں کا مرکز ہے، وہیں ایک مدرسہ میں والد ماجد قبلہ بھی مدرس اول تھے، راقم اس مناسبت سے مئو گیا ہوا تھا، انہی دنوں مدرسہ فیض عام (اہلحدیث) اور مدرسہ مفتاح العلوم (حنفی جس کے صدر مدرس مولانا حبیب الرحمٰن صاحب تھے، اور شاید اب بھی ہوں) میں سالانہ جلسے تھے، سید صاحب قبلہ دونوں طبقوں کے مرجع تھے، ایک ہی دن صبح شام دونوں جلسوں کی صدارت کی، مفتاح العلوم کے جلسے میں عاجز بھی ساتھ تھا، نماز کو جاتے ہوئے خادم نے استاذؒ کے جوتے اٹھالیے، استاذؒ نے مسکرا کر تمام حاضرین کے سامنے فرمایا: "یہ میرا باضابطہ شاگرد نہیں، مگر شاگردی کا حق ادا کر رہا ہے" خادم نے دبی زبان سے عرض کیا: "آخر شاگردی کی تعریف کیا ہے؟"

(۳)

جولائی ۲۹ء میں سالانہ امتحان ہوا، اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے خاکسار نے نمایاں کامیابی حاصل کی، اور اپنی جماعت میں اول رہا، سید صاحب قبلہ نے نتیجہ کے اعلان کے ساتھ حوصلہ افزا نوٹ لکھا، اور والد ماجد (مولانا حکیم محمد عبدالشکور صاحب مدظلہ؛ مولود سنہ ۱۲۹۰ھ) کو خط کے ذریعہ مبارکباد دی، اور تو اور انہی دنوں مولانا حمید الدین فراہی مرحوم و مغفور کسی تقریب سے ندوہ تشریف لائے، اور ہم لوگ اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے تو استاذ مرحوم نے تعارف کے انداز میں (مولانا فراہی کی طرف مخاطب ہوکر) فرمایا:

---

[1] سیرت النبیؐ جلد چہارم میں حضرت الاستاذؒ نے اس کی پوری تحقیق فرمادی ہے،

پیدا ہو چکا تھا، اور اب زیادہ تر حدیث کے درس میں مشغول رہا کرتے تھے) بھی از سر نو نحو و ادب کی تجدید و تکمیل میں لگ گئے، اکثر ہم لوگوں کا ساتھ رہتا، ہلالی صاحب بھی ہم لوگوں سے بہت خوش تھے، ہمارے علاوہ محمد ناظم صاحب اور ابو اللیث[۱] صاحب کا بھی، ہلالی صاحب کے خاص شاگردوں میں شمار تھا، سید صاحب قبلہ جب بھی تشریف لاتے ہلالی صاحب سے ملتے، اور ان کا بڑا احترام کرتے، ہلالی صاحب ہم لوگوں کی بہت تعریف کرتے، اور بار بار زور دیتے، "ان لوگوں سے ندوہ میں تدریس کا کام لیا جائے"

باتیں بہت ہیں، اس دوران میں ایک اور دلچسپ بات عرض کر دی جائے، تو اچھا ہو، ہلالی صاحب کی آمد سے پہلے راقم یکسو نہیں تھا، طب کی تحصیل کا خیال بھی بار بار آتا، علی گڑھ سے دستور العمل منگوا کر تیاری بھی شروع کر دی تھی، سید صاحب قبلہ سے مشورہ کیا، تو کچھ دیر خاموش رہے، پھر فرمایا،

"جو چاہو، کرو، مگر طالب علمی کو پیشہ نہ بنانا"

(۴)

ستمبر ۳۱ء میں تکمیل ادب کا امتحان ہوا تاثیر الاسلام فی الشعر العربی (اسلام کے اثرات عربی شاعری پر) اطروحۃ (Thesis) کا عنوان تھا، اطروحہ منظور ہوا، اور راقم نے وطن کی راہ لی، اور انگریزی زبان کی تحصیل و تکمیل میں لگ گیا، ادھر ہلالی صاحب نے سید صاحب کو ایک عربی ماہنامہ نکالنے کی ترغیب دی، اور راقم کا نام ادارت کے لئے پیش کیا، تجویز طے پا گئی، اور علی میاں نے فرط مسرت سے فوراً اطلاع دی، اور راقم انگریزی پروگرام کی بساط الٹ، لکھنؤ پہنچ گیا، (مارچ ۳۲ء)۔ مئی ۳۲ء (محرم الحرام ۱۳۵۱ھ) سے الضیاء عمل اجراء عمل میں آیا، عام طور پر زبان کی تصحیح ہلالی صاحب کرتے اور دوسرے امور کے متعلق سید صاحب قبلہ ہدایتیں دیتے یہ پہلا موقع تھا کہ حضرۃ الاستاذ کی راست نگرانی، اور سرپرستی میں کام کرنے کا موقع ملا، یہ سلسلہ تقریباً چار برس جاری رہا، پہلے دو سال ہلالی صاحب مدظلہ کے مشورے بھی رہنمائی کرتے تھے، ہلالی صاحب کے چلے جانے کے بعد

---

[۱] مولانا ابو اللیث ندوی اصلاحی اعظمی، امیر جماعت اسلامی ہند (رام پور)

"پھر دوسری مرتبہ موتمر اسلامی مکہ مکرمہ میں اس مشق نے پورے ہندوستان کی لاج رکھ لی،

گھبراؤ نہیں، جوہر ضائع نہیں ہوتا"

کس قدر صائب رائے اور کتنی دور بین نظر تھی؟ آج ندوہ کے وہ طالب علم جو عربی لکھنے بولنے پر پوری قدرت رکھتے ہیں، ہاتھوں ہاتھ لئے جا رہے ہیں، خود محمد ناظم صاحب کو اس کا عملی تجربہ ہو رہا ہے، اس سال کا ایک اہم واقعہ طلبہ ندوہ کی اسٹرائک تھی، (مئی: سنہ ۳۰ء)۔ بات معمولی تھی، بڑھ گئی، سید صاحب قبلہؒ نے بڑی کوشش کی، مگر نوعمر و پرجوش طالب علموں نے ایک نہ مانی، اسٹرائک ناکام رہی، اور جولائی سنہ ۳۰ء میں دار العلوم کھلتے ہی دھڑا دھڑ معافیاں داخل ہونے لگیں، چھ طالب علم (جن پر قیادت کا الزام تھا) خارج کئے گئے، اور ندوہ کی اصطلاح میں "ممنوع الداخل" قرار پائے، ان میں ایک راقم بھی تھا، گو میری حیثیت عام طالب علم کی نہیں رہی تھی لیکن واقعہ ہے کہ دار کونسل یا مجلس عمل کا ممبر میں بھی تھا، اس لئے میرے باب میں اساتذہ کی رائے مختلف تھی، اور اسی اختلاف سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سید صاحب قبلہ نے میرا اخراج منسوخ کرا دیا، باقی دوسرے پانچ نادمین کے داخلہ سے بھی حضرۃ الاستاذ کو اختلاف نہیں تھا، اور نواب صاحب بھی تیار تھے، مگر ندوہ کی مجلس انتظامی کے ایک قدیمی رکن نے سید صاحب کی نہ چلنے دی، حالانکہ استاذ مرحوم معتمد تعلیم تھے، وہ چاہتے تو اپنے اختیار خاص کو بعض معاف کر دیتے، مگر سید صاحب قبلہ لڑنا نہیں جانتے تھے، اور ان کے بعض رفیقوں نے اُن کی اس نرم مزاجی سے ہمیشہ ناروا فائدہ اٹھایا، جس کا اُن کی صحت پر بھی پڑتا رہا —

تکمیل ادب کے دوسرے سال ہماری زندگی بدل گئی، ندوہ میں بہار کا موسم آیا، یعنی اگست سنہ ۳۰ء میں استاذ محترم شیخ تقی الدین محمد بن عبد القادر الہلالی المغربی تشریف لائے، ندوہ کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ ایک چوٹی کے عرب ادیب و زبان دان نے کرسی تدریس کو زینت دی، — بس پھر کیا تھا، سارے مشاغل بالائے طاق رکھ کر زبان و ادب کی تحصیل میں لگ گیا، علی میاں[1] (جنھیں خلیل عرب[2] صاحب کی صحبت میں زبان کا خاصا ذوق

[1] مولانا ابو الحسن علی حسنی ندوی (معتمد تعلیم دار العلوم ندوۃ العلماء) [2] شیخ خلیل بن محمد بن حسین ندوی (یمنی الاصل)

طرف متوجہ ہو کر فرمانے لگے "دیکھو بیٹا! صرف میرے نام کے نقطے نہ مٹایا کرنا" اس لطیف فقرے کے بعد مجھ سے
پایا "کچھ سمجھے"؟ عرض کیا: جی ہاں! اللہ الحفیظ علی میراث بھی عطا کرے"

یہ ۱۳۴۲ھ کی گرمیوں کا ذکر تھا، اس سے چھ ماہ پہلے (دسمبر ۱۹۳۰ء ۔ جنوری ۱۹۳۴ء) دار المصنفین بھی حاضری
ہوئی تھی، اور رمضان المبارک کا پورا مہینہ وہیں گذرا تھا، باضابطہ شاگردی کا موقع بھی یہیں نصیب ہوا محمد ناظم
صاحب اور ابو اللیث صاحب بھی ساتھ تھے، ہم تینوں قرآن مجید اور حجۃ اللہ البالغہ کا درس لیتے، غالباً سورہ بقرہ
تک رُبع ہو سکا، اس کے نوٹ اب تک حسنِ اتفاق سے محفوظ ہیں، حجۃ اللہ کے ابتدائی ۲۵، ۳۰ صفحے ہو سکے تھے
دس بجے صبح کو سید صاحب کے کمرے میں درس ہوتا، اسی وقت ڈاک بھی آتی، اور بڑے لطیفے رہتے، ایک
بار ایک انگریزی خط آیا، مجھے پڑھنے کا حکم ہوا، میں نے ساتھ ساتھ ترجمہ بھی شروع کر دیا، فرمانے لگے "میں انگریزی
سمجھتا ہوں، صرف اس خط کا عادی نہیں" بڑی ندامت ہوئی، ایک روز دفتر کا ملازم ایک پرزہ دے گیا، ڈر
ت آٹھ روپیے، پہلے تو جیب میں رکھ لئے، پھر پرزہ اور روپیے نکال کر کہنے لگے۔

"تم لوگ خیال کرتے ہوگے کہ میں بہت کچھ کماتا ہوں گا، بس میرا حصہ اسی قدر ہے، یہ اللہ
تعالیٰ کے انتظامات ہیں، اپنے بندے کے ہاتھ سے خرچ کراتا ہے، ملازموں عزیزوں، اور دوسرے دن
کو ان کا اپنا رزق ملتا ہے، میرے حصے کے یہی چند روپیے ہیں، اسے اچھی طرح سمجھ لو، تم لوگ بھی اس
منزل سے گذرنے والے ہو"

اسی دور میں ندوہ میں پھر ایک ہنگامہ ہوا، (۱۹۳۵ء) طلبہ کی معاونت کا الزام ایسے تین افراد پر بھی
جو کسی نہ کسی حد تک اسٹاف میں شمار کئے جاتے تھے، ان میں سب سے کمزور ابو اللیث صاحب تو فوراً الگ
ہو گئے، مفتی محمد سعید صاحب اور راقم کو دار العلوم سے باہر رہنے کا حکم ہوا، حالانکہ ابو اللیث صاحب میرے
بلکہ میں بہت نرم، بے زبان، اور مرنجان مرنج آدمی تھے، راقم کے متعلق مشہور تھا کہ اسے سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ
مانتے ہیں، اور غالباً اسی لئے مجھ پر سخت وار کرنے کی ہمت نہیں پڑی، ورنہ ہنگامے میں میرا رویہ

دو برس صرف سید صاحب قبلہ کی نگرانی اور مشورے، اس ناتجربہ کار اڈیٹر کے لئے مشعل راہ بنے رہے، ان دو سالون مین بہت کچھ سیکھا، اور جس چیز کو زندگی کا تجربہ کہتے ہین، وہ پہلی مرتبہ حاصل ہو رہا تھا، سید صاحب قدم قدم پر ٹوکتے، معمولی زبان کی غلطیون کی نشان دہی فرماتے، کتابت کے متعلق بھی مشورے دیتے، مضامین کی سطحیت پر تنبیہ کرتے، اور ساتھ ساتھ کبھی حوصلہ افزائی بھی فرماتے، اور اپنے مخصوص انداز مین — اسی دوران مین راقم نے عربی اخبارون مین اسلامی ہند کی سیاسیات پر لکھنا شروع کیا، اس پر کبھی ٹوکتے کبھی خاموش رہتے اور کبھی حوصلہ افزائی فرماتے، یہ تاکید ہمیشہ رہتی کہ شہرت کے پیچھے نہ دوڑو، کبھی لکھتے "مقصد عربی لکھنا آگیا، گو یہ نہین معلوم کیا لکھین؟" الضیاء کا پہلا افتتاحیہ خود اپنے قلم سے لکھا تھا، اور خوب تھا، آج بھی پڑھا جا سکتا ہے، ہم لوگون کو حیرت تھی کہ بیس برس کے بعد بھی حضرۃ الاستاذ کی عربی انشاء مین بانکپن باقی ہے۔ اپنا عربی کلام بھی اشاعت کے لئے دیتے،

تعلقات بڑھے تو چھٹیون مین ایک آدھ بار دیسنہ بھی ضرور حاضر ہوتا۔ استاذ مرحوم عام طور پر گرمیون کے دن وطن ہی مین گذارتے، ندوہ مین بھی چھٹیان ہوتین، راقم جب بھی دیسنہ حاضر ہوتا، ایک دو مقامی دوست یا ندوہ کے کوئی پردیسی[51] طالب علم ضرور ساتھ ہوتے، ۳۴ء کی گرمیون کا ذکر ہے، ندوہ کے ایک طالب علم محمد حسن اللہ کو لے کر دیسنہ حاضر ہوا، طعام و کلام کے سلسلہ کے بعد دوپہر کو اوپر کی منزل مین (جو برادرم ابوسہیل[52] صاحب کا کمرہ تھا،) آرام کرنے کا حکم ہوا، راقم دن کو سونے کا عادی نہین، بستر پر پڑا رہا، نماز ظہر کے وقت خود حضرۃ الاستاذ تشریف لائے، سلمان[53] میان گود مین تھے، کمرے مین سہیل صاحب کی انگریزی ٹوپی (ہیٹ) لٹکی ہوئی تھی، ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بڑے تاثر کے ساتھ بولے "دیکھا آب زمزم مین شراب کی آمیزش" پھر ننھے سلمان

---

[51] ندوہ کی روایات مین داخل تھا کہ دور دراز کے طالب علم لمبی چھٹیون مین اپنے دوستون کے ساتھ ان کے گھر جاتے اور گھر کے افراد کی طرح وہین چھٹیان گذارتے۔

[52] حضرۃ الاستاذ کے بڑے صاحبزادے سید ابوسہیل عظیم آبادی، بی اے (علیگ)

[53] چھوٹے صاحبزادے سلمان میان سلمہ اللہ،

اسی دوران مین راقم نے بے اجازت مدینہ (بجنور) کے شعبۂ ادارت کی رکنیت قبول کر لی تھی، عتاب ہوا اور حسب الحکم ڈیڑھ ماہ کے بعد ندوہ واپس آگیا (اگست ۳۷ء)

(۵)

دسمبر ۳۷ء مین حضرۃ الاستاذؒ کی تحریک اور مخدومی مولانا محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ کی کوشش و تائید کر خدا بخش اورئینل لائبریری مین میرا تقرر ہو گیا، اس علمی ماحول مین بھی میرا مرجع اعظم گڈھ ہی رہا، جو کچھ بھی لکھتا، پہلے حضرۃ الاستاذؒ سے مشورہ لیتا، ادھر عربی سے تعلق کچھ کم ہوا، تو معارف مین لکھنا شروع کیا، بہت ڈرتے ڈرتے ہمت ہوئی، مگر سید صاحب قبلہ کی حوصلہ افزائی نے یہ مرحلہ آسان کر دیا، ۳۸ء سے ۴۴ء تک معارف کے لئے کچھ نہ کچھ لکھتا رہا، سید صاحب پٹنہ اکثر تشریف لاتے، مختلف سرکاری کمیٹیون مین اُن کی شرکت ضروری خیال کی جاتی، مخدومی مولانا ریاض حسن خان صاحب خیال کی کوٹھی پر قیام ہوتا، استاذ مرحومؒ کے تشریف لاتے ہی مولانا کا ملازم اطلاع کر جاتا، اور جب تک سید صاحب قیام فرما ہوتے، راقم روزانہ حاضر ہوتا، اور گھنٹون وہان نشست رہتی، پٹنہ مین یہی ایک رئیس کا گھر تھا، جہان یہ فقیر بے تکلف کھانے پینے مین شریک ہوتا، مولانا ریاض حسن خان خیال استاذ الاستاذ مولانا شبلی کے ملنے والون مین تھے، سید صاحبؒ بھی ان کا احترام کرتے، اور ہم وابستگان سید و شبلیؒ کو تو وہ اپنا عزیز ہی سمجھتے، مولانا ریاض حسن خان صاحب اور اُن کے بڑے بھائی مرحوم مولانا اعجاز حسن خان صاحب خوب آدمی تھے، ہماری پچھلی تہذیب اور شائستگی کے زندہ نمونہ،

پٹنہ مین خاکسار تقریباً سات سال رہا، (دسمبر ۳۷ء تا ستمبر ۴۴ء) اس دوران مین بیسیون ملاقاتین ہوئین کبھی کبھی ندوہ مین بھی اجتماع کے موقع ملے، ایک آدھ بار شبلی منزل بھی حاضر ہوا، دسنہ تو بار بار جانا ہوا، باتین بہت ہین مگر اس تحریر کی محدود گنجائش مین کیا کیا بیان کیا جائے؟ بہرحال دو چار ضروری باتین تو بیان کرنا ہی پڑین گی،

۴۰ء تک سید صاحب قبلہؒ سے کبھی کسی مسئلہ مین اختلاف نہین ہوا تھا، مگر اس کے بعد اُن کے افکار و

حد درجہ غیر محتاط تھا، مفتی محمد سعید صاحب کا تکیہ بھی ایک بڑے ستون پر تھا، اور وہ بھی بال بال بچ گئے، اسی زمانہ میں استاذ مرحوم کا ایک بڑا مفصل خط آیا، جس میں ذرا تند لہجے میں نصیحت کی گئی تھی، وہ خط آج بھی حکمت و موعظت سے لبریز نظر آتا ہے، نیز دارالعلوم تشریف لائے، تو ابو اللیث صاحب اور خاکسار کو الگ برآمدے میں کھڑے کھڑے بڑی دردمندی اور دلسوزی کے ساتھ نصیحتیں کیں، حضرۃ الاستاذؒ ابو اللیث صاحب کو بہت مانتے تھے، یہ نام (ابو اللیث) بھی انہی کا رکھا ہوا تھا، (ان کا اصل نام شبیر محمد تھا) اور ندوہ کے لئے انھیں مغتنم سمجھتے تھے، اگر جب ابو اللیث صاحب رخصت ہونے لگے، تو اُن کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو تھے، بولے، تو صرف اس قدر.... صاحب سے صفائی کر لو" سید صاحبؒ صدمے سہنے کے خوگر تھے، اپنے اختیارات استعمال کرنا یا عام زبان میں اپنے کو Teased کرنا جانتے ہی نہیں تھے۔ ——— اس واقعہ کے ہفتہ عشرہ بعد ہی ان پر امراض قلب کا دا شدید حملہ ہوا جس سے مہینوں ذی فراش رہے، اور مہینوں موت و حیات کی کشمکش رہی، اور پہلی سی صحت تو پھر نصیب ہی نہیں ہوئی،

"الضیاء" بھی اسی علالت کے دنوں میں بند کرنا پڑا، اور راقم کے ذمہ صرف تدریس کی خدمت رہ گئی، فارغ وقت میں علمی تحقیق و مطالعہ کا شوق پیدا ہوا، اور اس کے لئے سید صاحب قبلہ سے برابر مشورہ کیا کرتا، مراسلت کے ذریعہ اور زبانی بھی، اسی زمانے میں لغاتِ جدیدہ کی تکمیل کی، اور آغاز میں جدید اسالیب بیان پر ایک مفصل مقدمہ کا اضافہ کیا، حضرۃ الاستاذؒ بہت خوش ہوئے، اور دریافت فرمایا:

"اپنی محنت کا معاوضہ کیا چاہتے ہو؟ نام یا دام؟"

خادم نے عرض کیا "صرف استاذ کی خوشنودی مزاج" ——— کتاب کے سات نسخے مرحمت ہوئے" ٹائٹل پر "مع اضافہ جدید از مسعود عالم ندوی" کا اضافہ ہوا، نیز دیباچہ میں ایک حوصلہ افزا نوٹ مزید تحریک عمل کے لئے ثبت ہوا، ابھی ابھی سال دو سال ہوئے، پھر مزید اضافہ کا حکم ہوا تھا، تعمیلِ ارشاد میں کافی اضافہ ہو چکا ہے، اور بہت ہی اگر آہ! کہ یہ کوشش استاذؒ کی نگاہ ذرہ نواز سے محروم رہی، اور رہے گی،

تعلق ؟ میں نے عرض کیا:"ہمارے اُن کے خاندانی تعلقات ہیں" بولے"اور میری داڑھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے (جو اس وقت چھوٹی تھی) "جی ہاں! اب تو داڑھی منڈے بھی اہل حدیث ہوتے ہیں" مولانا ابوالقاسم صاحب اس سے بہت متاثر ہوئے، اور پھر دونوں زمانے کے انقلاب کا شکوہ کرنے لگے،

سیرت ابن عبدالوہاب کی تالیف میں بھی حضرۃ الاستاذ ہی سے مشورہ لیتا چونکہ یہ میری پہلی علمی تصنیف تھی اسلئے بڑی تمناؤں کے ساتھ سید صاحب کے نام معنون کرنے کی جرات کی،

انتساب

"اپنے استاذ، مربی اور مخدوم حضرت مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ العالی

کے نام

جن کے مفید مشوروں نے مجھ میں لکھنے پڑھنے کا مذاق پیدا کیا، اور جن کی پدرانہ شفقت میری زندگی کے اُتار چڑھاؤ کی نگہبان رہی ہے، اور اپنی طالب علمی کے گذشتہ بارہ تیرہ سالوں میں جن کے مشوروں کا یکسر پابند رہا ہوں،

اپنی اس حقیر علمی کوشش کو معنون کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں،

گر قبول افتد زہے عز و شرف

خاکسار

مسعود عالم ندوی"

لہ والد صاحب قبلہ کے پھوپھی زاد بھائی اور استاذ مولانا سید عبدالکبیر بہاری عمر بھر بنارس ہی میں مولانا ابوالقاسم کے والد مولانا محمد سعید کنجاہی بنارسی کے دست راست کی حیثیت سے کام کرتے رہے، مولانا سعید کے تمام صاحبزادوں نے انہی سے تعلیم پائی، اور انھیں "چچا" کہتے تھے، اور مولانا عبدالکبیر صاحب کے صاحبزادے برادر محترم حافظ عبدالقدیر صاحب مولانا ابوالقاسم کو بڑے بھائی کہتے تھے،

رجحان میں کچھ تبدیلی ہونے لگی جس سے پہلے پہل میرے بنے بنائے افکار و خیالات کو سخت جھٹکا لگا، سید صاحبؒ کو خود بھی اس کا احساس تھا، پہلے تو یہ کہکر تسلی دی: کہ میں نے بعیت میں فقہی مسلک کو آزاد رکھا ہے "مگر انداز فکر بتا رہا تھا کہ فقہی مسلک میں بھی تبدیلی ہو رہی ہے، مگر بہت آہستہ، اس لئے قدرۃً سنہ ۳۰ء اور اس کے بعد ایک عرصہ تک گفتگو اور خط و کتابت جو کچھ بھی ہوتی، وہ تصوف پر، فقہی مسلک کو نہیں چھیڑتے، اس لئے کہ ذہنی طور پر وہ اپنے مسلکِ تحقیق پر قائم تھے، راقم گفتگو میں تو کیا جرأت کرتا، مگر خطوط میں خوب دل کھول کر لکھتا، وہ بڑے صبر و تحمل سے جواب دیتے، اس سلسلہ میں حضرۃ الاستاذؒ نے دو چار ایسے جامع اور مفصل خط لکھے ہیں، جو بعض حیثیتوں سے تصوف کی بڑی تصنیفات پر بھاری ہیں، ایک مرتبہ گفتگو اس حد تک پہنچی کہ "دلائل کا جواب دو یا بات مانو" میں نے عرض کیا: "جواب تو دے نہیں سکتا، مگر دل میں بات نہیں اُترتی"۔

فقہی مسلک کا ذکر آیا ہے تو چند لطیفے سُن لیجئے، راقم شیخ محمد بن عبد الوہاب نجدیؒ کی سیرت لکھ رہا تھا اس کا پہلا باب **معارف** میں نمونہ کے طور پر تازہ تازہ شائع ہوا تھا، (مئی۔ جون سنہ ۴۱ء) اتفاق سے انہی دنوں سید صاحبؒ پٹنہ تشریف لائے، دیکھتے ہی فرمایا "آج کل تمہیں نجدیات سے بڑا تعلق ہو گیا ہے" میں کیا عرض کرتا؟ نگاہیں نیچی کر لیں، پھر میری داڑھی کی طرف دیکھ کر فرمانے لگے "خیر اب داڑھی تو بڑھ رہی ہے"

اس سے تقریباً ایک برس پہلے (سنہ ۴۰ء) کا ذکر ہے، مدرسہ اکزامینیشن بورڈ (بہار) کی مجلس تھی، سید صاحبؒ صدر نشین تھے، موضوع اصلاح نصاب تھا، صوبہ کے تمام مشہور علما موجود تھے، مخدومی مولانا محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ، مولانا مناظر احسن گیلانی، حاجی معین الدین ندوی مرحوم ان میں زیادہ نمایاں تھے، راقم بھی ایک ممبر کی حیثیت سے حاضر تھا، اس دن شام کو پٹنہ سیٹی (پٹنہ کی قدیم آبادی عظیم آباد) میں انجمن محمدیہ کے زیر اہتمام تبلیغی جلسہ تھا، مولانا سجادؒ نے سید صاحبؒ اور مولانا گیلانی کو دعوت دے دی، اور خاکسار کو بھی اُن کی معیت میں آنے کا حکم ہوا، وہاں پہنچے، تو مولانا ابو القاسم بنارسی سے ملاقات ہوئی، سب لوگ وہاں کے قریب بیٹھ گئے، راقم وہیں مولانا بنارسی سے الگ باتیں کرنے لگا، سید صاحبؒ نے تعجب سے فرمایا، تمہارا ان سے کیا

ین موجود تھے وہ اور دوسرے دوست سید صاحب سے کہتے "اُسے جانے نہ دیں"، وہ فرماتے: "میں کس طرح روکوں؟"
ریں خاموش اُن کے چہرے کی طرف دیکھا کرتا، "کہیں آزردہ تو نہیں؟" محبت اور فرض کی کش مکش بڑی سخت
رتی ہے آخر الوداع کی ساعت آگئی، ہاتھوں میں ہاتھ لے کر فرمانے لگے "اب میں وہی ترکیب کروں گا، جو
ولانا الیاس صاحب نے علی میاں کے لئے کی تھی" میں نے کہا: "وہ کیا" فرمایا "الا لتجاء الی اللہ" عرض کیا: "اس سے کون
وک سکتا ہے؟" فرمایا "اگر دعا قبول ہوگئی" تو عرض کیا "تو پھر کیا؟ خود بخود واپس چلا آؤں گا" ـــــ ان لطیف
بلوں کے بعد دیدۂ پرنم کے ساتھ رخصت فرمایا، اور میں نے اسے اپنی بڑی کامیابی خیال کی (۴ر اکتوبر ۴۳ء)
ـــــ اس کے بعد ایک مدت تک اس سلسلہ میں خط و کتابت ہوتی رہی، موضوع زیادہ تر تصوف ہوتا، وہ
بھی کبھی جماعت اسلامی کے اخبارات اور بعض لکھنے والوں پر تنقید، خاکسار اپنی بساط بھر اس خلیج کے پاٹنے کی
کوشش کرتا رہتا، اور کون کہہ سکتا ہے کہ بالکل ناکام رہا؟

سید صاحب قبلہ میں مہمان نوازی بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، اس کا صحیح اندازہ دینہ پہنچ کر ہوا،
شبلی منزل میں وہ معروف رہتے، دینہ میں نسبتہً فرصت ہوتی، وہاں وہ اپنے شاگردوں اور چھوٹوں کی بھی
ہی آؤبھگت کرتے، حضرت الاستاذ کو آموں کا بہت شوق تھا، بڑے شوق سے اپنا باغ بھی لگایا تھا، ایک
رتبہ آموں کے موسم میں دینہ حاضری ہوئی، تقی الدین نعمانی میرے پٹنہ کے رفیق بھی ساتھ تھے، سید صاحب اپنے
ہاتھ سے ایک ایک قاش کاٹ کر تقسیم فرماتے، ایک مرتبہ سید صاحب قبلہ کے ہاتھوں میں گٹھلی رہ گئی، تقی صاحب
نے از راہ تواضع گٹھلی طلب کی، فرمایا "آموں کے باب میں یہ تواضع نہیں"

پٹنہ میں حضرۃ الاستاذ نے ایک مرتبہ راقم کے غربت کدہ پر بھی قیام فرمایا، (۴۳ء)، اپنی تنگ دامانی اور
ستاذ مرحوم کے معمولات کے پیش نظر کبھی اس تحریک کی خود جرأت نہ ہوئی، مگر اب کی سید صاحب قبلہ نے خود ہی
طلاع دی، مدرسہ اکزامنیشن بورڈ کی مجلس منعقد ہو رہی تھی، گرمیوں کا موسم تھا، راقم کا مستقر اجتماع گاہ سے
الکل قریب تھا، شاید اسی وجہ سے غربت کدہ کا انتخاب ہوا ہو، بہر حال جونہی اطلاع ملی بڑی خوشی ہوئی

اور عجب شومیٔ قسمت کہ یہ سرنامہ اپنے وقت پر استاذ مرحوم کے ملاحظہ میں نہ آیا، یہ راز بھی کئی سال کے بعد مدینہ منورہ میں
کھلا، ایک شام کو سید صاحبؒ سلمان میاں کے ساتھ غربت کدہ پر تشریف لائے، (محرم ۱۳۶۹ھ / نومبر ۱۹۴۹ء)
دورانِ گفتگو میں دریافت فرمایا: "تمھاری محمد بن عبدالوہاب یہاں ہے؟" کتاب نکال کر پیش کی، سرنامہ پر
نگاہ اٹھک گئی، بہت متاثر ہوئے اور آنکھوں میں دو آبدار موتی چمکتے نظر آئے، اور پھر بڑی محبت سے فرمایا، "آپ
یہ جنسِ وفا عنقا ہے"، وہ منظر اب تک نہیں بھولتا، اور نہ بھولنے کی چیز ہے، ـــــ عرب ملکوں میں امیر شکیب ارسلان
(ف ۱۳۶۶ھ/۱۹۴۶ء) "امام الاوفیاء" کہے جاتے ہیں، سید رشید رضا مرحوم (ف ۱۳۵۳ھ/۱۹۳۴ء) نے بھی اپنے استاذ محمد عبدہ
کے ساتھ "حق وفا" خوب نباہا، ہمارے ملک میں یہ جنسِ گران بہت نایاب ہے، حضرت سید صاحبؒ اسلامی ہند
کے "امام الاوفیاء" کہے جا سکتے ہیں، استاذ کی رفاقت و اطاعت سے لے کر استاذ کے ہم نشینوں اور دوستوں تک
جس ذاتِ گرامی نے عہدِ وفا کو نباہا، وہ وفا شعاروں کا قافلہ سالار نہ ہو تو کون ہو؟ اب دیکھیں کہ اس کے خوانِ علم
کے زلہ ربا اس عہدِ وفا کو کس طرح نباہتے ہیں؟

تصوف اور فقہی مسلک کے علاوہ ایک دوسرا مسئلہ بھی اس دور میں ہمارے لئے پریشانی کا موجب
رہا، ۱۹۳۰ء ہی سے اسلامی ہند میں ایک نئی فکر بیدار ہو رہی تھی، جس نے ۱۹۴۱ء (۱۳۶۰ھ) میں ایک منظم دعوت
و تحریک کی صورت اختیار کر لی، اور راقم بھی پورے ذوق و شوق اور انشراحِ صدر کے ساتھ اس میں شریک ہو گیا،
اصولی اتفاق کے باوجود حضرت سید صاحبؒ کو اس کے متعلق کچھ شکوک و شبہات تھے، جس سے ہم عقیدتمندوں
کے لئے بڑی مشکل کا سامنا تھا، بہر حال اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے، کہ یہ مشکل سدِ راہ نہ بنی اور جہاں تک استاذ
مرحوم کی محبت و عقیدت اور ان کی طرف سے شفقت و محبت کا تعلق ہے، اس میں بھی کوئی فرق نہ آیا، اور راقم
اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتا رہا، اس سلسلہ میں سب سے بڑا مرحلہ ملازمت چھوڑ کر دارالاسلام پٹھان کوٹ
جانے کا تھا، پہلے والد ماجد مدظلہ سے اجازت لی، اس کے بعد سید صاحب قبلہؒ سے اجازت کا سوال تھا، اتفاق
سے سفر کے وقت لکھنؤ میں ملاقات کا پروگرام بن گیا، (اکتوبر ۱۹۴۲ء) شاہ معین الدین صاحب بھی اتفاق سے

...بذکر سے کچھ آب و تاب پیدا ہو جائے، مدینہ منورہ میں بھی استاذ علیہ الرحمۃ کا قیام رباط بھوپال میں تھا، ایک ...ن نو بجے صبح کو (اپنے ہاں کے وقت سے) حاضر ہوا، تو کیا دیکھتا ہوں، غزل خوانی ہو رہی ہے، اور کلام خود استاذ ...اے دلچسپی سے سننے لگا، اتنے میں کسی صاحب نے دریافت کیا، یہ کلام کس دور کا ہے؟ سید صاحب قبلہ میری طرف ...تہ ہو کر کہنے لگے: یہ نہیں بتاؤں گا، میرے بعض عزیز ایک خاص دور کے بعد کا میرا کلام قبول نہیں کرتے، اس ...صاحب بولے، پھر تو آپ نے بتا ہی دیا، کلام کی مناسبت سے واقعات کی تاریخی ترتیب قائم نہیں رہ سکی، اور نہ اس ...ریں اس اہتمام کی خاص ضرورت تھی،

اکتوبر ۱۹۴۴ء میں پنجاب آ گیا تھا، دو تین ماہ چکر لگانے کے بعد جالندھر کی آب و ہوا ساز گار نظر آئی ...وہیں اپنے کام کی طرح ڈال دی، اس دوران میں خط و کتابت برابر جاری رہی، شرف نیاز صرف ایک مرتبہ ...نو میں حاصل ہوا، (جولائی ۱۹۴۵ء) راقم گھر جاتے ہوئے، صرف دو چند دن کے لئے ندوہ ٹھہر گیا تھا، کچھ خیال ...یا تھا کہ عربی لٹریچر کی تیاری کا کام یہیں رہ کر کیا جائے، پورے برصغیر پاک و ہند میں عربی زبان کا کام ...نے کے لئے ندوہ سے اچھا ماحول اور بیش قیمت کتب خانہ نہیں مل سکتا، سید صاحبؒ نے مستقل قیام کی اجازت ...ت دے دی تھی، مگر پھر ارادہ بدل گیا، اور تقسیم کے بعد تو اس کا کوئی امکان ہی نہیں رہا۔

(۶)

تقسیم کے بعد مدتوں حالات سے بے خبری رہی، اعزار و احباب میری زندگی سے مایوس ہو چکے تھے، عرصہ ...بعد استاذ محترم کو میری سلامتی کی خبر ملی، اور مراسلت شروع ہوئی، اس دور کے خطوط میں زیادہ تر نئی مملکت ...ن کی ہمسایہ ریاست کا حال پوچھتے، خاص طور پر ہر خط میں برادرم سید مظفر حسین ندوی اور ان کے اعزار و اقربا ...کی خیریت دریافت کرتے، بعض بعض خطوط کا انداز بیان بڑا لطیف ہوتا تھا، ان کے جواب بھی رمز و کنایہ کی زبان ...میں ہوتے تھے،

اللہ تعالیٰ کی شان کریمی کے قربان جائیے چار سال کے بعد ملاقات ہوئی تو انہوں نے حسب معمول پہلے سے کوئی

مگر ساتھ ساتھ فکر بھی دامنگیر ہوگئی کہیں تکلیف نہ ہو، بہر حال اپنی سی ہر ممکن کوشش کی، مگر سچ یہ ہے کہ آرام و آسائش کا خاطر خواہ انتظام نہ ہوسکا، اسی موقع پر ایک دن ظہر کی نماز کے بعد کا ذکر ہے، ـــــ سید صاحب قبلہ اوراد و وظائف میں مشغول تھے، خاکسار اُن کے قریب سے گذرا فرمایا ٹھہرو، تم بہت نکتہ چینی کیا کرتے ہو، یہ (اذکار کی) کتاب دیکھو میں کونسی چیز خلاف سنت ہے،؟ الامر فوق الادب۔ عاجز نے چھوٹی سی مختصر کتاب (جس پر غالباً مناجات مقبول نام درج تھا) ہاتھ میں لی، اور درمیان سے ورق الٹا، تو ایک منظوم شجرہ پر نظر جم کر رہ گئی جس کی ردیف کے واسطے تھی اس گستاخ نے فوراً انگلی رکھ دی "یہ ہے توسل بالاموات" فرمایا کوئی اور چیز بتاؤ، عرض کیا پھر کیا مجال کہ خردہ گیری کروں؟ یہ تو صرف تعمیل ارشاد کی گئی۔

اس حکایت کے بیان کرنے سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ حضرۃ الاستاذ کس قدر روادار تھے؟ مسلک و رجحان فکر کی تبدیلی کے باوجود اُن کے علم نے کبھی ان کا ساتھ نہ چھوڑا،

اسی طرح کا لیکن اس سے بالکل الگ ایک واقعہ مکہ معظمہ میں پیش آیا، راقم ایک دن رباط بھوپال حاضر ہوا خاص قسم کی مجلس تھی، اور مجذوب صاحب کی غزل پڑھی جا رہی تھی، میں بھی بیٹھ گیا، کچھ دیر کے بعد سید صاحب نے فرمایا تمھیں بھی شعر و شاعری کا ذوق ہے؟ عرض کیا اور ذرا جرأت کے ساتھ "ذوق تو آپ ہی کا پیدا کیا ہوا ہے مگر خادم تو کسی اور چیز کی طلب میں حاضر ہوا کرتا ہے" اس پر میں نے طواف سے متعلق ایک سوال کیا، جس میں مفتوں سے الجھا ہوا تھا، اور حنفی مسلک کی تائید حدیث سے نہیں ہوتی تھی، سید صاحب قبلہ کچھ دیر غور فرماتے رہے، پھر مختلف کتابوں کی مراجعت کا مشورہ دیا، نیز مولانا عبدالوہاب دہلوی سے پوچھنے کو کہا، اتنے میں وہ صاحب جو ابھی ابھی غزل سنا رہے تھے، بولے تم تو حنفی ہو، فقہائے حنفیہ کا مسلک معلوم ہو جانے کے بعد اتنی چھان بین کی کیا ضرورت ہے؟ میرا جی جل گیا، اور عرض کیا معاف کیجئے گا میں حنفی نہیں ہوں"، سید صاحب قبلہ مسکرائے اور اشاروں میں بر اس ٹھیٹھ وہابیانہ جواب کی داد دی،

غزل خوانی کا ذکر چھڑ گیا ہے تو ایک واقعہ مدینہ منورہ کا بھی سنا دوں، شاید اس کم سواد تحریر میں جگہ

کا اپنا تاثر یہ تھا کہ یہ لوگ معذور ہیں، وہ اپنی مخصوص تعلیم و تربیت کی وجہ سے سمجھ نہیں سکتے کہ دین ایک نظامِ زندگی کا نام ہے۔ خواجہ صاحب چاہتے تھے کہ مجلس تعلیمات اسلامی کی صدارت قبول کرنے پر انھیں راضی کریں۔ سید صاحب نے انکار تو کیا، مگر خواجہ شہاب الدین جیسا ہوشیار انسان بھی سید صاحب سے زبان نہ لے سکا، یا عام زبان میں کوئی (Commitment) نہ کرا سکا، ہمارے بعض احباب حضرۃ الاستاذ کو سادہ لوح سمجھتے تھے، یہ خیال خود سادہ لوحی پر مبنی تھا، اُن کی سب سے بڑی خوبی یا کمزوری صرف اُن کی حد سے بڑھی ہوئی شرافت اور مروت تھی، معاملہ فہمی میں وہ کسی بڑے سے بڑے ذہین سے ذہین اور تجربہ کار سے تجربہ کار آدمی سے کسی طرح کم نہیں تھے،

یہ پاکستان آنے کی تمہید تھی حُسن اتفاق کہ جس دن حضرت سید صاحب قبلہؒ دہلی سے لاہور تشریف لائے ہیں، راقم لاہور میں موجود تھا، لیکن ان کے اس پروگرام سے بالکل بے خبر۔ مولانا مودودی، اور اُن کے رفقاء مولانا امین احسن اصلاحی اور میاں طفیل محمد صاحب بیس ماہ کی نظربندی کے بعد تازہ تازہ رہا ہوئے تھے، (اواخر مئی ۱۹۵۰ء) اور جماعت کی مجلس شوریٰ منعقد ہو رہی تھی، (جون ۱۹۵۰ء، اواخر شعبان ۱۳۶۹ھ) ــــــ انہی دنوں ایک روز مغرب کے بعد ہم لوگ دفتر جماعت اسلامی (مرکز) کے باہر کھلے صحن میں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے کہ دفتر کوٹھی سے فون پر اطلاع ملی: "مولانا سید سلیمان آئے ہوئے ہیں، اور کل صبح مولانا مودودی، مولانا اصلاحی اور مسعود عالم سے ملنے کے لئے آئیں گے" خبر پا کر جو مسرت ہوئی، اس کا کیا پوچھنا؟ مگر فکر یہ ہوئی کہ کسی طرح اُڑ کر دفتر کوٹھی پہنچ جاؤں، مگر رات کو چار میل کی مسافت کس طرح طے کی جائے؟ آخر علی الصباح اپنے ایک رفیق راؤ اللہ داد خان کی موٹر پر مولانا اصلاحی کو اُن کے گھر سے لیتے ہوئے، دفتر کوٹھی پہنچے، سید صاحب قبلہ ابھی چائے سے فارغ ہوئے تھے، اور انتظار ہی کر رہے تھے، تھوڑی دیر میں اچھرہ واپس آ گئے، مولانا مودودی کے دفتر میں نشست ہوئی، اندر صرف ہم چار آدمی[1] تھے، اور تمام ارکانِ شوریٰ اور رفقاء مرکز باہر برآمدے میں بیٹھے رہے، باتیں دیر تک ہوتی رہیں، سید صاحبؒ نے مولانا مودودی کو عرصہ کے بعد دیکھا تھا، کہنے لگے، اب تو ماشاء اللہ

---

[1] سید صاحب قبلہ، مولانا مودودی، مولانا اصلاحی اور خاکسار،

خبر بھی نہیں تھی، راقم عراق و نجد کا چکر لگا کر مکہ مکرمہ پہنچا، (ذی قعدہ ۱۳۶۸ھ) تو ہمارے معظم شیخ عبدالرحمن مظہر نے سب سے پہلے خوشخبری سید صاحبؒ کی سنائی اُن کے ایک معاون نے اس پر دریافت کیا "ندوی کسی خاندان کا نام ہے؟" میں نے کہا جی ہاں! بہت بڑا خاندان ہے" دوسرے ہی روز علی الصباح رباط بھوپال حاضر ہوا، اور دیار حرم کی اس ملاقات سے بڑی مسرت ہوئی، پھر تو برابر حاضری ہوتی،

وہیں معلوم ہوا کہ سید صاحب کو پاکستان بلایا جا رہا ہے، پوچھنے والا ہی تھا کہ ایک روز خاص طور پر مجھے الگ بٹھا کر کچھ سرکاری کاغذات دکھائے، یہ حکومت پاکستان کی طرف سے تعلیمات اسلامی بورڈ کی صدارت قبول کرنے کی دعوت تھی، اس کے بعد میری رائے دریافت کی، عرض کیا: "ذاتی طور پر تو مجھے بہر حال آپ کی آمد سے خوشی ہوگی لیکن ڈر لگتا ہے کہیں آپ کے انتقالِ مکان سے ندوہ اور دارالمصنفین کو نقصان نہ پہنچ جائے" اس پر وہ سوچ میں پڑ گئے پھر فرمانے لگے: "تمہاری جماعت کا رویہ کیا ہوگا"؟ اس کا جواب میرے لئے بہت مشکل تھا، بہر حال اچھی طرح غور کرنے کے بعد عرض کیا: جماعت کی پالیسی تو امیر اور اس کی شوریٰ کے ہاتھ میں ہے لیکن جہاں تک میں جماعت کے موقف کو سمجھا ہوں اسے آپ کی آمد اور صدارت قبول کرنے سے خوشی ہی ہوگی، اس طرح یہ بورڈ کے اندر بھی ایک صحیح مسلک کی توضیح ہو سکے گی، اور حکومت کو من مانی کارروائیاں کرنے کا موقع نہیں مل سکے گا۔ —— البتہ اگر آپ کی صدارت میں بورڈ نے کہیں کوئی ایسی سفارش کی جو جماعت کی نگاہ میں قابلِ قبول نہ ہوئی تو پھر ظاہر ہے کہ جماعت مخالفت کرے گی، آپ کی شخصی نہیں، بلکہ بورڈ کے فیصلے کی" کوئی نصف گھنٹہ گفتگو ہوئی اور راز داری کا عہد لے کر اجازت دی، اور یہ پہلا موقع ہے کہ یہ گفتگو کھول کر بیان کر رہا ہوں،

اتفاق سے اسی سال (۱۳۶۸ھ ۱۹۴۹ء) خواجہ شہاب الدین صاحب وزیر داخلہ (حال گورنر صوبہ سرحد) بھی حج کو آئے ہوئے تھے، وہ نماز عشاء سے پہلے اور بعد حنفی مصلّی کے پاس سید صاحبؒ کے پہلو میں بیٹھتے، اور دونوں میں روزانہ گفتگو ہوتی، خواجہ صاحب اوراد و اذکار قسم کی خالص مذہبی باتیں پوچھتے، اور حضرۃ الاستاذ امور مملکت و امور زندگی کے دوسرے مسائل چھیڑتے، یہ شعوری اور مہذب مناظرہ دونوں کے درمیان برابر جاری رہا، سید صاحب

کی ایک دعوت نہیں بھولتی، بہار کی قبولی اور سیخ کباب کا مزا کبھی بھولنے ہی کا نہیں، حکیم نصیر الدین صاحب ندوی اور خاکسار نے خاص طور پر کبابوں ہی پر اپنی توجہ مرکوز رکھی، حضرۃ الاستاذ ہماری اس بے تکلفی اور طفلانہ حرکت سے بہت محظوظ ہوئے،

مارچ ۵۳ء میں اس گنہگار کو بھی بے گناہوں کے ساتھ سرکاری مہمان خانہ کی ضیافت نصیب ہوئی، حضرۃ الاستاذ پر اس کا بہت اثر ہوا، بار بار عزیزی محمد عاصم صاحب رفیق دارالعروبہ سے خیریت دریافت کرتے، جیل میں بھی دو والا نامے ملے جن سے بڑی مسرت اور طمانیت حاصل ہوئی، پر افسوس کہ رہائی کے بعد (اگست ۵۳ء) پھر نیاز نہ حاصل ہو سکا، اور اس سے زیادہ افسوس یہ کہ آخری دنوں میں حضرۃ الاستاذ کی علالت سے بھی بے خبر رہا، اسے قسمت کی ستم ظریفی کے سوا اور کیا کہا جائے کہ جیل میں اچھا خاصا رہا، مگر رہائی کے بعد دورہ کے مسلسل اور سخت حملے ہونے لگے، اور نومبر (۵۳ء) کے آغاز میں تو ایسا حملہ ہوا کہ اپنی بیماری کی پچیس سالہ زندگی میں کبھی ایسا حملہ نہیں ہوا تھا، دو تین ماہ ذی فراش رہا، ایک دوست کو کراچی لکھا کہ استاذ محترم کی خدمت میں حاضر ہو کر دعا کی درخواست کیجئے، (۱۳ر نومبر ۵۳ء) مگر ہونا کچھ اور لکھا تھا، میں بستر علالت پر روزانہ کراچی سے جواب کی راہ دیکھ رہا تھا کہ ۲۲ر نومبر کی شب (۱۴ر ربیع الاول ۷۳ھ) کو ۸ ½ بجے ایک اخباری نمائندے نے آکر وفات حسرت آیات کی اطلاع دی، انا للہ وانا الیہ راجعون،

أيتها النفس اجملي جزعاً　　إن ما تحذرين قد وقعا

تعزیت کے لئے بھی کراچی نہ جا سکتا تھا، چلنے پھرنے کی سکت بھی نہیں تھی، کہیں ہفتوں کے بعد جا کر سفر کے قابل ہوا، دسمبر کی ۱۶ر کو کراچی پہنچا، اور برادرم ابو عاصم صاحب اور سلمان میاں سلمہ اللہ کی معیت میں اس قطعہ ارض کی زیارت کی، جہاں استاذ مرحوم کا جسد خاکی معروف استراحت ہے، اللہ تعالیٰ ان کی تربت پر رحمت کے پھول برسائے اور انہیں اعلیٰ علیین میں جگہ دے،

اب ہمارے نصیبوں میں ماتم ہی ماتم ہے، جو جگہ خالی ہوتی ہے وہ پر نہیں ہوتی، ہائے شبلی منزل کی

آپ کی داڑھی خوب بڑھ گئی ہے، پھر نعیم صاحب کو دریافت کیا، وہ بلائے گئے، اور اُن کی پیٹھ ٹھونکی، اور دینی خدمات کی انجام دہی پر مبارک باد دی، اتنے میں رفقا رکا تقاضا ہوا کہ باہر تشریف لائیں، تاکہ سب لوگ نیاز حاصل کر سکیں، باہر برآمدے میں بھی دیر تک نشست رہی، وہاں سید نقی علی صاحب علوی (جو ان دنوں تسنیم کے رپوٹر مقرر ہوئے تھے، اور آج کل سنٹرل جیل میں نو سال کی قید کاٹ رہے ہیں) نے کچھ سوالات کئے، اور تسنیم کے لئے اچھا خاصا انٹرویو تیار کر لیا،

اس وقت تو سید صاحب قبلہ خیر سگالی کے وفد میں آئے تھے، واپسی کا عزم مصمم تھا، مگر کراچی جا کر کچھ ایسی صورتِ حال پیدا ہوئی، یا کر دی گئی کہ وطن مالوف کو نہ لوٹ سکے،

پاکستان نے حضرت الاستاذ کی آو بھگت میں کمی نہیں کی، سرکاری اور غیر سرکاری، ہر حلقہ میں ہاتھوں ہاتھ لئے گئے، حکومت کی ہر ایسی چھوٹی بڑی کمیٹی جس میں اسلامی نگاہ کی نمایندگی مطلوب ہوتی، اس کی رکنیت اُن کو پیش کی جاتی، اور وہ اس میں شریک ہوتے، اپنے مفید مشوروں اور تجربوں سے کمیٹی کی مدد کرتے، دستور ساز اسمبلی کی مجلس تعلیمات اسلامی سے پہلے تو الگ رہے، لیاقت علی خان مرحوم نے بہت ترغیب دی، مگر سید صاحب ضمانت (Assurance.) چاہتے تھے کہ بورڈ کے مشورے قبول کئے جائیں گے، مگر حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ بورڈ کی صدارت قبول کر لی، اور ہمارے نقطۂ نظر سے بھی ان کا قبول کرنا اچھا رہا، "ہمارے نقطۂ نظر" سے مراد پاکستان میں اسلامی دستور کیلئے جد و جہد کرنے والوں کا نقطۂ نظر ہے،

سید صاحب کبھی کبھی ٹنڈو بھی تشریف لاتے، دو مرتبہ دارالعروبہ کی بھی عزت افزائی ہوئی، ایک مرتبہ استاذ محترم ڈاکٹر تقی الدین ہلالی (حال پروفیسر بن یونیورسٹی جرمنی)[1] کی موجودگی میں، جب کہ وہ عراق سے چند دنوں تفریح کے لئے پاکستان تشریف لائے تھے، (اگست ۱۹۵۱ء)

۱۹۵۱ء میرا بھی کبھی کبھی کراچی جانا ہوتا، اور سید صاحب کے دولت کدہ پر دلچسپ صحبتیں رہتیں، اس موقع پر دو ...

---

[1] ہلالی صاحب کا مستقل قیام بغداد ہی ہے، اس سال بون یونیورسٹی نے عراقی حکومت سے ان کی خدمات مستعار لی ہیں،

مولانا سید سلیمان ندوی میری نظر میں

از

جناب مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی ایم اے پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت یہ کہنا کہ وہ ایک بہت بڑے محقق، نامور مصنف، بلند پایہ عالم، اور صاحب طرز انشا پرداز تھے، ایک عام اور معمولی پیرایۂ بیان ہے جس سے مولانا کا اصل مقام، ان کا رتبہ متعین نہیں ہوتا، اور نہ اُن کا صحیح حق ادا ہوتا ہے حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی میں ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی کے ذہن و فکر، اور مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں خواہ وہ طرز قدیم کا ہو، یا طرز جدید کا، نصف صدی کے اندر مذاق تصنیف و تالیف، طریق فکر و استدلال اور تہذیبی امیال و عواطف کے اعتبار سے جو عظیم الشان انقلاب ہوا ہے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اور اُن کے علمی و عملی کارناموں کو اس میں بڑا دخل ہے، اور یہ انقلاب جس طرح پیدا ہوا، اور اس نے ذہنی و فکری دنیا میں قدیم تعلیم یافتہ طبقہ کو جو سیادت بخشی ہے، اس کی نظیر آج پورے عالم اسلام میں کہیں نظر نہیں آئے گی، اس کی اصل حقیقت معلوم کرنے کے لئے ضروری یہ ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل کے علمی و تصنیفی حالات پر ایک نگاہ ڈال لی جائے،

مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے نامور استاذ مولانا شبلی کے زیر سایۂ عاطفت جب تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا تو یہ وہ زمانہ تھا جب کہ تعلیم یافتہ مسلمان دو طبقوں میں بٹے ہوئے تھے، ایک قدیم تعلیم یافتہ یعنی علماء اور دوسرا جدید انگریزی تعلیم یافتہ گروہ، دونوں کا دائرۂ عمل ایک دوسرے سے الگ تھا، اور صرف اتنا ہی نہیں

وہ دو گز زمین جسے استاذ مرحوم نے اپنی آرام گاہ کے لئے پسند فرمایا تھا، وہ اپنے استاذ کے پہلو میں استراحت کرنا چاہتے تھے، مگر قدرت انھیں ایسی جگہ لے آئی، جہاں ساحل عرب کی ٹھنڈی ہوائیں، صبح و شام آیا کرتی ہیں، شاید اُن کے تحت الشعور میں کوئی ایسی آرزو رہی ہو،

"یہ نقوش اور تاثرات" نہایت عجلت میں اور قلم برداشتہ لکھے گئے ہیں، اس سے اپنی تعریف مقصود نہیں دلوں کا حال اللہ بہتر جانتا ہے، مطلوب یہ ہے کہ غلطیوں اور فروگذاشتوں سے درگذر کیا جائے، اس تحریر میں جو سنین اور تاریخیں درج کی گئی ہیں، یا جو واقعات بیان کئے گئے ہیں، وہ سب اپنے کمزور حافظہ کے سہارے ہیں، ان میں غلطی کا بہت کچھ امکان ہے، اگر کسی دوست کو ایسی فروگذاشت محسوس ہو، تو ضرور مطلع کریں، عنایت ہوگی، اسی طرح جہاں جہاں حضرۃ الاستاذ کے اقوال نقل کئے گئے ہیں وہ اکثر و بیشتر روایت بالمعنی ہیں، اصلی الفاظ یاد رکھنا میرے بس سے باہر تھا، البتہ واقعات و اقوال کی صحت کا پورا اطمینان ہے،

واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین،

داغنگار

"مسعود عالم ندوی"

اس کی صورت بجز اس کے کچھ اور نہیں ہو سکتی تھی کہ ایک طرف تعلیم قدیم کے نصاب میں تغیر و تبدل کر کے ایسے علما پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی، جو صرف فروعی اور جزئیاتی مسائل میں ہی وقت صرف کرنے کو دین کی سب سے بڑی خدمت نہ سمجھتے ہوں، بلکہ تعلیم جدید نے اسلام اور اسکی تعلیمات و روایات سے متعلق جو صدہا نئے قسم کے سوالات و مباحث پیدا کر دیئے تھے، ان پر وقت کی زبان میں گفتگو کر سکتے، اور اسلام کے نمایندہ کی حیثیت سے بزم نو کے ارکان کو خطاب کر سکتے ہوں، اور دوسری طرف ضرورت تھی کہ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کے دل و دماغ پر مغربی علوم و فنون اور انگریزی تعلیم سے جو مرعوبیت چھائی ہوئی تھی، اور جس کے باعث وہ خود اپنی تاریخ، کلچر، تہذیب و تمدن اور روایات سے متعلق احساس کمتری میں مبتلا تھا، اس کو دور کرنے کی کوشش کی جاتی، اس سلسلہ میں کرنے کے اصلی کام دو تھے، ایک یہ کہ علی گڈھ کے نصاب تعلیم میں عربی فارسی اردو، اسلامی تاریخ، اسلامی فلسفہ و الٰہیات، یہ مضامین بھی شامل کرائے جاتے، اور دوسرا کام یہ تھا کہ صاف ستھرے اور دلچسپ و دلنشین انداز بیان و زبان میں مغربی مذاق تحقیق و تصنیف کے مطابق اسلامی مسائل و مباحث اور اسلامی تاریخ و تمدن پر کتابیں لکھ کر شائع کی جاتیں تاکہ یہ انگریزی تعلیم یافتہ گروہ بھی ان کو پڑھ کر فائدہ حاصل کر سکتا،

مولانا شبلی جو قدرت کی طرف سے ایک بڑا حساس دل اور بیدار دماغ لے کر پیدا ہوئے تھے، انھوں نے ان دوگونہ ضرورتوں کو محسوس کیا، اور علی گڈھ کو خیرباد کہکر ہمہ تن اس کام میں لگ گئے، تقاضائے وقت کے مطابق علما پیدا کرنے کی غرض سے وہ ندوۃ العلما، سے وابستہ ہو گئے، جو خاص اسی غرض سے قائم ہوا تھا، اور تعلیم یافتگان سرسید کی خصوصاً اور عام مسلمانوں کی عموماً ذہنی اصلاح کے لئے انھوں نے تاریخ و فلسفۂ اسلام کو اپنا خاص موضوع بنا کر کتابیں لکھنی شروع کیں اس سلسلہ میں اور سب چیزوں سے قطع نظر، مولانا نے اردو پر جو احسان عظیم کیا ہے، وہ کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا، جو زبان اب تک صرف شعر و شاعری یا افسانہ خوانی و داستان طرازی کی زبان تھی، اس کو ایک نہایت باوقار مگر ساتھ ہی دلچسپ و شگفتہ علمی زبان بنا دیا، اور بحث و تحقیق، تنقید اور جمع و ترتیب معلومات کے اعتبار سے اردو اب تک جس جدید مغربی انداز تصنیف سے ناآشنا تھی

بلکہ دونوں میں رقابت تھی، ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتا تھا، علماء کی علمی کوششوں اور تحریری و تصنیفی سرگرمیوں کا دائرہ چند فروعی اور جزئیاتی مسائل، یا متون درسیہ کی شروح و حواشی تک محدود تھا، تصنیف و تالیف کی زبان صاف، دلچسپ اور رواں نہیں تھی، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ تعلیم یافتہ طبقہ کو اُن کے ساتھ نہ کوئی دلچسپی تھی، اور نہ اس کی نگاہ میں ان مسائل و مباحث کی کوئی اہمیت تھی مغربی علوم و فنون اور انگریزی تعلیم نے اسلامی مسائل سے متعلق طرق فکر و بحث میں جو تبدیلی پیدا کردی تھی علماء کو نہ اس تبدیلی کا احساس تھا، نہ اس تبدیلی کے اسباب سے ان کو واقفیت تھی، اور نہ ان کی زبان وقت کے جدید طرز سخن سے آشنا تھی،

دوسری جانب انگریزی تعلیم یافتہ گروہ کا حال یہ تھا کہ وہ چونکہ سرسید کی آخری عمر کی پالیسی جو مسٹر بیک پرنسپل مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے زیر اثر تھی، اوس سے کافی متاثر تھا، اس بنا پر اس کے دل و دماغ پر انگریزوں کی نقالی اور ان کی تہذیبی و تمدنی تقلید کی دھن سوار تھی، اس جنون میں اوس کو نہ مذہب سے لگاؤ تھا، نہ دینی اور قومی روایات سے دلچسپی تھی، اور نہ قومی تہذیب اور کلچر کی اس کے دل میں عظمت تھی، مسلمانوں کی تاریخ سے متعلق اگر اسے تھوڑی بہت کچھ واقفیت تھی بھی، تو اس کی معلومات کا ذریعہ خود مسلمان مصنفین کی کتابوں کے بجائے یورپ کے مشنری مصنفین یا مستشرقین کی تصنیفات تھیں، جو علمی تحقیق اور ریسرچ کے پردہ میں اسلام کی روایات حسنہ کو بھی اسی طرح پیش کرتے تھے کہ ایک مسلمان اسے پڑھکر شرم سے گردن جھکا لیتا تھا، خود اس کے دل میں اپنی تاریخ سے نفرت پیدا ہوجاتی تھی، اس طرح دونوں گروہوں کی راہ منزل مقصود اور سمت ایک دوسرے سے بالکل الگ تھی، ایک دوسرے کا مذاق اڑاتا تھا، طنز و تعریض کرتا تھا، دونوں میں اختلاف و افتراق کی ایسی وسیع خلیج حائل تھی جس کا دور کرنا آسان نہیں تھا،

وقت کی ملی اور قومی ضرورتوں کا تقاضا تھا کہ دونوں طبقوں کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے، اُن میں صلح کرا کے مصافحہ کرایا جائے، تاکہ دونوں باہمی اشتراک عمل سے وقت کے جدید تقاضوں کو پورا کر سکیں

اس طبقہ کا پورا اعتماد حاصل نہیں ہو سکتا تھا، علاوہ بریں بعض کوتاہ نظروں نے خواہ مخواہ مولانا شبلی کو خواجہ حالی سے ٹکرا دیا، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم جدید کے لوگوں میں ایک مستقل گروہ ایسا پیدا ہو گیا جس کا سب سے محبوب ادبی مشغلہ خواجہ حالی کی جا وبیجا مدح سرائی اور منقبت کرنا، اور ساتھ ہی مولانا شبلی پر مختلف دروازوں سے حملہ کرتے رہنا تھا، چنانچہ تنقید شعر العجم عطیہ فیضی کے نام مولانا شبلی کے خطوط وغیرہ کتابوں اور ان جیسے مضامین ومقالات کی اشاعت اسی طبقہ کی اندرونی کوششوں اور سرگرمیوں کی رہین منت ہے۔

ان حالات اور اس ماحول میں مولانا شبلی کی سب سے بڑی خوش نصیبی یہ تھی کہ اُن کو مولانا سید سلیمان ندوی کی شکل میں ایک ایسا شاگرد مل گیا جو وسعتِ مطالعہ، ذوقِ تحقیق، دقیقہ رسی، اور علم وفضل میں استاد کا صحیح جانشین تھا، اور ساتھ ہی اپنے اندر بہت سی ایسی خوبیاں اور کمالات رکھتا تھا، جو اسی کا اپنا حصہ تھے، اس کا قلم بجائے گرم مزاج ہونے کے نرم رو اور سبک خرام تھا، جو تنقید کے نازک سے نازک موقع پر بھی جادۂ احتیاط واعتدال سے منحرف نہیں ہوتا تھا، اس کی طبیعت میں متانت وسنجیدگی اور حلم وبردباری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، جس کی وجہ سے اس کے خامہ گوہر فشاں کی پیشانی پر کبھی بھی جھنجھلاہٹ اور غیظ وغضب کے تیور ظاہر نہیں ہوتے تھے، تشرّع، تدیّن، بلکہ تقشف اس کی قبائے علم کا تکمۂ زرّین تھا، جس کے باعث کسی مسئلہ میں اختلاف کے باوجود جماعتِ علماء کو بھی اس پر نکتہ چینی کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی، پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے مزاج میں استقلال، طبیعت میں صلح پسندی، مزاج میں مسکنت تھی، فکر پر بجائے عقلیت اور تفلسف کے اشعریت بلکہ سلفیت غالب تھی، ان خداداد اوصاف وکمالات کے باعث وہ جس محفل میں بھی بیٹھا، صدر بزم ہو کر رہا، جس انجمن میں بھی شرکت کی، شمع انجمن کہلایا۔

مولانا سید سلیمان ندوی کے یہ وہ ذاتی اوصاف وکمالات تھے جن کے باعث جہاں مولانا شبلی کامیاب نہ ہو سکے، وہ کامیاب ہوئے، اور جو عام اور ہمہ گیر اعتماد ان کو حاصل ہوا، وہ ان کے استاذ کو حاصل نہیں ہو سکا تھا، علماء نے ان پر اپنے اعتماد کلی کا اظہار اس طرح کیا کہ وہ جمعیۃ علمائے ہند کے

مولانا نے اوس کو اس سے مالا مال کر دیا،

مولانا شبلی نے جو پودا لگایا اور جس درخت کا بیج بویا تھا، اگرچہ ان کی زندگی مین برگ و بار لانے لگا اور اس کے ثمرات ظاہر ہونے لگے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس پودے کو ایک تناور درخت بنانے مین سب سے بڑا دخل انہی کے جانشین و تلمیذ خاص مولانا سید سلیمان ندوی کا ہے، انھون نے جس طرح اس تحریک کو چلایا، اوس کو کامیاب بنانے کے لئے جو راہ (مصنوعی طور پر نہین بلکہ فطری اور طبعی طور پر) اختیار کی، سچ یہ ہے کہ وہ مولانا شبلی کے بس کی بات بھی نہین تھی،

اس مین شبہ نہین کہ مولانا شبلی کی شخصیت بڑی جامع اور ہمہ گیر تھی، انھون نے مجتہدانہ طور پر علمی کام بھی کئے، اور عملی بھی، انھون نے نثر کے میدان مین بھی گوہر لٹائے، اور نظم کے سبزہ زار مین حسن تخیل، لطافت بیان اور جذبات واثر کے پھول کھلائے، انھون نے ہندوستانی مسلمانون کی ذہنی معاشرتی یہان تک کہ سیاسی اور تعلیمی زندگی کے ہر پہلو اور ہر گوشہ کو متاثر کیا، اور سب پر کچھ نہ کچھ اپنا نقش چھوڑا، آج ہم واضح طور پر ان وسیع اثرات ونقوش کو ہر جگہ محسوس کر سکتے ہین لیکن بہرحال یہ ماننا پڑے گا کہ بعض خاص اسباب کی بنا پر جن مین سے بعض کا تعلق ضرور مولانا کی اپنی طبیعت اور افتاد مزاج سے تھا، مولانا شبلی کو نہ قدیم الخیال علما کا پورا اعتماد حاصل ہو سکا، اور نہ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کا، مولانا نے الکلام، علم الکلام اور سیرت النبی مین بعض خاص بحثین اپنے نقطہ نظر سے لکھی تھین، علماء کا طبقہ ان کو برداشت نہ کر سکا، یہان تک کہ خود ان کے سب سے بڑے قدردان اور مداح نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خان شروانی بھی اُن کی تحریک ندوہ کے مخالفون مین ہو گئے[1]، اور اس پر جو طوفان بپا ہوا، اور مولانا پر جس طرح اس طبقہ کی طرف سے حملے ہوئے وہ باخبر اصحاب سے پوشیدہ نہین ہین،

رہا تعلیم جدید کا گروہ، تو چونکہ یہ گروہ سر سید کے زیر اثر تھا، اور مولانا شبلی سر سید کی سیاسی بلکہ کسی ایک حد تک تعلیمی پالیسی کے مخالف تھے، اور اس مخالفت کا برملا اظہار بھی کرتے تھے، اس بنا پر ظاہری تو

[1] معارف: مولانا شروانی کے متعلق یہ بیان صحیح نہین ہے، سیرت تو اس وقت چھپی بھی نہین تھی،

نمایندے تھے، مولانا اس وفد کے رئیس وامیر تھے، اُن کے علاوہ ہندوستان کی اور دوسری یونیورسٹیاں اوران یونیورسٹیوں کے مختلف علمی اورادبی ادارے مولانا کو برابر بلاتے رہتے، اوراُن کے چشمۂ علم وفضل سے سیراب ہوتے رہتے تھے،

اس عنایت کے باعث مولانا کی تصنیفات وتالیفات، مضامین ومقالات، تقریرین اورخطبات دونون تعلیم یافتہ طبقون مین مقبول وپسندیدہ تھے، ہرایک اُن کی قدر کرتا، اوراُن سے فائدہ اٹھاتا تھا، اس طرح مولانا شبلی کی تحریک کا جواصل مقصد تھا، وہ باحسن وجوہ تکمیل کو پہنچا یعنی ایک طرف علماے کرام نے کتب درسیہ کے متون وحواشی اورمنہیات وشروح کے دائرہ سے باہر نکل کرعلماے سلف کے علمی کارنامون کا جائزہ لینا شروع کیا، ان مین ذوق تحقیق وجستجو پیدا ہوا، تاریخ جس کو انھون نے اپنے نے شجرممنوعہ بنارکھا تھا، اوراگراس کی طرف توجہ بھی ہوتی، تواس کا دارومدار علامہ جلال الدین سیوطی کی تاریخ الخلفاپر تھا، اسکی طرف متوجہ ہوتے، فلسفہ تاریخ کا ذوق بڑھا، واقعات کی تحقیق وتنقید کا جذبہ ابھرا، اسلامی علوم وفنون کے بہت سے گوشے تھے، جن کی طرف اب تک توجہ نہین کی گئی تھی، اُن کی طرف بھی رجحان ہوا، اورپھر سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ وقت کی زبان مین گفتگو کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی، دوسری جانب انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کو اسلامیات سے دلچسپی ہوئی، قومی روایات کا احترام اوراُن کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا، مغربی مصنفین کی غلط بیانیون نے اسلامی تاریخ وثقافت سے متعلق جونقوش بدان کے دل ودماغ مین جمادیئے تھے، وہ مٹنے لگے، اوراب خود ان مین مستند ذرائع معلومات کی روشنی مین اسلامیات پرریسرچ کرنے کا ولولہ پیدا ہوا اوراس طرح انھون نے استادانِ مغرب کی اندھی پیروی سے نجات پائی، آج ہم مین کتنے ملکی اورغیرملکی یونیورسٹیون کے اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات ہین جن کا موضوع تحقیق وتصنیف، اسلامی علوم وفنون، اسلامی دینیات اوراسلامی ادبیات ہین، کون کہہ سکتا ہے کہ اس عام فضا کے پیدا کرنے مین مولانا سید سلیمان ندوی کے علمی اور اسلامی کارنامون کو بہت بڑا دخل نہین ہے،

سالانہ اجلاس منعقدہ کلکتہ کے صدر منتخب ہوئے، ایک عرصہ تک اوس کی مجلس عاملہ کے سربرآوردہ ممبر رہے،
جمعیۃ علمائے ہند کے زیر اہتمام دلی میں آل انڈیا فلسطین کانفرنس ہوئی تو اس کے صدر بھی وہی ہوئے، تو
ندوۃ العلماء کی وہ سرزمین جو مولانا شبلی پر تنگ ہوگئی تھی، مولانا سید سلیمان ندوی کے لئے اُس نے عزت
واحترام کے ساتھ اپنی آغوش کھول دی، پھر علماء خواہ کسی مسلک خیال کے ہوں مولانا کا ہرایک مسلک کے
علماء میں بڑا وقار اور درجہ تھا، اور سب دل سے مولانا کے علم وفضل کے مداح ہونے کے ساتھ اُن کے اخلاق
وفضائل کے قدردان تھے، دوسری طرف جس علی گڈھ کو مولانا شبلی نے حالات سے تنگ اور مجبور ہوکر خیرباد
کہا تھا، اُسی نے مولانا سید سلیمان ندوی کی علمی اور اسلامی خدمات کا اعتراف اس طرح کیا کہ مولانا کو
ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری دینے پر فخر کیا، علاوہ بریں وہ مسلم یونیورسٹی کی کورٹ کے اور اس کی
بعض اور مجلسوں کے رکن رکین ایک مدت تک رہے، انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کو مولانا کی ذات کے ساتھ جو عقیدت
وارادت تھی، اس کا اظہار مولانا محمد علی اور ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہما کے ان خطوط سے بھی ہوتا ہے جو ان
دونوں بزرگوں نے مولانا کو لکھے ہیں، مولانا محمد علی کے خطوط میں تو خیر نری عقیدت اور جوش ارادت کا ہی
اظہار ہے لیکن ڈاکٹر اقبال کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی مسائل ومباحث پر غور کرتے وقت انھیں جب
کبھی کوئی الجھن اور دقت پیش آتی تھی، تو وہ فوراً مولانا کی طرف رجوع کرتے تھے، ڈاکٹر صاحب مرحوم کو
مولانا کے ساتھ جو گہری عقیدت تھی، اس کا عملی اظہار انھوں نے اس طرح بھی کیا کہ ادارۂ معارف اسلامیہ
جس کے بانی خود ڈاکٹر صاحب تھے، اس کے اجلاس منعقدہ لاہور کی صدارت انھوں نے مولانا کو پیش کی، اور پھر
صدارت کی تحریک کرتے ہوئے انھوں نے جو الفاظ مولانا کی نسبت کہے تھے وہ اُن کے دلی جذبات ارادت
کے آئینہ دار تھے، انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کے اعتماد کا ایک اور واضح ثبوت یہ ہے کہ خلافت کا وفد انگلستان
گیا تو مولانا اوس کے رکن تھے، حجاز کی موتمر عالم اسلامی میں شرکت کرنے کے لئے ہندوستان سے خلافت
کا جو وفد گیا تھا جس میں مولانا محمد علی، شوکت علی، شعیب قریشی جیسے لوگ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کے

ازراہِ شفقت بزرگانہ ندوۃ المصنفین دہلی کے دفتر واقع قرول باغ میں ایک دن شام کے وقت تشریف لائے ہم سب بیٹھے چائے پی رہے تھے، اور مولانا کی شفقت آمیز باتوں اور مشوروں سے مستفید ہو رہے تھے کہ اتنے میں ملک کے ایک مشہور صاحبِ قلم جن کا رجحان تجدد کی طرف تھا، اور جن کا ایک مقالہ "برزخ" کی بحث پر حال میں ایک علمی مجلہ میں شائع ہو چکا تھا، اچانک دفتر برہان میں آنکلے، مولانا نے انھیں دیکھا تو نیم استادہ ہو کر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا، اور مسکراتے ہوئے فرمایا "السلام علیکم یا اہل البرزخ" وہ تو یہ سن کر کچھ جھینپ سے گئے، لیکن مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی کے اس فقرہ نے کہا کہ دنیا میں جنت کہاں ہے؟ فضا کو صاف کر دیا، اسی مجلس میں مولانا نے اپنی سیرت النبی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ بعض لوگ پوچھتے ہیں کہ سیرت پہلی، اور دوسری جلد میں ختم ہو گئی، اب سیرت کہاں ہے؟ یہ تو سب اسلامی تعلیمات ہیں جن پر باقی جلدوں میں بحث ہوئی ہے تو بھئی اصل بات یہ ہے کہ انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کسی ایسی کتاب کو پڑھتے ہی نہیں جس میں خالص دینی اور مذہبی بحثیں ہوں، وہ صرف تاریخ اور سیرت سے مانوس ہیں، اس لئے میں نے در اصل عنوان سیرت کا ہی رکھا ہے، اور اس بہانہ چاہتا ہوں کہ ان حضرات کو اسلام کی تمام دینی اور اخلاقی تعلیمات اور ان کے احکام و مسائل سے واقف کر دوں، اس طرح گویا میں نے بچوں کی طرح اپنے اصل مقصد کے چہرہ پر ایک نقلی کا مصنوعی چہرہ لگایا ہے تاکہ ان حضرات کو توحش نہ ہو، اور وہ سیرت محمدیہ کے ساتھ ساتھ شریعت محمدیہ سے بھی واقف ہو جائیں۔

بہرحال اس گذارش کا مقصد یہ ہے کہ مولانا علماً و عملاً صورۃً و شکلاً ظاہراً و باطناً ایک عالم دین تھے، انھوں نے جو کچھ کیا اسی حیثیت سے کیا، اور اپنے عالمانہ وقار کو ہر جگہ اور ہر موقع پر برقرار رکھا، اس بنا پر طبقۂ علماء کو ان کا خاص طور پر ممنون و شکر گذار ہونا چاہئے کہ ان کے ایک فرد فرید نے یونیورسٹیوں کی علمی مجلسوں بشمول کل کانگرس کے اجلاسوں اور ادبی و تحقیقاتی اداروں کے جلسوں کی صدارت کر کے اور اسلامی علوم و فنون کے علاوہ دوسرے ملکی، ادبی، تاریخی، اور سیاسی مسائل و مباحث پر محققانہ تصنیفات و مقالات لکھ کر صرف اپنے آپ کو سرفراز و سربلند نہیں کیا، بلکہ تعلیم جدید کے حضرات کے دل و دماغ پر یورپ سے طبقۂ علماء اور مدارس عربیہ کی علمی تحقیقی سیادت

اس بنا پر کوئی شبہہ نہیں کہ مولانا کے احسانات دونوں طبقوں پر ہیں، اور چونکہ ان دونوں کو مولانا نے ایک دوسرے سے قریب کر دیا، اور ان میں علمی و دینی ارتباط و اتفاق پیدا کر کے انھیں اس قابل بنا دیا کہ دونوں باہمی اشتراک و تعاون سے اسلام کی اور مسلمانوں کی بیش از بیش مفید تر خدمات انجام دے سکیں، اس بنا پر مولانا کا احسان تمام مسلمانوں پر بھی ہے، اس عام فیضان و احسان کے علاوہ اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہئے کہ مولانا طرز قدیم کے تعلیم یافتہ تھے، انھوں نے یونیورسٹیوں کے ایوانوں کے بجائے مدرسہ کی چٹائیوں پر بیٹھکر علم حاصل کیا تھا، اور وہ اپنی وضع قطع شکل و صورت، لباس اور عادات و اطوار ہر لحاظ سے کٹر قسم کے تعلیم قدیم کے فرد تھے، اور اُن کو اس میں اتنا غلو تھا کہ تعلیم جدید کے حضرات کی بڑی بڑی انجمنوں میں بیٹھکر بھی اپنی مولویت کو چھپاتے نہیں، بلکہ اس پر فخر کرتے تھے، جب کبھی موقع ملتا تھا، ایک مخصوص لطیف پیرایہ میں چٹکیاں بھی لے لیا کرتے تھے، چنانچہ راقم الحروف کو یاد ہے ندوۃ العلماء کا سالانہ جلسہ (غالباً ۲۸ء میں) امرتسر میں منعقد ہو رہا تھا، میں اس زمانہ میں طالب علم تھا، اور لاہور میں مقیم تھا، لاہور سے میں اور ڈاکٹر محمد عبد اللہ چغتائی جو ڈاکٹر اقبال مرحوم سے خاص تقرب رکھتے، اور اُن کے ایڈیکانگ کی حیثیت سے رہتے تھے، اس اجلاس میں شرکت کرنے کے لئے امرتسر پہنچے، ڈاکٹر صاحب مرحوم کسی عذر کی بنا پر اس میں شرکت نہیں کر سکتے تھے، میں اور چغتائی صاحب مغرب کے بعد مولانا سید سلیمان ندوی کی قیامگاہ پر حاضر ہو کر مولانا سے ملے، تو مولانا نے علیک سلیک کے بعد چغتائی صاحب سے خطاب کر کے پوچھا، کیوں ماسٹر صاحب! ڈاکٹر صاحب (ڈاکٹر اقبال) تشریف نہیں لائیں گے چغتائی صاحب نے ڈاکٹر صاحب کی طرف سے عذر بیان کیا، تو مولانا نے فوراً اپنے خاص انداز میں مسکراتے ہوئے فرمایا، اگر ڈاکٹر صاحب تشریف لے ہی آتے تو اچھا ہوتا، یہاں سب علماء جمع ہوں گے اُن کو سنانے کا اس سے بہتر اور کیا موقع ہوگا، چغتائی صاحب معلوم نہیں سمجھے، یا نہیں لیکن دہلی اور لکھنؤ کے جو حضرات اس وقت وہاں موجود تھے، انھوں نے مولانا کے اس فقرہ سے بڑا لطف لیا۔

غالباً ۳۹ء یا ۴۰ء کی بات ہے، ایک مرتبہ دہلی میں تشریف فرما تھے، اسی اثناء میں حسب معمول

ن لے گا، سے کس طرح جمع اور کس طرح مرتب کرنا چاہیئے اور پھر جب آپ مقالہ تیار کرلیں، تو میرے پاس
ج دیجئے میں اس میں اصلاح کردیا کروں گا"

اس واقعہ کے دو تین سال بعد کا ذکر ہے، اس زمانہ میں میرے اس قسم کے مضامین و مقالات
ب کے بعض ادبی رسالوں میں شائع ہوتے تھے لیکن مجلہ معارف کی جو عظمت میرے دل میں تھی، اس کی وجہ سے
وں تھا کہ کبھی معارف میں بھی میرے نام سے کوئی چیز شائع ہو، اس معیار کا کوئی مقالہ تو لکھا نہیں گیا،
ب نظم لکھی تھی جو بعد میں پنجاب کے ایک ادبی رسالہ میں شائع ہوگئی تھی، اس نظم کی نسبت خیال ہوا کہ معارف
ی معیار کے مطابق ہے، فوراً مولانا کی خدمت میں ارسال کردی، مولانا نے یہ نظم واپس کرتے ہوئے بڑی محبت
ر شفقت کے ساتھ تحریر فرمایا "آپ اس نظم نویسی کے چکر میں کہاں پڑ گئے یہ آپ کے مرتبہ سے گری ہوئی چیز ہو
لی محنت کیجئے اور مقالہ نویسی پر توجہ کیجئے، قوم کو آپ سے اسی کی توقع ہو سکتی ہے اور یہی ہونی چاہئے، مولانا
کے اس گرامی نامہ کا میرے دل پر خاص اثر ہوا، اور مجھے اب تک یاد ہے کہ میں نے مولانا کے اس مکتوب گرامی
کے جواب میں یہ شعر لکھا تھا،

کون ہوں کیا ہوں کہاں ہوں سب حقیقت کھل گئی
تو نے دہ ٹھوکر لگائی چشم علت کھل گئی

بہرحال حق یہ ہے کہ ارباب قلم و تحقیق علماء کی ایک جماعت پیدا کرکے مولانا نے ہندوستان کی
اسلامی سوسائٹی میں جو انقلاب پیدا کیا ہے وہ آج پورے عالم اسلام میں اپنی نظیر آپ ہے،
ورنہ عہد حاضر کے ٹرکی، مصر، ایران، شام، بیروت، اور افغانستان پر نگاہ ڈالئے، تو
معلوم ہوگا کہ مغربی طرز پر تحقیق و تصنیف کا جو کام بھی ہو رہا ہے، اسے جدید تعلیم یافتہ طبقہ ہی
انجام دے رہا ہے، طرز قدیم کی تعلیم کے حامل جو حضرات ہیں وہ اب تک وہی اسی پرانی ڈگر پر چلے جا رہے ہیں
اور سیات و دینیات کے حوالت کدہ سے باہر نکل کر نئی دنیا کی آب و ہوا سے زیادہ آشنا نہیں، اس

رفاقت بھی ثبت کر دیا، ورنہ ظاہر ہے ان علمی مجلسوں میں علما کا گذر ہی کہاں تھا!

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی عظیم الشان خدمات علم و دین کا ایک بڑا روشن و تابناک پہلو یہ ہے کہ انھوں نے جو کچھ کیا خود ہی نہیں کیا، بلکہ ان ہی مدارس عربیہ کے پڑھے ہوئے اور بوریہ نشین علماء میں سے ایک ایسی جماعت تیار کر دی، جو ارباب قلم بھی ہیں، اور علم و تحقیق کے میدان کے شہسوار بھی، اسلامیات کے مبصر بھی ہیں، اور دینی مسائل و معاملات کے نکتہ دان و نکتہ سنج بھی، واقعہ یہ ہے کہ خود مصنف اور محقق ہونا اس قدر مشکل نہیں ہے جتنا مصنف گر اور محقق ساز ہونا ہے، مولانا شبلی کی طرح مولانا سید سلیمان ندوی کو بھی قدرت نے اس کا خاص ذوق اور ملکہ عطا فرمایا تھا، اور اُن میں دوسروں کی علمی نگرانی و رہنمائی کا بڑا جذبہ تھا، دار المصنفین، مولانا جس کے ناظم اعلیٰ اور سرخیل و امام تھے، اس کا تو خیر قیام ہی اسی مقصد کے لئے ہوا تھا کہ ارباب قلم علماء اور محقق مصنفین پیدا ہوں، اس بنا پر اس ادارہ کے ارکان و رفقاء کو تو مولانا کے فیضان تعلیم و تربیت سے بلاواسطہ و براہ راست بہرہ مند ہونے کا شرف حاصل تھا ہی لیکن اس ادارہ سے باہر ملک کے دور دراز گوشوں میں جو نوجوان علمی ذوق رکھتے تھے، اور اس سلسلہ میں مولانا سے استفادہ کرنا چاہتے تھے، مولانا نے کبھی اُن کی امداد و اعانت میں دریغ نہیں فرمایا، اور بڑی خوشی سے جو علمی رہنمائی بھی وہ کر سکتے تھے، وہ کرتے تھے، خود راقم الحروف کو یاد ہے کہ سنہ ۲۷ء میں جب کہ میں دار العلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہونے والا تھا، میں نے مولانا کو ایک خط لکھا کہ میں کچھ تصنیف و تالیف کا ذوق رکھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ دو تین سال دار المصنفین میں آپ کے زیر تربیت رہ کر اپنے اس ذوق کی تکمیل کروں تو کیا یہ صورت ممکن ہے؟ مولانا نے بڑی شفقت اور محبت کے ساتھ دار المصنفین کے قواعد و ضوابط کی ایک کاپی ارسال کر دی، اور افسوس کے ساتھ تحریر فرمایا کہ بالفعل کسی معاوضہ پر یہاں قیام کی کوئی صورت نہیں ہے، ولعل اللہ یحدث بعد ذالک امراً" اس کے بعد لکھا کہ بہرحال آپ کو یہاں آنے کی ضرورت نہیں ہے، آپ مجھ سے جو فائدہ یہاں رہ کر حاصل کرنا چاہتے ہیں، اپنی جگہ پر رہتے ہوئے بھی کر سکتے ہیں، آپ جس عنوان پر لکھنا چاہیں، مجھکو اس سے مطلع کر دیں، میں بتا دوں گا کہ اس عنوان سے متعلق مواد کہاں کہاں

پذیر ہونے لگا ، بعض کوتاہ نظر خواہ کچھ کہیں لیکن حق یہ ہے کہ آخر عمر میں مولانا کو جو روحانی مقام حاصل ہوا اور جس کی وجہ سے وہ علمی اور تحقیقی کاموں سے کنارہ کش ہو گئے تھے ، وہ قرب و اتصالِ الٰہی کا ایک بلند مقام تھا ، ایک انسان کے کمال کی معراج ہے ، عشق کی فغاں سنجی یا زمزمہ پیرائی ہجر و فراق کی مدت کے دراز ہونے تک باقی رہتی ہے لیکن جب حسن خود بے نقاب ہو کر سامنے آ جائے ، اور اپنی جلوہ طرازیوں سے عشق کی کائناتِ زندگی پر مستولی اور غالب ہو جائے تو عشق کی زبان گنگ ہو جاتی ہے ، وہ مسحور و بے خود ہو کر قوتِ گفتار سے محروم ہو جاتا ہے ، اور تجلیات میں گم ہو کر حیرت کی تصویر بن کر رہ جاتا ہے ، علم کی مثال اس نقشِ پا کی سی ہے جس کے ذریعہ محبوب تک پہونچنے کی کوشش کی جائے لیکن جب محبوب خود سامنے آ جائے تو اس وقت بھی اس نقشِ پا کی پیروی کرنا اور اسی کے اشاروں پر چلنا خود منزلِ مقصود سے دور ہونا نہیں تو اور کیا ہے ؟ یہی وہ حقیقت ہے جس کو "العلم حجاب اکبر" میں بیان کیا گیا ہے ،

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

حضرت سید صاحب کا آخر عمر میں روحانی لطائف و مزایا کی طرف مائل ہو جانا ، اور اس میں غلو کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اب تک وہ جو کام کرتے رہے تھے ، اس کو انھوں نے تکمیل کے آخری درجہ تک پہونچا دیا تھا ، مولانا کی تخصیص نہیں بلکہ ہر صاحب کمال کا حال یہی ہوتا ہے کہ جب اس کا کمال عروج و ارتقا کے آخری نقطہ تک پہنچ جاتا ہے ، تو اب اُس کو اس میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہتی ، اور وہ اس سے منہ موڑ کر ایک ایسے سبزہ زار میں جا نکلتا ہے ، جو زمان و مکان ، این و آن اور زوال دنیا کے خرخشوں اور حد بندیوں سے ماوراء ہوتا ہے ، اور جہاں کسب کمال کی تشنگی کبھی نہیں بجھتی ، خوب سے خوب تر تلاش کرنے والی نگاہ کو کبھی سیری نہیں ہوتی ، جہاں دامانِ طلب کبھی پر نہیں ہوتا ، جہاں قرب و اتصال کی ٹھنڈک شوق و اشتیاق کی آگ کو سرد نہیں کرتی ، بلکہ اُسے اور مشتعل کرتی ہے ، آئزک نیوٹن جس نے عالمِ طبعیات میں ایک انقلابِ عظیم

نتیجہ یہ ہے کہ ان ملکون کے جدید تعلیم یافتہ حضرات پر اسلامی تہذیب و ثقافت اور تمدن و معاشرت کا رنگ اتنا گہرا نہین ہے، جتنا کہ ہندوستان کے اس طبقہ پر ہے، وہان جدید و قدیم کا فرق و امتیاز اُن کی باہمی رقابت اور کشمکش اب تک قائم ہے، مصر مین جامعہ ازہر اور جامعہ فواد دونون ایک دوسرے کے حریف ہین لیکن یہان دیوبند علی گڈھ ندوۃ العلماء اور جامعہ ملیہ سب ایک دوسرے کے حلیف شریک اور متعاون ہین، غور کیجئے اس انقلاب عظیم کا سرچشمہ کہان ہے؟ اس مین شک نہین کہ اس مین خلافت کی تحریک اور بعد مین کانگریس کی بھی جدوجہد کو بھی دخل ہے لیکن جہان تک اس انقلاب کے علمی پہلو کا تعلق ہے، کوئی شبہ نہین، وہ بڑی حد تک سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کوششون کا مرہون ہے۔

اب ایک اور پہلو سے دیکھئے خالص علمی اور تحقیقی کام اور پبلک لائف دونون مین بیر رہا ہے۔ دونون کو نباہنا جام و سندان باختن سے کم مشکل نہین ہے لیکن مولانا کو قدرت نے جو عجیب ہمہ گیر اور جامع طبیعت عطا فرمائی تھی، اس کی وجہ سے انھون نے اس راہ کو بھی اپنے لئے آسان کر لیا تھا، تحریک خلافت اور اس کے بعد تحریک آزادی کے زمانہ مین وہ ان دونون تحریکون کے سرگرم زعما کے دوش بدوش چلتے رہے، ملک کے دور دراز گوشون کے اور ملک سے باہر بھی سفر ہو رہے ہین، جلسون مین تقریرین ہو رہی ہین، اجلاس کا خطبۂ صدارت پڑھا جا رہا ہے، مشاورتی کونسلون مین شرکت ہو رہی ہے، قومی کارکنون کی عملی نگرانی کی جا رہی ہے غرض کہ مسلمانون کی قومی زندگی کا کوئی گوشہ تعلیمی ہو، یا سیاسی، مذہبی ہو یا معاشرتی، ادبی ہو یا علمی، ایسا نہین ہے جس مین مولانا عملاً شریک نہ رہے ہون اور اس کی سرگرمیون مین حضور قلب و دماغ کے ساتھ حصہ نہ لیتے ہون، اس بنا پر مولانا کی شہرت اور اُن کی شخصیت کی عظمت کا احساس صرف طبقۂ خواص تک محدود نہین رہا بلکہ عام مسلمانون اور ابنائے وطن نے بھی اُن کی بزرگی اور زعامت کے سامنے سر نیازمندی خم کر دیا

علم و فضل کمال و ہنر اور عروج و ارتقا کے یہ تمام منازل و مراحل طے کرنے کے بعد آخر وہ وقت بھی آگیا جب کہ علم کے حجابات ظاہری بھی اٹھ گئے، اور شاہد حقیقی کا جمال معنوی بلا کسی واسطہ و وسیلہ کے

جاتے ہوتے، سید صاحب میرے کمرہ میں تشریف لائے، اور کتاب طلب کی، جب میں نے افسوس کے ساتھ عرض کیا کہ کتاب ہو مگر یہاں نہیں، آگرہ میں ہے، تو فرمایا بس جب کتاب یہاں تمھارے پاس بھی نہیں تو اور کس کے پاس ہوگی، دارالمصنفین کی کتابیں یہاں اور پڑھتا کون ہے!"

تلمذ روحانی کی اس نسبت کی وجہ سے مجکو سید صاحب کی ذات اور شخصیت کے ساتھ نہ صرف ایک رسمی عقیدت تھی، بلکہ محبت بھی تھی، اور مجکو یہ کہنے میں مسرت اور فخر دونوں محسوس ہوتے ہیں کہ حضرت سید صاحب بھی مجکو اسی بزرگانہ شفقت وکرم سے دیکھتے، اور اسی کے مطابق برتاؤ کرتے تھے، دلی جب کبھی آتے تو ناممکن تھا کہ شرف ملاقات عنایت فرمائے بغیر واپس چلے جاتے، ایک مرتبہ میں نے برہان کے نظرات میں اسلامی تعلیم گاہوں کی خصوصیات بتاتے ہوئے ندوۃ العلماء کی نسبت "دینی مگر دنیوی" کا فقرہ لکھدیا، یہ جب حضرت سید صاحب کی نظر سے گذرا تو بڑا ملال ہوا، اسی اثنا میں کسی سفر میں کہیں مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی اور سید صاحب کی ملاقات ہوگئی، سید صاحب نے مولانا حفظ الرحمن سے فرمایا "ہم لوگ تو مولوی سعید صاحب کو اپنا ہی آدمی سمجھتے تھے، لیکن اب اُن کے قلم سے ندوہ کی نسبت یہ الفاظ پڑھ کر سخت صدمہ اور ملال ہوا ہے، مولانا سیوہاروی نے دہلی پہونچ کر مجکو سید صاحب کی یہ شکایت پہنچا دی تو مجکو خود اس کا بہت افسوس اور ملال ہوا، کچھ دنوں بعد لکھنؤ میں ایک جلسہ کے سلسلہ میں سید صاحب سے ملاقات ہوگئی تو میں نے اس واقعہ کا ذکر کرکے عرض کیا کہ دراصل مجھ سے تعبیر میں کوتاہی ہوگئی، مجکو ایک "بھی" کا لفظ اور لکھنا چاہئے تھا، یعنی دینی مگر دنیوی بھی، تو میرا مطلب زیادہ واضح ہوتا، کیونکہ ظاہر ہے دین کے ساتھ دنیا جمع کرنا عیب اور نقص نہیں، بلکہ ہنر و کمال ہے،

"دین و دنیا بہم آمیز کہ اکسیر اینست"

اور درحقیقت ندوہ کے قیام کی ایک غرض یہ بھی تھی کہ ایسے علما پیدا کئے جائیں جو علوم دینیہ کے ساتھ علوم دنیویہ میں بھی کوتاہ نہ ہوں، حضرت سید صاحب یہ سُن کر غایت شفقت سے مسکرا دیئے، اور فرمایا، "الآن

پیدا کر دیا جب وہ سب کچھ کر چکا تو خود اس سے منحرف ہو کر گرجا سے وابستہ ہو گیا، اور اس کے قلب و روح کو سکون وہین ملا، حضرتنا الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہ الکشمیریؒ کا حال بھی یہی تھا، عمر بھر علم و تحقیق کے میدان میں کونہ کونہ کی خاک چھانتے پھرے، اور ہزاروں کو اپنے فیوض علیہ سے باکمال بنا گئے لیکن خود آخر عمر میں ذکر و شغل اور مراقبہ و مناجات کی طرف حد سے زیادہ مائل ہو گئے تھے، اور فرماتے تھے کہ افسوس! ہم علم کے پیچھے لگے رہے لیکن اصل کام جو کرنے کا تھا وہ نہ کیا !!

جس طرح آئزک نیوٹن اپنی لافانی تحقیقات و اکتشافات سے بیزار ہو کر ایک گوشہ میں جا بیٹھا لیکن دنیا آج تک اس سے فائدہ اٹھا رہی ہے، اور اٹھاتی رہے گی، اسی طرح اگرچہ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور آخر میں اپنے عمر بھر کے کاموں سے، ایک بلند تر و اعلیٰ تر مقصد کی خاطر کنارہ کش ہو گئے تھے لیکن یہ انھوں نے اس وقت کیا تھا، جب کہ اُن کی کوششوں کا لگایا ہوا پودا پورے طور پر بار آور ہو چکا تھا، اور اُن کو یقین تھا کہ اس سلسلہ میں انھیں خود جو کام کرنا تھا، وہ اسے پورا کر چکے تھے اور اب ایک ایسی جماعت پیدا ہو گئی تھی، جو اُن کے نقش قدم پر چل کر اس کام کو برابر جاری رکھے گی اور فروغ دے گی، اس بنا پر اب آئندہ اس راہ میں جو کام بھی ہو گا، وہ مولانا کی منت کشی احسان سے آزاد نہیں ہو سکتا،

جیسا کہ میں نے اوپر کہا مجکو مولانا سے براہ راست تلمذ و استفادہ کا شرف حاصل نہیں ہو سکا لیکن واقعہ یہ ہے کہ میں اپنے تئیں مولانا کا تلمیذ معنوی سمجھتا ہوں، کیونکہ میں نے مولانا شبلی، اور مولانا سید سلیمان ندوی دونوں کی کتابوں سے کافی استفادہ کیا ہے، مجکو ان دونوں بزرگوں کی کتابیں اور بالالتزام مجلہ معارف پڑھنے کا شوق اُس وقت سے تھا، جب کہ میں پورے طور پر ان کے مضامین سمجھنے کی استعداد بھی نہیں رکھتا تھا

دارالعلوم دیوبند کی طالب علمی کے زمانہ میں میں اپنی اس خصوصیت کے اعتبار سے مشہور تھا، چنانچہ ایک مرتبہ حضرت شاہ صاحب (مولانا سید محمد انور شاہ) کو یاجوج و ماجوج سے متعلق ایک بحث کا مطالعہ کرنے کے سلسلہ میں ارض القرآن کو دیکھنے کا خیال پیدا ہوا تو ایک دن عشاء کی نماز کے بعد مسجد سے کمرہ کی طرف واپس

حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کے دینی و علمی خدمات

(اُن کی تصانیف کی روشنی مین)

از

شاہ معین الدین احمد ندوی

حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی جیسی جامع کمالات شخصیتین کہین صدیون مین پیدا ہوتی ہین، وہ اپنے کمالات مین ائمۂ سلف کی یادگار تھے، جملہ اسلامی علوم پر اُن کی نظر نہایت گہری اور وسیع تھی، اور بعض علوم مین امامت و اجتہاد کا درجہ حاصل تھا، اور اُن مین اپنی علمی و دینی بصیرت اور تلاش و تحقیق کی ایسی یادگارین چھوڑین جو مدتون علمی دنیا کی رہنمائی کا کام دیتی رہین گی، ان کا علمی درجہ اتنا بلند اور اُن کے علمی و دینی خدمات کا دائرہ اتنا وسیع اور گوناگون اور اتنا متنوع ہے کہ اس کی تفصیل کے لئے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے، ایک مضمون مین اس کو سمیٹنا دریا کو کوزہ مین بند کرنے کی سعی لاحاصل کرنا ہے، اس لئے اس مضمون مین صرف اُن کی اہم تصانیف کی روشنی مین اُن کے علمی کمالات پر اجمالی تبصرہ کیا جائے گا، اور اُن کی تصنیفی خصوصیات دکھانے کی کوشش کیجائے گی جس سے اُن کے علمی درجہ اور ان کے دینی و علمی خدمات کا سرسری اندازہ ہوسکے،

اُن کے علمی و دینی خدمات کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے اس کے پس منظر سے واقفیت ضروری ہے اس کے بغیر اُن کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہین ہوسکتا، اٹھارہوین خصوصًا انیسوین صدی مین مسلمانون کے سیاسی زوال کے ساتھ پوری اسلامی دنیا کے ہر شعبۂ زندگی مین ایک عام جمود و انحطاط طاری ہوگیا تھا، اور حکومت کیساتھ

اصبت" اور بات رفت و گذشت ہوگئی،

اب وہ شفقت و محبت اور کرم و توجہ یاد کرتا ہوں تو دل تڑپ جاتا ہے، گویا میر تقی میرؔ سے معذرت کے ساتھ!

معائب اور تھے پر اُن کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے!

میرؔ کے اصل شعر میں بجائے "اُن" کے "دل" ہے،

فرحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً وطاب ثراہ

ان حالات مین سب سے سخت مرحلہ مسلمانون کے مذہب اور اُن کی تہذیب و روایات کی مدافعت اور اُن کے تحفظ کا تھا جن پر دو سمتون سے حملے ہو رہے تھے، ایک عیسائی مشنریون کا تبلیغی حملہ، دوسرے علم و تحقیق کی راہ سے، مشنریون کا طریقہ پرانے بحث و مناظرے کا تھا، اس لئے اس دور کے علما اور بعض نئے تعلیم یافتہ لوگون نے اس کا پوری کامیابی سے مقابلہ کیا، اور اُن کے خطرات کو بڑی حد تک روک دیا، مگر مشنریون سے کہین زیادہ خطرناک، اور ضرر رسان مستشرقین اور فضلاے مغرب کی جماعت تھی، جس نے پرانے طرز کے اعتراضات اور بحث و مناظرے کے بجائے جن کی اس عقل و دانش کے زمانہ مین کوئی قدر و قیمت نہ رہ گئی تھی، ایک نیا علمی اور سائنٹفک طریقہ اختیار کیا، انھون نے عربی زبان سیکھی، اور اس کی نادر و نایاب کتابین تلاش کرکے بڑی محنت سے تصحیح و تحشیہ کے ساتھ ان کو شائع کیا، اور خود مسلمانون کی کتابون سے غلط اور غیر معتبر واقعات و روایات ڈھونڈ کر، اور صحیح روایات مین تلبیس و ملمع سازی کرکے علم و تحقیق کے رنگ مین مذہب اسلام اور اسلامی تاریخ و تہذیب پر اعتراضات شروع کر دیئے، اور اُن کو ایسی بدنما شکل مین پیش کیا، کہ انھین پڑھکر خود مسلمانون کو شرم آنے لگی، ان مستشرقین مین ایسے بھی ہین جو مذہب اسلام اور اسلامی تہذیب کے بڑے مداح ہین، اور انھون نے بڑی کشادہ دلی سے اسلام کی خوبیون اور ساری دنیا خصوصًا یورپ پر مسلمانون کے علمی و تمدنی احسانات کا اعتراف کیا ہے، اور اس پر مستقل کتابین لکھی ہین، لیکن ایسے کم ہین جن کا دامن بالکل پاک ہو، اور انھون نے کسی نہ کسی پہلو سے کوئی نہ کوئی زہر چکانی نہ کی ہو،

اس قسم کی تحریرون کا اثر نہ صرف دوسری قومون بلکہ ان تعلیم یافتہ مسلمانون پر بھی جو اپنے مذہب اور اپنی تاریخ سے واقفیت نہین رکھتے، بڑا اثر پڑتا تھا، اور اسلام کے متعلق ایک عام غلط فہمی پھیل رہی تھی، اس حملہ کے مقابلہ کے لئے دینی علوم مین پوری مہارت اور دینی بصارت کے ساتھ اسلامی تاریخ مین وسعت نظر، تلاش و تحقیق کے جدید طریقون، مغربی زبانون، جدید افکار و تصورات، اور نئے رجحانات سے واقفیت ضروری تھی، اور ان تمام باتون کا اجتماع نہ پرانے علما مین تھا، اور نہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ مین، علما کا بڑا طبقہ سرے سے ان حالات ہی سے بے خبر تھا، نیا طبقہ

دین و ملت علم و اخلاق اور تہذیب و روایات بھی رخصت ہو رہے تھے، مغربی قوموں کی یلغار ایک طرف اسلامی حکومتوں کو ختم کر رہی تھی، دوسری طرف ان کے علوم و فنون اور نظر فریب تہذیب مسلمانوں کے مذہب و اخلاق اور تہذیب و تمدن کے قلعوں کو مسمار کر رہے تھے، اور مسلمان یورپ کی سیاسی غلامی کے ساتھ ساتھ اس کی ذہنی غلامی میں بھی مبتلا ہوتے جا رہے تھے، جو سیاسی غلامی سے بھی زیادہ سخت تھی۔

یہی حال ہندوستان کے مسلمانوں کا بھی تھا خصوصاً ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد وہ اور بھی پست و پامال ہو کر رہ گئے تھے، عوام کو اس کا احساس نہیں تھا، اونچا طبقہ اس وقت بھی تعیش میں مبتلا اور خواب غفلت میں مدہوش تھا، علمائے کرام کا بڑا طبقہ اس انقلاب کے نتائج سے بے خبر پرانی بے روح مدرسی تعلیم فقہی جزئیات کا رد و قدح اور فروعی مسائل میں جنگ و مناظرے میں مشغول تھا، تاہم ان میں کچھ نفوس ایسے ضرور تھے جن میں مسلمانوں کی اس زبون حالی کا احساس اور ان کی سیاسی و مذہبی تجدید و اصلاح کا جذبہ موجود تھا، اور ان میں مجاہدانہ روح بھی تھی، مگر وہ بھی نئے حالات اور اس کے مقابلہ کے اسباب و ذرائع سے واقف نہ تھے اور صرف مذہبی تعلیم و مذہبی اصلاح کو مسلمانوں کی دینی اور دنیوی فلاح کا ذریعہ سمجھتے تھے، اور ان کی ساری کوششیں اسی دائرے کے اندر محدود رہیں، ان میں سے بعض مجاہدین قوت کے ذریعہ نئی حکومت کا تختہ الٹنا چاہتے تھے، مگر اس میں کامیابی کا کوئی امکان نہیں تھا۔

اس کے مقابلہ میں ایک نیا گروہ تھا، اس کا مقصد بھی مسلمانوں کی فلاح تھا، وہ نئے حالات اور اس کے مقابلہ کے وسائل سے بھی واقف تھا، مگر نئی حکومت، اس کے علوم و فنون اور اس کی تہذیب سے اس قدر مرعوب تھا کہ وہ محض جدید تعلیم اور مغربی تہذیب کی نقل و تقلید ہی کو مسلمانوں کی نجات کا ذریعہ سمجھتا تھا، اس لئے اس کی کوششیں زیادہ تر اسی دائرہ کے اندر محدود رہیں، اور ان دونوں کوششوں سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچا، اگر علماء کا طبقہ نہ ہوتا، تو ہندوستان سے دینی علوم اور دینی روح کا خاتمہ ہو جاتا، اور نئے طبقہ کی کوششیں نہ ہوتیں تو دنیاوی حیثیت سے مسلمانوں کا وجود ختم ہو جاتا، اس لئے ان دونوں کی کوششیں امت کے شکریہ کی مستحق ہیں

کرتی ہیں، اور اُن کی ساری تصانیف کا مرکز و محور ایک ہی نقطہ ہے، خواہ وہ کسی موضوع سے تعلق رکھتی ہوں، اس سے ایک نیا علم کلام پیدا ہوا جس کی بنیاد پرانے فلسفہ اور منطق کے بجائے عقل و درایت اور تنقید و تاریخ پر ہے، اور اس سلسلہ کی سب سے اہم کتاب سیرۃ النبی ہے،

بعض مستشرقین نے اسلام کے خلاف سب سے بڑا حربہ یہ اختیار کیا تھا کہ نعوذ باللہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات قدسی ہی کو اعتراضات کا نشانہ بنا کر مجروح کر دیا جائے، اس سے خود بخود اسلام کی پوری عمارت منہدم ہو جائے گی، چنانچہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر مختلف قسم کے اعتراضات کا سلسلہ شروع کیا، علامہ شبلی مرحوم نے ان متفرق اعتراضات کا جواب دینے کے ساتھ ساتھ سیرۃ النبی پر ایک مبسوط کتاب لکھنے کا ارادہ کیا جس میں سوانح نبوی کے ساتھ اسلام کے عقائد و احکام و اعمال کی بھی تفصیل آ جائے، اور وہ سیرت پاک اور اسلام کا ایسا صحیح اور دلکش مرقع ہو، جس میں کسی اعتراض کی گنجائش ہی باقی نہ رہے، اور جسے دیکھ کر مخالفین کو بھی آنحضرت صلعم، اور آپ کے لائے ہوئے مذہب کی حقانیت و صداقت اور عظمت و جلالت کا یقین ہو جائے، چنانچہ بڑے سر و سامان سے اس کتاب کی تالیف شروع کی، مگر ابھی اس کی دو جلدیں لکھی تھیں، اور وہ شائع بھی نہ ہوئی تھیں کہ اُن کا وقت آخر ہو گیا، اور وہ اس کام کی تکمیل اپنے لائق شاگرد مولانا سید سلیمان ندوی کے سپرد کر گئے، جنھوں نے نہ صرف اس عظیم الشان کام کو مکمل کیا، بلکہ اسلامی علوم و فنون میں تلاش و تحقیق اور اس کی تعبیر و ترجمانی کی نئی نئی راہیں نکالیں، اور اس کی مختلف شاخوں پر اپنے علم و نظر کی وسعت اور تحقیق و تلاش کے بے مثال نمونے چھوڑ گئے۔

اُن کے علمی و دینی خدمات کا دائرہ نہایت وسیع ہے، مگر ان سب کی غرض و غایت تقریباً ایک ہے یعنی اسلامی احکام و تعلیمات کی صحیح اور دلنشین تعبیر و ترجمانی، اور اسلامی علوم و فنون، اسلامی تاریخ، اسلامی تہذیب و ثقافت اور مسلمانوں کے علمی و تمدنی کارناموں کی محققانہ مرقع نگاری، یہ موضوع اتنا وسیع ہے کہ اس میں پوری اسلامی تاریخ آ جاتی ہے، اور اُن کی بیشتر بلکہ تقریباً کل تصانیف اور مضامین کا محور و مرکز یہی نقطہ ہے، گو اُن کے ہمہ گیر علم و قلم کی عنان کبھی کبھی خالص علم و ادب کی جانب بھی مڑ جاتی تھی، مگر بہت کم مضامین ایسے نکلیں گے، جو کسی نہ کسی حیثیت

جو باخبر تھا، اس مین صحیح دینی روح نہ تھی تاہم سب سے پہلے اسی طبقہ کے فضلاء مین سرسید احمد خان، اور مولوی چراغ علی وغیرہ نے اپنی بساط کے مطابق اس فرض کو انجام دیا، اور مستشرقین کے اعتراضون کے جواب مین مضامین اور کتابین لکھین، مگر یہ لوگ دینی علوم کے ماہر نہ تھے، اور نہ صحیح دینی بصیرت رکھتے تھے، اس کے علاوہ وہ مغربی علوم اور مغربی تہذیب سے اس قدر مرعوب تھے کہ ہر چیز مین اسی کو رد و قبول کا معیار سمجھتے تھے، اس لیے حسن نیت کے باوجود انھون نے بھی وہی غلطی کی جو اسلام کی ابتدائی صدیون مین یونانی فلسفہ کے اعتراضات کے جواب مین متکلمین مثلاً معتزلہ اور باطنی کر چکے تھے، یعنی معترضین کے تمام اعتراضات کو صحیح مان کر اُن کے جوابات دینے کی کوشش کی گئی، بعض جوابات محققانہ بھی تھے، لیکن جن اعتراضات کا جواب نہ بن پڑا ان مین خود اسلامی عقائد و تعلیمات مین ایسی تاویلین کین جن کو حقیقت سے کوئی علاقہ نہ تھا، تاہم انھون نے حسن نیت سے اپنے مقدور بھر اس فرض کو انجام دیا، اور اس سے ایک طبقہ کو فائدہ بھی پہنچا،

علماء کی جماعت مین مولانا شبلی پہلے شخص ہین جن مین یورپین فضلاء کے اس علمی حملہ کے مقابلہ کے شرائط بڑی حد تک موجود تھے، وہ اسلامی علوم کے بھی ماہر تھے، اسلامی تاریخ پر بھی اُن کی نظر بہت وسیع تھی، نئے خیالات و رجحانات، اور مستشرقین کے اعتراضات سے بھی ان کو ایک حد تک واقفیت تھی، اس لئے اُن کی نظر اس فتنہ کے تمام گوشون تک پہنچی، اور ہر گوشہ سے انھون نے اس کو روکنے کی کوشش کی، اور ان کے زمانہ مین جن اعتراضات کا زیادہ شہرہ تھا، اُن کے نہایت محققانہ جوابات دیے، الجزیہ، کتب خانہ اسکندریہ، اورنگ زیب عالمگیر، اور الانتقاد علی التمدن الاسلامی وغیرہ اس سلسلہ کے معرکۃ الآراء مضامین ہین،

اس سلسلہ مین اُن کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ متفرق اعتراضات کے جواب کے ساتھ انھون نے مذہب اسلام، اسلامی تاریخ اور اسلامی تہذیب کو ایسے محققانہ اور دلنشین انداز مین پیش کرنے کا سلسلہ شروع کیا جس مین اعتراض کی گنجایش باقی نہ رہے، اور معترضین بھی اُن کی عظمت ماننے پر مجبور ہو جائین، اور اس سلسلہ مین بکثرت مضامین اور مستقل کتابین لکھین، یہ مضامین مقالات شبلی مین موجود ہین، اور اُن کی بیشتر تصانیف اسی سلسلہ کی

نہایت اہم چیز ہے، تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ان تمام اعتراضوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے جو مخالفین کرتے ہیں اور مناظرانہ بحث و مباحثہ اور اعتراض و جواب میں پڑنے کے بجائے نفس واقعہ کو ایسے محققانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ اعتراض خود بخود اٹھ جاتا ہے، اور جو اعتراضات غیر معتبر روایات پر مبنی ہیں، وہ ان کی تنقید ہی سے دور ہو جاتے ہیں، اسی کے ساتھ جدید دور کے سیرت نگاروں اور متکلمین کی غلطیوں سے پورا احتراز کیا گیا ہے، اور محض اعتراض سے بچنے کے لئے نہ کسی صحیح واقعہ کا انکار کیا گیا ہے، اور نہ غلط تاویل کی گئی ہے، بلکہ اعتراض سے پر محققانہ نگاہ ڈالی گئی ہے، جو اعتراضات غلط فہمی یا قصور نظر کا نتیجہ ہیں اُن میں غلط فہمی کا ازالہ کیا گیا ہے، جو غیر معتبر روایات پر مبنی ہیں، ان پر تنقید کر کے ان کی بے اعتباری ظاہر کر دی گئی ہے، اور جو معترضین کے خود ساختہ نقطۂ نظر کا نتیجہ ہیں، اُن میں نقطۂ نظر ہی کو غلط ثابت کیا گیا ہے، اور کسی مسئلہ میں صحیح اسلامی نقطۂ نظر سے قدم ہٹنے نہیں پایا ہے، اور سارے مسائل کو قرآن مجید اور احادیث نبوی کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے، اور کسی عقیدہ و خیال میں سلف صالحین کے عقیدہ سے انحراف نہیں کیا گیا ہے،

یہ کتاب چونکہ اسلامی تعلیمات کا بھی خلاصہ ہے، اس لئے اس میں مذہبی عقائد، شرعی قوانین اخلاقی اصول اور تاریخی واقعات ہر قسم کے مسائل زیر بحث آئے ہیں، جن میں عالم غیب، وحی، ملائکہ، یوم آخرت جزا و سزا، دلائل و معجزات وغیرہ جیسے مابعد الطبیعی نازک مسائل بھی ہیں جن کو ایمانی ذوق اور وجدان سلیم کے بغیر تنہا عقل اور مادی حواس کی مدد سے سمجھنا مشکل ہے، اور ایسے موقعوں پر بڑے بڑوں سے چوک ہو جاتی ہے، مگر مصنف نے ادنیٰ لغزش کے بغیر اس خوبی سے ان نازک مراحل کو طے کیا ہے کہ کہیں نقل و روایت اور کتاب و سنت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا ہے، اور کسی صحیح عقیدہ کی غلط تاویل نہیں کی گئی ہے، دوسری طرف ہر بحث عقل و درایت کی حیثیت سے اس قدر مدلل، دلپذیر اور دلنشین ہے کہ عقل سلیم کے لئے اس میں کسی شک و شبہہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی، غرض سیرت نبوی علم و نظر کی وسعت، تحقیق و تنقید، دیدہ وری و نکتہ سنجی، دلائل کی دلنشینی اور اسلامی تعلیمات کی صحیح اور حکیمانہ تعبیر و ترجمانی کا ایسا شاہکار ہے اور اس میں مصنف کے علمی کمالات کے ایسے

سے اصل مرکزی مقصد سے تعلق نہ رکھتے ہوں، ان کی نظر تمام اسلامی علوم پر یکساں تھی، مگر قرآن مجید قدیم و جدید علم کلام، اور اسلامی تاریخ اُن کا خاص موضوع تھے، اور اُن کے بیشتر مضامین و تصانیف اسی سے تعلق رکھتے ہیں، ان میں سیرۃ النبی شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے، اس میں اُن کے خاص فنون کا اجتماع ہے، اور اُن کے علم و تحقیق کی تمام شانیں نمایاں نظر آتی ہیں،

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

یہ کتاب اپنی خصوصیات میں سیرۃ کے سارے ذخیرۂ کتب میں خواہ وہ کسی زبان میں لکھی گئی ہوں منفرد حیثیت رکھتی ہے، حتیٰ کہ عربی میں بھی اس نوعیت کی ایسی جامع کوئی سیرت نہیں لکھی گئی، سیرۃ النبی کی تالیف سے پہلے اردو میں سیرۃ نبوی پر جس قدر کتابیں لکھی گئیں، وہ زیادہ تر مغازی اخلاق و شمائل نبوی پر مشتمل ہیں، اور اُن میں روایات کی صحت اور تحقیق و تنقید کا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا اور وہ ہر قسم کی رطب و یابس روایات کا مجموعہ ہیں، صرف بعض کتابیں مثلاً قاضی سلیمان صاحب منصورپوری کی رحمۃ للعالمین، اور اس قسم کی چند کتابیں اس سے مستثنیٰ ہیں، مگر ان کا نقطۂ نظر بھی بعض دائرہ کی سیرۃ النبی سے مختلف تھا، اور وہ صرف دیندار مسلمان کے ذوق کی تھیں، ان میں مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات اور جدید ذوق و رجحان کی تشفی کا کوئی سامان نہ تھا، اس لحاظ سے اردو میں یہ پہلی سیرت ہے جس میں ان تمام ضروریات کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے، اور جس میں سوانح اور شمائل نبوی اور اسلام کی تعلیمات کو ایسے محققانہ اور دلنشین انداز میں پیش کیا گیا ہے جس سے منکرین و مخالفین بھی اُن کی صداقت و عظمت ماننے پر مجبور ہو جائیں، اس کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں کہ وہ تنہا سوانح نبوی نہیں ہے بلکہ اس میں اسلام کے عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاق کا خلاصہ آگیا ہے، اور اس حیثیت سے وہ اسلامی تعلیمات کی دائرۃ المعارف کہی جا سکتی ہے، دوسری خصوصیت یہ ہے کہ روایات کے رد و قبول میں بڑی احتیاط برتی گئی ہے، اور اُن کی تحقیق میں نقد و جرح اور روایت و درایت کے تمام محدثانہ اور تحقیقی اصولوں کو کام میں لایا گیا ہے، اور صرف معتبر اور مستند روایتیں لی گئی ہیں، اس سلسلہ میں سیرۃ النبی کا مقدمہ جس میں سیرت نبوی کے عربی ماخذوں اور روایت و درایت کے اصولوں پر بحث کی گئی ہے

مدینہ میں اسلامی حکومت کی تاسیس اس کے سادہ نظام، مذہبی تعلیمی و تبلیغی انتظامات، شریعت کی تکمیل، اس کے عقائد، عبادات، معاملات، حلال و حرام، حجۃ الوداع، خطبۃ الوداع، وفات نبوی، آپ کے شمائل و معمولات، اخلاق و سیرت، ازواج مطہرات، اولاد و امجاد، اور اہل بیت کی زندگی کے حالات ہیں، اور ان تمام حالات و واقعات کو خواہ وہ تبلیغ اسلام سے تعلق رکھتے ہوں، یا میدان جنگ سے، خانگی زندگی سے متعلق ہوں، یا پبلک زندگی سے، پیغمبر کی حیثیت سے ہوں، یا عام انسان کی حیثیت سے، دشمنوں سے متعلق ہوں، یا دوستوں سے، غرض زندگی کے ہر شعبہ سے بھی تعلق رکھتے ہوں، اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ جس سے آپ کی پیغمبرانہ صداقت، اور اخلاقی عظمت پوری طرح نمایاں ہو جاتی ہے، اور آپ کے خلق کریم کو دیکھ کر مخالف بھی آپ کی عظمت ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے،

جہاں تک خاص سیرت نبوی کا تعلق ہے وہ ان دونوں حصوں پر ختم ہو جاتی ہے، مگر اس سیرت کی تالیف کا مقصد محمد الرسول اللہ کے سوانح کے ساتھ آپ کے لائے ہوئے مذہب کو بھی پیش کرنا تھا، اس لئے باقی حصوں میں اسلامی تعلیمات کی تفصیلات ہیں، اس میں سب سے اہم مسئلہ دلائل و معجزات کا ہے، اگرچہ معجزات اور خوارق عادات تمام مذاہب میں مشترک ہیں، مگر عقل پرستوں کے عقل کی سمائی سے سب سے زیادہ یہی باہر ہیں، اس لئے تیسری جلد جامع دلائل و معجزات پر ہے، اس میں پہلے نفس معجزہ کی حقیقت، اور قرآن مجید، قدیم و جدید فلسفہ اور علم کلام کی روشنی میں معجزہ کے امکان و وقوع پر بڑی مبسوط بحث کی گئی ہے، اور یہ دکھایا گیا ہے، کہ خود نوامیس فطرت کے لحاظ سے بھی خوارق عادت یا معجزہ میں کوئی عقلی استبعاد نہیں ہے، اس میں حسب ذیل بحثیں ہیں، دلائل و معجزات کی حقیقت، دلائل و معجزات اور فلسفہ قدیم و علم کلام، معجزات اور فلسفہ جدید، معجزات کا امکان اور اس کا استبعاد، معجزات کا یقین، اس کی غرض و غایت، آیات و دلائل اور قرآن مجید، ان مباحث کے بعد خصائص نبوت یعنی مکالمہ الٰہی، نزول ملائکہ، رویا اور معراج و شرح صدر کا بیان ہے، پھر ان آیات و معجزات کا ذکر ہے، جو قرآن مجید اور معتبر روایات سے ثابت ہیں، اس کے بعد غیر معتبر روایات پر تنقید کی گئی ہے، پھر بعثت نبوی کی ان بشارتوں

گوناگون جلوے ہیں، کہ اُن کی ایک جھلک بھی اس مضمون میں دکھانا ممکن نہیں، اگر سیرۃ النبی کے مباحث کی جزئیات سرخیاں نقل کیجائیں تو بھی ایک ضخیم کتاب تیار ہوجائے گی، ایسی حالت میں ایک مختصر مضمون میں تبصرہ کی گنجایش کہاں سے نکل سکتی ہے، اس لئے صرف ہر جلد کے موضوع اور اس کے مباحث کا اجمالی خاکہ پیش کرنے پر اکتفا کیجائے گی جس سے ان مباحث کی نوعیت کا اندازہ ہوسکے،

سیرۃ النبی چھ ضخیم مجلدات میں ہے، پہلے دو حصے علامہ شبلی کے قلم سے ہیں، اور باقی چار مولانا سید سلیمان ندوی کی تالیف ہیں، پہلے حصہ میں فن سیرت پر ایک مبسوط مقدمہ ہے جس میں سیرۃ نبوی کی اہمیت و ضرورت اور اس کی مختصر تاریخ اور اس کے قدیم ماخذوں کا محققانہ جائزہ لیا گیا ہے، اور سیرت سے متعلق حدیث، مغازی و سیرت اور تاریخ کی روایات کے رد و قبول کے بارہ میں محدثانہ اصول سے ناقدانہ بحث کی گئی ہے، اور آخر میں سیرت کے یورپین مصنفین اور اُن کی تصانیف پر مختصر تبصرہ کیا گیا ہے، یہ مقدمہ اپنے معلومات و مباحث کے لحاظ سے ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے، اس کے بعد دوسرے مقدمہ میں عرب کی قدیم سیاسی و مذہبی تاریخ سے خانۂ کعبہ کی تعمیر، حضرت اسمٰعیلؑ کے ذبیح ہونے کی بحث بھی آگئی ہے،

اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے، اس میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ولادت سے لے کر پہلے حج تک غزوات و سرایا کے مفصل اور محققانہ حالات ہیں، اس میں اسلامی جہاد، غزوات نبوی، یہود خیبر کی جلا وطنی، اور بعض ازواج مطہرات سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح کے متعلق جو اعتراضات کئے جاتے ہیں، ان کا محققانہ جواب بھی دیا گیا ہے، آخر میں غزوات پر مجموعی تبصرہ ہے جس سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ اسلام کا مقصود قتل و خونریزی اور ملک گیری نہیں، بلکہ صرف اسلام کی پر امن تبلیغ اور عرب میں امن و امان کا قیام تھا، اور یہ لڑائیاں محض کفار و مشرکین کی مزاحمت اور اُن کی زیادتیوں کی وجہ سے پیش آئیں، اس کے باوجود اسلام نے نہایت منصفانہ اصول جنگ اختیار کئے اور پرانے وحشیانہ طریقوں کا خاتمہ کرکے اسلامی جہاد کو عبادت اور خیر بنا دیا،

دوسرے حصہ میں نبوت کی پر امن زندگی یعنی اسلام کی تبلیغ و اشاعت قبایل عرب کا قبول اسلام

ان پر روشنی ڈالی گئی ہے، پھر جسمانی عبادات یعنی نماز زکوٰۃ روزہ حج اور جہاد کی تفصیل اور ان کی حکمتوں اور مصلحتوں کی تشریح ہے، پھر قلبی عبادات جو جسمانی عبادات کی روح کی حیثیت رکھتی ہیں، مثلاً تقویٰ، اخلاص، توکل، اور صبر وغیرہ کی تفصیل، اور اُن کی ایسی حکیمانہ تشریح ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسانی اخلاق کے تزکیہ و تطہیر اور تعلق مع اللہ کا سب سے بہتر وسیلہ اسلامی عبادات ہیں، اس سلسلہ میں دوسرے مذاہب کی عبادات سے اسلامی عبادتوں کا موازنہ بھی آگیا ہے،

چھٹا حصہ اخلاق پر ہے، دنیا کا سارا نظام اور انسانیت کا سارا شرف اخلاق ہی سے وابستہ ہے، اس لئے تمام مذاہب میں اخلاق کی اہمیت ہے، اور اس حیثیت سے کہ اُن کا تعلق زیادہ تر حقوق العباد سے ہے، وہ عبادات سے بھی زیادہ اہم ہیں، اور اسلام میں اُن کی سب سے زیادہ اہمیت ہے، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کا مقصد ہی مکارم اخلاق کی تکمیل تبلایا ہے، اس حیثیت سے یہ حصہ بھی نہایت اہم ہے، اور اس میں فلسفۂ اخلاق کی تمام جزئیات پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے، اور اسلامی اخلاق کے امتیازی پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے، اس میں پہلے اسلام اور اخلاق حسنہ کا تعلق ظاہر کیا گیا ہے، اور اسلام میں اس کی اہمیت دکھائی گئی ہے، پھر دنیا کے تمام اخلاقی معلموں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز نمایاں کیا گیا ہے، پھر اسلام کے فلسفۂ اخلاق پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور دوسرے مذاہب کی اخلاقی تعلیمات کی خامیاں اور کمزوریاں اور اُن کے مقابلہ میں اسلام کی اخلاقی تعلیمات کی جامعیت و کاملیت دکھلائی گئی ہے، پھر تعلیم اخلاق کے مختلف طریقوں کو تبلا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقۂ تعلیم کی خوبی ظاہر کی گئی ہے، پھر انسانوں کے باہمی حقوق و فرائض اور اخلاقِ فاضلہ اور اخلاقِ رذیلہ کی تفصیل ہے، آخر میں آدابِ معاشرت کا اجمالی ذکر ہے، اس طرح یہ کتاب اسلام کی اخلاقی تعلیمات کا مرقع ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے، کہ اسلام نے اخلاق کو کتنی اہمیت دی ہے، اور اس کی اخلاقی تعلیمات کس قدر مکمل اور جامع ہیں،

اسلام درحقیقت کوئی نیا مذہب نہیں ہے، بلکہ قدیم الہامی مذاہب کی اصلاح شدہ ترقی یافتہ اور آخری تکمیلی

کا تذکرہ ہے، جو قدیم الہامی صحیفوں میں ہیں، اور آخر میں خصائصِ محمدی کا ذکر ہے، ان مباحث میں اس جامعیت اور استقصاء کے ساتھ معجزات پر بحث کی گئی ہے کہ اس کا کوئی گوشہ اور کوئی رُخ چھوٹنے نہیں پایا ہے، اور ان کا خلاصہ یہ ہے کہ معجزات کے صدور میں کوئی عقلی استحالہ نہیں ہے، اور نہ وہ نوامیسِ فطرت کے خلاف ہیں، دنیا میں بہت سے ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں، جن کی کوئی عقلی توجیہ نہیں ہو سکتی، اس لئے اگر خالقِ کائنات قادرِ مطلق کسی حق کے اثبات، اور کسی پیغمبر کی تائید کے لئے خرقِ عادت کا ظہور کر دے تو اس میں کوئی عقلی استحالہ اور معجزات کا مقصد صرف عوام کی تشفی ہوتا ہے، خواص کے لئے اس کی ضرورت نہیں ہوتی،

چوتھی جلد اسلام کے بنیادی عقائد پر ہے، اور اس میں نبوت، وحی، ملائکہ، قیامت، سزا و جزا، اور جنت، دوزخ وغیرہ جیسے ما بعد الطبیعی مسائل پر بحث ہے، اس لئے وہ تیسری جلد سے بھی زیادہ اہم ہے، اس میں پہلے منصبِ نبوت پر ایک مبسوط مقدمہ ہے، جس میں نبوت کی حقیقت، اس کی اہمیت و ضرورت پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور اس کے لوازم و شرائط بیان کئے گئے ہیں، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت دنیا کی تمام قوموں کی مذہبی حالت اور ان کی اخلاقی اور روحانی پستی کا نقشہ دکھایا گیا ہے، خصوصاً عرب کے حالات زیادہ تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں، پھر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت، اور عربوں کی اصلاح میں آپ کو جو گوناگوں دشواریاں پیش آئیں، اور بالآخر اسلام نے جو عظیم الشان انقلاب پیدا کیا، اس کی تفصیل ہے، اس کے بعد اسلام کے بنیادی عقائد یعنی اللہ تعالیٰ پر ایمان، فرشتوں، انبیاء، رسل، اور کتبِ سماوی پر ایمان کی تفصیل ہے، پھر عالمِ برزخ، جزا و سزا، دوزخ و جنت، قضا و قدر کے مباحث ہیں، اور آخر میں ایمان کے نتائج کا ذکر ہے، اور ان تمام نازک اور دقیق مسائل کو جن کا محض عقل و مادی حواس کے ذریعہ سمجھنا بہت دشوار ہے، ایسے حکیمانہ اور دلنشیں انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ قلبِ سلیم کی تشفی کے لئے بالکل کافی ہے

پانچواں حصہ عبادات پر ہے، اس میں پہلے اعمالِ صالحہ کی اہمیت دکھائی گئی ہے، اور اس کے اقسام بیان کئے گئے ہیں، جن میں سب سے زیادہ اہم عبادت ہے، اس کے بعد اسلامی عبادات کی خصوصیات اور ان کے احکام

اس لحاظ سے سیرۃ النبی جدید علم کلام کی بڑی معرکۃ الآرا کتاب ہے، اور اسلام کا ایسا کامل مرقع ہے جس میں اس کے سارے خط و خال نمایاں ہیں،

خطباتِ مدراس

اس سلسلہ کی دوسری اہم کتاب خطباتِ مدراس ہے، یہ وہ خطبات ہیں، جو مدراس کے بعض دیندار مسلمانوں کی فرمایش پر اکتوبر ۱۹۲۵ء میں مدراس میں سیرۃ نبوی کے مختلف پہلوؤں پر دیئے گئے تھے جنھیں بعد میں کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا، یہ کل ڈیڑھ سو صفحوں کی کتاب ہے، مگر اپنی معلومات کی وسعت، مباحث کی ندرت اور افادہ کے لحاظ سے سیرت کی ضخیم کتابوں پر بھاری ہے، اور تنہا یہ کتاب مصنف کے فخر کے لئے کافی ہے، اس میں ایک نئے نقطہ نظر اور نئے اسلوب سے سیرۃ نبوی کے ان پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے، جن کی جانب بہت کم توجہ کی گئی ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخی حیثیت آپ کی جامعیت و کاملیت، اور آپ کی زندگی کے عملی پہلو پر اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تمام انبیا علیہم السلام میں ساری دنیا کے لئے دائمی نمونۂ عمل آپ ہی کی ذاتِ مقدس ہو سکتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جس قدر بھی انبیا علیہم السلام مبعوث ہوئے، وہ سب اپنے زمانہ کے پیغمبر برحق تھے لیکن اُن کی بعثت کسی خاص قوم خاص خطۂ زمین اور ایک محدود زمانہ تک اور ایک محدود مقصد کے لئے تھی اس لئے ان کی تعلیمات کا دائرہ بھی محدود تھا، اور وہ ان کے زمانہ کے بعد منسوخ ہوگئیں اس لئے انکے حالات اور ان کی تعلیم میں آیندہ زمانہ کے لئے تاریخی استناد اور جامعیت و کمال کی ضرورت ہی نہ تھی؛ اس لئے قدرت کی جانب سے بھی اس کا انتظام نہیں کیا گیا، چنانچہ جن جن پیغمبروں کے نام معلوم ہیں، اور جن کے مذاہب موجود ہیں، ان میں سے کسی کے مستند تاریخی حالات نہیں معلوم، بلکہ بعضوں کی شخصیت تک مشتبہ ہے، اور جن کے حالات کچھ معلوم ہیں وہ اتنے ناقص اور غیر معتبر ہیں کہ اُن سے زندگی کے کسی شعبہ میں بھی رہنمائی نہیں ہو سکتی، مگر خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں تھا، اور اسلام ساری دنیا کے لئے دائمی مذہب بنا کر بھیجا گیا تھا، اور آپ کی

نشکل ہے ان مذاہب مین دو قسم کی خامیان تھین، ایک انسانون کی پیدا کردہ دوسری فطری، انسانون کا پیدا کردہ نقص یہ تھا کہ انھون نے ان مین اپنے حسب منشا تصرفات کرکے اُن کی شکل اس قدر بدل دی تھی، اور اُن مین اس قدر آمیزش کر دی تھی کہ اصل شکل کا پہچاننا مشکل تھا، اور ان کا اصل مقصد ہی فوت ہوگیا تھا، اسلام نے اُن کو ان آمیزش سے پاک کرکے اصلی شکل مین جلوہ گر کیا،

فطری نقص یہ تھا کہ مذاہب درحقیقت انسانیت کی تکمیل کا نصاب ہین، اور نصاب تعلیم کی ترقی کے ساتھ بدلتا رہتا ہے، اس لئے انسانی ارتقاء کے ساتھ مذاہب کی تعلیمات بھی بدلتی رہین، اور ہر دور کے انسانون کی عقل و دانش اُن کے حالات و ضروریات کے مطابق ان مین تغیر اور ترقی ہوتی رہی، قدیم انسانون کی ذہنی ادراک و تعقل ادنیٰ درجہ کی تھی، اور اُن کی ضروریات بھی سادہ اور محدود تھین، اور اُنکا دائرہ خاص خاص قومون تک محدود تھا، ان مین عالمگیریت نہ تھی، اسلئے اُنکے مذاہب بھی اسی کے مطابق تھے، پھر جیسے جیسے انسان عقل و شعور مین ترقی کرتا گیا، اسکی ضروریات بڑھتی گئین، اور انسانیت کا دائرہ پھیلتا گیا، اسی قدر اُن کے مذاہب مین بھی بلندی، وسعت، گہرائی اور عالمگیریت آتی گئی، اور پرانے مذاہب کی وہ تعلیمات جو ترقی یافتہ دور کے انسانون کے لئے موزون نہ رہگئی تھین منسوخ ہوتی گئین، اور اُن کی جگہ نئی موزون تعلیمات آتی گئین، اور مذہب کا یہ ارتقاء انسانی ارتقا کیساتھ برابر جاری رہا تاآنکہ انسان عقل و دانش کے کمال تک پہنچ گیا، اور اس کے ساتھ اس کی ضرورتین بھی نہایت وسیع ہوگئین، ایسے ترقی یافتہ انسانون کے لئے ایسے جامع کامل عالمگیر اور دائمی مذہب کی ضرورت تھی، جو اس کی جملہ دینی و دنیوی ضروریات کا کفیل ہو، یہی آخری تکمیلی مذہب اسلام ہے، جو ایک مکمل نظام زندگی ہے، اور جس کے دائرہ سے انسانی زندگی کا کوئی شعبہ بھی باہر نہین ہے، اور اس کی تعلیمات جملہ دینی و دنیوی اور مادی و روحانی ضروریات پر حاوی ہین، سیرۃ النبی مین اسلام کی اسی جامعیت و کاملیت اور اسکی تعلیمات کے حکم و مصالح کو اس طرح دکھایا گیا ہے کہ گذشتہ تمام مذاہب کے مقابلہ مین اسلام کا امتیاز نمایان ہوجاتا ہے، اور یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ انسانیت کی فلاح و سعادت کا آخری جامع و کامل اور دائمی عالمگیر مذہب اسلام ہی ہے، اس

تاریخ اور دلائل وشمائل نبوی کے پورے ذخیرہ کا جائزہ لیا گیا ہے، اس میں ان علوم کی اجمالی تاریخ آگئی ہے اور پھر محدثانہ اصول سے اس ذخیرہ پر بحث وتنقید کی گئی ہے، ان بحثوں سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر جتنا مستند ذخیرہ معلومات موجود ہے اس کے عشر عشیر غیر مستند حالات بھی کسی پیغمبر کے نہیں مل سکتے۔

چوتھے اور پانچویں خطبہ میں آپ کی جامعیت وکاملیت پر بحث کی گئی ہے، یہ دونوں چیزیں درحقیقت ایک ہی چیز کے دو رخ ہیں، کاملیت سے یہ مراد ہے کہ شروع زندگی سے وفات نبوی تک آپ کی زندگی کا ہر واقعہ محفوظ ہے، مثلاً خاندان، آباؤ اجداد، پیدائش، شیرخوارگی، بچپن، سن شعور، جوانی، اس زمانہ کے مشاغل، پیشہ، شادی، احباب، قبل از نبوت، قریش کے معاہدہ میں شرکت، امین کا خطاب، آثار نبوت، تنہائی پسندی، غار حرا کی خلوت نشینی، اور چلہ کشی، نبوت کا آغاز، وحی، اسلام کا ظہور، اس کی دعوت، اس راہ کے مشکلات ومصائب، ہجرت، قیام مدینہ، غزوات کے حالات، دعوت اسلام کے خطوط، اسلام کی اشاعت وتکمیل، حجۃ الوداع اور وفات وغیرہ کے تمام حالات محفوظ ومعلوم ہیں، اسی طریقہ سے زندگی کے تمام معمولات، عادات وخصائل کے حالات شمائل کی کتابوں میں موجود ہیں، جن سے آپ کی زندگی کے جزئی سے جزئی واقعہ کا علم ہوسکتا ہے، حتیٰ کہ وہ واقعات بھی جن میں وحی کے ذریعہ آپ کو تنبیہ کی گئی ہے، ایسے واقعات بھی جن پر مخالفین اعتراض کرتے ہیں بجنسہ محفوظ ہیں، یہ سیرت نبوی کی تکمیل کا پہلو ہے۔

اس کا دوسرا پہلو اس کی جامعیت ہے، یعنی مختلف انسانی طبقات اور ان کی زندگی کے ہر پہلو اور ہر انسانی ضرورت کے متعلق آپ کی زندگی میں اسوۂ عمل موجود ہے، مثلاً شاہ وگدا، حاکم ومحکوم، فاتح ومفتوح، امیر وغریب، تاجر ومزدور، عزیز اور دوست وغیرہ مختلف حالتوں اور حیثیتوں سے آپ نے زندگی بسر کی ہے، اس لئے ان سب کی حیثیت اور ان کے تعلقات وفرائض کا سبق بھی ہم کو سیرت پاک سے مل سکتا ہے، پھر ہر انسان کے معمولات زندگی اور روزانہ کے کاروبار مثلاً اٹھنے بیٹھنے کھانے پینے سونے جاگنے، ہنسنے بولنے، لین دین، تعلیم وتعلم، عبادت وریاضت وغیرہ ان تمام معمولات ومشاغل کا سبق بھی جو روزانہ کی زندگی میں پیش آتے ہیں، ہم حیات طیبہ سے سیکھ سکتے ہیں، حتیٰ کہ انسانی اوصاف اور ان کے ذہنی وجذباتی کیفیات واحوال مثلاً خوشی ورضامندی، غم

ذات جامع کمالات بنائی گئی تھی، اس لئے آپکے حالات کی حفاظت کے لئے قدرت کی جانب سے یہ اہتمام کیا گیا کہ آج تیرہ صدیان گذر جانے کے بعد بھی آپ کی پوری زندگی کا ایک ایک واقعہ اور ہر ہر پہلو اس تفصیل اور اس تاریخی اسناد کے ساتھ محفوظ ہے کہ دنیا کی کوئی تاریخ بھی صحت اسناد مین اس کا مقابلہ نہین کر سکتی خطبات مدراس مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی تاریخیت، آپکے حالات کی جامعیت اور آپ کی تعلیمات کی کاملیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے،

پہلے خطبہ مین دکھایا گیا ہے کہ انسانیت کی تکمیل صرف انبیاء علیہم السلام کی سیرتون سے ہو سکتی ہے، اور تاریخی شواہد سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ وہ سلاطین و کشور کشا جنھون نے دنیا کا نقشہ بدل دیا، وہ مدبرین سیاست دان جنھون نے قومون کی قسمتین پلٹ دین، وہ مقننین جنھون نے بڑی بڑی حکومتون کے دستور بنائے، اور وہ حکما و فلاسفہ جنھون نے بہتر سے بہتر فلسفے پیدا کئے، انسانیت کے امراض کا مداوی، اور دلون کی دنیا منور نہ کر سکا اور آج دنیا مین جہان کہین بھی اخلاق و روحانیت کا نور نظر آتا ہے، وہ صرف انبیاء علیہم السلام کا فیض ہے،

دوسرے خطبہ مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے دائمی اور عالمگیر نمونۂ عمل ہونے پر بحث کی گئی ہے اور اس سلسلہ مین سیرت محمدی کے تاریخی و تکمیلی پہلوؤن اور اس کی جامعیت و عملیت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ آج ہم کو جن پیغمبرون کے نام معلوم ہین، ان مین صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مستند تاریخی حالات کا علم ہے، اور اس جامعیت کے ساتھ کہ آپ کی پوری زندگی کا ہر پہلو پوری طرح محفوظ ہے، اور اس مین ہر شعبۂ زندگی کے لئے اسوۂ عمل موجود ہے، پھر آیندہ خطبات مین اُن مین ہر ایک پہلو پر تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے،

تیسرے خطبہ مین سیرت نبوی کے تاریخی پہلو پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے، اور یہ دکھایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر جس قدر تاریخی مواد موجود ہے، اتنا مواد دنیا کے کسی بڑے سے بڑے انسان کے حالات مین نہین مل سکتا، اور اس سلسلہ مین سیرت کے تمام ماخذون قرآن مجید، کتب حدیث، مغازی کا ذخیرہ

پرستش کے لائق نہیں ہے، توحید کا یہ پہلا سبق اسلام ہی نے پڑھایا، دنیا کے تقریباً تمام مذاہب نے انسان کو فطرۃً خطاکار قرار دیا ہے جس سے نجات پانا دشوار ہے، اسی سے آریائی مذاہب میں تناسخ کا اور عیسائیون مین کفارہ کا عقیدہ پیدا ہوا، مگر اسلام نے انسان کو فطرۃً معصوم اور گنہ گاری کو بُرے اعمال کا نتیجہ قرار دیا اور ہر انسان کے لیے نجات کی راہ کھلی رکھی، اسلام سے پہلے انسانیت نسلی اور جغرافی حدود مین بٹی ہوئی تھی، اسلام نے ان حدون کو توڑ کر عالمگیر انسانی برادری قائم کی، دوسرے تمام مذاہب مین درمیانی واسطون کے بغیر خدا تک نہین پہنچا جا سکتا تھا اسلام نے ان واسطون کو ختم کر کے براہ راست ہر انسان کا خدا سے تعلق قائم کیا، پیغمبرون اور صلحاء و اخیار کے ساتھ غلو عقیدت نے شرکت و بت پرستی کی شکل اختیار کر لی تھی، اسلام نے ان کا صحیح درجہ متعین کر کے شرک کے ایک بڑے وسیلہ کو ختم کیا،

آٹھوین خطبہ مین پیغام محمدیؐ کی بنیادی تعلیمات کو تبلایا اور یہ دکھایا گیا ہے کہ اسلام سے پہلے کسی مذہب مین بھی خالص توحید نہین تھی، جن مذاہب مین کسی حد تک تھی بھی تو وہ خدا اور بندہ کے تعلق کی تشبیہ و تمثیل اور اس کی ذات و صفات مین التباس و اشتباہ اور افعالِ خداوندی کی نیرنگیون کی غلط تعبیر کی وجہ سے شرک مین بدل گئی تھی، اسلام نے اس سارے التباس و اشتباہ کو دور کر کے شرک کا ہر دروازہ بند کر دیا، اور دنیا مین توحیدِ خالص کو پہلی مرتبہ پیش کیا، اسی طرح عبادت کے غلط مفہوم یعنی ترکِ دنیا، رہبانیت، اور جسمانی اذیت کو مٹا کر اس کی صحیح شکل تبلائی، اور اس کا اصلی مقصد و منشاء واضح کیا،

اسلام سے پہلے انسانی جان کی کوئی قیمت نہ تھی، اور وہ دوسرے کی ملک کی سمجھی جاتی تھی، آقا غلام کو قتل کر سکتا تھا، دیوی اور دیوتاؤن پر انسانون کی قربانی عام تھی، عورت شوہر کی لاش کے ساتھ ستی ہو جاتی تھی، لڑکیون کو زندہ درگور کر دیا جاتا تھا، اسلام نے انسانی جان کا احترام قائم کیا، اور کسی انسان کو خود اپنی جان کا بھی مالک نہین بنایا، چنانچہ خودکشی تک حرام قرار دی، حسب و نسب کی تفریق کو مٹا کر تقویٰ کو معیار فضیلت اور اسلام کے عالمگیر تصور کے ماننے والون کو آپس مین بھائی بھائی قرار دیا، اور اس قبیل کی دوسری

عفت، عزم واستقلال، صبر وتوکل، شجاعت وشہامت، استغنار وقناعت، جود وسخا، تواضع وانکسار وغیرہ تک کی تعلیم بھی ہم کو اسوۂ نبی سے ملتی ہے، غرض انسانی زندگی کے ہر شعبہ اور ہر حالت اور اس کے سارے نظام کا سبق ہم سیرتِ نبوی سے سیکھ سکتے ہین،

چھٹے خطبہ مین سیرتِ نبوی کے عملی پہلو کو دکھایا گیا ہے یعنی آپ نے جو اخلاقی تعلیمات دین آپ خود اُن کا عملی نمونہ تھے، اس سلسلہ مین آپ کی زندگی سے ہر قسم کے اخلاقِ فاضلہ کے واقعات نقل کئے گئے ہین،

ساتوین خطبہ مین دوسرے مذاہب کے مقابلہ مین پیغامِ محمدی کی جامعیت، عالمگیریت اور اس کی پیدا کردہ اصلاحات اور دوسری انقلاب انگیز خصوصیات پر بحث کی گئی ہے، اور یہ دکھایا گیا ہے کہ جملہ مذاہب کی مشترک اور بنیادی تعلیمات یعنی ایمان وعمل صالح، عقائد وعبادات اور اخلاق ومعاملات وغیرہ کو اسلام ہی نے تکمیل تک پہنچایا، اور دوسرے مذاہب کی کتابین اور اُن کے صحیفے اس حیثیت سے بالکل ناقص ہین چنانچہ توراۃ وانجیل مین عقائد وعبادات تک کی تعلیمات اتنی مبہم غیر واضح اور ناصاف ہین کہ ان سے عیسوی اور یہودی مذہب کے عقائد وعبادات کی تفصیل نہین معلوم ہوسکتی، توراۃ مین دنیاوی قوانین اگر کسی قدر تفصیلی ہین، مگر اولاً وہ نہایت سخت ہین جن کا تحمل انسانی طاقت کے لئے دشوار ہے، دوسرے بعض حیثیتون سے ناقص بھی ہین، پھر اُن کا دائرہ بنی اسرائیل تک محدود ہے، اسلام نے ان کی سختی کو کم اور اُن کی خامیون کو دور کرکے اُن کو معتدل اور عالمگیر بنایا، اسی طرح اخلاق کے ناقص حصہ کی تکمیل کی، اسلام سے پہلے انسان ہر اس قوت کے سامنے جس سے اس کے وہم مین ضرر کا اندیشہ یا فائدہ کی امید ہوتی، سربسجود ہو جاتا تھا جس سے بے شمار دیوی اور دیوتا پیدا ہوگئے تھے، عیسائی اور یہودی مذہب مین اگرچہ اس قسم کے معبودانِ باطل کی پرستش نہین ہوتی تھی، مگر ان مین قسیسون اور رہبانون کو خدائی کا درجہ حاصل تھا، اسلام پہلا مذہب ہے جس نے انسان کو اشرف المخلوقات قرار دیکر اس کی عظمت نمایان کی، اور یہ بتلایا کہ انسان کائنات کے لئے نہین بنایا گیا ہے، بلکہ کائنات اس کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہے، اس لئے دنیا کی کوئی چیز بھی اوس کی

وہ بڑی ذہین و ذکی اور ابتدا سے علم و تعلیم کی شائق تھیں، اور اُن کے شعور کی آنکھیں تعلیم و تربیت گاہ نبوت میں کھلیں جہاں ہر وقت دینی تعلیم کا چشمہ اُبلتا رہتا تھا، اس لئے حضرت عائشہؓ پوری طرح اس چشمہ سے سیراب ہوئیں، اور تعلیم کے جو مواقع بھی ان کو ملے، اُن سے انھوں نے پورا فائدہ اٹھایا، اور اُن کو سب سے زیادہ ایسے مواقع حاصل تھے، اس لئے اُن کے ذوق و شوق اور تعلیم نبوی نے ان کو اپنے زمانہ کی بڑی عالمہ بنا دیا اور تفسیر و حدیث فقہ و فتاویٰ وغیرہ دینی علوم میں اُن کو بڑی دستگاہ حاصل تھی، اور تفقہ کلام و عقائد اور اسرار دین تک پر اُن کی نگاہ بڑی گہری اور مجتہدانہ تھی جس کا اندازہ ان کی روایات اور اُن کے فقہی مسائل سے ہوتا ہے، ان علوم میں وہ نہ صرف عورتوں بلکہ جماعت صحابہ میں امتیازی درجہ رکھتی تھیں، اور بڑے بڑے محدثین اور ائمہ اُن سے استفادہ کرتے تھے، وہ باقاعدہ دینی علوم کا درس دیتی تھیں جن میں بڑے بڑے علماء شریک ہوتے تھے۔ حج کے زمانہ میں جب مکہ میں ساری دنیائے اسلام کا اجتماع ہوتا تھا، اُن کا حلقۂ درس قائم ہوتا تھا، اُن کے پاس دور دراز سے فتاویٰ آتے تھے، خلفائے راشدین اور اکابر صحابہ تک ان مسائل میں جو اُن کے علم میں نہ ہوتے تھے، اُن کی جانب رجوع کرتے تھے، اگر اُن کے فتاویٰ کو جمع کیا جائے، تو کئی ضخیم جلدیں بن جائیں گے، اُن کے تلامذہ کی فہرست بڑی طویل ہے، غرض حضرت عائشہؓ کے ذریعہ دینی علوم کی بڑی اشاعت ہوئی خصوصاً عورتوں سے متعلق بیشتر دینی احکام و مسائل انہی سے مروی ہیں، دینی علوم کے علاوہ وہ اُس زمانہ کے دوسرے مروجہ علوم، انساب، شعر و ادب اور تاریخ وغیرہ میں بھی مہارت رکھتی تھیں،

انھوں نے طویل عمر پائی، اور حضرت امیر معاویہ کے زمانہ تک زندہ رہیں، حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جو انقلاب برپا ہوا، اور جس نے مسلمانوں کی مرکزیت کا شیرازہ منتشر کر دیا، اور اُن کی تلواریں آپس ہی میں بے نیام ہو گئیں تو اس نازک صورتِ حال کی اصلاح کے لئے حضرت عائشہؓ نے اس زمانہ کی سیاست میں بھی حصہ لیا، اور آخر تک اصلاحِ حال کی کوشش کرتی رہیں، مگر فریقین کے فتنہ انگیز عناصر کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکیں جس کا اُنھیں بعد میں بڑا افسوس رہا،

اصلاحات کین،

یہ خطبات مدراس کے مباحث کا اجمالی خلاصہ ہے جس سے اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، درحقیقت یہ تنہا کتاب اسلام اور پیغمبر اسلام کی صداقت و عظمت اور دوسرے مذاہب پر اس کی برتری کے ثبوت کے لئے کافی ہے،

سیرتِ عائشہ رض

سلسلۂ سیرت کی تیسری کتاب سیرت عائشہ ہے، اگرچہ وہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی سوانح عمری ہے لیکن ایک حیثیت سے وہ بھی سیرت نبوی کا ضمیمہ ہے، انسان کی زندگی مین اس کی رفیقۂ حیات کو بڑا دخل ہوتا ہے خصوصاً اگر بیوی تعلیم یافتہ اور ہوشمند ہو تو شوہر کے کامون کی تکمیل مین اس سے بڑی مدد ملتی ہے، اور اس کے حالات سے شوہر کی زندگی کے مختلف رُخون پر روشنی پڑتی ہے، اس حیثیت سے ازواج مطہرات کے حالات بھی سوانح نبوی کا جزو ہین، یون تو بہت سی ازواج مطہرات تھین لیکن وہ بیویان جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج مین زیادہ دخل تھا، اور جنھون نے کسی نہ کسی حیثیت سے دین کی خدمت کی، اور جن سے اسلام کی تبلیغ و اشاعت مین مدد ملی، دو تھین، حضرت خدیجہ رض اور حضرت عائشہ رض، حضرت خدیجہ رض نے سب سے پہلے آپ کی نبوت کی تصدیق اور اس زمانہ مین آپ کی تشفی و دلدہی کی، جب مکہ کا ذرہ ذرہ آپ کا دشمن ہو رہا تھا، اور ان کی دولت و جاہ سے اسلام کی ابتدائی تبلیغ و اشاعت مین بڑی مدد ملی، مگر ان کا انتقال ہجرت نبوی ص سے کئی سال پہلے ہو گیا تھا اور اسلام کی ترقی کا زمانہ انھون نے نہین پایا، حضرت عائشہ رض اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد مین آئین، اور وفات نبوی تک برابر ساتھ رہا، اور اس کے بعد تقریباً نصف صدی تک زندہ رہین، اس لئے اسلام کے عروج و ترقی کا پورا زمانہ انھون نے آنکھون سے دیکھا، اور اس زمانہ کے بعض واقعات و حوادث مین بھی انھون نے حصہ لیا، وہ اپنی ذاتی صلاحیتون اور گوناگون اوصاف و خصوصیات کے اعتبار سے اپنے دور کی نسوانی دنیا مین امتیازی درجہ رکھتی تھین، اور اسلام کی ابتدائی تاریخ مین مختلف حیثیتون سے ان کا نمایان حصہ رہا ہے

بلکہ بقول مصنف اس کو سیرۃ النبی کا دیباچہ سمجھنا چاہیئے، اس کا مقصد کلام مجید کے بعض تاریخی اور جغرافی بیانات پر مستشرقین کے اعتراضات کا جواب اور عرب کے قدیم جغرافیہ اور تاریخ کی تحقیق و تنقید ہے، اسلام سے پہلے عربوں میں لکھنے پڑھنے کا رواج محض برائے نام تھا، اور اُن کی پرانی تاریخ کا دار و مدار زیادہ تر زبانی روایات اور قومی داستانوں پر تھا جس میں غلط و صحیح کی آمیزش ناگزیر ہے، اس لئے ایک زمانہ تک عربوں کی قدیم تاریخ پر پردہ پڑا رہا، اسلامی عہد میں جب تاریخ نگاری شروع ہوئی تو عربوں کی زبانی روایات کی بنا پر عرب قبل از اسلام کی تاریخ کے بارہ میں صحیح و غلط ہر قسم کے واقعات شامل ہو گئے،

مستشرقین نے جب عربوں کی تاریخ پر تحقیقات شروع کی، تو انھوں نے قدیم یونانی اور رومی مورخین جغرافیہ نویسوں کے بیانات اور جدید اثری اکتشافات اور پرانے کتبات وغیرہ سے ایسی معلومات حاصل کیے جو اُن کی قدیم روایات کے خلاف تھے،

کلام مجید میں عبرت و بصیرت کے لئے عرب کی قدیم قوموں، اُن کے انبیاء و رسل اور اُن کے اماکن و آبادیوں کا ذکر کیا گیا ہے، جس کے بعض بیانات مستشرقین کی تحقیقات سے مطابقت نہیں کرتے، اس پر مستزاد یہ ہوا کہ بے احتیاط مفسرین نے ان بیانات کی تفسیر میں عربوں کی بہت سی زبانی روایات اور اسرائیلیات نقل کر دیں، اس سے مستشرقین کو اور بھی اعتراض کا موقع مل گیا، جس سے اُن کے نزدیک قرآن مجید کی صداقت مشتبہ ہو جاتی تھی، ارض القرآن ان اعتراضات کے جوابات اور عرب کی قدیم تاریخ کی تحقیق میں لکھی گئی ہے، مگر سیرۃ نبوی کی طرح اس کا طرز بھی مناظرانہ کے بجائے تحقیقی و تنقیدی ہے، اس میں قدیم و جدید دونوں ماخذوں سے قدیم عرب کی محققانہ تاریخ اور اس کا جغرافیہ پیش کیا گیا ہے، کلام مجید کے بیان کردہ واقعات پر مستشرقین کے اعتراضات کی تنقید و تردید کا خصوصیت سے لحاظ رکھا گیا ہے جس سے دونوں میں مطابقت پیدا ہو جاتی ہے یا مستشرقین کی تحقیقات کی غلطی اور کلام مجید کے بیان کی صداقت ظاہر ہو جاتی ہے، اگرچہ مصنف کی ابتدائی تصنیف ہے مگر علم و نظر کی وسعت، تحقیق و تنقید کے لحاظ سے وہ درجہ کمال کی تصانیف سے کم نہیں ہے، اور اسکے شروع کا حصہ جسکو کتاب

غرض دینی علوم کی مسند سے لیکر رزمگاہ سیاست تک حضرت عائشہؓ کے نہایت نمایان کارنامے ہیں اور اسلام نے عورتوں کو مدارج ترقی کے جو حقوق عطا کئے ہیں، حضرت عائشہؓ کی ذات اس کا عملی نمونہ تھی، انھوں نے اپنی ذہانت و قابلیت سے جنس نسوانی کا درجہ بلند کر دیا، اور عملاً ثابت کر دکھایا کہ ایک مسلمان عورت نسوانی حدود میں رہ کر بھی علمی، اجتماعی اور سیاسی کاموں اور دنیا کے دوسرے حقوق و فرائض کی ادائگی میں مردوں کے دوش بدوش کام کر سکتی ہے، وہ عورت تھیں، اس لیے اسلام میں عورتوں کے حقوق کی تعیین و تصریح اُن کے تحفظ اور عورتوں کی عظمت و وقار قائم کرنے میں اُن کا بڑا حصّہ ہے، اور ان امور سے متعلق اُن کی کثرت روایتیں اور واقعات حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں، اس لئے سیرت نبوی کے اس پہلو کی (یعنی) اسلام میں جنس نسوانی کے حقوق کی تعیین، اس کے تحفظ و نگہداشت اور اس کی عملی مثال کی حیثیت سے سیرت نبوی ہی کے قلم سے حضرت عائشہؓ کی سوانح نگاری کی ضرورت تھی، چنانچہ اسی نقطۂ نظر سے سیرت عائشہؓ لکھی گئی ہے، جس میں اُن کے حالات، اُن کے اوصاف و کمالات، اُن کے علمی و دینی اور سیاسی خدمات کو بڑی تفصیل سے لکھا گیا ہے، اور ان کے اور حضرت علیؓ کے تعلقات اور جنگ جمل کے بارہ میں جو غلط واقعات مشہور ہیں، اور اس سلسلہ میں بعض اسلامی فرقے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی زندگی کے متعلق مستشرقین جو اعتراضات کرتے ہیں اُن کی پوری تنقیح و تردید کی گئی ہے، اس سوانح عمری سے یہ پوری طرح نمایان ہو جاتا ہے کہ اسلام نے عورتوں کو کتنے حقوق عطا کئے ہیں، اور اُن کا درجہ کتنا بلند کیا ہے، اور اس پہلو سے حضرت عائشہؓ نہ صرف اپنے زمانہ کے اعتبار سے بلکہ موجودہ دور کے نسوانی ترقی کے صحیح اسلامی تصور کے لحاظ سے بھی کتنے بلند درجہ پر فائز تھیں، اور آج بھی ایک مسلمان عورت اُن کی تقلید کے ذریعہ صحیح اور مدارج ترقی کے بلند سے بلند مدارج تک پہنچ سکتی ہے،

ارض القرآن

اس سلسلہ کی تیسری کتاب ارض القرآن ہے، اگرچہ اس کا موضوع سیرت سے جدا ہے، مگر

سے ایک یہ بھی ہے کہ ہندوؤن سے مسلمانون کا تعلق محض فاتحانہ اور حاکمانہ رہا ہے، اور وہ سندھ کی اسلامی حکومت کو چھوڑ کر ہندوستان سے مسلمانون کا تعلق غزنوی عہد سے شروع کرتے ہین، جن کا مقصد اُن کے نزدیک ہندوستان کی دولت کا سمیٹنا تھا اور اسی مقصد کے ماتحت بعد کے مسلمان حکمران خاندانون نے ہندوستان کو فتح کیا، مگر حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان سے عربون کا تعلق اس کی فتح بلکہ اسلام کے ظہور سے بھی صدیون پہلے سے تھا، عرب ایک تاجر قوم اور مشرق و مغرب کے درمیان تجارتی کڑی تھے، وہ مصر و افریقہ اور شام و عراق کا تجارتی سامان ہندوستان، سیلون، برما، انڈونیشیا اور چین تک لیجاتے تھے، اور ان ملکون کی چیزین مذکورۂ بالا ملکون مین پہنچاتے تھے، پھر ظہور اسلام کے بعد ہندوستان مین اسلامی حکومت کے قیام سے بہت پہلے مسلمانون اور ہندوؤن کے درمیان علمی مذہبی اور تمدنی ہر قسم کے تعلقات پیدا ہو گئے تھے، اور ہندوستان کے جنوبی ساحلی علاقون مین ان کی بڑی بڑی آبادیان قائم ہو گئی تھین، اور ان کی معاشی فوائد کی وجہ سے ہندو راجہ ان کا بڑا لحاظ اور اُن کے ساتھ بڑی رعایت کرتے تھے، جہان اُن کی زیادہ آبادی تھی، وہان ان کا مستقل مذہبی نظام قائم تھا، اور اُن کے معاملات کے فیصلہ کے لئے قاضی مقرر تھے۔

عرب و ہند کے تعلقات مین تعلقات کے ان تمام پہلوؤن کو بڑی تفصیل سے دکھایا گیا ہے، یہ کتاب پانچ ابواب مین منقسم ہے، پہلے باب مین ہندوستان سے عربون کے تعلقات کی ابتداء پر بحث کی گئی ہے، اور تجارتی تعلقات کی قدامت پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس سلسلہ مین یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ دنیا کی پہلی بحری تجارتی قوم فنیقین عرب تھے، جو شام کے ساحل پر بس گئے تھے، اور اُن کے علمی اثرات ظہور اسلام سے بہت پہلے ہندوستان پر پڑ چکے تھے، اس کے بعد ہندوستان پر مسلمانون کے ابتدائی حملہ اور سندھ کی فتح کا مختصر تذکرہ ہے، پھر مسلمان جغرافیہ نویسون ابن خردادبہ سنہ ۲۵۰ھ، سلیمان تاجر سنہ ۲۳۷ھ، ابوزید حسن سیرافی سنہ ۲۶۴ھ، ابودلف مسعر بن مہلہل سنہ ۳۳۱ھ، بزرگ بن شہریار سنہ ۳۰۰ھ، مسعودی سنہ ۳۰۳ھ، اصطخری سنہ ۳۴۰ھ، ابن حوقل سنہ ۳۳۱ھ، بشاری مقدسی سنہ ۳۷۵ھ، البیرونی سنہ ۴۰۰ھ، ابن بطوطہ سنہ ۷۴۹ھ وغیرہ کی کتابون سے جو خود ہندوستان آئے تھے، اور اپنی کتابون مین اس زمانہ کے ہندوستان کے حالات لکھے ہین، اور وہ ہند قدیم کی تاریخ کا سب سے بڑا ماخذ ہین، ہندوستان کے حالات نقل کئے ہین

کا مقصد سمجھنا چاہئے اور جس میں عرب کی تاریخ وجغرافیہ کے قدیم وجدید ماخذ یعنی قرآن مجید تفسیری روایات، اسرائیلیات، کلام عرب، عرب قدیم کی تاریخ کے اسلامی مصنفین، ان کی تاریخوں، کتب جغرافیہ، انساب عرب، اسرائیلی لٹریچر، رومی و یونانی مصنفین کی کتابوں، عربوں کی قدیم روایات اور جدید اثری اکتشافات پر بحث وتنقید ہے، بڑا فاضلانہ اور محققانہ ہے، اور اس بحث وتنقید ہی سے اعتراضات کا میدان بہت تنگ ہو جاتا ہے۔

اس مقدمہ کے بعد عرب قدیم کا مفصل جغرافیہ، اس کی قدیم تاریخ، اور کلام مجید میں جن اقوام وقبائل اور مقامات کا ذکر ہے، ان کی تاریخی واثری تحقیق ہے، اور دوسرے حصہ میں قرآن مجید، توراۃ، یونانی ورومی مصنفین کے بیانات اور اثری اکتشافات کی روشنی میں بنو ابراہیم کی تاریخ، عربوں کی قبل از اسلام تجارت، اور ان کے مذاہب پر تفصیل کے ساتھ بحث، اور جدید ماخذوں سے کلام مجید کے بیانات کی تائید وتوثیق کی گئی ہے اور مستشرقین کے بیانات کا رد کیا گیا ہے، اس طرح یہ کتاب گویا عرب کی قدیم اقوام وملل اور اماکن ومقامات کے متعلق کلام مجید کے بیانات کی تاریخی جغرافی اور اثری تفسیر ہے، اور اس کی روشنی میں اس کے بہت سے تاریخی وجغرافی بیانات کی تائید وتوضیح ہو جاتی ہے،

عرب وہند کے تعلقات

مذکورہ بالا علمی و مذہبی تصانیف کے علاوہ متعدد خالص علمی تصانیف بھی ہیں، مگر وہ بھی تبلیغی مقصد سے خالی نہیں ہیں، ان میں عرب وہند کے تعلقات اور خیام زیادہ اہم ہیں، اور اپنے معلومات کی وسعت اور تلاش وتحقیق میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں، اور ان کو یورپین زبانوں کی اعلیٰ سے اعلیٰ تصانیف کے مقابلہ میں بلاتکلف پیش کیا جا سکتا ہے۔

ان دونوں میں عرب وہند کے تعلقات امتیازی حیثیت رکھتی ہے، یہ کتاب اگرچہ خالص علمی وتاریخی ہے مگر اس کا مقصد ہندو مسلمانوں کے تعلقات کے متعلق بعض غلط فہمیوں کا ازالہ اور ان دونوں کے تعلقات کی قدامت اور اس کی خوشگواری دکھانا ہے، انگریزوں نے اپنے سیاسی مصالح کے لئے جو غلط فہمیاں پھیلائی تھیں ان

اس زمانہ میں بہت سے علوم کا مرکز تھا، اس لئے برامکہ نے یہاں کے مختلف علوم کے فضلاء کو بڑے اعزاز واکرام سے بغداد بلایا، ان کی بڑی قدردانی کی اور ان کے علوم سے پورا فائدہ اٹھایا جس کا سلسلہ برامکہ کے زوال کے بعد مامون کے عہد میں بھی قائم رہا، بلکہ مامون کی علم نوازی کی وجہ سے اور زیادہ بڑھ گیا، اس بحث میں طب، نجوم، دانش، ہیئت، ریاضی، بیطاری، موسیقی، جنگ، سیاست، منطق، کیمیا، جعفر، رمل، قصص و حکایات، اور اخلاق وغیرہ کی سنسکرت کی جو کتابیں عربی میں ترجمہ ہوئیں، اور ان ہندو علماء کا جنھوں نے بغداد میں علمی خدمات انجام دیں مفصل تذکرہ ہے، اس باب کا خاتمہ البیرونی کے حالات پر کیا گیا ہے جس نے قدیم ہندوستانی علوم اور اس کی تاریخ و تہذیب کی اتنی خدمت انجام دی، جو اس زمانہ کے کسی ہندو سے بھی نہیں ہو سکی، اس نے ہندوستانی علوم پر بہت سی کتابیں لکھیں، سنسکرت کی بعض کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا، اس کی کتابیں قدیم ہندوستانی علوم اور ہندوستانی کلچر کی تاریخ کا بہت بڑا ماخذ ہیں،

چوتھا باب مذہبی تعلقات پر ہے، ہندو مسلمانوں کے مذہبی تعلقات کے سلسلہ میں ہم کو انگریزوں کا پڑھایا ہوا صرف یہ سبق یاد رہ گیا ہے، کہ مسلمان ہندوؤں کو کافر و مشرک سمجھتے تھے، اُن کو تلوار کے زور سے مسلمان بناتے تھے، ان سے جزیہ وصول کرتے تھے، اُن کی عبادت گاہوں کو ڈھاتے تھے، اور اس کے ثبوت میں ترک افغان اور مغل سلاطین کے کچھ واقعات بھی مل جاتے ہیں، اس لئے اس باب میں پہلے اس شہرت عام پر بحث و تنقید کی گئی ہے، اور یہ دکھایا گیا ہے کہ وسط ایشیا کے جن مسلمان خاندانوں نے ہندوستان میں حکومت کی، ان کے بعض سلاطین اور عہدہ داروں کو چھوڑ کر وہ قوم کی مجموعی حیثیت سے اسلام کے صحیح نمایندے نہ تھے، اور نہ اُن کی حکومت کا کچھ اسلامی نظام حکومت سے کوئی علاقہ تھا، اور اُن کے افسروں کو جو زیادہ تر غیر مسلم یا بالکل جدید الاسلام تھے اسلام کے صحیح نظام جنگ اور حاکمیت و محکومیت کے قوانین ہی سے واقفیت نہ تھی، اور جب تک زمانہ میں ان خاندانوں نے حکومت کی، ان کی قوم مسلمان بھی نہ ہوئی تھی، اور اس میں ہزاروں غیر مسلم تھے، جو لوگ مسلمان بھی تھے، وہ بھی اسلامی روح سے محض بیگانہ، اور اپنی قومی خصوصیات پر قائم تھے، اور انھوں نے جو کچھ بھی کیا، خواہ وہ مذہب کے نام پر

دکھلایا ہے کہ تاریخی حیثیت سے ان جغرافیہ نویسون نے ہندوستان کی کتنی بڑی خدمت انجام دی ہے، ان بیانات سے ہندوستان کے عام حالات کے ساتھ ہندو مسلمانون کے تعلقات پر بھی روشنی پڑتی ہے، اس کے بعد ان جغرافیہ نویسون اور مورخین کا تذکرہ ہے، جو خود تو ہندوستان نہین آئے مگر اپنی کتابون مین اس کے حالات لکھے ہین،

دوسرے باب مین تجارتی تعلقات پر بحث کی گئی ہے، اور اس سلسلہ مین ان تعلقات کی قدامت مشرق بعید کے درمیان عرب تاجرون کی اہمیت ان ملکون کے درمیان تجارتی راستون ان کی درمیانی منزلون اور بندرگاہون کی تفصیل، ہندوستان مین دوسری بیرونی قومون کی تجارت، ہندوستان کی پیداوار مصنوعات اور دوسرے سامان تجارت، تجارتی درآمد برآمد عرب کے ہندو بیوپاریون بحر ہند مین چلنے والے جہازون کی وسعت ہندوستان کی بحری تجارت اور دولت وثروت وغیرہ پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے، اور آخر مین یہ ثابت کیا گیا ہے کہ عرب کو چھوڑ کر افریقہ کی پشت سے بحر ہند مین آنے کے راستے کے انکشاف کا سہرا پرتگالیون کے سر باندھا جاتا ہے لیکن درحقیقت اس کے پہلے رہنما عرب تھے، اور پرتگالیون کو ہندوستان پہنچانے والا ایک عرب بحری ابن ماجد تھا

تیسرا باب علمی تعلقات پر ہے، اس مین یہ دکھایا گیا ہے کہ مسلمانون اور ہندوستان کے درمیان علمی تعلقات کا کچھ نہ کچھ سلسلہ بنی امیہ کے آخری دور ہی سے شروع ہو گیا تھا، مگر خود مسلمانون کی اصل علمی تاریخ جب انھون نے دوسری قومون کے علوم کی جانب توجہ کی عباسیون کے زمانہ سے شروع ہوتی ہے، اسی زمانہ سے مسلمانون نے دوسری علمی قومون کے علوم سے فائدہ اٹھانا شروع کیا، اور یونانی سریانی اور ایرانی علوم وغیرہ کی طرف توجہ کی تو اس سلسلہ مین انھون نے ہندوستان سے بھی علمی روابط پیدا کئے، عباسی خلفاء خود بھی صاحب علم اور علم وفن کے بڑے قدردان اور سرپرست تھے لیکن عباسی دور کی علمی ترقیون کا سہرا بڑی حد تک برمکی خاندان کے سر ہے، اس لئے اس کتاب مین ہندوستان سے عربون کے علمی تعلقات کے باب کا آغاز برامکہ کی تاریخ سے کیا گیا ہے، ان کے متعلق عام شہرت تو یہی تھی کہ وہ مجوسی تھے، مگر اس کتاب مین عقلی دلائل اور تاریخی شواہد سے ثابت کیا گیا ہے کہ برامکہ نسلاً ایرانی مگر مذہباً بدھسٹ تھے، یہ محققانہ بحث دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے، اس رشتہ سے ہندوستان سے ان کا مذہبی تعلق تھا اور ہندوستان

بڑھے جنھین عرب تنبیج کہتے تھے، ہندوستان مین ابتدائی اسلامی فتوحات کے زمانہ مین خصوصاً جن علاقون سے مسلمانون کا تعلق رہا زیادہ تر بدھ آباد تھے، اس لئے وہی عربون سے زیادہ متاثر ہوئے، اور اسلام کا اثر رفتہ رفتہ ہندوستان مین پھیلنے لگا، بعض ہندو راجہ بھی مسلمان ہوئے، اور آج سے ایک ہزار سال پہلے سندھ کے ایک راجہ نے قرآن مجید کا سندھی زبان مین ترجمہ کرایا، ہندوستان مین توحید خالص کا تصور بھی، اسلام کے اثرات کا نتیجہ ہے، گو ہندوؤن کے بعض فرقون مین ایک حد تک توحید پائی جاتی تھی، مگر تنزیہی اور کامل توحید اسلام کے اثرات کا نتیجہ ہے، اسی طریقہ سے مسلمان بھی ہندوؤن سے متاثر ہوئے اور اس بحث مین دونون پر ایک دوسرے کے اثرات دکھائے گئے ہین،

آخری اور پانچوان باب "ہندوستان مین اسلامی فتوحات سے پہلے یعنی غزنویون سے قبل مسلمانون کی آبادی" ہے، یہ باب درحقیقت گذشتہ ابواب و مباحث کا نتیجہ اور ان کا حاصل ہے، اس مین دکھایا گیا ہے کہ کوکن اور جنوبی ہند مین جہان مسلمانون کی حکومت سب سے آخر مین قائم ہوئی، وہین مسلمان سب سے پہلے آباد ہوئے اور اس کا کوئی ساحلی علاقہ اور تجارتی شہر مسلمانون سے خالی نہ تھا، بعض بعض شہرون مین ان کی تعداد کئی کئی ہزار تھی، اور یہان کے ہندو راجاؤن پر ان کا بڑا اخلاقی اثر تھا، اور وہ ان کا بڑا لحاظ کرتے تھے، ان کو طرح طرح کی سہولتین دے رکھی تھین، ان کی تمام آبادیون مین مسجدین تھین، اور جہان ان کی آبادی زیادہ تھی، وہان ان کا مستقل مذہبی نظام قائم تھا، اور ان کے معاملات کے فیصلے کیلئے ائمہ و قضاۃ مقرر تھے، ان مسلمانون کے اخلاقی اثر سے بعض ہندو راجہ مسلمان بھی ہوئے۔

اس بحث مین ان علاقون مین مسلمانون کی آمد کی تاریخ، ان کی بڑی اور مرکزی آبادیون، اور ان کے حالات کی پوری تفصیل آگئی ہے، اور مالدیپ، سراندیپ، ملیبار، کولم (ٹراونکور) کارومنڈل، صیمور (چیمور) تھانہ (بمبئی) کھنبایت، کاٹھیاواڑ، گندھار (بھڑوچ کے قریب) بیرم، گوگہ (بھاؤنگر کے پاس) چنداپور (گوا کے قریب) ہنور (احاطہ بمبئی) ملیبار مین ابی سرور، باکنور (موجودہ برکور) منگلور، ہیلی (کنانور کے قریب) جرتن (موجودہ سری کنداپورم) دہ فتن، بدھ فتن، پنداری، کالی کٹ، چالیات، شیون، کاوڑی، ودا سمند (علاقہ میسور) کا

کیا ہو، مگر درحقیقت اس کو مذہب سے کوئی علاقہ نہ تھا، اور محض سیاست کے لئے تھا، اس لئے اُن کے ذاتی اعمال کی ذمہ داری اسلام پر رکھنا اور پوری مسلمان قوم کو ان پر قیاس کرنا کسی حیثیت سے بھی صحیح نہین ہی،

اسلام کے اصل نمایندے عرب تھے، وہ حکمرانی مین اسلام کے مقرر کئے ہوئے حدود سے آگے نہ بڑھتے تھے، ان کی حکومتون مین محکومون کے ساتھ زیادتی کی مثالین شاذ ہی ملتی ہین، جن سے دنیا کا کوئی حکمران خاندان بھی مستثنیٰ نہین ہی، مذہب کے معاملہ مین وہ بڑے روادار تھے، جن جن قومون پر انھون نے حکومت کی اُن کے مذہبی عقائد و مذہبی نظام، بلکہ مذہبی رسم ورواج تک مین کوئی مداخلت نہین کی، اور نہ اُن کی عبادت گاہون مین ہاتھ لگایا، اور جزیہ اور خراج کے ٹیکس لینے کے بعد انکو تمام حقوق مین مسلمانون کے برابر قرار دیا، خود سندھ مین عربون کی حکومت اسی روش پر رہی، اور ہندؤن کو شبہ اہل کتاب قرار دے کر اُن کی عورتون سے شادی اور ان کے ہاتھ کا ذبیحہ کھانے کی ممانعت کے علاوہ ہر چیز مین اُن کو اہل کتاب کے برابر حقوق عطا کئے، مسلمانون کے اس فیاضانہ سلوک کا یہ نتیجہ تھا کہ سندھ کے ہندو مسلمان حکمرانون کے گرویدہ ہوگئے، اس سلسلہ مین اہل کتاب، شبہ اہل کتاب کا فر و مسلم اور جزیہ کے مسائل کی بحثین بھی آگئی ہین، جن سے ان امور کے متعلق بہت سی غلط فہمیان دور ہوجاتی ہین،

اس کے بعد اصل بحث مذہبی تعلقات کی شروع ہوتی ہے، اس مین یہ دکھایا گیا ہے کہ ہندوستان کے ساتھ گوناگون تعلقات کی بنا پر عربون کو یہان کے مذاہب کی تحقیقات کا شوق پیدا ہوا، اور انھون نے بڑی محنت سے اس کی تلاش بتحقیق کر کے اپنی کتابون مین اُن کے حالات لکھے، اور ان مسلمان سیاحون اور جغرافیہ نویسون کے علاوہ جن کے نام اوپر گذر چکے ہین، اور جنھون نے اپنی کتابون مین ہندوستان کے عام حالات کے ضمن مین یہان کے مذاہب کا بھی حال لکھا ہے، دوسرے مسلمان علما مین ابن ندیم، مطہر بن طاہر مقدسی، ابوالعباس ایرانشہری، عبدالکریم شہرستانی اور عبدالقاہر بغدادی نے خاص طور سے اپنی کتابون مین ہندو مذاہب، اُن کے فرقون، اُن کے عقائد اور مذہبی رسوم کے تفصیلی حالات تحریر کئے ہین، اور ان بیانات کو نقل بھی کیا ہے، اسی سلسلہ مین فرقہ سمنیہ پر جس کا عربی تاریخون مین ذکر آتا ہے، بڑی محققانہ بحث کی گئی ہے، اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ وہ

عالم اور فلسفی قسم کا صوفی تھا، مذہبی حیثیت سے وہ ایک دیندار مسلمان تھا، اور مذہبی علوم میں پوری دستگاہ رکھتا تھا، اس کی زندگی زاہدانہ تھی، مگر اہل یورپ کا مذاق خود رندانہ ہے، اس لئے رباعیاتِ خیام کے ظاہری آئینہ میں اس کی جو تصویر دیکھی وہ ہم مشربی کی بنا پر بڑی دلکش نظر آئی، چنانچہ اسی کو اصل سمجھکر اس کی اتنی تشہیر کی کہ عمر خیام اُنکے ہاں بدمست شرابی کا ہم معنی بن گیا، حالانکہ کسی شاعر کے کلام سے اس کی عملی زندگی کا قیاس صحیح نہیں ہے، خصوصاً مشرقی شاعری میں تو سراسر غلط ہے، بڑے بڑے مسلّم صوفی شعراء کا کلام بھی شراب و شاہد کے ذکر سے خالی نہیں ہے، مولانا روم، شمس تبریز، ابوسعید ابوالخیر جیسے بزرگوں کے کلام میں بھی شراب، شاہد کی رنگینیاں نظر آتی ہیں، اور خواجہ حافظ کا کلام تو پورا میخانہ ہے، ممکن ہے بعض ظاہر بین حافظ کی شراب کو بھی شراب ناب ہی پر محمول کریں لیکن ان کے علاوہ اور بزرگوں کو کون رند شاہد باز کہہ سکتا ہے، اس کو فارسی شاعری کا عیب سمجھا جائے یا ہنر، شراب و شاہد، چنگ و رباب، گل و بلبل، ہجر و وصال اس کے ایسے لوازم بن گئے ہیں کہ ان کے سہارے کے بغیر ایک قدم بھی شاعری کے میدان میں نہیں چلا جا سکتا، اور نہ ان کے بغیر اس میں حسن و دلکشی پیدا ہوتی ہے، اس لئے حکیم و فلسفی اور صوفی صافی شعراء بھی ان کنایات و استعارات کے استعمال پر مجبور رہتے، اور غالب نے تو صاف کہدیا ہے کہ

ہرچند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اس لئے خیام کے شاہد و شراب کو کیوں حقیقت پر محمول کیا جائے، اس کے علاوہ اس کی بہت سی رباعیاں فلسفیانہ اور اخلاقی بھی ہیں، ان کو کیوں نظر انداز کیا جائے، خصوصاً جب تاریخی حیثیت سے یہ معلوم و مسلّم ہے کہ وہ ایک بڑا عالم حکیم اور صوفی تھا، جس پر اس کی تصانیف شاہد ہیں، مگر ظاہر پرست اہل یورپ نے اس کی رندانہ رباعیوں کے آئینہ میں اس کی ظاہری تصویر دیکھ کر اسی کو اصل سمجھ لیا، اگر انھوں نے رباعیوں کے بجائے تاریخ کے اوراق اور خود خیام کی فلسفیانہ تصانیف کے ذریعہ خیام کو سمجھنے کی کوشش کی ہوتی، تو اس کی اصل شکل نظر پڑتی، کتاب خیام میں اس کی صحیح شکل پیش کی گئی ہے، اور یہ دکھایا گیا ہے کہ وہ رند شاہد باز نہیں

قدیم پایۂ تخت) وغیرہ مین مسلمانون کی آمد، اُن کی آبادیون، اُن کے نظام، ہندوون سے اُن کے تعلقات اور اس زمانہ کے ان علاقون کے مختلف حالات لکھے گئے ہین،

آخر مین سندھ و ملتان مین مسلمانون کی تاریخ بیان کی گئی ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمد بن قاسم کے حملہ سے بھی پہلے یہان کئی سو مسلمان آباد تھے، سندھ کی فتح سے لیکر امویون کے خاتمہ بلکہ عباسیون کے ابتدائی زمانہ تک سندھ مین مسلمانون کی تاریخ بہت صاف ہے، مگر اس کے بعد سندھ کی طوائف الملوکی کے زمانہ کی تاریخ بڑی گنجلک اور پیچیدہ ہے، غزنویون اور غوریون سے پہلے یہان کئی مسلمان خانوادون نے حکومت کی، بلکہ ایک وقت مین دو دو حکومتین رہی ہین، جن کے حالات تاریخون مین بہت کم اور اتنے گنجلک ہین کہ ان خاندانون اور ان کے حکمرانون کی تعیین مشکل ہے، اور بعض خاندانون کے متعلق یہ بھی نہین معلوم کہ اُن کی اصل و نسل کیا تھی، اور اُن کا زمانہ کونسا ہے، اس باب مین ان تمام خاندانون کی تحقیقات کرکے اس کی تعیین کی گئی ہے، اور ان کے حالات لکھے گئے ہین جس سے سندھ کے حکمرانون کا سلسلہ بڑی حد تک مکمل ہو جاتا ہے، یہ بحث بڑی محققانہ ہے، ان خاندانون کے حالات کے ساتھ ان کے زمانہ کے سندھ کے بڑے بڑے شہرون کے مختلف قسم کے حالات لکھے ہین، اور ان پرانے شہرون کے جاے وقوع کی جن کے اب صرف نام تاریخون مین باقی رہ گئے ہین تعیین کی گئی ہے، اسی بحث پر یہ اہم کتاب ختم ہو جاتی ہے، ان مباحث سے اس کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوسکتا ہے،

خیام

علمی سلسلہ کی دوسری اہم کتاب خیام ہے، اس نامور حکیم اور جلیل القدر فاضل کو اہل یورپ نے ایک عیاش اور بدمست رندِ لاابالی کی شکل مین پیش کیا ہے، جو ہمہ تن شاہد و شراب مین غرق رہتا تھا، اور جس کی زندگی رندی و عیش پرستی کے سوا کچھ نہ تھا، اور اس مشرب کا وہ بہت بڑا مبلغ بھی تھا، مگر اس تصویر کو حکیم عمر خیام کی اصل شکل سے کوئی علاقہ نہین ہے، وہ اپنے زمانہ کا ایک بڑا فلسفی، ہیئت و نجوم اور ریاضیات کا بہت بڑا

کی زندگی میں جب کسی نے ان کی سوانح عمری لکھنے کا خیال ظاہر کیا، تو وہ اس کو ٹال گئے، اور اسی قسم کی ایک فرمایش کے سلسلہ میں انھوں نے ہونہار شاگرد کو لکھا تھا کہ "دوسرے لوگ میری سوانح عمری کیا لکھیں گے میں خود ہی جب کبھی دنیا کے اور کاموں سے فرصت پاؤں گا تو اس کام کو انجام دوں گا" اس لئے حیاتِ شبلی کی تالیف ہمیشہ مصنف کے پیش نظر رہی، مگر یہ اتفاق ہے کہ ان کو اسی وقت اس کی تالیف کا موقع ملا جب دنیا کے اور کاموں سے بڑی حد تک فرصت مل چکی تھی، چنانچہ حیاتِ شبلی ان کی آخری تصنیف ہے اور اسی پر ان کی تصنیفی زندگی کا خاتمہ ہو گیا،

مولانا شبلی کی ذات جامع کمالات تھی، وہ قدیم مذہبی علوم کے عالم بھی تھے، اور جدید افکار و خیالات کے واقف کار بھی، قدیم علماء کی صحبت بھی اٹھائی تھی، اور جدید طبقہ کے شریک بزم بھی رہے تھے، وہ مفکر و محقق بھی تھے اور ادیب و شاعر بھی، انشا پرداز بھی تھے اور خطیب بھی، مورخ بھی تھے اور متکلم بھی، مصلح بھی تھے، اور ماہر تعلیم بھی، اور سیاست کا ذوق بھی رکھتے تھے، اور ان سب میں اُن کے بڑے کارنامے ہیں، وہ محض پرانے طرز کے عالم نہ تھے بلکہ زمانہ کے نئے حالات و ضروریات کی بنا پر بہت سے خیالات میں انقلابی تھے، وہ قدیم بنیادوں پر جدید قصر ملت کی تعمیر کرنا چاہتے تھے، اس لئے اُن کے خیالات پُرانے اور نئے دونوں طبقوں سے مختلف تھے، اور دونوں ان سے کھٹکتے تھے، خصوصاً عربی تعلیم اور علماء کی مذہبی و تعلیمی اصلاح کے لئے انھوں نے جو انقلابی قدم اٹھایا، وہ بالکل نیا تھا، وہ ان دونوں کی اصلاح کر کے ان کو جدید دینی و ملی ضروریات کے مطابق بنانا چاہتے تھے، جس کا نمونہ دار العلوم ندوۃ العلماء اور دار المصنفین ہے، علوم و معارف پر غور و فکر اس کی تعبیر و ترجمانی اور علمی تلاش و تحقیق کا ایک نیا طریقہ اختیار کیا تھا جس کا نمونہ دار المصنفین ہے، ان دونوں باتوں سے پُرانے علماء بالکل نامانوس تھے، اس لئے علامہ شبلی کو طرح طرح کی بدگمانیوں کا نشانہ ہونا پڑا، لیکن بالآخر زمانہ کے حالات نے سب کو اس راستہ پر چلنے کے لئے مجبور کر دیا، اور جو اس سے الگ رہے، اُن کے خدمات کا دائرہ محدود ہو کر رہ گیا، یہ علامہ شبلی کا بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے اپنی عاقبت اندیشی و فراست سے دینی علوم، اور علماء کا بھرم قائم کر دیا، ورنہ قدیم اور جدید کی ٹکر میں ان کا وقار قائم رہنا مشکل ہو جاتا

بلکہ بڑا عالم حکیم اور فلسفی قسم کا صوفی تھا،

خیام پر مشرق سے زیادہ مغرب میں لکھا گیا ہے، مگر جس قدر لکھا گیا ہے، اسی قدر اس کے حالات و واقعاتِ زندگی میں مختلف قسم کی تاریخی پیچیدگیاں اور گتھیاں پیدا ہوگئی ہیں، مصنف نے اس کے سوانح کے تمام مشرقی و مغربی ماخذوں سے اُن پر تنقید کرکے ان گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی ہے، اردو نہ صرف بلکہ دوسری زبانوں کے مقابلہ میں بھی پہلی مرتبہ اس بسط و شرح اور تحقیق و تنقید کے ساتھ خیام کے حالات لکھے گئے ہیں، اور اس کے علمی کمالات اور علمی کارناموں پر مفصل تبصرہ کرکے دکھایا ہے کہ عمر خیام اپنے زمانہ کا بہت بڑا فاضل حکیم، ہیئت و نجوم اور ریاضیات کا بہت بڑا عالم اور صوفی مشرب فلسفی تھا، اور اس کے سوانح کے سلسلہ میں سلجوقیوں کے دور کے علمی اور خیام کے معاصر علماء کے حالات بھی آگئے ہیں،

بعض دوسرے شعراء کے کلام کی طرح عمر خیام کی رباعیاں بھی دوسرے شعراء کی رباعیوں سے خلط ملط ہوگئی ہیں اسلئے رباعیات کے مختلف قلمی اور مطبوعہ نسخوں کی مدد سے خیام کی رباعیات کی تعیین کی کوشش کی گئی ہے، اور رباعیات کے ایک قدیم اور صحیح قلمی نسخہ کی نقل بھی کتاب میں شامل کر دی گئی ہے، اس کے علاوہ خیام کے سات نادر فلسفیانہ رسالوں کو جن میں سے چھ عربی میں ہیں، اور ایک فارسی میں تصحیح و تحشیہ کے ساتھ مرتب کرکے آخر میں شامل کر دیا گیا ہے، یہ اس کتاب کا اجمالی خاکہ ہے، مگر اس کے گوناگوں علمی مباحث مختلف النوع تاریخی معلومات، اور مصنف کی وسعت و دقتِ نظر اور تحقیق کا اندازہ کتاب کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے،

حیاتِ شبلی

ان کے علاوہ علمی سلسلہ کی دو اہم کتابیں اور ہیں، ایک حیاتِ شبلی اور دوسری عربوں کی جہاز رانی ان میں حیاتِ شبلی مختلف حیثیتوں سے زیادہ اہم ہے، وہ ایک جلیل القدر اور شفیق استاذ کے حضور میں ایک لائق شاگرد رشید کا نذرانۂ عقیدت ہے، اس لئے مصنف نے اس میں اپنا پورا تصنیفی کمال اور زورِ قلم صرف کر دیا ہے علامہ شبلی

عربون کی جہازرانی

یہ ان خطبات کا مجموعہ ہے جو مارچ ۱۹۳۰ء مین اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن بمبئی کی فرمائش پر دیئے گئے تھے اور جنھیں کتابی شکل مین شائع کر دیا گیا تھا، جیسا کہ اوپر عرب و ہند کے تعلقات پر تبصرہ کے سلسلہ مین لکھا جا چکا ہے کہ عرب قدیم الایام سے ایک تاجر قوم اور مشرق و مغرب کے درمیان تجارتی کڑی تھے، وہ مصر و افریقہ اور عرب و شام اور عراق کا تجارتی مال ہندوستان، سیلون، برما، انڈونیشیا اور چین لیجاتے تھے، اور ان ملکون کا سامان مذکورہ ممالک مین پہنچاتے تھے، ورظہور اسلام کے بہت پہلے سے اپنے زمانہ کے بڑے بحرپیما اور جہازران تھے اس کے بعد جب اسلامی فتوحات کا سیلاب عرب سے نکل کر افریقہ اور یورپ کی طرف بڑھا، تو اُن کے سمندر اور ان کے بحری بیڑون کا جولانگاہ بن گئے، اور ایک صدی کے اندر وہ بحر عرب خلیج فارس بحیرۂ اسود بحر قلزم اور بحر روم کے حکمران بن گئے، اور ان کی بحری حیثیت و اہمیت تقریباً بڑھ گئی جو اس زمانہ مین برطانیہ کی ہے، اور اس سلسلہ مین انھون نے علمی اور عملی دونون حیثیتون سے فن جہازرانی کو بڑی ترقی دی۔

ملک گیری کے بعد جب دوسری صدی سے ان کی علمی ترقی کا دور شروع ہوا تو علم و فن کے دوسرے شعبون کے ساتھ سمندرون کے متعلق تحقیقات اور جغرافی اکتشافات کے سلسلہ مین انھون نے اس زمانہ کے معلوم سمندرون کا چپہ چپہ چھان مارا، بعض نئے سمندرون کا پتہ چلایا، مختلف سمندرون کے راستے دریافت کئے، نامعلوم جزیرون کا اکتشاف کیا، یورپ، ایشیا اور افریقہ کے نامعلوم خطون سے واقفیت پیدا کی، فن جہازرانی کو ترقی دی، اس کے بہت سے آلات ایجاد کئے، سمندرون کے حالات اور جہازرانی پر کتابین لکھین، عربون کی جہازرانی مین ان سب کی پوری تفصیل بیان کی گئی ہے۔

پہلے لغات عرب اور کلام مجید سے عربون کی بحری واقفیت اور ان کی جہازرانی کا ثبوت دیا گیا ہے، اس کے بعد عہد رسالت مین عربون کے بحری سفرون کا حال لکھا ہے، پھر خلافت راشدہ

مگر اسی کے ساتھ وہ جدید تعلیم و تہذیب سے مرعوب نہ تھے، اور اس کے بعض محاسن کے اعتراف کے ساتھ اس کی خامیوں کے ناقد بھی تھے۔ اور سیاسیات میں آزادانہ خیالات رکھتے تھے، اس لئے جدید تعلیم یافتہ طبقہ بھی ان سے مطمئن نہ تھا،

اس کے علاوہ مسلمانوں کی جتنی تمام قومی و ملی تحریکیں خواہ وہ تعلیمی ہوں یا اصلاحی علمی ہوں یا سیاسی جو ان کے زمانہ میں اٹھیں، ان سب میں ان کا نمایاں حصہ رہا، اور بعض تحریکوں کے وہ خود بانی اور رہنما تھے، اور ان میں سے کسی میں وہ کسی کے مقلد نہ تھے، بلکہ خود مجتہد اور رہنما کی حیثیت رکھتے تھے، اسلئے اس زمانہ کے بعض اشخاص و جماعتوں سے انکو اختلافات بھی پیش آئے، اس لئے ان کی سوانح کو اس طرح لکھنا کہ مولانا شبلی کے کمالات و کارنامے ان کی جدت و ندرت اور قائدانہ و مجتہدانہ حیثیت بھی نمایاں ہو جائے، اور کسی آبگینہ کو ٹھیس بھی نہ لگنے پائے، بڑا نازک کام تھا، اگر مصنف نے بڑی خوبی سے ان نازک مراحل کو طے کیا ہے، اور مولانا شبلی کے کمالات اور ان کے کارناموں کا ایسا دلکش مرقع تیار کیا ہے جس میں ان کے سارے خط و خال نمایاں اور وہ اپنے تمام معاصرین میں ممتاز نظر آتے ہیں، اس کتاب میں ان کے ذاتی سوانح کے ساتھ ان کے علمی و تعلیمی، اصلاحی اور سیاسی کارناموں کی پوری تفصیل آگئی ہے، اور چونکہ ان کی پوری زندگی قومی و ملی کاموں میں گذری اور انھوں نے مسلمانوں کے گوناگوں کام انجام دیئے، اور ان کی ہر تحریک میں سرگرم حصہ لیا، اس لئے ان کے سوانح کے سلسلہ میں ہندوستان کے مسلمانوں کی پچاس سالہ ملی سرگذشت بھی آگئی ہے، اس کتاب کا مقدمہ نہایت فاضلانہ اور اپنی جگہ پر ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتا ہے، اس میں پرانے صوبے اودھ خصوصاً اس کے مشرقی اضلاع کی کئی صدیوں کی علمی، دینی اور اخلاقی و روحانی تاریخ بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے جمع کی گئی ہے جو کسی ایک کتاب میں اس طرح مرتب اور یکجا نہیں مل سکتی، اس طرح یہ کتاب مولانا شبلی مرحوم کے حالات اور کارناموں کا مرقع بھی ہے اور ہندوستان کے مسلمانوں کی پچاس سالہ تاریخ بھی،

اوراُن کی کتابوں میں اُن کے بارہ میں اُن کے بیانات کی تفصیل ہے، اور یہ دکھایا گیا ہے کہ بحرِ روم اور بحرِ اٹلانٹک سے افریقہ کے سواحل پر گھوم کر بحرِ ہند میں آنے کا راستہ دریافت کرنے والا پہلا شخص ایک عرب ابن ماجد تھا، اور واسکو ڈی گاما اسی کے ذریعہ ہندوستان پہنچا تھا،

اس کے بعد عربوں کے بنائے ہوئے بحری نقشوں، ان کے تعمیر کردہ لائٹ ہاؤس اور ریل کے نشانات کا ذکر اور جہازرانوں کے رہنما ستاروں، سمندری ہواؤں اور اُن کے جغرافیہ پر عربوں کی تصانیف کا حال ہے، پھر قطب نما کی ایجاد اور ترقی کی بحث اور عربوں کے ایجاد کردہ اُن فلکی آلات کا ذکر ہے جن سے جہازرانی میں مدد ملتی ہے پھر عربوں کے قائم کردہ جہازرانی کے کارخانوں، مصنوعی بحری لڑائیوں، ڈوبے ہوئے جہازوں کے نکالنے جہاز، جہاز سازوں، جہازی ساز و سامان وغیرہ جہاز کے مختلف متعلقات کی تفصیل، اور بحرِ ہند اور بحرِ عرب کے راستوں کا تذکرہ ہے، اور مسلمانوں کی بحری ترقی کے خاتمہ پر یہ داستان ختم کی گئی ہے، آخر میں عربوں کی بحری تصانیف کا اجمالی تذکرہ ہے، یہ اس کتاب کے مباحث کا اجمالی خاکہ ہے، اور اس میں اس موضوع پر جو معلومات فراہم کئے گئے ہیں، اُن کا صحیح اندازہ اصل کتاب کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، ان کے علاوہ اور بھی متعدد چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں۔

مضامین و مقالات و خطبات

ان تصانیف کے علاوہ انھوں نے مختلف موضوعوں پر سیکڑوں مضامین لکھے، علم و ادب کا مشکل ہی سے کوئی گوشہ ایسا نکل سکتا ہے، جو تشنۂ تحقیق رہا ہو، اور ان کی نظر سے چھوٹا ہو، انھوں نے اسلامی علوم و فنون کے بہت سے مستور گوشے بے نقاب کئے، علمی و مذہبی مباحث پر لکھا، ادبی و لسانی مسائل پر بحث و تنقید کی، مختلف اعتراضات کے جواب دیئے، تاریخی گتھیوں کو سلجھایا، قومی و ملی مسائل پر اظہارِ خیال کیا، مسلمانوں کے علمی و تمدنی کارناموں کو اس طرح پیش کیا کہ اسلامی تاریخ علم و فن اور تہذیب و تمدن کا تماشاگاہ نظر آنے لگی، غرض اسلامی علوم و ادب کی ہر شاخ، اور ہر پہلو پر معلومات کا ایک دفتر جمع کر دیا، اور جس موضوع پر قلم اٹھایا، اس کو

مین جہازرانی کی ترقی کا ذکر ہے، اس کا آغاز حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد سے ہوا تھا، اور امیر معاویہ نے شام کی گورنری کے زمانہ مین بحر روم کے متعدد جزائر فتح کئے تھے، اور اسلامی بیڑے کو اتنا طاقتور بنا دیا تھا کہ ۳۱ھ مین جب قیصر روم نے چھ سو جہازون کے ساتھ شام کے سواحل پر حملہ کیا، تو اسلامی بیڑے نے اس کو نہایت فاش شکست دی، لیکن عربون کی بحری ترقی کا اصل زمانہ اموی عہد ہے، اس زمانہ مین بحر روم اسلامی بیڑے کی ترک وتاز کا جولانگاہ بن گیا، اور مسلمانون نے چند دنون کے اندر سسلی اور اسپین کا پورا جزیرہ اور اٹلی کے بعض حصے فتح کر لئے، اور یہ لوگ فرانس تک بڑھتے چلے گئے،

ان فتوحات کے سلسلہ مین مختلف حیثیتون سے جہازرانی کو بڑی ترقی ہوئی، اور امویون کا بحری بیڑا زمانہ کا سب سے زیادہ طاقتور بن گیا، اس کے بعد بنی عباس کے زمانہ مین اگرچہ مشرقی خلافت مین بحری سرگرمی کم ہوگئی تھی مگر مغرب مین بنی امیہ اندلس اور فاطمیہ مصر کے یہان اس کا سلسلہ برابر جاری رہا، اور عباسیون کے عہد مین علمی و فنی حیثیت سے جہازرانی کو بڑی ترقی ہوئی، اس لئے ان دونون زمانون کی ترقی کا حال کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھا گیا ہے، اور اس سلسلہ مین عرب اور عراق کی بندرگاہون کا بھی ذکر کیا گیا ہے، اس کے بعد مشرقی ملکون مین عربون کی تجارت کے حالات ہین، اور اس سلسلہ مین مغربی ہند کی بندرگاہون سے لیکر سیلون، برہما، جاوا، سماٹرا، وغیرہ جزائر شرق الہند اور چین تک کی بندرگاہون، یہان عربون کی تجارت اور اُن کے اثرات کی تفصیل ہے، پھر افریقہ کے سواحل یعنی بحر روم کے جزائر، اس کے ساحلی ملکون سسلی، اسپین، مصر، شمالی افریقہ مین عربون کی جہازرانی اور اس کی بندرگاہون کے حالات ہین،

پھر بحر پیمائی اور فن جہازرانی کے متعلقات مین عربون کے علمی کارنامون، اور ان کے ایجادات و مکتشفات کا ذکر ہے، اور اس سلسلہ مین سمندرون کے بارہ مین عربون کے علم، ان کی پیمائش، بحر ہرکند سے ان کی واقفیت، عرب جہازرانون کی تحقیقات، بحر محیط، (اٹلانٹک) کے جزائر مین انگلینڈ، آئرلینڈ، دوبارہ انگلستان، جزائر فرجونیس، آئرلینڈ) بحر چین، بحر الکاہل مین جاوا، سماترا، جاپان، فلپائن، ڈگاسکر اور کمورو سے ان کی واقفیت

(نظر) قضاۃ، مسلمانانِ ہند کا شرعی نظام،

ہندوؤن کی علمی و تعلیمی ترقی مسلمانون کے عہد حکومت مین، مرہٹون کا فوجی نظام، عہدِ اسلام مین تعلیم
(مسلمانون) کی درسگاہین، ہندوستان مین اسلام کی اشاعت کیونکر ہوئی، ہندوستان مین علمِ حدیث، مسلمان حکماء
(اور) یونانی فلاسفہ، نظام اور اُس کا فلسفہ، لاہور کا ایک فلکی آلات ساز خاندان، عربون کی بحری تصنیفات
(محمد) بن تغلق کی چند من گھڑت کہانیان، برمک اور پرمکھ، واقدی پھر واقدی، اصولِ تمہید، ہندوستانی
کی ملیت اور اس کے کچھ اصول، حجاز کے کتب خانے، انڈیا آفس لائبریری مین اردو کا ذخیرہ،

ان مضامین کے علاوہ ان مقالات کی بھی خاصی تعداد ہے، جو مختلف علمی مجالس مین پڑھے گئے، اور معارف
مین شائع ہوئے، اس قسم کے بیشتر مقالات مضامین سے زیادہ اہم ہین، چنانچہ اُن کی متعدد اہم کتابین مثلاً عرب
و ہند کے تعلقات، خطباتِ مدراس، خیام اور عربون کی جہازرانی اصل مین مقالات ہی تھے، جو ترمیم و اضافے
کے بعد کتابی شکل مین شائع ہوئے، ان مین حسب ذیل مقالات زیادہ اہم ہین، مسلمانون کی آئندہ تعلیم، یہ مقالہ
جامعہ ملیہ مین پڑھا گیا، تاج محل اور لال قلعہ کے معمار، اور قنوج، ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور کے دو مختلف
اجلاسون مین پڑھے گئے، اردو کیونکر پیدا ہوئی، ناگری پرچارنی سبھا کے لئے لکھا گیا تھا، ابو البرکات بغدادی
اور اس کی کتاب المجرد، دائرۃ المعارف حیدرآباد مین عربی مین پڑھا گیا تھا، اور اس کا اردو ترجمہ معارف مین
شائع ہوا، عرب اور امریکہ، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک اجلاس مین پڑھا گیا تھا، اس کے علاوہ اور بھی مقالات
ہین، مگر ان سب کا استقصا مقصود نہین،

انھون نے مجلس خلافت، جمعیۃ علماے ہند، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور،
ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد، دائرۃ المعارف حیدرآباد، آل انڈیا ہسٹری کانگریس وغیرہ مختلف علمی و دینی مجالس
کے اجلاسون اور قومی و ملی کانفرنسون کی صدارت کی، اور ان مین صدارتی خطبے پڑھے، ان مین سے جو خطبات تحریری
تھے، وہ معارف مین شائع ہوئے، اس لئے وہ محفوظ ہین، وہ جملہ امور و مسائل پر (خواہ وہ علمی ہون یا)

اس تحقیق وجامعیت کے ساتھ لکھا کہ پھر اس پر اضافہ کی گنجایش نہ چھوڑی،

صرف ایک موضوع اردو زبان وادب پر ان کے مضامین کی تعداد اتنی ہے کہ ان کا مجموعہ کئی سو صفحات مین نقوش سلیمانی کے نام سے شائع ہوا ہے، اس سے اُن کے دوسرے مضامین کی تعداد کا قیاس کیا جاسکتا ہو اگر ان سب کو جمع کیا جائے، تو ان کا مجموعہ کئی جلدون مین آئے گا، ان مین سے بعض مضامین اتنے طویل ہین کہ مستقل رسالون کی شکل مین شائع ہوئے، مثلاً رسالۂ اہل سنت والجماعت، بہادر خواتین اسلام، حیات مالک، اور خلافت اسلامیہ اور دنیائے اسلام، ان سب مضامین پر تبصرہ کے لئے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہو، اگر صرف ان کے نامون کی فہرست لکھی جائے، تو بھی کئی صفحون مین آئے گی، اس لئے مختلف موضوع ومسائل سے متعلق ذیل مین کچھ مضامین کا نام لکھا جاتا ہے، اس سے ان کی نوعیت اور اُن کے تنوع کا اندازہ ہوگا، مثلاً

محبت الٰہی اور اسلام، اسلام مین حیوانات کیساتھ سلوک، احکام القرآن، توکل صبر کا قرآنی مفہوم، مذہب کا قانونی حصہ، ارض مقدس کی داستان، ارض حرم، اور قرآنی احکام خلیل اللہ کی بشریت، ذبح عظیم، قربانی کا اقتصادی پہلو، فن تصوف اور محدثین وصوفیہ مین تطبیق کی راہ، لفظ اللہ کے معنی، اور اسم اعظم کا تخیل، اسلام و حرمت ربا، جبر وقدر، کیا خلقی معذورین کی پیدایش انصاف الٰہی کے خلاف ہے، اسلامی عقیدہ کے مطابق بچون کی پیدایش کے احوال کا اختلاف، امت مسلمہ کی بعثت تخلیق عالم کا مقصد، قرآن پاک کا تاریخی اعجاز، سنت، وحی، اور ملکۂ نبوت، کیا قرآن پاک انسانی ذہن ودماغ سے ماخوذ ہے، حکومت الٰہیہ، اور مسلمانون کا مطمح نظر،

اسلامی تہذیب وتمدن، مسلمان عورتون کے حقوق کا مسئلہ، اسلام اور زنان ہند، تحفظ حقوق زوجین، احادیث وسیر کی تحریری تدوین، اسماء الرجال کا قدیم ذخیرہ، خلفائے اسلام کا اقتدار، خلفائے راشدین کا طریق حکومت موجودہ ہندوستان مین کاشتکارون کے حقوق، سیاسیات اسلام کے نظریے، مسلمانان ہند کی مذہبی تنظیم، دنیائے اسلام مین ذہنی انقلاب، عالم اسلام کی تنظیم کا مسئلہ، نظم امت، اندراج نکاح وطلاق

ہے کی صحیح العقیدہ، لیکن بے عمل مسلمانوں کو باعمل، طالب دین کو دیندار اور دیندار کو متقی بنا دینا بہت آسان ہے، لیکن پڑھے لکھے جنون کو شیشہ میں اتارنا اور تعلیم یافتہ متشککین اور منکرین کو دین کی راہ پر لگانا، بہت دشوار ہے، اور یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس دشوار کام کو سب سے زیادہ سید سلیمان کی تحریروں نے انجام دیا، اور جو لوگ اپنے مذہب اور اپنی تہذیب کے نام سے شرماتے تھے، وہ اس پر فخر کرنے لگے، اور ان میں اس کا ذوق اور اس کی طلب پیدا ہو گئی، اس طرح سید سلیمان ندوی نے ہزاروں گم کردہ راہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کو راہ راست پر لگایا۔

ان کا ایک بڑا علمی کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے اسلامی علوم و فنون پر تحقیقات کا ایک ایسا ادارہ قائم کر دیا، اور اس کو اس درجہ تک پہنچا دیا کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری اسلامی دنیا میں اس کی شہرت ہے، اور اس کے کاموں کو عزت و وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، اور ان کی تربیت کردہ جماعت کے علاوہ ان کی تصانیف اور مضامین نے بہت سے تعلیم یافتہ مسلمانوں میں بھی سنجیدہ علمی و تحقیقی کاموں کا مذاق پیدا کر دیا، چنانچہ آج جن مسلمانوں میں بھی اس قسم کا ذوق نظر آتا ہے، اور ہندوستان میں جہاں بھی اس قسم کا کام ہو رہا ہے، اس میں سید سلیمان ندوی کی تصانیف کو بڑا دخل ہے، اس لئے وہ درحقیقت ایک علمی دور اور ایک خاص مکتب خیال کے بانی تھے، اور جب تک علمی دنیا قائم ہے، سید سلیمان کا یہ کارنامہ زندہ رہے گا۔

ان کا مزاج و مذاق اگرچہ ابتدا سے دینی تھا، اور ان کی کسی دور کی تحریریں بھی دینی روح سے خالی نہیں ہیں، لیکن عمر کے ساتھ ساتھ دین کا رنگ اور زیادہ گہرا ہوتا گیا، اور آخر میں وہ صبغۃ اللہ میں بالکل رنگ گئے تھے، و من احسن من اللہ صبغۃ، اور ان میں بڑا روحانی انقلاب ہو گیا تھا، اس دور میں ان کے خیالات میں بھی بڑا تغیر پیدا ہو گیا، اور ان کی تقریروں اور تحریروں کا رنگ بھی بدل گیا، یہاں تک کہ اپنے بعض پرانے خیالات اور تحریروں سے رجوع کیا، اور ان کے نزدیک ان کے قلم سے جو بھول چوک ہوئی تھی، اس کو "رجوع و اعتراف" کے نام سے معارف میں شائع کیا، یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے، اس کو بڑا آدمی ہی انجام دے سکتا تھا، اور یہ ان کی عظمت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

ہوں یا قومی و ملی ایک سوچی سمجھی ہوئی پختہ اور صائب رائے اور مستقل خیالات و نظریے رکھتے تھے اور ان کا علمی ذوق استناد چاہا ہوا اور ہمہ گیر تھا کہ ان کا کوئی خطبہ و تقریر بھی خواہ وہ کسی موضوع پر ہو افکار و نظریات اور علمی و تاریخی معلومات سے خالی نہ ہوتی تھی علمی مجالس اور علمی جلسوں کے خطبے معلومات کا خزانہ اور قومی و ملی کانفرنسوں اور جلسوں کے خطبات زیر بحث مسئلہ کے متعلق تفکر و تدبر فہم و بصیرت اور صحیح اور سلجھی ہوئی رائے کا درس ہوتے تھے، ان کا کوئی خطبہ بھی ان خصوصیات سے خالی نہیں ہے، علمی و تاریخی خطبات میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی پچاس سالہ جوبلی کے شعبۂ علوم و فنون اور اسی کانفرنس کے اجلاس کلکتہ کے شعبۂ اردو اور آل انڈیا ہسٹری کانگریس کے اجلاس مدراس کے شعبۂ تاریخ ہند از منۂ وسطی کے خاص طور سے خطبات صدارت علمی و تاریخی معلومات کا گنجینہ اور ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں، طب سے ان کو کوئی تعلق نہ تھا لیکن طبیہ اسکول پٹنہ کے جلسۂ تقسیم اسناد کا خطبۂ صدارت اسلامی طب کی پوری تاریخ ہے، ان خطبات کی بڑی تعداد ہے، مثالاً صرف چند خطبات کا تذکرہ کر دیا گیا۔

ان کے علاوہ ان کے شذرات بھی نہایت اہم ہوتے تھے، وہ تقریباً مختلف النوع وقتی امور و مسائل اور کبھی کبھی مستقل معاملات پر شذرات میں اظہار خیال کرتے تھے، اس لئے ان کے شذرات و مسائل و مباحث کے تنوع کی حیثیت سے دائرۃ المعارف کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ان سے گذشتہ تیس پینتیس سال کی قومی و ملی تحریکوں، مختلف خیالات و رجحانات اور دوسرے پیش آمدہ حالات و واقعات کی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے، اور ان کے متعلق مصنف کے خیالات معلوم کئے جا سکتے ہیں، ان کے شذرات غور و فکر، خیالات کی صحت و پختگی اور اصابت رائے کا نمونہ اور ایجاز و اختصار اور بلاغت کے لحاظ سے ادب و انشاء کا شاہکار ہیں،

مذکورۂ بالا تصانیف اور مضامین و خطبات کی فہرست پر سرسری نظر ڈالنے سے ان کی وسعت و دقت نظر، علمی جامعیت و ہمہ گیری کا کسی قدر اندازہ ہو جاتا ہے، اس دور میں وہ جامعیت علوم کی تنہا مثال تھے، ان میں ابن رشد و ابن خلدون، ابن تیمیہ و ابن قیم، غزالی و رازی شاہ ولی اللہ و مجدد سرہندی کے علمی جلووں کی جھلک یکجا نظر آتی تھی، اسی طرح ان کی تحریروں سے مسلمانوں کو جس قدر فیض پہنچا، اس کی مثال اس زمانہ میں کم

جیسی اہم کتاب بھی اسی زمانہ کی ہے۔ مکتوب فرنگ کے نام سے اپنے ان خطوط کا مجموعہ مرتب کیا، جو وفد خلافت کے سفر میں لندن سے اپنے احباب واعزہ کو لکھے تھے، یا رفتگان کے نام سے اُن کے لکھے ہوئے وفیات کا جو مجموعہ حال میں شائع ہوا ہے، اس کو بھی وہ ترتیب دے چکے تھے۔ معارف میں اُن کے جو مضامین شائع ہوئے تھے، اُن کی ترتیب بھی پیش نظر تھی، علمی مجالس کی شرکت بھی برابر جاری رہی، چنانچہ آل انڈیا ہسٹری کانگریس پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، انجمن ترقی اردو وغیرہ کے جلسوں کی صدارت اسی زمانہ میں کی اور ایسے خطبۂ صدارت پڑھے، اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ تصوف کی راہ میں آنے کے بعد انھوں نے علم کا کوچہ بالکل چھوڑ دیا تھا، یا اس کی کوئی اہمیت اُن کی نگاہ میں نہ رہ گئی تھی، اگر کسی خاص حالت میں ان کی زبان یا قلم سے کوئی ایسا فقرہ نکل گیا جس سے تصنیف و تالیف یا علمی کاموں کی بے وقعتی ظاہر ہوتی ہو، تو اس کو حقیقت پر محمول کرنا خود سمجھنے والوں کی خوش فہمی ہے، جو لوگ شطحیات صوفیہ تک کی تاویل کرتے ہیں، کم از کم ان سے تو اس کی توقع نہیں کی جا سکتی،

اس سلسلے میں ایک ذاتی واقعہ کا ذکر کرنا نامناسب نہ ہوگا، راہِ سلوک میں آنے کے بعد اکثر اپنے تلامذہ اور متوسلین کو بھی اس کی تلقین فرمایا کرتے تھے، ایک مرتبہ میں نے عرض کیا کہ آپ نے تو سارے کام ختم کرنے اور جو حاصل کرنا اور دوسروں کو دینا تھا، اس کو حاصل کرنے اور دوسروں تک پہنچانے کے بعد یہ راہ اختیار فرمائی ہے، اگر ہم خدام ابھی سے اس راہ پر لگ گئے تو ہمارا انجام کیا ہوگا، میرا اشارہ سمجھ کر فرمایا "میں یہ نہیں کہتا کہ علمی کام بے کار ہیں یا ان کی ضرورت نہیں رہی، یا اُن کو چھوڑ دیا جائے، بلکہ تالیف و تصنیف کا مقصد اور نقطۂ نظر بدل جانا چاہیے اور اس کے لئے خود اپنے میں تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت ہے، میں نے عرض کیا، اور ان خالص علمی کاموں کے متعلق کیا ارشاد ہے جس کے لئے کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے، اس کے جواب میں حسب عادت معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا شوق سے کیجئے، اس سے کون روکتا ہے، یہ بھی ایک کام ہے، اور اُن کی دلآویز مسکراہٹ پر بات ختم ہو گئی،

لیکن جو لوگ اُن کے سلوک و تصوف پر اعتراض کرتے ہیں، وہ بھی غلطی پر ہیں، ہر انسان پر دوسروں کے حقوق و فرائض کے ساتھ اپنے نفس کے بھی کچھ حقوق ہیں، اور دوسروں کی خدمت اور اصلاح و تکمیل کے ساتھ اپنی

اس روحانی انقلاب اور اس کے نتائج کے بارہ میں دو قسم کے خیالات ہیں ایک جماعت اس کو پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھتی، اور اس کو ان کی علمی عظمت کے منافی تصور کرتی ہے، اس میں اس کو ان کے علمی مرتبہ کا استخفاف نظر آتا ہے، دوسری جماعت اس انقلاب اور اس کے بعد ہی کی زندگی کو ان کا سب سے بڑا کارنامہ اور حاصل زندگی سمجھتی اور اس سے پہلے کے علمی کاموں کو ناقابل اعتنا تصور کرتی ہے یہ دونوں رائیں غلط اور افراط و تفریط پر مبنی ہیں ان دونوں زندگیوں میں کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ وہ ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں اور اس سے ان کا مرتبہ اور مقام اور زیادہ بلند ہو گیا، اس سے نہ ان کی علمی منزلت میں کوئی فرق آتا ہے، اور نہ ان کے علمی کاموں کی اہمیت گھٹتی ہے کہ ان کے علمی کاموں کا مقصد بھی دین و ملت اور اسلام و مسلمانوں کی خدمت تھا، اس لئے مذہبی حیثیت سے بھی ان کی اہمیت پہلے کی طرح قائم رہتی ہے، اور ان کے روحانی انقلاب کو اتنی اہمیت نہیں دی جا سکتی کہ اس کے مقابلہ میں ان کے علمی کارناموں پر پانی پھیر دیا جائے، یہ دونوں پہلو اپنی اپنی جگہ پر اہم ہیں، اور ایک کو بڑھانے کے لئے دوسری کی اہمیت نہیں گھٹائی جا سکتی، یہ کوئی غیر معمولی واقعہ یا نئی مثال نہیں ہے، اس قسم کے واقعات دوسرے اکابر اسلام کی زندگی میں بھی پیش آ چکے ہیں، امام غزالی مولانا روم حتی کہ امام رازی تک کو ان مراحل سے گزرنا پڑا، لیکن آج کون صاحب علم و نظر ان کے علمی کارناموں کی اہمیت کا انکار یا اس کی زندگی کے دونوں رخوں سے کسی کا استخفاف کر سکتا ہے، اس لئے اس سے سید صاحب کی بھی کسی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آتا،

درحقیقت یہ دونوں نقطۂ نظر غلط ہیں، نہ سید صاحب رحمۃ اللہ نے راہ سلوک اختیار کرنے کے بعد علمی کاموں کو چھوڑا، اور نہ ان کا یہ راہ اختیار کرنا کسی حیثیت سے بھی قابل اعتراض ہو سکتا ہے، ان کا مذاق ضرور بدل گیا تھا، لیکن علمی کاموں کا سلسلہ بدستور جاری رہا، انھوں نے بہت سے خالص علمی مضامین مثلاً ابوالبرکات بغدادی، اور اس کی کتاب المعتبر، ابن منصور کو سولی نہیں پھانسی دی گئی، عہد اسلامی میں تعلیم نسواں کی درسگاہیں، عدل جہانگیری کا ایک واقعہ، کیا مرزا بیدل عظیم آبادی شیعہ تھے، برکت اور برکھ، ملا خیر اللہ مہندس کے چند رسائل، قنوج، اور قومیت وغیرہ اس کے بعد لکھے، حیات شبلی

تاریخ ارض القرآن

کے متعلق

میرے ذاتی احساسات و تجربات

از

جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی

نفاظ یا ترتیب کے معمولی ردو بدل سے پیش رو مصنفین کی کتابوں کو نقل کر کرکے اپنی طرف منسوب کرلینا، شاید دنیا کی کتابی زبانوں کا یہ ایک ایسا عارضہ ہے، جو نہ کسی ملک کے ساتھ مخصوص ہے، اور نہ کسی فن اور نہ علم کی حد تک ۔ ودو نظر آئے گا، خصوصاً فصابی کتابوں کے ساتھ تجارتی اغراض جب سے وابستہ کر دیئے گئے ہیں، تو اس نے وبائی شکل اختیار کرلی ہے. شمار کرنے والے ان کتابوں کے لکھنے والوں کو مصنفین اور مولفین ہی کے نام شمار کرتے چلے آئے ہیں، اور آج بھی اُن لوگوں کو مصنف و مؤلف ہونے کی سند ملتی ہی چلی جارہی ہے، حالانکہ کے کلام (نظم یا نثر) کو بغیر کسی ردو بدل کے کوئی اپنی طرف اگر منسوب کرے، تو لگانے والے اب بھی اس پر علمی دزدکاری کا بے محابا الزام عائد کر دیتے ہیں، لیکن سوچا جائے تو پہلے اور دوسرے فریق میں عملاً و حقیقۃً کوئی فرق نہیں ہے.

لیکن تصنیف و تالیف ہی کے دائرہ میں کچھ ایسی ہستیاں بھی پیدا ہوتی رہتی ہیں جو کسی علم و فن کے کسی گوشہ کو اس وقت تک چھوتی بھی نہیں، جب تک کہ اس کے متعلق کوئی نیا پہلو تازہ زاویۂ نگاہ اُن کے سامنے

فکر بھی ضروری ہے، اس مین کوئی شبہہ نہین کہ سید صاحب نے جو علمی کام انجام دیئے، ان کا مقصد دین وملت کی خدمت تھا، اس لئے وہ بھی اُن کے اعمالِ حسنہ مین داخل ہین لیکن ان کا تعلق زیادہ تر دوسرون کی اصلاح سے تھا، اس فرض کی ادائگی اور اس کام کی تکمیل کے بعد اگر انھون نے اپنی فلاح وتکمیل کے لئے کوئی راستہ اختیار کیا تو اعتراض کی کونسی بات ہے، درحقیقت ایک مسلمان کی زندگی کے مراحل کی فطری ترتیب یہی ہے، اور اسوۂ نبوی بھی یہی ہے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد اگرچہ آپ کی زندگی کا کوئی لمحہ بھی تعلق مع اللہ اور رضائے الٰہی طلب سے خالی نہ تھا، اور آپ کی پوری زندگی اسلام کی تبلیغ، اسکی تعلیمات کی اشاعت، روے زمین پر حکومت قیام اور اس کے احکام کے نفاذ کی جدوجہد مین گذری مگر جب ان کامون سے فراغت اور دین کی تکمیل ہوگئی کے ساتھ تسبیح وتحمید اور توبہ واستغفار کا حکم ہوا، اور سورۂ فتح نازل ہوئی، اور جیسا کہ بخاری اور حدیث کی دو کتابون مین ہے، اس کے بعد آپ کا زیادہ وقت تسبیح وتہلیل مین بسر ہونے لگا، اس لئے سیرت نگار نبوی نے اسوۂ نبوی پر عمل کیا، اور ہر مسلمان کا یہی عمل ہونا چاہئے،

درحقیقت ان دونون زندگیون مین کوئی تضاد نہین ہے، بلکہ وہ ایک ہی تصویر کے دو رُخ، ایک ہی کے نقش ونگار اور ایک ہی گلدستہ کے مختلف رنگ و بو کے پھول ہین جن کے بغیر تصویر حیات کی تکمیل نہین اس لئے جو لوگ ان دونون پہلوؤن مین سے کسی کو بھی نظر انداز کرتے ہین، وہ خود ناآشنائے حقیقت ہین،

اس سلسلہ میں کتنے نئے پہلوؤں کا اضافہ فرمایا، بڑے بڑے مصنفین کی کتابوں میں بمشکل گنی چنی چند ہی نئی چیزیں ملتی ہیں، لیکن سید صاحب کی کتابوں میں قدم قدم پر نئے انکشافات اچھوتے معلومات سے پڑھنے والوں کا دامن بھرتا چلا جاتا ہے، یہی ان کی تصنیفات کی سب سے بڑی خصوصیت ہے، معارف کے سلیمان نمبر نکالنے کا ارادہ جب کیا گیا تو فقیر نے چاہا تھا کہ قرآن کے متعلق سید صاحب کی مشہور کتاب "تاریخ ارض القرآن" سے ان چیزوں کو پیش کرے، جن کے متعلق اپنا خیال یہی ہے کہ ایک خاص پہلو سے "قرآن فہمی" کے معیار میں فکری انقلاب پیدا ہو گیا ہے، اعتراف کیا جائے یا نہ کیا جائے لیکن شعوری یا غیر شعوری طور پر عوام ہی نہیں خواص کے فہمیدہ و سنجیدہ طبقات بھی سید صاحب کی اس نئی علمی کوشش اور اس کے نتائج سے اکثر و بیشتر متاثر ہوئے، میری خواہش تھی کہ سید صاحب کی اس جدید قرآنی خدمت پر سیر حاصل بحث کروں، لیکن ٹھیک ان ہی دنوں میں جب اس مقالہ کی تیاریوں میں مشغول تھا، بیمار ہو گیا، اور ایسا بیمار کہ پانچ چھ مہینے گذر چکے ہیں اس وقت تک لکھنے پڑھنے کی صلاحیت جیسی کہ چاہئے واپس نہیں ہوئی ہے، احباب دار المصنفین کا تقاضا ہوا کہ واقعی شہیدوں میں شریک ہونے کا موقع اگر نہیں ہے، تو خون ہی لگا کر شہیدوں میں شامل ہو جاؤ، اسی حکم کی تعمیل کر رہا ہوں،

واللہ ولی الامر والتوفیق،

سید صاحب مرحوم کی کتاب "تاریخ ارض القرآن اول سے آخر تک ایسے معلومات سے بھری ہوئی ہے جو کم از کم علماء کے لیے صرف یہی نہیں کہ نئے ہیں، بلکہ ان معلومات کی رہنمائی میں مطالعہ اور تحقیق کے ارباب ذوق اگر چاہیں تو اندازہ ہوگا کہ کافی مدد مل سکتی ہے، عرب کے جغرافیائی معلومات کے مصادر و مآخذ کی طویل فہرست اس کتاب میں درج ہے جن میں اسرائیلی و یونانی اور رومانی ادبیات، اور اکتشافات اثریہ کے سوا سید صاحب نے ادبیات اسلام کے ذیل میں جن مطبوعہ اور غیر مطبوعہ عربی زبان کی کتابوں کا ذکر کیا ہے، یہ ایک ایسی علمی فہرست ہے کہ ہمارے علماء جو انگریزی یا اسی قسم کی جدید عصری زبانوں سے ناواقف ہیں، وہ بھی "ادبیات اسلامیہ" کی ان کتابوں سے کافی حد تک مستفید ہو سکتے ہیں، یہ واقعہ ہے کہ سالہا سال کی

نہ آئے۔ سچ پوچھیے تو صحیح معنوں میں مصنف اور مؤلف قرار پانے کا قدرتی استحقاق ان ہی بزرگوں کو حاصل ہوا ورنہ دوسروں کی باتوں کا دہرانے والا اگر سارق نہیں تو ایک نقل نویس کاتب کے سوا اور بھی کچھ ہے، دنیا میں کتابوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ زیادہ تر انہی دزدانِ علم اور نقل نویسوں ہی کی وجہ سے ہوا ہے، اردو کی یہ داستان کافی ہے میں کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے سید علامہ مولینا سلیمان الندوی قدس اللہ سرہٗ جو اردو زبان کے اعظم المصنفین بجا طور پر سمجھے جاتے ہیں، اور انھوں نے اپنے بعد ہزار ہا ہزار صفحات کی شکل میں اپنی تالیفی یادگاریں چھوڑی ہیں آپ اُن کو پڑھ جائیے، سب سے بڑی خصوصیت سید صاحب مرحوم کے تصنیفات میں کم از کم اس فقیر کو تو یہی نظر آتی ہے کہ انھوں نے جو کچھ بھی ارقام فرمایا ہے، اس میں نئی بات، نئے معلومات پڑھنے والوں کو ملتے چلے جاتے ہیں یا کم از کم پہلے جو باتیں مجمل شکل میں تھیں، سید صاحب کی تحقیق و تدقیق نے ان ہی باتوں کو زیادہ مفصل اور زیادہ اُجاگر کر دیا ہے،

مرحوم غفر اللہ لہٗ دینیات و اسلامیات کے عالم تھے لیکن اسی کے ساتھ عربی فارسی، اردو زبانوں کے ادب کا بھی صاف ذوق رکھتے تھے، اسی لئے اُن کے عام علمی کارناموں کا تعلق اگرچہ اسلامیات و دینیات ہی سے ہے لیکن اسی کے ساتھ ادبیات کے متعلق کبھی کبھی اُن کو کچھ لکھنے کا موقع اگر مل گیا، تو اُس میں بھی انھوں نے ہمیشہ نئی راہیں پیدا کیں، اور ایسے اچھوتے نتائج اُن کی بدولت اس سلسلہ میں بھی دنیا کے سامنے آئے کہ ہر طرف مرحبا و آفرین کے ساتھ اُن کا استقبال کیا گیا،

قرآن و حدیث فقہ کلام و تصوف، اور سب سے زیادہ تاریخ اسلامی، اور ان سب کے سوا جس جس موضوع پر سید صاحب نے قلم اٹھایا ہے، اور اس سلسلہ میں نئے معلومات، یا نئے نقاط نظر سے دنیا کو انھوں نے روشناس کرایا بتانے والے اگر اُن کی فہرست بنائیں گے، تو میرا خیال ہے کہ اُن کی تعداد لاکھوں نہیں، تو ہزاروں تک ضرور پہنچ جائے گی یہ اُن کے سوانح نگار کا فرض ہے کہ اس مطمح نظر سے اُن کے تصانیف اور شائع کردہ مقالات مضامین کا جائزہ لے، دنیا کو حیرت ہوگی کہ کتنے قلیل عرصہ میں اس بندۂ خدا نے جدید معلومات از قسم علم

ان پر کہ عاد کسی خاص آدمی کا نام تھا منطبق نہیں ہو رہی تھی،

اسی لئے زیادہ وسیع النظری سے کام لینے والے بھی بجائے شخص کے "عاد" کو عرب کے کسی ناپید اشدہ مختصر قبیلہ کا عنوان قرار دیتے تھے لیکن سید مرحوم نے جب یہ اعلان کیا کہ

"عاد صرف کوئی محدود اور مختصر قبیلہ نہ تھا وہ ایک عظیم الشان قوم تھی، جو عرب ہی نہیں بلکہ دنیا کی قدیم ترین تہذیب کی بانی تھی،

اور یہ فرماتے ہوئے کہ عادی تہذیب و تمدن عرب ہی کے کسی خاص علاقہ تک محدود نہ تھا، سید صاحب نے ناقابل انکار مستحکم تاریخی و اثری شہادتوں سے یہ ثابت کیا کہ عاد جو قوم نوح کے بعد زمین کے خلیفہ ہوئے اور یہ کہ

"ایشیا، اور افریقہ کا کثیر حصہ اس کے (یعنی عاد کے) زور و قوت کا تماشا گاہ تھا،

(ص ۶۵ - ج ۱)

اور صرف ایشیا و افریقہ ہی نہیں، بلکہ سید صاحب نے یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ یورپ ہی کے بعض علاقوں یونان وکریٹ تک سے یورپ کے کسی قدیم تمدن کا جو نشان ملتا ہے، یہ سارے قصے اسی "عاد" سے تعلق رکھتے تھے اور نوح کے بعد زمین کے خلیفہ قرآن کے رو سے قرار پائے تھے،

انصاف سے کہئے کہ قرآنی آیت جس میں عاد کو خطاب کرکے ارشاد ہوا ہے،

واذکروا اذ جعلکم خلفاء من	اور یاد کرو (اے عاد کی قوم والو) جب
بعد قوم نوح	قوم نوح کے بعد خدا نے تم کو (زمین)
(الاعراف)	کی خلافت بخشی،

اس کا صحیح وزن سید مرحوم کے بیان و تحقیق کے بعد قلوب میں پیدا جو ہوتا ہے کیا یہی وزن وہ روایتیں پا سکتی ہیں جن میں زیادہ سے زیادہ اگر کچھ پتہ دیا گیا ہے تو وہ اسی قدر ہے کہ

کانت عاد ما بین الیمن الی الشام	یمن سے شام عاد والے چیونٹیوں کی طرح

کہ دکاوش تحقیق وجستجو کے بعد ہم جن کتابوں تک رسائی حاصل کر سکتے تھے، سید صاحب کی درج کردہ فہرست پر ہر ایک نظر معلومات کا یہ سارا ذخیرہ ہمارے سامنے اس طرح پر آجاتا ہے، کہ کتابوں کے مصنف سنین تصنیف مطبوعہ ہے یا غیر مطبوعہ، غیر مطبوعہ شکلوں میں ان کتابوں کے نسخے کہاں کہاں پائے جاتے ہیں، عموماً ان امور کے متعلق بھی کافی وشافی اشارے ملتے چلے جاتے ہیں،

اسی طرح تورات اور عہد عتیق وقدیم کا مطالعہ کس طریقہ سے کرنا چاہئے تورات کے سوا کتب قدیمہ ترگوم اور تالمود نامی کتابوں کی اسرائیلی دین میں کتنی اہمیت ہے، اور ان کتابوں کے مضامین کی نوعیت کیا ہے "تاریخ ارض القرآن" کے ابتدائی اوراق ہی میں یہ سارے قیمتی معلومات ایک ہی جگہ میں مل جاتے ہیں،

عرب اور اس کے جغرافیہ وتاریخ کے ساتھ یورپ کے ارباب تحقیق نے جن معلومات کو وقف عام کیا اور اُن سے غلط یا صحیح نتائج نکالنے کی سنجیدہ کوششیں کی ہیں، ایک بڑا قیمتی تبصرہ اس سلسلہ میں بھی آپ کو اس کتاب کے شروع ہی میں مل جائے گا، جو دلوں میں اس کا شوق پیدا کرتا ہے کہ غیروں کی دلچسپیوں کا حال جن کے ساتھ جب یہ ہے تو ہم مسلمانوں کا علمی فرض اس باب میں یقیناً اس سے کہیں زیادہ ہونا چاہئے،

بہر حال آپ اس کتاب کو پڑھتے چلے جائیے، کتاب پڑھنے سے پہلے آپ کے جو علمی احساسات اور معلومات تھے، میں یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ شعوری اور غیر شعوری طور پر اُن میں پائیں گے کہ ترمیم ہوتی چلی جاتی ہے، سید صاحب کے پیدا کئے ہوئے نتائج سے اتفاق واختلاف بجائے خود ایک الگ جداگانہ مسئلہ ہے، لیکن اُن کی کاوش وکوشش کی داد میں بخل میرے خیال میں صرف تنگ دلی ہی نہیں، بلکہ گونہ ایک قسم کی عقلی اور طبیعی سفاہت ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے،

دور کیوں جائیے، قرآن مجید کے لفظ "عاد" ہی کے متعلق میں پوچھتا ہوں انصاف سے دلوں پر ہاتھ رکھ کر کہئے کہ ہمارے علماء کا عام علمی احساس اُس کے متعلق کیا یہی نہیں تھا کہ عاد کسی غیر معمولی صفات رکھنے والی شخصیت کی تعبیر تھی، اگرچہ خود قرآن کی یہ تعبیر کہ "قوم نوح کے بعد عاد والے زمین کے خلیفہ بنائے گئے" دلوں کے اس عام

سے تھا، اسی زمانہ میں شام و فلسطین میں اسرائیلی تمدن برسرِ عروج تھا، اور عرب کے جنوبی حصہ میں سبائی تبع و حمیر وغیرہ نے اسی عہد میں امتیاز حاصل کیا تھا، الغرض یہ تہذیبیں بھی مقامی تھیں، اور ان کی اصلاح و تصحیح کے لئے بھی مقامی مصلحین خدا کی طرف سے جو اٹھتے رہے، وہ مقامی مصلحین تھے،

(۴) چوتھا دورِ انسانیت کی تاریخ کا وہ ہے، جب مختلف سیاسی و ذہنی عوامل و مؤثرات کے زیرِ اثر سارے مغربی ممالک میں قیصر نامی قوت کو اور سارے مشرقی علاقے میں کسریٰ نامی طاقت کو مرکزیت کا مقام حاصل ہو گیا، قیصر و کسریٰ کے مقبوضات کے درمیان عرب کی سرزمین ایک ایسی سرزمین تھی، جس پر نہ پورا اقتدار قیصر ہی کو حاصل تھا، اور نہ کسریٰ کو، یہی وہ زمانہ ہے کہ وسطِ عرب سے

اذا ھلک کسریٰ فلا کسریٰ بعدہ — جب کسریٰ ہلاک ہوگا تو پھر کسریٰ نہ ہوگا،

واذا ھلک قیصر فلا قیصر بعدہ، — اور قریب ہے وہ زمانہ بھی جب قیصر بھی ہلاک ہو جائے گا، پھر اس کے بعد قیصر نہ ہوگا،

کا عجیب نعرہ بلند ہوا جس نے مغرب و مشرق کے سارے قصوں ہی کو ختم کر دیا اور اسی کے بعد دنیا پانچویں دور میں داخل ہو گئی، اس وقت سے آج تک قدرتی کارفرمائیاں توحیدِ عالم کے نظریہ کو واقعہ کا قالب عطا کرتی چلی جا رہی ہیں، بے شمار خطوں اور اقلیموں میں بٹی ہوئی دنیا ایک ملک بلکہ شاید ایک شہر ایک بستی کی شکل اختیار کئے چلی جا رہی ہے، تاکہ معلوم ہو کہ ساری نسلِ انسانی ایک ہے، اس کا معبود و خدا ایک ہے، اس کی زندگی کا قدرتی آئین بھی ایک ہے، اس کی کتاب بھی ایک ہے، اس کا نبی بھی ایک ہے، اس کا کعبہ بھی ایک ہے، سارے مقامی خصوصیات حذف کر دیئے گئے، اور وہ حذف ہوتے چلے جا رہے ہیں، باہر سے زور لگانے والے اگرچہ ایک انسان ایک دنیا کو لاکھوں انسانی قسموں اور بیسیوں دنیاؤں میں تقسیم کرنے پر اپنا زور صرف کر رہے ہیں[1] لیکن قدرتی مشیت ظاہر

[1] ان کی مذبوحی حرکتوں کی یہ انتہا ہے کہ شام جیسے مختصر ملک کو انھوں نے جنگِ عظیم کے بعد لبنان، اسرائیل، فلسطین، شرق اردن، سوریہ پانچ پانچ مستقل علاقوں کی شکل میں بانٹ رکھا ہے، حالانکہ اس مختصر سرزمین کے باشندوں میں نہ

مثل الذر (ص ۹۶ ج ۳ در منثور) پھیلے ہوئے تھے،

ورنہ عام طور پر عاد و ثمود کے متعلق یہی سمجھا بھی جاتا ہے، اور کہا بھی جاتا ہے کہ

فیما بین عمان الی حضر موت عمان سے یمن کے اس علاقے تک محدود تھے،

بالیمن (درمنثور ص ۹۶ ج ۳) جسے حضر موت کہتے ہیں،

یمن دو سروں کے متعلق کیا کہوں سچی بات تو یہ ہے کہ نسلِ انسانی کی تاریخ کو نبوات و رسالات کی روشنی میں سب ادوار (پیریڈ) پر تقسیم کرنے کی ضرورت جامعہ عثمانیہ کے اسباق کے لئے خود فقیر کو ابتدا میں پیش آئی اور اس سلسلہ میں جیسا کہ میرا دستور تھا، ان پانچ دوروں پر بنی آدم کی تہذیبی و تمدنی اولوالعزمیوں کو تقسیم کرکے بیان کیا کرتا تھا یعنی

(۱) پہلا دور تو از آدم تا قوم نوح کا قرار دیتا تھا،

(۲) دوسرے دور کا نام اپنی اصطلاح میں میں نے دجلینیلی قدر رکھ چھوڑا تھا،

مقصد یہ تھا کہ ایک خاص علاقہ جو دریائے دجلہ اور دریائے نیل کے درمیان محدود تھا، اسی کے مقامات میں عمران وارتقاء کا ظہور ہوتا رہا، کبھی اس کی ابتدا جنوبی عرب سے ہوئی کبھی شمالی عرب سے کبھی ارض بابل نینوہ سے انسانی تہذیب و تمدن نے سر اٹھایا، اور کبھی دریائے نیل کے کنارے اس کے ہنگامے برپا ہوئے اسی دور میں عاد و ثمود اور اُن کے انبیاء ھود و صالح (علیہما السلام) اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اور نمرودی تمدن، آخر میں موسیٰ علیہ السلام اور فرعونی تہذیب کے مقابلہ پر اس دور کی داستان ختم ہوجاتی

(۳) تیسرا دور میرے خیال کے مطابق تاریخ انسانی کا وہ تھا جب پرانی دنیا کے مشرقی و مغربی شمالی و جنوبی علاقوں میں بنی آدم کی کافی تعداد آباد نظر آتی ہے، اور ہر خطہ کے باشندے اپنے اپنے احوال اور امکانات کے مطابق اپنی اپنی تہذیب و تمدن کی تعمیر میں اس طور پر مصروف و مشغول ہیں کہ دوسرے علاقوں سے ان کا کوئی قوی رشتہ قائم نہ ہوا تھا، چین، ہند، ایران، یونان، روم وغیرہ اقلیموں کی تمدنی تاریخ کا تعلق اسی دور

وباغبانی ہی نہین بلکہ آب پاشی کے عام ذرائع خصوصاً دریاؤن کو کاٹ کر نہرون کا انتظام بھی قائم کرچکی تھی، ایسے جانور اور مویشی جنھین عربی مین الانعام کہتے ہین یعنی اونٹ، گائے، بیل، بھیڑ، بکریون کو لوگ پالتو بنا کر ان کے مناسب حال کام لینے لگے تھے، بلکہ قرآن کے ایسے الفاظ یعنی ثیاب دوسر کا ترجمہ اگر دہی کیا جائے، جو لغۃً اُن سے سمجھا جاتا ہے تو کہا جاسکتا ہے کہ جامہ بافی (حیاکت) آہنگری جیسی صنعتون کا رواج بھی اس عہد تک ہوچکا تھا، بلکہ جب تک یہ تسلیم نہ کیا جائے کہ نجاری کا فن عہد نوح تک کافی ارتقائی مراتب طے کرچکا تھا، اس وقت تک سفینۂ نوح اور جن کاریگرون سے اس مین کام لیا گیا ہم اس کی توجیہ نہین کرسکتے۔ اسی طرح چھوت چھات، یا جات پات کی طبقاتی تقسیم کا سراغ بھی قصۂ نوح مین ملتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ تک اس مسئلہ مین اتنی قوت حاصل ہوچکی تھی کہ حضرت نوحؑ کے انکار کی ایک وجہ اُن کی قوم کی طرف سے یہ بھی بتائی گئی تھی کہ تمہارا ساتھ اراذل (یا اچھوت پنچ طبقات) نے دے رکھا ہے، یہی نہین بلکہ اسی سلسلہ مین حضرت نوح علیہ السلام کے دعوی نبوت کی تنقیح کرتے ہوئے جو باتین اس قوم کی طرف سے پیش ہوتی تھین ہم ان پر جب غور کرتے ہین، تو پتہ چلتا ہے کہ احتجاج کیئے، یا ایڈوکیسی کی مشق مین یہ قوم کہان تک ترقی کرچکی تھی کہ سورۂ المومنون کے ان الفاظ پر غور کیجیے فرمایا گیا ہے، کہ

قال الذین کفروا من قومہ ما	نوح کا جنھون نے انکار کیا تھا وہ بولے کہ
ھذا الا بشر مثلکم، یرید ان	نہین ہے یہ ایک آدمی تم ہی جیسا، چاہتا
یتفضل علیکم ولو شاء اللہ	ہے کہ تم پر بڑائی حاصل کرے، خدا چاہتا
لانزل ملائکۃ ماسمعنا	تو فرشتون کو اتارتا، ہم نے پچھلے گذشتہ
بھذا فی اٰبائنا الاولین ان	باپ دادون مین یہ بات سنی نہین ہے

(بقیہ حاشیہ ص ۲۲۲) جس کے معنی کپڑا ہین، اسی طرح سورۃ القمر مین سفینۂ نوح کے متعلق ذات الواح دوسر کے الفاظ پائے جاتے ہین، دوسر کی تفسیر سمار کے لفظ سے کی گئی ہے، ترجمہ جس کا میخ اچھی ہے۔

کا ارادہ انسان کا ارادہ نہیں کرسکتا تقسیم و تجزی کی آگ لگانے والے ہی توحید عالم کے ذرائع فراہم کرتے چلے جارہے ہیں، تخریب ہی والوں سے توحید عالم کی تعمیر کا کام لیا جارہا ہے، اور لیا جاتا رہے گا،

حتیٰ یکون الدین کلہ للہ ، تاآنکہ دین صرف اللہ (خالق عالم) ہی کے ساتھ وابستہ ہوکر رہ جائے،

باوجود انتہائی اختصار پسندی اور اجمال کے بیچ کا یہ جملہ معترضہ کافی طویل ہوگیا، اقرار یہ کرنا چاہتا تھا کہ انسانی تاریخ کے ان پنجگانہ ادوار کی ترتیب کے سلسلہ میں مجھے اس کا اعتراف کرنا چاہئے کہ کم از کم وجنہیں ... والے دوسرے دور کے متعلق معلومات کی فراہمی میں بہت زیادہ مدد مجھے سید مرحوم کی اسی کتاب تاریخ ارض القرآن ہی سے اس وقت ملی تھی، جب آج سے تیس پینتیس سال پہلے دروس عثمانی کو پہلی دفعہ مرتب کرنے کا ... میرے سامنے پیش آیا تھا،

خلاصہ یہی کہ نسل انسانی کے مذکورۂ بالا ادوار و قرون میں سے سید مرحوم کی کتاب تاریخ ارض القرآن میں مجھے دوسرے دور کے متعلق تاریخی اور تاریخی سے زیادہ اثری اکتشافات سے مدد ملی تھی، بلکہ اسی سے یہ سمجھ میں بھی آیا کہ قرآن بذات خود گو کوئی تاریخی کتاب نہیں ہے، اور جن قصص کا تذکرہ اس کتاب میں بھی کیا گیا ہے اصلی مقصود سب موعظت و بصیرت کا درس ہی ہے، تاہم اسی کے ساتھ انسانی تاریخ کے اس حصہ کو جسے لوگ بھول جانے والے تھے، خاص انداز اور طریقہ سے اس حصہ کو قرآن میں محفوظ کردیا گیا ہے، اور اس کی مصلحت سمجھ میں آئی کہ پہلے اور دوسرے دور کے متعلق قرآن نے نسبتہً زیادہ تفصیل سے کیوں کام لیا، اور کیسی تفصیل؟ کہ قوم نوحؑ کے متعلق آج کوئی چاہے تو قرآن سے ان تاریخی نتیجوں کو پیدا کرسکتا ہے، مثلاً یہ کہ ...

بقیہ حاشیہ ۲۲۱) زبان ہی کا اختلاف تھا، نہ رنگ کا، نہ نسل کا، حتیٰ کہ مذہبی حیثیت سے بھی اکثریت کا دین ایک ہی تھا، لیکن باایں ہمہ انتہائی بے شرمیوں سے کام لے کر اس غریب علاقے کی تکابوٹی کردی گئی،

سلہ سورۂ نوح میں اسی قوم کی طرف واستغشوا ثیابھم کے الفاظ منسوب کئے گئے ہیں، ثیاب ثوب کی جمع

یا قوم نوح، اسی طرح دورِ ثانی یعنی عاد و ثمود، ہود و صالح علیہما السلام کی مخاطب قومون یا ابراہیم و موسیٰ علیہما السلام نے جن لوگون مین کام کیا، اپنی خاص اصطلاح مین جس تمدن و تہذیب کا نام مین نے "جنینی تمدن" رکھدیا ہے، اس کے بعض پہلوؤن کے متعلق معلومات کا جو ذخیرہ قرآن مین محفوظ کردیا گیا ہے، شاید ان دونون ادوار کے متعلق اُن کے معلومات قرآن کے سوا اور کسی ذریعہ سے ہم حاصل نہین کرسکتے، سید مرحوم کو خدا جزائے خیر دے کہ ان قرآنی قصص کے متعلق یورپ نے شکوک و شبہات کے جو گرد و غبار اچھالے تھے، خود ان ہی کے طریقہ تحقیق سے اُن کے صاف کرنے کی ایک ایسی راہ کھول دی ہے کہ کام کرنے والے چاہین تو اس سلسلہ مین بہت کچھ کام کرسکتے ہین، اپنی اثریاتی حفریاتی جد و جہد سے یورپ و امریکہ والے ایسے نئے نئے اکتشافات دنیا کے سامنے لارہے ہین جن سے قرآنی بیانات کی قدر و قیمت روز بروز بڑھتی چلی جارہی ہے۔

بہرحال اپنی تاریخ کے جس حصہ کو یعنی دور اول و ثانی جسے لوگ عموماً بھول جانے والے تھے، اسی کے متعلق قرآن مین نسبتاً جو زیادہ تفصیل پائی جاتی ہے، اور ان کے سوا تیسرے دور جس مین دنیا کے اکثر حصون مین مقامی تمدنون کا ظہور ہوا، اس کے متعلق بجز اس قسم کے اجمالی اشارون کے کہ "زمین مین چلو پھرو، ان کے آثار تم پر واضح ہون گے" یا قرآن کی پہلی مخاطب قوم عرب کو اجمالی لفظون مین اطلاع دی گئی ہے کہ دنیا کی تعمیر و ارتقاء کا کام تم سے بہت زیادہ بہتر طریقہ پر دوسری قومین انجام دے چکی ہین، اور ان کی اصلاح کے لئے ڈرانے والے ہر آبادی مین چونکانے والے (نذیر) گذرتے رہے، اسی طرح چوتھا دور جس مین دنیا قیصریت و کسرویت کی مغربی و مشرقی قوتون کے ساتھ بلاواسطہ یا بالواسطہ وابستہ ہوگئی تھی، اس کے متعلق بہت اِدم کا ابتدائی حصون مین حد سے زیادہ اجمالی اشارہ کرکے قرآن جو گذر گیا ہے، تو بظاہر اس کی مصلحت غالباً یہی نظر آتی ہے کہ دونون پچھلے ادوار سوم و چہارم کی حالت اول اور دوم ادوار کی جیسی نہ تھی، بلکہ ہر ملک اور ہر قوم

(بقیہ حاشیہ ص ۲۵۴) یا اصنام کی شکل مین انھون نے ڈھال لیا تھا اور ہر شہر قصبہ گاؤن مین انھی بتون کو نمایان مقامات پر گاڑ کر قوم کو وہ زندگی کا درس دیتے تھے، تفصیل کے لئے معلومات کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

هو الا رجل بہ جنۃ فتربصوا بہ — مگر ایک آدمی جس پر جنون کا اثر ہے پس

حتی حین، — انتظار کرو کچھ دن کے لئے،

بجائے ایک دلیل کے آپ دیکھ رہے ہیں، پانچ پانچ باتیں اپنے انکار کی توجیہ میں اُن کی طرف سے پیش ہو رہی ہیں، یعنی وحی کے ایک جدید علمی ذریعہ کا دعویٰ اس لئے صحیح نہیں ہے کہ نوح ہم ہی جیسا ایک آدمی ہے احساس و ادراک کی جو قوتیں عام انسانوں میں مشترک ہیں، کوئی وجہ نہیں کہ نیا حاسہ اس میں پیدا ہوا ہو، پھر اس جدید حاسہ کا دعویٰ اُس نے کیوں کیا؟ اس کا جواب دیتے کہ بڑے بننے کی خواہش بھی اندرونی محرک ہے جس نے اس دعویٰ پر اس کو آمادہ کیا ہے، باقی یہ خیال کہ خدا نے اپنے بندوں کی اصلاح کے لئے اس شخص کو اس قدر علمی ذریعہ سے سرفراز فرمایا ہے، اس کا جواب دیتے کہ خدا کے لئے اس سے زیادہ آسان یہ تھا کہ اپنے کسی فرشتہ کو ہم میں بھیج دیتا، جسے عوام و خواص بآسانی تسلیم کر لیتے، آخر میں تاریخی شہادت یہ پیش کرتے کہ ہماری گذشتہ تاریخ میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی، یعنی کسی نے وحی و نبوت کا دعویٰ کیا ہو، آخر میں کہتے کہ دماغی توازن اس شخص کا کچھ بگڑ گیا ہے، جو خود بخود رفتار زمانہ کے ساتھ درست ہو جائے گا،[لہ]

اور یہ تو میں نے چند اجمالی اشارے کئے ہیں، ورنہ قرآن میں انسانی تاریخ کے دور اول یعنی از آدم تا

لہ میں نے مختصر لفظوں میں قوم نوح کے پیش کردہ نقاط کا ذکر کر دیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ غور کرنے سے ہر نقطہ و بحث سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی منطقی اور استدلالی قابلیت کافی ترقی یافتہ ہو چکی تھی، آج بھی وحی و نبوت کے مخالفین جو باتیں بناتے ہیں، شاید وہ اسی قسم کی ہیں، اس زمانہ میں قوموں کا ایک دستور یہ بھی ہے کہ اپنی قومی زندگی کی جوہری بنیادوں کا خلاصہ چند الفاظ میں کر لیتے ہیں، مثلاً اخوت، مساوات، عدالت، پھر ان لفظوں کو معبود بنا کر ساری قوم کو اُن کے آگے جھکنے کا حکم دیتے ہیں، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قوم نوح میں ود (محبت ۔۔۔۔) سواع (دنت اور اس کی قدر و قیمت) یغوث (باہمی امداد میں ایک دوسرے کی فریادرسی) یعوق (دفاعی قوتوں کی تعمیر) نسر (کوئی خاص موسم جب بنا نسر میں ستارہ آ جاتا تھا) ان پانچ دیوتاؤں کی عبادت کا مطلب یہی تھا کہ اپنی قومیت کی صفاتی بنیادوں کو معبود

مجلہ لقمان" کے نام سے عرب مین عام طور پر مشہور تھی، جس کا مطلب یہی ہوا کہ قرآن نے جیسے تورات و انجیل وغیرہ کی سچائیون کو اپنے اندر محفوظ کر دیا ہے، اسی طرح سورہ لقمان کی وہ باتین جن کا لقمانی حکمت کے نام سے قرآن مین تذکرہ کیا گیا ہے، یہودی شریعت کی غیر فانی صداقتون سے تعلق رکھنے والی باتین ہین، گویا قرآنی دعوی "مصدقا لما بین یدیہ" ہی کی ایک شکل لقمانی حکمت بھی ہے،

اس مین شک نہین کہ اس سلسلہ مین سید صاحب کے بعض دعاوی دلائل کے لحاظ سے اب بھی محل غور و تحقیق مین لیکن کہنے والون نے جیسا کہ کہا ہے سوال اور جواب علم ان ہی دونون باتون کے مجموعہ کی تعبیر ہے، ہر علم اور فن مین سوال اٹھانے والے علم کے نصف حصہ کے حقدار ہوتے ہین، خواہ اُن کے پیش کردہ جوابون سے لوگون کو اختلاف ہی کیون نہ ہو، یہی بات سید صاحب مرحوم کے متعلق مین کہنا چاہتا ہون، انھون نے قرآن کے ایک خاص پہلو کو اپنی اس کتاب مین تلاش و تحقیق کے لئے پیش کیا ہے، ان کا دعویٰ یہی ہے، فرماتے ہین کہ

"تیرہ سو برس مین ایک کتاب بھی مخصوص اس فن مین نہین لکھی گئی" (ص ۳ ج ۱)

اس سلسلہ مین اُن کے جوابون سے ممکن ہے، اختلاف کیا جائے لیکن سوالات کے پیدا کرنے والے یقیناً وہی قرار پائین گے، انھون نے علم سے دین کی خدمت کی ایک نئی راہ نکالی، امید ہے کہ آیندہ اس پر کام کرنیوالون کے اجر مین اُن کا بھی حصہ ہوگا،

سید صاحب نے جس زمانہ مین اپنی یہ کتاب مرتب کی تھی، جیسا کہ جاننے والے جانتے ہین اُن پر عقلیت پسندی ہی کا زیادہ اثر تھا، اور شاید اسی کا نتیجہ ہو کہ بعض مواقع پر مثلاً حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کی پیدایش کے سلسلے مین چٹان سے نکلنے کے واقعہ کا جو انھون نے صاف لفظون مین انکار کیا ہے[1] غالباً یہ اُن کی عقلیت پسندی کی یادگار ہے، لیکن با این ہمہ حیرت ہوتی ہے کہ اسی زمانہ مین سد مأرب کا تذکرہ کرتے ہوئے سر سید احمد خان کی تفسیر کے متعلق اُن کے قلم سے یہ الفاظ نکل پڑے ہین کہ

---

[1] دیکھو ارض القرآن ج ۱ ص ۱۹۰

اپنی تاریخ اور اپنی اثری یادگاروں کو اس طور پر قائم کر چکی تھی کہ با سانی اُن کے متعلق کافی معلومات عام تحقیقاتی ذرائع سے حاصل کئے جا سکتے تھے، اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کا بڑا حصہ آج ان کا مرتب شکل میں ہمارے سامنے موجود بھی ہے،

خیر میں بہت دور نکل گیا، کہنا یہ چاہتا تھا کہ سید مرحوم کی تاریخ ارض القرآن نے قرآنی مطالعہ کے متعلق ایک نئے زاویۂ نظر کو پیش کیا جس کا اعتراف قرآن کے ہر خادم کو کرنا چاہئے، انھوں نے صرف "عام انسانی تاریخ" کے سلسلہ میں نئی راہیں اسید و تلاش و تحقیق کرنے والوں کے لئے نہیں کھولی ہیں، بلکہ قرآن کی بعض جزئی شخصیتوں کے متعلق بعض ایسے اہم انکشافات پیش کئے ہیں جن کی روشنی میں اُن کی حیثیتوں اور اُن کی قدر و قیمت میں نمایاں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے، مثلاً لقمان نامی ایک شخص کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہو اور اُن کی طرف منسوب کر کے بعض قیمتی نصائح اس کتاب میں ملتے ہیں، اب ایک طرف سوچئے جو عام طور پر مشہور ہے کہ لقمان کسی عرب کے حبشی غلام تھے، اور دوسری طرف سید صاحب مرحوم کی اس تحقیق کو سامنے رکھئے جس کا حاصل یہ ہے کہ قوم عاد کے مادی عروج کے بعد جو زوال ہوا، اور اس کے بعد حضرت ہود علیہ السلام پر ایمان لانے کے بعد یہی قوم ہود کی شریعت کے مطابق" اسلامی تہذیب و تمدن" کے نظام کے قائم کرنے میں کامیاب ہوئی، اسی عہد کے ایک اولوالعزم حکمران لقمان تھے، سید مرحوم نے مختلف تاریخی شہادتوں سے اپنے دعویٰ کو ثابت کرتے ہوئے آخر میں عدن کے قریب حصن غراب نامی مقام کے کھنڈروں سے نکلے ہوئے اس کتبہ کو جسے ایک انگریز افسر ولٹد نے ۱۸۳۴ء میں برآمد کیا تھا اسی کتبہ کے اس فقرے سے یعنی

"ہم پر وہ بادشاہ حکومت کرتے ہیں، جو کمینہ خیالات سے بہت دور، اور شریروں کو سزا دینے والے تھے، ہود کی شریعت کے مطابق ہمارے واسطے پیدا ہوتے تھے، اچھے فیصلے ایک کتاب میں لکھے جاتے تھے،" (ص ۱۰۲ ج ۱ تاریخ ارض القرآن)

انھوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ کتاب جس میں فیصلوں کے نقل کرنے کا جو ذکر ہے یہی وہ کتاب ہے جو

"نقوش سلیمانی"

ادب و انشاء کی کچھ جھلکیان

از

جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی

"تو یہ کہئے کہ آپ امیر مینائی کی غزل گوئی کے قائل نہین صرف اُن کی فن دانی اور تحقیق لغت و زبان کے قائل ہین، اچھا ایک شعر سناتا ہون، ..... بتائیے کیسا ہے ......"

"اچھا اور بہت اچھا ہے"

"اور یہ شعر!!....."

"یہ بھی خوب ہی، سُبحان اللہ"

"اچھا اور یہ ...... اور یہ ...... لے اب کہان تک سنئے گا، یہ سارے شعر امیر ہی کے تھے"،

ذکر دسمبر ۱۹۱۳ء کا ہے آگرہ یا اردو والون کے شہر اکبرآباد مین محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ حسب معمول خوب ٹھاٹ سے ہو رہا ہے جلسہ مین میلہ کی دھوم دھام جشن شاہی کا تزک، و احتشام، خواص کا مجمع اور عوام کا اژدہام ملک کے گوشہ گوشہ سے پڑھا لکھا مسلمان کھنچا چلا آرہا ہے، مہمانون کے ایک خیمہ مین آخیر دسمبر کی ایک ٹھنڈی رات مین دو شخص آس پاس بیٹھے ہوئے وقت گذاری کے لئے شغل اردو شعر و شاعری سے کر رہے ہین؛

"سرسید نے اس سورہ کی جو تفسیر تہذیب الاخلاق مین لکھی تھی، اور جس سے اس واقعہ کے اعجوبہ پن کو دور کرنے کی کوشش کی تھی، وہ سرتا پا لغو اور اغلاط سے مملو ہے۔" (ص ۳۲۲)

اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصہ مین ہد ہد پرندے کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ لکھتے ہوئے کہ

"اس زمانہ کے بعض نطرت پرست کہتے ہین کہ مرغ کا بولنا، اور اس کی بولی سے مفہوم کا سمجھنا خلاف عقل ہے"،

سید مرحوم نے جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ

"جانورون کی عاقلیت کا مسئلہ مسلم ہوتا جاتا ہے، بندرون کی بولیون کی ابجد تیار کی جا رہی ہے تو ہدہد کے بولنے پر تعجب کیون ہو"

اسی کے ذیل مین یہ اضافہ بھی اُن کے قلم نے کیا ہے کہ

"اگر پرندون کا بولنا اب بھی کھٹکتا ہے تو فرض کر لو کہ نامہ بر کبوترون کی طرح تربیت یافتہ نامہ بر ہدہد ہوگا"

مگر اسی کے ساتھ اسی سلسلہ مین اُن کا یہ فرمانا کہ

"طیر کے معنی فوج لینا جیسا کہ مولوی چراغ علی نے لیا ہے، اسی طرح بے ثبوت ہے جس طرح سرسید کا سورۂ فیل کی تفسیر مین طیر سے خیال بدلینا،" (ص ۲۴۸)

یہی باتین اُن کی حقیقی دینی نطرت کی غمازی کر رہی ہین، اور خدا کا شکر ہے کہ اسی پر اُن کا خاتمہ بالخیر ہوا ثم العاقبة للتقوی

رتے ہوئے اس نے اُس کی زبان پکڑ لی، اُس نے اِس سے محاورہ کی سند مانگی، اِس نے اُس کے کلام مین ایطائے لی نکالا، اُس نے اس کے استادون تک کو پُن کے رکھدیا، انھون نے اُن پر سرقہ مضمون کا الزام رکھ کر اُن کی موتی سی عزت اُتار لی، انھون نے اِن کے شعر مین پہلوے ذم وفحش نکال کر اُن کی گردن ناپ دی، ——

یہ سید صاحب کا وطن خود ہی اردو شعر و سخن کے حق مین گلزار اور پھر سید صاحب کا لکھنؤ مین سالہا سال کا قیام رکسر رہی تھی پوری ہوگئی۔ سید صاحب اس چمن کے ایک چہکتے ہوئے بلبلِ خوشنوا خود بن گئے،

شاعر بھی تھے تخلص رمزی کرتے تھے، کبھی قطعہ کبھی رباعی کہتے، اور تفریحاً سر بزم سخن مین شاعری کرتے، جون ۱۹۱٦ء مین جب اس ہیچمدان کا عقد ہوا ہے، سید صاحب نے ازراہ محبت و یگانگت کئی کئی رباعیان فی البدیہہ موزون کردی تھین، صرف ایک یاد رہ گئی، آپ بھی سُن لیں،

لایا ہے پیام یہ خوشی کا قاصد — نوشاہ بنے ہین آج عبدالماجد
وہ روز سعید بھی خدا لائے جلد — بن جائین گے جب کسی کے والد ماجد

غزل بھی کبھی کبھی چوری چھپے کہہ لیتے، صرف دو چار شعر نمونہ کے حاضر ہین،

دل حریفِ نگہ یار کہان سے لاؤن — جو نہ بیخود ہو وہ میخوار کہان سے لاؤن
مدرسہ چھوڑا، خرابات مین آکر ٹھہرا — دوسرا سایۂ دیوار کہان سے لاؤن
توبہ توبہ، مری توبہ بھی ہے کوئی توبہ — ٹوٹ جائے جو نہ ہر بار کہان سے لاؤن

تشہیر کا باعث نہ ہو دامانِ قبا دیکھ — لائے نہ کہین رنگ یہ خونِ شہدا دیکھ
انکار تھا تجھکو مری تاثیر دعا سے — اب میری طرف دیکھ تو تاثیرِ دعا دیکھ
آزاد مکان سے ہو اُسے قیدِ مکان کیا — گر آنکھ ہو بتخانہ مین بھی نورِ خدا دیکھ

یہ مضمون سید صاحب کی شاعری پر نہین، نثر پر ہے، اُن کی شاعری پر نقد و تبصرہ کے لئے ایک مستقل مقالہ درکار ہے، اور یہ منزل تو پھر بعد کی ہے، پہلے کوئی شاگرد ذرا تلاش و تفحص سے کام لے کر اُن کا سارا کلام

امیر کو داغ سے ٹکرا رہے ہیں، ایک کو گرا اور دوسرے کو چڑھا رہے ہیں، یہ شعر پہ شعر تابڑ توڑ سنانے والا ہے سیدی جا سلیمان ندوی، ۱۳۵۳ھ کا شیخ طریقت نہیں ۱۳۱۳ھ کا جوان عمر صاحب نظر و صاحب قلم، اور سُن سُن کر بلا بیت بازی مات کھا جانے والا ہے، ان سطور کا راقم آثم، پڑھا نہ لکھا، نام محمد فاضل! — سید صاحب سے ربط ایک مدت سے قائم تھا، اُن کے علم و فضل کا سکہ کئی سال سے دل پر بیٹھا ہوا، یہ کیا خبر تھی کہ ندوہ کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو سنبھالنے والا اور الہلال کو وقت کی ظلمتوں میں چمکانے والا، کلام امیر کا حافظ نکلے گا، مرآۃ الغیب[51] کا آئینہ بردار صنم خانۂ عشق[52] کا پرستار! یہ پہلی بار کھلا کہ یہ حضرت بہ این زہد و تقوی اردو شعر و سخن کے رسیا ہیں، اور اردو غزل و تشبیب کے متوالے!

سید صاحب کے فاضل اجل اور عالم بے بدل ہونے کا ایک زمانہ قائل ہے، دنیا کو مسلّم ہے کہ وہ فن تاریخ میں امام وقت تھے، اور سیرت نگاری میں اپنی نظیر آپ لیکن آخر تک کم ہی لوگوں نے اُن کے ادبی شعری (اور تنقیدی) مرتبہ کو جانا، اور کمتر ہی لوگوں نے انھیں ادیب انشا پرداز اور سخن سنج کی حیثیت سے پہچانا! — علم و ادب کی تاریخ میں ایسی ناشناسی اور کم شناسی کی مثالیں نہ معدوم ہیں نہ غیر معلوم،

اب آخر زمانہ میں تو اُن کا عام مطالعہ یوں بھی بہت گھٹ گیا تھا، بلکہ کہنا یہ چاہیے کہ سمٹ سمٹا کر صرف "دینیات" تک محدود رہ گیا تھا لیکن جب شوق مطالعہ جوان تھا، اور وہ خود بھی جوانی کے تھے، تو اردو کی غزلیات کیا معنی ہزلیات تک کا دفتر بے معنی و با معنی اُن کی انگلیوں کی نوک پر تھا، دیوان کے دیوان پڑھ ڈالے، کلیات پر کلیات ختم کر دیے اور "گلدستہ" کا تو اب لفظ بھی تشریح طلب ہو گیا ہے (اپنے وقت میں تازہ غزلوں کے ماہنامہ کو کہتے تھے) ایک زمانہ میں ان گلدستوں کی بہار تھی، لکھنؤ تو پھر لکھنؤ ہے، اور اور شہروں بلکہ قصبوں[53] تک میں اُن کے ورق، ورق گل کی طرح کھلے ہوئے اور سید صاحب تھے کہ ان کی خوشبوؤں میں بسے ہوئے پھر شاعروں کی باہمی نوک جھونک کے رسالے، اپنی بوقلمونیوں میں مولوی صاحبان کے مناظرانہ رسالوں سے

---

[51] امیر مینائی کا دیوان اوّل [52] ایضاً دیوان دوم [53] خیر آباد و نقیباً اور کاکوری غالباً،

ہاں تو سید صاحب اپنی زبان کے خزانۂ ادب میں تحقیق الفاظ کے نوادر کا اضافہ کرنے کے لئے کھڑے ہوئے ہیں، اور تمہید کے اس دُرِ بے بہا کے بعد یوں گہرافشاں ہیں:

"ہماری زبان کا ایک پامال لفظ "دام" ہے، ایک تو اس کے معنی قیمت کے ہیں، اور دوسرے معنی ایک معمولی سکہ کے ہیں جس کی ایک ذلیل ترین صورت ہماری زبان میں چھدام کی ہے، جو چھ اور دام دو لفظوں سے بنا ہے، اس لفظ کی تاریخ کے لیے ہم کو آج سے دو ہزار برس پہلے لوٹ جانا ہے، ایک زمانہ تھا کہ یونان کے کشورکشا اور سوداگر [illegible] ایشیا پر چھا گئے تھے، ان ملکوں میں یونانی حکم اور یونانی سکے چلتے تھے، اور ان کے یونانی نام زبانوں پر تھے.....

......یونان کے چاندی کے سب سے کم قیمت سکہ کا نام درخم تھا، اس نے عربی میں درہم اور فارسی میں بیچ سے ایک حرف گرا کر درم کی صورت اختیار کی، اور ہندوستان میں ایک حرف اور گرا کر، اور اس کی جگہ ایک لمبی (ا) بڑھا کر دام ہو گیا[1]، یہ لفظ جس طرح سکہ کو بتاتا تھا، سکہ کے وزن کو بھی بتاتا تھا، چنانچہ عربی طب میں دواؤں کا وزن درہم اور فارسی طب میں درم سے بتایا جاتا ہے، اسی لفظ نے جب فرنگستان کی ٹوپی پہنی تو ڈرام ہو گیا، جو ہمارے انگریزی طبی کالجوں، دواخانوں اور شفاخانوں میں ایک بیگانہ کی حیثیت سے وارد ہے، اور شاید ہی کوئی پہچانے بھی نہیں کہ دام اور ڈرام دونوں کی ایک ہی شخصیت ہے، صرف آب و ہوا، لہجہ اور شکل و صورت کا فرق ہو گیا ہے،

اکبر کے زمانہ میں دام چاندی کے سب سے چھوٹے سکہ کے بجائے تانبے کے سکہ کا نام تھا، اس کو پہلے پیسہ کہتے تھے اور اب بھی کہتے ہیں، یہ روپیہ کا چالیسواں حصہ تھا، پھر ایک دام کے پچیس حصے کرکے ہر حصہ کو جیتل کہتے تھے جس کو گنڈا کہتے ہیں، اکبر کے زمانہ میں بھی اس کا نام ملتا ہے، اسی تقسیم سے پورب کی زبان میں ایک محاورہ ہے ہر گاؤں یا ہر زمیندار کی ملکیت **۱۶ آنے فرض** کی جاتی ہے، اور یہ آنے پھر پائی اور دام پر بانٹے جاتے ہیں، ایک دام

---

[1] یہ عبارت نقل کرتے وقت درم و دام کی اس قرابت پر ایک ساتھی کو غالب کا یہ مصرعہ بے اختیار یاد پڑ گیا، "درم و دام اپنے پاس کہاں" یا اور فارسی کا چلا ہوا فقرہ، "دست درمے بھی"۔

یکجا تو کریں،

سید صاحب کی نثر پر اگر قلم اٹھائیے تو دیدہ و دل حیران، کہ شروع کہاں سے کیجئے، اور ختم کہاں پہنچ کر کھینچیے، سیرۃ النبیؐ کی ضخیم مجلدات سے لے کر خیام، خطبات مدراس اور رحمتِ عالم تک بڑی، منجھولی اور چھوٹی کتابوں تک کوئی بھی ایسی ہے، جہاں حضرت سلیمانؒ ایک خشک مولوی ملّا نظر معلوم ہوتے ہوں، اور صحت زبان و سلاست بیان نمایاں نہ ہو؟ شستگی، متانت، شرافت یہ تو اُن کے اسلوبِ تحریر کے جوہر اصلی ہیں، اور اس پر جا بجا شوخی ظرافت کی گلکاریاں، اور حسنِ صناعت کی سحر طرازیاں، جیسے خاتم سلیمانی میں نگین، اور مستقل تصنیفات کو چھوڑ معارف کے شذرات اور معارف اور دوسرے رسالوں کے مقالات سب کو یکجا کیجئے، تو صفحات کی تعداد سیکڑوں نہیں، ہزاروں تک پہونچے، اور مجموعہ کو تقسیم کیجئے، تو جلدوں پہ جلدیں کتابوں کی ڈھلتی اور نکلتی چلی آئیں ـــــ اتنے بڑے کام پر ہاتھ ڈالنا ہے بڑے جگر کا کام، اور ممکن اُسی کے لئے ہے، جو ایک چھوٹے سے مضمون لکھنا نہیں، پوری ایک کتاب کا تہیہ کرکے بیٹھے، اور فرصت دو چار دن کی نہیں، ایک مدت دراز کے لئے نکال رکھے، سلیمان عالی جاہ کے حدود مملکت کا جائزہ لینا ہرگز کم ہمتوں، کم فرصتوں، کوتاہ نظروں کا کام نہیں

"ہم اپنی زبان کے اس قیمتی سرمایہ کا آغاز سکون سے کرنا چاہتے ہیں، تاکہ لفظی دولت معنوں کی معنوی دولت کے لئے فالِ نیک بن سکے" (ص ۲۹۰)

یہ الفاظ سید صاحب کے ہیں، اور ایک مقالہ کی تمہید سے منقول ہیں، جو بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق کے عنوان سے ہندوستانی اکیڈمی یو۔پی کے سالانہ اجلاس الٰہ آباد میں ۱۹۳۲ء میں انھوں نے پڑھ کر سنایا تھا، اور بعد کو وہ اُن کے دوسرے خطبات، مقالات و مقدمات کے ساتھ مل کر اُن کے ادبی و علمی مضامین کے مجموعہ میں شائع ہوا ہے، مجموعہ کا نام نقوشِ سلیمانی ہے، اور یہ کتاب ۲۰ × ۲۶ کے سائز پر ۴۶۲ صفحہ پر ۱۹۴۰ء میں شائع ہو چکی ہے، کتاب کیا ہے سید صاحب کے کمالات ادبی و علمی کی ایک مہر زدہ دستاویز، آگے اقتباسات جو بھی ہوں گے، اسی کتاب سے ہوں گے۔

کے لئے دس لاکھ تنکہ وظیفہ مقرر ہوا۔ مصری خلیفہ کا سفیر جب سلطان محمد تغلق کے دربار میں آیا ہے اور جمعہ کے دن خلیفہ کا نام خطبہ مین پہلی دفعہ پڑھا گیا ہے تو چندین طبقہا پُر از تنکۂ زر و نقرہ بر آن نثار شد" (برنی ص ۴۹۲)

اس سے معلوم ہوا کہ اشرفی کے لئے اس زمانہ مین تنکۂ زر بولا جاتا تھا، خلجی کے زمانہ مین ایک تنکۂ زر ایک تولہ سونے کا ہوتا تھا اور تنکۂ نقرہ ایک تولہ چاندی کا (فرشتہ ص ۱۱۴) روپیہ کو تنکۂ نقرہ اور اس سے کم درجے کے سکہ کو صرف تنکہ کہتے تھے، یہ لفظ قدیم یادگار کے طور پر آج بھی بعض پرانے خاندانی مسلمانوں مین دین مہر کی تعیین مین بولا جاتا ہے، خیال ہوتا ہے کہ یہی تنکہ تو آج ٹکے کی صورت مین ہمارے سامنے نہین؟

دوسرا لفظ "مہر زر" ہے، اُس کو مہر اس لئے کہتے تھے کہ اس پر شاہی نقش ہوتا تھا، مُہر زر کی اصطلاح برنی مین ملتی ہے،

"سلطان محمد مُہر مس پیدا آورد و فرمان داد کہ مہر مس را خرید و فروخت چنانچہ مہر و زر و نقرہ جاری است" (ص ۵۰۴)

..... دکن مین طلائی سکہ کا نام ہون تھا، جو آخر مین مخفف ہو کر ہُن ہو گیا، اور آج ہماری زبان مین نہایت سے دولت کی کثرت کے معنی مین ہُن برسنا ایک یادگار رہ گیا ہے، روپیہ کا لفظ روپیہ سکہ پر شاہ کا چلایا ہوا ہے، (آئین اکبری ص ۱۸) اور عجب نہین کہ روپا سے بنا ہو، سونے کے سکہ کے لئے اشرفی لفظ ہندوستان مین نورالدین جہانگیر کے زمانہ مین استعمال مین آیا ہے، چنانچہ فرشتہ نے اپنی تاریخ مین حسن گنگوہی کے خزانہ پانے کی اتفاقی سرگذشت کے بیان مین لکھا ہے:-

"زنجیر را در گرہ دن ظرفے مملو از اشرفی طلائی و طلاے غیر مسکوک دید"

(فرشتہ۔ نولکشوری ص ۲۷۴)

..... مصر کے چرکسی بادشاہون مین ایک برسبائی تھا، اُس نے ۸۲۵ھ سے ۸۴۱ھ تک حکومت کی اس کا شاہی لقب الملک الاشرف تھا، یہی اشرف اشرفی کا مصدر و منبع ہے، مشہور عرب تاجر زن

کا آدھا ادھیلا اور ۱/۴ پاؤلہ اور ۱/۸ دمڑی کہلاتا ہے، اور یہ اخیر لفظ دام کی تصغیر یا تحقیر ہے، آئین اکبری کے مطابق ایک من تانبے میں ایک ہزار چوالیس درم (پیسے) تیار ہوتے تھے" (ص ۲۹۰ - ۲۹۱)"

سید علیہ الرحمۃ نے یقیناً فیلالوجی (لسانیات) پر کوئی تصنیف اپنی یادگار نہیں چھوڑی لیکن اس کے نمونہ سے اندازہ ہو گیا ہوگا، کہ انھیں فن لغت و اشتقاق الفاظ سے کتنی مناسبت تھی، اس میدان میں اپنا ذہن کہاں کہاں دوڑاتے رہتے، کن کن آسمانوں سے تارے توڑ توڑ کر لایا کرتے، اور خشک لغوی تحقیق کو کتنا شگفتہ بنا کر رکھتے —— اتنا پھیلاؤ تو آپ نے صرف ایک لفظ دام کی خاطر کیا، کتاب کا پورا ڈیڑھ صفحہ اسی کی نذر ہو گیا، قدر جب اس گھٹیا سکہ کی یہ ہوئی تو پھر اشرفی کی قیمت تو اس سے کہیں زائد ہے، اس کی وجہ تسمیہ کی کاوش میں تو جو کچھ پاپڑ نہ بیل ڈالے ہوں، بجا ہے، سنیئے اور کچھ دیر تک کان لگائے سنتے رہیے!

"دام اور قیراط جس طرح باہر سے آئے ہوئے نام ہیں، اسی طرح ہمارے سب سے قیمتی سکہ "اشرفی" کا نام بھی باہر سے آیا ہوا ہے، مجھے بہت دنوں سے اس کی اصلیت کی تلاش تھی، اور پتہ نہ چلنے پر دل کو یہ کہکر تسکین دے لی کہ چونکہ یہ طلائی سکہ سب سکوں میں اشرف ہے، اس لئے اشرفی کہلایا، مگر دفعۃً ایک غیر متوقع ماخذ سے اس کی اصلیت دریافت ہوئی، تو معلوم ہوا کہ سکہ اشرف نہ تھا، بلکہ جس بادشاہ کی طرف وہ منسوب ہے وہ اشرف تھا،

طلائی سکہ کے لئے سب سے پرانا نام دینار ہے، اور یہ بھی یونانی ہے مگر چونکہ عربوں میں یہ سکہ جاری تھا اس لئے انھوں نے عبدالملک کے زمانہ میں ۷۶ھ یا ۷۵ھ میں طلائی سکہ ڈھالا تو اس کا نام "دینار" ہی رہنے دیا جب اُن کے قدم ہندوستان پہنچے تو ان کا دینار بھی اُن کے ساتھ آیا، اور آج تک خاندانی مسلمانوں میں دین مہر کی تعداد میں سکہ رائج الوقت کے ساتھ چند دینار سرخ رسمی طور سے جاری ہے، تغلق کے زمانے میں ہم کو اشرفی کے لئے دو لفظ ملتے ہیں، ایک تنکہ زر، یہ تنکہ سکہ کے معنی میں عام طور سے بولا جاتا تھا اور اسی سے تنخواہوں کی تعیین ہوتی تھی، پیادہ کی ماہانہ تنخواہ ۴۸ تنکہ اور سوار کی ۵۰۰ تنکہ تھی، مخدوم زادہ بغداد

ایک دوسرے سے متصل بنا دیا ہے ——— دعویٰ پر دلیل! ملاحظہ ہو،

"ڈاک" کے مقابلہ "قمری" آیا ہے، بھلا ان دو اسموں میں کیا ربط، کیا تعلق ہو سکتا ہے، لغت "ڈاک" کے خاتمہ پر سنیے :-

"اگلے زمانہ میں مصر وغیرہ اور ہمارے ملک میں بھی جہانگیر نے ڈاک کے کبوتر اڑا دیئے تھے، اس نسبت سے ایک اڑتی سی بات کبوتر ہی سے ایک ملتے جلتے پرندے کی نسبت سن لیجیے"

دیکھا آپ نے ادب و انشا کے اس شہباز نے کس طرح ہنستے کھیلتے ڈاک کے تھیلے کی ڈوری قمری کے پر سے باندھ اس سے حق ہنر بڑھوا دیا! اسی ہلکے پھلکے انداز سے ربط "تیمیا" و "ڈاک" کے "نیرنگی" اور "قمر" کے، "ورق" اور "ہندسہ" کے درمیان قائم ملے گا، ——— اس ربط ضبط کی ساری داستان پڑھنا ہو تو اس کتاب کی طرف توجہ فرمائی جائے،

پھر یہ نہیں ہوا کہ یہ لسانیاتی کاوش اسی ایک لکچر پر ختم ہو گئی ہو، اس کی چاٹ جو پڑی تو مصرع طرح پر غزل کے بجائے دو غزلہ تیار ہو گیا، لکچر تو اکیڈمی میں سنایا گیا تھا، اس کا دوسرا نمبر اسی عنوان کے ساتھ خاص "معارف" کے لیے لکھا اور وہ ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا، اس میں الفاظ ذیل زیر بحث آئے،

ناشتہ[1]، نہار[2]، فلسفہ[3]، قاب[4]، رکابی[5]، قلیہ قورمہ[6]، شوربا[7]، شراب[8]، کباب[9]، قالین[10]، شاگرد پیشہ[11]، داق زحمت[12]، ستری[13] خوان[14]، ساہول[15]، گنیا[16]، جہاز[17]، جہیز[18]، تجہیز[19]، سرخی[20] (عنوان)، مسل[21]، نستعلیق[22]، جلیبا[23]، کفش[24]، مادری[25]، قلعی[26]، تماشہ[27]

—یعنی پہلے مقالہ کے دونے سے بھی زائد، ۱۲ کی جگہ ۲۷۔ نقش ثانی کے معنی ہی یہی ہیں کہ نقش اول سے بڑھ چڑھ کر رہے، کیا کیفیت میں اور کیا کمیت میں،

اس مقالہ کا بھی رنگ انشا آپ دیکھنا چاہتے ہیں؟ اچھا تو ایک ہلکی سی جھلک سہی، شوربا کی نمکینی کے بعد قلم زبان یوں شکر فشان ہوتی ہے، اور مستی کے ذکر میں بھی رندی تک نہیں پہنچتی، صرف شوخی کے حدود کے اندر رہتی ہے :-

ابن ماجد اسد البحر نے جس نے ۹۰۴ھ (۱۴۹۸ء) مین واسکوڈی گاما کو ہندوستان پہنچایا تھا، الفوائد فی اصول البحر والقواعد کے نام سے جہازرانی پر ایک کتاب لکھی ہے، جو چند سال ہوئے کہ فرانس سے چھپ کر شائع ہو چکی ہے، اس کا زمانہ نوین صدی ہجری کا اخیر اور دسوین صدی ہجری کی شروع تھا،

.... اس کی کتاب کے مطالعہ سے اشرفی کا بھید مجھے معلوم ہوا، ابن ماجد ایک خاص سلسلہ مین لکھتا ہے:

الحادی عشر برسبائی الاشرف صاحب	گیارہوان بادشاہ برسبائی اشرف ہے جو اشرفی
سکۃ الاشرفی (ص۲۴ طبع پیرس)	سکہ کا چلانے والا ہے،

اس سے معلوم ہوا کہ اشرفی کا سکہ مصر سے چل کر بحر ہند مین داخل ہوا تھا، اور وہان سے پورے ہندوستان مین پھیل گیا، ابن ماجد نے اپنی یہ کتاب ۸۹۵ھ مین لکھی ہے اور اس سکہ کے بانی کا ذکر کیا ہے، اور فرشتہ نے اپنی اصل کتاب اس کے بیس برس بعد ۹۱۵ھ مین لکھی، اور "اشرفی علائی" کا نام لیا ہے یعنی علاء الدین خلجی کے وقت کی اشرفی، حالانکہ خلجی کے زمانہ مین اشرفی کا نام بھی پیدا نہین ہوا تھا، مگر یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم پرانے زمانہ کے بادشاہون کے سونے کے سکون کو یا انگریزی پونڈ کو اشرفی کہہ دیتے ہین" (ص۲۹۶)

یہ ساری تحقیق جو یہان ذرا مختصر ہو کر نقل ہوئی ہے، کتاب کے پورے چار صفحون مین آئی ہے، اور اسی طرح لفظ پر لفظ لکھتے اور ہندی کی چندی کرتے چلے گئے ہین، "کرانت، بیمہ، ڈاک، تمری، سوسی، نیزی رقم، ہندسہ، ریاضیات، سیاسیات" یہ دس عنوانات اور اس نتائجہ کے ہین، اور ان بارہ لفظون کے اشتقاق اور تحقیق تسمیہ کی موشگافیون مین پورا افسانہ ختم ہو گیا ہے،

پھر یہ بارہ لفظ وہ ہین جن کی ذاتین بالکل الگ الگ ہین، یعنی ان کا تعلق باورچی خانہ سے بھی ہے، بزازے سے بھی، چھاپہ خانہ سے بھی، اور صرافے سے بھی، سرکاری دیوانون سے بھی، اور درسی کاشانون سے بھی، یونہی زبردستی گلے مین ہاتھ ڈال کر اکٹھے نہین کرلئے گئے ہین، بات مین بات پیدا کی گئی ہے، نکتہ سنجی کو کھل کھیلنے کا میدان ہاتھ لگ گیا ہے، اور انشاء لطیف نے جیسے الگ تھلگ رہنے والے روٹھے ہوؤن کو گلے ملا کر

مفید ہوا یہ اصول قریب قریب دنیا کی سبھی زبانوں میں چلتا ہے، اور اُس کے مانے بغیر ممکن ہی نہیں، کہ زبان ترقی پاسکے" (ص ۳۲۰)

آج ۱۹۵۵ء میں یہ بات بالکل صریح و واضح معلوم ہو رہی ہے مگر ۱۹۳۹ء میں جب سید صاحب نے "تنقید" کے عنوان سے اُسے معارف میں پیش کیا تو یہ آواز کچھ نامانوس سی تھی، پرانے خیال کے اہلِ قلم خاصی تعداد میں اس پر مصر تھے کہ عربی و فارسی کے قاعدے اردو میں بھی چلائے جائیں گے، اور اُن کے پاس دلیل بجز جمود تقلید کے اور کوئی نہ تھی، اُس کے مقابلہ میں سید صاحب کا سیدھا، صاف و دلنشین استدلال ملاحظہ ہو:-

...... ایک قوم کا آدمی جب کسی دوسری قوم کی بولی کا کوئی لفظ لیتا ہے تو اس کی زبان کی فطرت مجبور کرتی ہے کہ ارادہ اور احساس کے بغیر اس کی شکل بدل دے، ہندوستان کے باہر کا آدمی خواہ کچھ کرے، مگر وہ ہمارے ہندی حرفوں کو کبھی نہ بول سکے گا، وہ اس کو کچھ نہ کچھ بدل دے گا، وہ ہمارے لہجہ سے ہمارے لفظوں کو ملائے گا، مگر اس میں بھی کچھ ہیر پھیر کرے گا،

یہی حال ہندیوں کا بھی ہے، عربی کے خاص حرف وہ ادا نہیں کرسکتے، ع، ء اور الف میں، ث، س اور ص میں، اور ت اور ط میں وہ فرق نہیں کرسکتے، اس لئے دوسری زبان کا جو لفظ ہمارے ہاں آئے گا، جب تک اپنی بے گانگی چھوڑ کر بالکل گھریلو نہ بن جائے گا، وہ ہمارے دیس میں رہ نہیں سکتا، یہی وجہ ہے کہ عربی، فارسی، سنسکرت، انگریزی وغیرہ کے جو ہزاروں لفظ ہماری زبان میں آگئے ہیں، وہ ہماری زبان کے قاعدوں پر چڑھ کر ہماری زبان کی شکل و صورت اختیار کرنے پر مجبور ہیں،

تمنا کے معنی میں آرزو کی اصل عربی اور فارسی میں تمنا ہے، مگر ہمارا ہندوستانی لفظ آج ہی ہوگا، عربی میں یہ لفظ تمنی ہے مگر فارسی والوں نے اُسے لیا، تو تمنا کر دیا، اور ہم نے بھی اُسی کو قبول کیا، عربی تماشی کو انہوں نے تماشا کیا، اور ہم کو بھی یہی تماشا پسند آیا، لالٹین کی اصل لینٹرن ہے، مگر ہم کو لالٹین ہی کی روشنی پسند ہے، بٹن انگریزی ہو تو ہو، مگر ہمارا لفظ تو بوتام ہے، جو بٹن کی بگڑی ہوئی شکل ہے، لفظ تبادلہ عربی کے لحاظ سے

"اسی عربی شُرب (پینا) سے ایرانیون نے شراب اور شربت تیار کیا، اور اُسے ہندوستانیون نے قبول کر لیا، شراب کے معنی عربی مین ہین "جو چیز پی جائے"، یہان تک کہ قرآن مین دودھ کو بھی شراب کہا ہے، ایرانیون نے جس کو شراب کہا اُس سے متوالی شراب مراد لی، اس سے یورپی زبانون میں سیرپ تیار ہوا، جو شکر پڑ کر میٹھا ہو گیا، لیکن ایرانیون کے اثر سے ہم نے پانی مین گھول کر جو چیز تیار کی، اس کو شربت کا نام دیا، لفظ عربی ہے، اور معنی عجمی، عربی مین اس کے معنی فقط پینے کے ہین" (ص ۳۱۶، ۳۱۷)

ان میٹھے میٹھے بولون کو سُن کر خیال یہ نہ گذرے کہ سید صاحب کی ہر تحقیق سو فی صدی صحیح ہی تھی، کون فاضل اس کا دعویٰ کر سکتا ہے؟ بشر بہرحال بشر ہے، اور سید صاحب اپنی بشریت کے اعتراف و اقرار مین ہرگز کسی سے پیچھے رہنے والے نہ تھے، لسانیات کے ایک ماہر خصوصی ہمارے صوبہ مین ڈاکٹر عبدالستار صدیقی سندیلوی ثم الہ آبادی ہین، انھون نے جب بعض حصون پر نقد کیا، تو سید صاحب نے یہی نہین کہ فراخ دلی کے ساتھ اسے معارف مین شائع کر دیا، بلکہ شور ہا کی حد تک تو کھلے طور پر، اور مستری کے لئے بھی ایک حد تک اپنی تحقیق سے رجوع بھی کر لیا،

لغوی اور اشتقاقی بحثون کا شعبہ ختم ہوا سید صاحب کے دو اور بڑے کارنامے مستقل قدر و قیمت رکھنے والے یہ ہین، کہ

(۱) انھون نے عربی و فارسی کی تمام تر ماتحتی سے نکال کر اردو کی خود مختاری اور ایک قائم بالذات زندگی کی سرگرم وکالت کی، وہ اصلاً ایک عالم دین اور مولوی تھے، قدرۃً اُن کے طبقہ سے توقع یہ تھی کہ وہ اُردو پر عربی کی حاکمیت سے خوش ہونگے، اور سارے ہی کوشش اس کے قائم و برقرار رکھنے کی کرین گے، لیکن اس کے برعکس انھون نے عربون کی "تعریب"، اور فارسیون کی "تفریس" کی طرح، اہلِ ہند کو پورا حق "تہنید" کا دلایا،

"جب اہلِ ہند یہی کرین، یعنی وہ کسی دوسری زبان کے لفظ کو اپنی زبان کے اصول پر تراش خراش کر کے اپنی زبان مین ملا لین تو اُس کو تہنید کہین گے، یہ اصول زبانون کے بڑھنے اور پھیلنے کے لئے بہت اچھا

اس کا ہندوستانی نام، ہندوستان، اور وہ بھی ہندو اور مسلمانوں کے مشترکہ وطن کے نام کے تصور کے حامل ہونے کے سبب سے پوری طرح اپنے اندر ہمدردانہ جذبات کی روح رکھتا ہے، اور معلوم ہوتا ہے، کہ یہ ایسی زبان کا نام ہے جس کو پورے ملک سے تعلق ہے، اور وہ پورے ملک کی متحدہ زبان ہونے کا دعویٰ رکھتی ہے، عام خیال ہے کہ یہ ہندوستانی نام انگریزوں کا بخشا ہوا ہے، مگر یہ واقعہ نہیں، ...... ہم اس نام کے ذریعہ سے ملک کے سامنے وہ تخیل پیش کریں گے جو ہندو مسلم کے مشترکہ وطن کے تصور کی ترجمانی کرے گا، اور مغلوں کے لشکری استیلاء کی تاریخ سے جو لفظ اردو میں چھپی ہے، ہم کو نجات دے گا" (ص ۵۵، ۷۶)

یہ مقالہ ۱۹۳۲ء کا ہے، اور آج اس کی قدر ہوتی ہے، کہ اس زمانہ میں اس کے اندر کتنی دور اندیشی تھی کتنی مصلحت شناسی تھی، ـــــ مقالہ میں اور بھی جو مشورے درج تھے، وہ سب ایسے تھے، جو اردو کے ایک دست دانا ہی کی زبان سے ادا ہو سکتے تھے، مثلاً یہ کہ عربی و فارسی کے جتنے الفاظ اب تک ہماری زبان کا جزو بن چکے ہیں بس اُن کے علاوہ (بجز اصطلاحات کے) اور نئے نئے لفظوں کو فرہنگ و قاموس کی مدد سے گڑھ گڑھ کر اردو میں نہ لایا جائے، اور یا پھر یہ کہ ہندی کے جو لفظ اردو یا ہندوستانی میں بہ آسانی کھپ جانے والے ہوں، اُن کے لینے میں خواہ مخواہ ضد اور ہٹ کو کام میں نہ لایا جائے،

سید صاحب کو اُن کی زندگی کے صرف آخری ۵-۶ برسوں میں جنھوں نے دیکھا ہے، اور جن کی واقفیت اُن سے اسی زمانہ تک محدود ہے، وہ عجب نہیں کہ انھیں محض ایک مقدس شیخ خانقاہ سمجھ رہے ہوں جس کے اوقات صرف اوراد و نوافل، اذکار و اشغال کے لئے وقف رہتے ہیں اور جس کو شعر و شاعری، زبان و ادب کے مضمون سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہوتا، ـــــ معتقدوں، مریدوں، اور مسترشدوں کی یہ رائے کتنے ہی اخلاص نیت پر مبنی ہو، غلط فہمی ہر حال میں غلط فہمی ہی ہے، سید صاحب اور جو کچھ بھی ہوں، (اور یقیناً وہ اور بہت کچھ تھے بھی) اُن کے اس مرتبۂ امتیاز سے کوئی انھیں محروم نہیں کرسکتا، کہ وہ ایک ادیب صاحب طرز تھے، اور طرز اُن کا شگفتہ و لطیف، ایک انشاء پرداز تھے، شوخ و ظریف نقاد تھے، گہری نظر رکھنے والے،

غلط ہی کیوں نہ ہو، لیکن ہماری زبان میں یہ صحیح ہے کہ اس کو چھوڑ کر مبادلہ یا تبادُل کی کوشش زبردستی ہے۔"

(ص ۳۳۱)

قدیم طرز کے عالموں سے اس کی توقع ہو ہی نہیں سکتی مگر سید صاحب عالم تھے بھی تو ندوی، اور اُن کی ندویت اُن کی خوش ذوقی اور سلامتِ مذاق کی پوری طرح ضامن تھی ۔۔۔۔۔۔ ۲۰ صفحہ کے مقالہ میں سید صاحب نے پچاسوں عربی لفظوں کی مثالیں دے دے کر دکھایا، ہر کہ عربی میں اُن کے معنی کچھ تھے، اردو میں آکر کچھ ہو گئے، یا اُن کا تلفظ عربی سے اُردو ہو گیا یا اُن کے واحد جمع بنانے میں عمل اُردو قاعدوں پر ہوا۔

(۲۰) اسی درجہ کا بلکہ اس سے بھی بڑا دوسرا کارنامہ سید صاحب کا اردو زبان کے سلسلہ میں اس کے نام سے متعلق ہے، سید صاحب کا اصرار تھا کہ اس کا نام "ہندوستانی" چلانا اور پھیلانا چاہیے، کہ یہی اس کا نام فی الاصل ہے بھی، اور یہی اُس کی اشاعت و مقبولیت میں بھی بہت معین ہو گا، شروع شروع اس تحریک کی خاصی مخالفت ہوئی، اور انہی مخالفوں میں میں بھی تھا، اور بدگمانی مجھے یہ ہو رہی تھی کہ اردو کے خلاف، اس کے اسم و مسمّی دونوں کے خلاف جو زبردست پروپگنڈا اردو کے دشمنوں نے شروع کر رکھا ہے، اس سے کسی حد تک سید صاحب بھی متاثر و مرعوب ہو گئے ہیں، اور نام کی حد تک ہتھیار ڈالنے پر آمادہ!

لیکن غالباً ۱۹۳۸ء میں جب کہ ایک بار اُن سے علی گڈھ میں اس پر زبانی مفصل گفتگو ہوئی، تو قائل ہونا پڑا کہ رائے انہی کی صحیح و صائب تھی، اور اردو کے بجائے ہندوستانی نام رکھنے کا مشورہ کسی مرعوبیت کی بنا نہیں بلکہ اردو کی دوستی و ہوا خواہی ہی پر مبنی تھا، سید صاحب کا کہنا یہ تھا کہ

"ہم اس زبان کا نام اردو جو صرف سوا ڈیڑھ سو برس سے رفتہ رفتہ ہماری زبانوں پر چڑھ گیا ہے، یک قلم چھوڑ دیں، اس کا نام ہندوستانی رکھیں، اور اسی کو شہرت دے کر عام کریں، دنیا کی اکثر زبانوں کا نام ملک یا قوم کے نام سے موسوم و منسوب ہوتا ہے، اردو کا نام اس ملک و قوم سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، ایسا اجنبی نام جس سے قومی و ملکی جذبہ کو کوئی تحریک نہ پہنچے، احتراز کے قابل ہے، اور اس کے بجا

جب یہ اپنی سنجیدگی و متانت اِس پیکرِ شوخی و ظرافت کو اپنی بزمِ معارف میں لاتے ہیں، تو تعارف کس انداز سے کراتے ہیں اور نقیب بن کر صدائیں کیا کیا لگاتے ہیں ـــــ "نقیب" کی تشبیہ کسی معتقد کو گراں نہ گزرے، ذکر ندوی کا ہے جو اگر اُس وقت ۵۰ سال کے معمر و محترم بزرگ ہیں اور مولانا ندوی اُن کے خوردوں کے خورد، یعنی اُن کے صاحبزادہ سے بھی کم عمر۔

"ظرافت کا رنگ جو سید انشا اور سعادت علی خان کی بدولت لکھنؤ کی شاعری میں پیدا ہو گیا تھا، اس کا مقصد محض تفریحِ طبع اور دل بہلانا تھا، ضلع جگت اور رعایت لفظی لکھنؤ کا خاص مذاق ہے، اس کا مقصد بھی صرف تفننِ طبع تھا، لکھنؤ میں امانت اس اقلیم کا بادشاہ ہوا ہے، اجان صاحب کا رنگ گو زنانہ لہجہ میں اگر جدید ہو گیا تھا تاہم اس کی بنیاد بھی محض تفریحِ طبع تھی۔ میر صاحب کا احسان یہ ہے کہ انہوں نے مقصدی مضامین اور خیالات کو امانت کے الفاظ میں اور سید انشا کی بولی میں اس طرح ادا کیا کہ وہ صرف تفریحِ طبع اور واہ واہ کا سامان رہا بلکہ اُس کی تہ میں پند و موعظت، اخلاقی تعلیم، سیاسی نکتے، فلسفیانہ اسرار، مذہبی مسائل، اجتماعی مباحث نظر آنے لگے، سید انشا کے زمانہ کی سرکاری زبان فارسی اور ترکی تھی، وہ اسی شیرہ اور قوام سے اپنا شربت تیار کرتے تھے، اب انگریزی سرکاری زبان ہے، میر صاحب اس بادۂ افرنگی کی آمیزش سے ذوقِ کلام کو لطف دیتے ہیں .... میر صاحب اسی شیرۂ شکریں میں پند و موعظت اور نصیحت گری کی ان تلخ دواؤں کا گھونٹ گلے سے اتار دیتے ہیں جن کو ان پیرایوں کے سوا جدید دور بطافت و تنزہ پسندی میں ناممکن تھا، میر صاحب بھری محفل میں علمائے کرام، مشائخ عظام، امرا و حکام، مدعیانِ رہبریِ عام، اور نوجوانانِ تعلیم یافتوں کا خاکہ اڑاتے ہیں، اور اُن کی جبین پر بل تک نہیں آتا" (ص ۱۶۵، ۱۶۶)

اور پھر چند صفحوں کے بعد :-

"جدید تہذیب کے دلدادہ، بے پردگی کے حامی اور عورتوں کو پبلک میں دیکھنے کے مشتاق ہیں،

سخن سنج تھے، کھوٹے کھرے کے پرکھنے والے لکھنوی نہ تھے، پر لکھنوی ہی تھے، اپنے استاد شبلی نعمانی ہی کی طرح بلکہ اُن سے بھی کچھ بڑھ کر، وطن ثانی بھی مثل وطن ہی کے ہوجاتا ہے، یہ اعتراف آپ خود اُن کی زبان سے سنا چاہئے ہیں، تو سنیئے، جنوری ۱۹۳۲ء میں وہ ہندوستانی اکیڈیمی کے جلسۂ سالانہ میں شعبۂ اردو کے صدر منتخب ہوئے خطبۂ صدارت کے شروع ہی میں فرماتے ہیں:-

"......آپ کی اس ذرہ نوازی کی قدر اور بڑھ جاتی ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ مجھے اس اعزاز کی دولت اس سرزمین میں بخشی گئی، جو ہمیشہ سے علم و ادب کا گہوارہ اور بڑے بڑے ادیبوں اور عالموں کا مرکز ہے۔ خاکسار کو لکھنؤ سے وطن کی نسبت حاصل نہیں لیکن گذشتہ ۳۰ برس سے مجھے اس سے جو علمی و تعلیمی تعلق رہا ہے، وہ وطن ہی کے مانند ہے، اسی کی گود میں میرے ہوش و تمیز کی آنکھیں کھلیں، اسی کے دامن میں میری تعلیم و تربیت ہوئی، اور اسی کی آب و ہوا میں میرا علمی و ادبی نشوونما ہوا، اس نے اس سرزمین کا ہر گوشہ میرے لئے وطن اور اس چمن زار کی ہر کیاری میرے لئے نظر افروز ہے۔"

خوش نصیب ہے وہ ماں جو ایسے جوہر قابل کو گود دے دے، مبارک ہے وہ فرزند ناموجسے ایسی ماں کی آغوش نصیب ہوجائے ——— اعزاز و اکرام کی تالی دونوں ہی ہاتھ مل کر بجتی ہے،

نازانِ منم کہ ہیچو توئی قدردانِ من
نازانِ توئی کہ ہیچو منِ مدح خوانِ تو

تنقید و تبصرہ کی بہار دیکھنا ہو تو اسی مجموعہ کے صفحہ ۲۴۲ سے لے کر ۲۵۶ تک کے سو صفحوں سے اوپر مقدمات کی سیر کرجائیے، نثر و نظم کی ۱۱- ادبی و شعری کتابوں پر مقدمے ہیں، جو کتابیں گمنام، غیر معروف یا دھندلی سی تھیں، وہ جیسے اس شمع سلیمانی سے چمک اٹھی ہیں، اور جو پہلے ہی سے روشن و معروف تھیں اُن میں اور چار چاند لگ گئے ہیں۔

اکبر پر نقد و تبصرہ، داد و تحسین، آپ بہتوں کے قلم سے پڑھ چکے ہیں، اب ذرا دیکھئے کہ حضرت سلیمان

سید صاحب کے پیش نظر
بعض اہم علمی کام

از

مولانا محمد اویس صاحب ندوی استاذ تفسیر دار العلوم ندوۃ العلماء

سید صاحبؒ اس دنیا سے تشریف لے گئے، اور اپنے ساتھ علوم و معارف اور کمالات کا ایک خزانہ لے گئے، لیکن جو کچھ چھوڑ گئے ہیں، وہ بھی کم نہیں ہے، اُن کی تصنیفات، مقالات، خطبات، اور مکاتیب ایک گنج گرانمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں، موجودہ اور آیندہ نسلوں کی دینی، اخلاقی، علمی، اور ذہنی رہنمائی کے لئے اس میں بڑا قیمتی سامان موجود ہے،

لیکن ان "الباقیات الصالحات" کے سوا سید صاحبؒ کے سامنے کچھ اور بھی کام تھے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ کی جو باتیں میرے علم میں ہیں، اُن کو قلم بند کر دوں ممکن ہے کہ دوسرے حضرات کے پاس بھی اس سلسلہ کے کچھ معلومات ہوں، اگر یہ سب چیزیں جمع ہو جائیں تو آیندہ کے کاموں کا ایک خاکہ تیار ہو سکتا ہے، اور سید صاحبؒ کے "حسنات" کا ایک نیا باب کھل سکتا ہے،

سید صاحبؒ کو اسلامی علوم میں حقیقی شغف قرآن مجید سے تھا، آیاتِ قرآنی سے کلامی، فقہی، اخلاقی اور سیاسیاتِ اسلامی کے مسائل کا استنباط، اس کے ادبی لطائف کی تشریح و توضیح، اور تاریخی مباحث کی تحقیق اُن کی زندگی کا دلچسپ موضوع تھا، ارض القرآن، اور سیرۃ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ضخیم جلدیں، اُن کے اس مذاق کی شاہد عادل ہیں،

سمجھتے ہیں کہ جو انگریزی نہ جانے، گویا وہ تعلیم سے عاری ہے۔ امیر صاحب اُن کے دعوی کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں :-

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب وہ شمعِ بزم ہے پہلے چراغِ خانہ تھی

"شمعِ بزم" اور "چراغِ خانہ" کی تشبیہ میں کہ عجب نہیں کہ عورتوں کی بے پردگی، اور انگریزی تعلیم کے نذری چراغ پا ہو جائیں"

رخصت اے بزمِ شبلی کے مکین، بلکہ سر دبزم و صدر، اور چشم و چراغ، سلیمان ندوی رخصت! تو نے جہان ایک طرف، الحاد و بے دینی کے بڑے بڑے سرکش و منہ زور جنات کو بوتلوں میں بند کیا، وہیں الفاظ و معانی کی کیسی کیسی لطیف پریاں بھی شیشہ میں اتارتا رہا!

(۱) فضل العالم علی العابد کفضلی علی ادناکم ثم تلا انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء (ترمذی تفسیر)

(۲) فلما قضی الصلوٰۃ قال من نسی الصلوٰۃ فلیصلھا اذا ذکرھا فان اللہ تعالیٰ قال اقم الصلوٰۃ لذکری (ابوداؤد)

(۳) نھانا عن الاستخصاء ثم قرء علینا، یا ایھا الذین آمنوا لاتحرموا طیبات ما احل اللہ لکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین، (بخاری)

(۴) ان اللہ یملی الظالم ثم قراء وکذلک اخذ ربک اذا اخذ القری وھی ظالمۃ . (مسلم)

دوسرا عنوان یہ ہے،

القسم الثانی من الاحادیث التی تفسر القرآن بغیر ذکر القرآن،

اس عنوان کے تحت میں سید صاحب نے ۲۸ احادیث کو جمع فرمایا تھا، اسکی مثالیں ملاحظہ ہوں،

(۱) ایاکم والظن (مسلم) ان بعض الظن اثم،

(۲) انما ھی اعمالکم ترد علیکم ولا تجزون الا ما کنتم تعملون،

(۳) انفق ینفق علیک - وما انفقتم من شیٔ فھو یخلفہ

دوسرے علماء نے بھی اس عنوان سے دلچسپی ظاہر فرمائی ہے، مثلاً صاحب روح المعانی کا خیال ہے کہ دعا اللھم من احییتہ منا فاحیہ علی الاسلام ومن توفیتہ منا فتوفہ علی الایمان" الخ ماخذ آیت ولا تموتن الا وانتم مسلمون ہے[1] اسی طرح حضرت مولانا انور شاہ صاحب فرماتے ہیں:

ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر الآیہ استنبط منہ حدیثہ صلی اللہ علیہ وسلم،

---

[1] روح المعانی ج ۴ ص ۱۶،

سید صاحبؒ کے ذہن میں عصری مذاق کے مطابق قرآن مجید کے مسائل کی ترتیب و تدوین کا ایک نقشہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اصول کی رعایت کرتے ہوئے، دیانت اور ذہن کی سلامتی کے ساتھ آیاتِ قرآنی پر غور کیا جائے، اور ان آیات سے جن کلامی فقہی، اخلاقی اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی مسائل کا استنباط ہو سکے، ان کو احادیثِ نبویہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نیز صحابہؓ و تابعینؒ اور سلف صالحینؒ کی تشریحات کے ساتھ الگ الگ مرتب کیا جائے۔!

یہ تجویز بظاہر بہت مختصر معلوم ہوتی ہے لیکن اگر اس کو عملی جامہ پہنایا جائے تو پورا ایک ادارہ اس کام میں لگ سکتا ہے، اسلامی علوم میں مفید ترین کتابوں کا اضافہ اور اسلامی نظریات کو سمجھنے کے لیے بہترین مواد جمع ہو سکتا ہے!

سید صاحبؒ نے عقائد القرآن اور فقہ القرآن کے نام سے اس سلسلہ میں دو عنوان قائم فرما کر کچھ کام بھی شروع کر دیا تھا، فقہ القرآن کے لیے راقم سطور سے قرآن مجید کی آیاتِ احکام کو جمع کرایا تھا، جو میرے پاس موجود ہیں،

دوسرے محققین کی طرح سید صاحبؒ کا خیال تھا کہ آیاتِ قرآنی کی حیثیت کلیات کی ہے، اور احادیثِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) انہی کلیات کی تشریح ہیں، اس سلسلہ میں سید صاحب کی رائے تھی کہ قرآن مجید نیز ذخیرۂ احادیث کا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا جائے، اور ارشاداتِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو انہی کلیات کے ماتحت جمع کیا جائے، اس موضوع سے متعلق سید صاحبؒ نے اپنی یادداشت کی کاپی میں دو عنوانات قائم فرمائے تھے، پہلا عنوان یہ ہے:

"الآیات التی استدل بہا النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی ما قالہ"

اس عنوان کے تحت میں سید صاحبؒ نے ۹ استدلالاتِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جمع فرمایا تھا، مثال کے طور پر چند ملاحظہ ہوں،

(۴) قرآن مجید کے اعجاز کا مسئلہ قرآنی علوم میں جو اہمیت رکھتا ہے، وہ ظاہر ہے، ہر عہد میں مختلف نوعیتوں سے اس پر کلام کیا گیا ہے، مسلمانوں کے عہد تصنیف سے لیکر اس وقت تک اس موضوع پر جو کچھ بھی لکھا گیا ہو اس کو سنین کی ترتیب کے اعتبار سے سید صاحب نے جمع کرایا، یہ مجموعہ ایک جلد میں تیار ہوا، اس کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے اپنے زمانہ میں لوگوں نے، کن کن نوعیتوں سے اس مسئلہ پر غور کیا ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کی الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، سید صاحب کی نگاہوں میں بہت اہمیت رکھتی تھی، مگر اُن کے نزدیک اس کی حیثیت متن کی تھی، اس لئے وہ چاہتے تھے کہ اس کا تحشیہ کیا جائے، شاہ صاحب کے ارشادات کو آیاتِ قرآنی سے مدلل کیا جائے، نیز اُن کے بیانات کی دوسرے محققین کی کتابوں سے توثیق کی جائے، اس سلسلہ میں بھی تھوڑا کام ہو چکا ہے،

دار المصنفین کے زمانۂ قیام میں سید صاحبؒ نے مجھ سے اسلام کے نظام کاشتکاری، اور کتب فقہ سے زراعت و آب پاشی کے مسائل کو اُردو میں مرتب کرنے کے لئے فرمایا، میں نے کام شروع کر دیا، اسی زمانہ میں سید صاحب تھانہ بھون تشریف لے گئے، وہاں مولانا تھانویؒ سے اس کا ذکر آیا، اور رائے یہ قرار پائی کہ شروع سے پورے سلسلۂ فقہ کو اردو میں مدوّن کر دیا جائے تاکہ اردو دان طبقہ کے ہاتھ میں ایسا مجموعہ آ جائے جو روز مرہ کی ضروریات میں اُن کے لئے کافی ہو، سید صاحبؒ نے تھانہ بھون سے تشریف لا کر اس تجویز کا ذکر فرمایا، اور ارشاد فرمایا کہ اب کتاب الطہارۃ سے کام کو شروع کرو، اس کی تعمیل شروع کر دی گئی، مگر اس کے بعد میں دار العلوم ندوہ چلا آیا، اور سید صاحب قبلہ بحیثیت قاضی القضاۃ بھوپال تشریف لے گئے، وہاں پہنچ کر سید صاحب کو اس سلسلہ کی تکمیل کی اور ضرورت محسوس ہوئی، اور بار بار خطوط میں اس سلسلہ کی تکمیل کی تاکید فرماتے رہے، میں نے کتاب الطہارۃ کو ایک جلد میں مکمل کر کے بھوپال ارسال خدمت کیا تو بھوپال کے بعض علما سے اس پر تقریظیں لکھا کر واپس فرمایا اور دوسری جلد کا کام شروع کرنے کی تاکید فرمائی مگر افسوس کہ پہلی جلد سے کام آگے نہ بڑھ سکا، سید صاحب کو اس سلسلہ کی تکمیل کا بیحد خیال تھا، وفات سے چند ماہ پیشتر جب ہندوستان تشریف لائے تو بار بار فرماتے

لاتزال طائفۃ من امتی ظاھرین علی الحق وحدیثہ صلی اللہ وسلم والجھاد ماضٍ الی یوم القیامۃ[1]

ان عنوانات کو پورا کرنا کچھ آسان کام نہیں ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ بڑی اہم اور مفید خدمت ہوگی، اور اگر اس موضوع پر کچھ کام کر ڈالا جائے، تو اپنے طرز کی نئی چیز ہوگی،

اِن اہم اور بنیادی کاموں کے سوا قرآن مجید کے سلسلہ میں سید صاحبؒ کے پیش نظر حسب ذیل کام بھی تھے، ان میں سے بعض سید صاحب کی نگرانی میں انجام پا چکے ہیں، مگر ابھی ان کی طباعت کی نوبت نہیں آئی ہے،

(۱) دارالمصنفین کے کتب خانہ میں الفوز الکبیر کا ایک قلمی نسخہ ہے، جس میں شاہ صاحبؒ کے حواشی قرآن مجید اور اصول ترجمۂ قرآن مجید کا رسالہ بھی ہے، سید صاحب کی خواہش تھی کہ اس کو شائع کیا جائے،

(۲) قرآن مجید میں کائنات کی مختلف چیزوں کو بطور "آیات الٰہی" کے پیش کیا گیا ہے، سید صاحبؒ کا خیال تھا کہ ان تمام آیات کو الگ الگ عنوانات کے ماتحت جمع کیا جائے، اور جن چیزوں کو بطور آیات کے پیش کیا گیا ہے، اُن کے متعلق قدیم وجدید ماخذ سے ایسے معلومات کو جمع کر دیا جائے، جن سے ان آیات الٰہی کے آیت (یعنی) نشانی) ہونے کی حیثیت اور حقیقت واضح ہو جائے، سید صاحبؒ نے ان آیات کو عنوانات کے ماتحت جمع کرا لیا تھا، اُن کی تشریح کا کام باقی ہے،!

(۳) سید صاحب کا خیال تھا کہ معانی و بلاغت نیز دوسری کتابوں میں مسائل کی تشریح کے فن میں قرآن مجید کے لطائف ادبیہ کو واضح کیا گیا ہے، اگر آیات متعلقہ کو عنوان بنا کر ان سب کو سورتوں کی ترتیب کے ساتھ جمع کر دیا جائے، تو قرآن مجید پر ادبی حیثیت سے غور کرنے والوں کے لئے ایک مفید خدمت ہوگی، بحمد للہ دو جلدوں میں یہ کام پورا ہوا،

---

[1] مشکلات القرآن ص ۱۹،

آخر میں سید صاحب کی ایک خواہش کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جس کا تعلق خود اُن کی تصانیف سے ہے اور جس سے ان کے تصنیفی احتیاط کا اندازہ ہوتا ہے، وہ خواہش یہ تھی کہ اُن کی تصانیف بالخصوص سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نظرِ ثانی کا کام کیا جائے، اپنے بعض شاگردوں سے زبانی اور خطوط میں اس کا ذکر فرمایا، گو صرف تنقید ہی نہیں بلکہ حقیقۃً سید صاحب کا قلم خود اس قدر محتاط تھا کہ اُن کی تصانیف پر خصوصی طور سے نظرِ ثانی کی ضرورت نہیں، لیکن اُن کی یہ خواہش اُن کی عالی ظرفی، وسعتِ نظری، تلاشِ حق کی فکر اور مسائلِ دینیہ میں انتہائی درجہ احتیاط کی کھلی ہوئی دلیل ہے، شاید عام طور سے لوگوں کو نہ معلوم ہوگا کہ دار المصنفین میں جب سیرۃ کی کوئی جلد چھپتی تھی، تو پہلا ایڈیشن بڑی تقطیع پر چھپتا تھا، اور اس کے ڈھائی سال کے بعد چھوٹی تقطیع والا ایڈیشن چھپتا تھا، یہ تاخیر صرف سید صاحب کی احتیاط کی وجہ سے ہوتی تھی، وہ چاہتے تھے کہ پہلا ایڈیشن علماء اور اہلِ نظر کی نگاہوں سے گذر جائے، اُن کی تنقید کا حال معلوم ہو جائے، تب دوسرا ایڈیشن چھاپا جائے تاکہ اس نئے ایڈیشن میں تصحیح وغیرہ کا موقع مل جائے، اللہ تعالیٰ عام مصنفین کو بھی فضل و کمال اور رسوخِ علم کے ساتھ یہی احتیاط نصیب فرمائیں، آمین۔

تھے کہ اس وقت نئے نئے مسائل سامنے آرہے ہیں، اور ایسے علما رکی ضرورت ہے جو ان مسائل کا تشفی بخش جواب دے سکیں، اس لئے فقہ کی تعلیم پر بہت توجہ کرنا چاہئے، دارالعلوم کے طلبہ کے سامنے جو تقریر فرمائی تھی اس میں بھی اس پر زور دیا تھا، بہرحال اردو میں فقہ اسلامی کی تدوین کی تجویز اہمیت رکھتی ہے، اور یہ کرنیکا کام ہے

ہندوستان کے گذشتہ اور موجودہ علما رکے حالات کے جمع و ترتیب کا کام بھی سید صاحب کے پیش نظر تھا، اسی خیال سے معارف میں وفیات کا عنوان قائم فرمایا تھا، ارشاد فرماتے تھے کہ آئندہ مورخ کو اس سے بڑی مدد ملے گی،

نواب صدیق حسن خان صاحب مرحوم کے کتب خانہ میں ہندوستان کے گذشتہ علما رکے حالات پر کچھ قلمی مسودات فارسی زبان میں تھے، سید صاحب ان مسودات کو دارالمصنفین لائے، ان کو صاف کرایا، مبیضہ کو اصل سے مطابقت کا کام میرے سپرد فرمایا، اسی زمانہ میں مجھ کو ملا جیونؒ امیٹھوی کی خودنوشت سوانحعمری کا ایک قلمی نسخہ ملا، گو اس کو خودنوشت کہنا آسان نہیں ہے، بہرحال میں نے سید صاحب کو دکھلایا، سید صاحب نے اس کو بھی نقل کرایا، اور اسی مجموعہ میں شامل کرایا، ان کا خیال تھا کہ یہ مجموعہ شائع کردیا جائے، میں نے برادرم مولانا شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی ناظم دارالمصنفین سے اس مجموعہ کے متعلق دریافت کیا تھا، مگر وہ فرماتے تھے کہ دارالمصنفین میں موجود نہیں ہے، خدا کرے یہ مجموعہ محفوظ ہو، اگر کبھی اس کی اشاعت کی نوبت آئی تو ایک تاریخی خدمت ہوگی،

سید صاحب نے ایک بار میبذی پڑھاتے وقت ارشاد فرمایا تھا کہ مسلمان فلاسفر نے طبعیات کے سلسلہ جن عملی تجربات کا ذکر کتابوں میں کیا ہے، اگر ان سب کو جمع کردیا جائے، تو ان علما رکی اس سلسلہ کی خدمات پر روشنی پڑ سکتی ہے،

اسی طرح منطق کے سلسلہ میں سید صاحب کا خیال تھا، کہ مسلمانوں نے فن منطق میں جو اضافے کئے ہیں ان کے متعلق بھی مفصل طور سے لکھا جائے،

اس غلبہ کا اثر یون تو ساری دنیا پر پڑا، مگر اس کا شکار سب سے زیادہ اسلامی ممالک ہوئے، ہندوستان مین اہل یورپ کے معاشی اور کہین کہین سیاسی اثرات تو اٹھارہوین صدی کے آخر سے پڑنا شروع ہو گئے تھے، تاہم ابھی تک یہان ایک نام نہاد مرکزی حکومت باقی تھی، جو عام ہندوستانیون اور خاص طور سے مسلمانون کی امیدون کا آخری سہارا تھی، لیکن جب ۱۸۵۷ء مین انگریزون نے اس پر بھی قبضہ کر لیا، اور یہ آخری سہارا بھی جاتا رہا تو یہان کے عام باشندون مین شکست خوردگی اور انتشار ذہنی کی عجیب کیفیت پیدا ہوئی،

تحریک ندوۃ العلماء کا پس منظر مسلمانون پر اس نئی صورت حال کا ردعمل دو طرح سے ہوا، ایک گروہ نئے انقلاب کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرنے مین لگ گیا، اور دوسرا گروہ اپنے اسلاف کے چھوڑے ہوئے سرمایہ کی حفاظت مین مشغول ہو گیا،

پہلے گروہ کا نقطۂ نظر زندگی کے ہر شعبہ مین سراسر نقل و تقلید تھا، اس لئے اس سے جو لوگ متاثر ہوئے وہ آہستہ آہستہ سیاست، معیشت، تہذیب، تمدن، معاشرت، اخلاق حتیٰ کہ دین و مذہب کے بارے مین بھی اُن کا وہی نظریہ بن گیا، جو حکمران قوم کا تھا، اس سے کچھ نہ کچھ مادی فوائد ضرور حاصل ہوئے، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ اس طرز عمل کی بدولت ہمارا تصور دین بدلا، تصور اخلاق بدلا، فلسفۂ زندگی بدلا، اور ہماری تہذیب کی بنیادین متزلزل ہو گئین ،،

دوسرے گروہ کا ردعمل اس کے بالکل برعکس ہوا، پہلا گروہ اگر آنے والے "سیلاب مین بہ نکلا، تو دوسرا گروہ جمود کی چٹان بن کر بیٹھ گیا، اس نے کوشش کی کہ علم و مذہب اور اخلاق و معاشرت اور روایات کی اس پوری میراث کو جو اٹھارہوین صدی کے لوگون نے چھوڑی ہی اور انیسوین صدی کے لوگون نے پائی تھی جون کا تون باقی رکھا جائے، اور نئی فاتح قوم کا نہ کوئی اثر قبول کیا جائے، اور نہ اس کے سمجھنے مین اپنا وقت ضائع کیا جائے، انھون نے ایک لمحہ کے لئے بھی اس پر غور نہین کیا، کہ اگلون کی میراث کا تجزیہ کر کے دیکھین کہ اس مین کیا باقی رکھنے کے اور کیا بدلنے کے لائق ہے اور نہ اس کی جانب توجہ کی کہ جدید تہذیب سے کیا لینے کے

تحریک ندوۃ العلماء اور سید صاحب

از

جناب مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی رفیق دار المصنفین

اٹھارہویں اور انیسویں صدی کا جو زمانہ یورپ کی تاریخ کا سب سے زرین دور شمار ہوتا ہے وہی مسلمانوں کی تاریخ کا سب سے تاریک اور مظلم دور ہے، یورپ اس زمانہ میں اپنی ترقی کے نقطۂ عروج تک پہنچ رہا تھا، اور اسلامی ممالک زوال کے آخری نقطے تک گر کر موت کی ہچکیاں لے رہے تھے، دنیا کی سیاسی و تمدنی قیادت کی وہ باگ جو ایک ہزار برس سے اُن کے ہاتھوں میں تھی یورپ کے ہاتھوں میں جا رہی تھی، اور یہ موت کا سنبھالا لے کر یکے بعد دیگرے اپنی قیادت کی زندگی سے محروم ہو رہے تھے، یا محروم کئے جا رہے تھے، یورپ غالب ہو رہا تھا، اور یہ محکوم و مغلوب ہو رہے تھے،

مسلمانوں کا یہ زوال کوئی اتفاقی واقعہ نہیں تھا، جو اچانک پیش آ گیا ہو، بلکہ اپنے پیچھے اسباب زوال کی ایک لمبی تاریخ رکھتا ہے، اسی طرح یورپ کا یہ غلبہ اور عروج محض کوئی ہنگامی سیاسی تغلب نہیں تھا، جو یکایک اُسے حاصل ہو گیا ہو، بلکہ اس کے جلو میں ایک جدید تمدن، ایک جدید فلسفہ، علم و فن، ایجاد و اختراع کی ہمہ گیر قوت اور سیرت و کردار کی ایک نئی طاقت بھی، جو اُس نے برسوں کی محنت اور جانفشانی کے بعد فراہم کی تھی، یہی وجہ ہے کہ اس کے اثرات جہاں پڑے، وہاں اُس کو محض سیاسی و معاشی غلبہ ہی حاصل نہیں ہوا، بلکہ ان سے وہاں کی تہذیب و تمدن، علم و فن اور فکر و عمل کے تمام گوشے متاثر ہوئے، یورپ

بہت سی تقسیموں اور تفرقوں کا شکار ہو رہی تھی،

مگر اس اختلاف و پراگندگی کے دور میں بھی قوم میں بعض ایسے عاقبت اندیش اور اعتدال پسند افراد موجود تھے جو اس اختلاف کو قومی و دینی حیثیت سے سخت مضر سمجھتے تھے، اُن کے خیال میں مسلمانوں کے لئے نہ تو جدید طبقہ کی مرعوبانہ اور خالص ترقی پسندانہ ذہنیت بالکلیہ مفید تھی، اور نہ قدیم گروہ کا جمود و تعطل، تعصب و تحزب، اور جدید تعلیم سے گریز سود مند تھا، مگر ان طبقوں میں اختلاف کی خلیج اتنی وسیع ہو چکی تھی، کہ اس کا پاٹنا اور ان کو کسی ایک مقصد پر متحد کرنا آسان نہیں تھا، اس لئے پہلے انھوں نے ایسے تمام لوگوں کو جو موجودہ صورت حال کو بدلنے اور اس کی اصلاح کا جذبہ رکھتے تھے، ایک مرکز پر جمع کرنے کی کوشش کی، تاکہ انہی کے ذریعہ موجودہ فضا کو بدلنے اور قدیم و جدید اور مذہبی گروہی عصبیت کو مٹانے کا کام انجام دیا جائے، اسی اعتدال پسندانہ اور جامع تخیل کی صورت گری ۱۸۹۲ء میں کانپور میں مجلس ندوۃ العلماء کی شکل میں ہوئی،

اس مجلس نے جب اس تخیل اور مقاصد کو مسلمانوں کے سامنے پیش کیا تو ابتدا میں بعض جماعتوں خصوصاً قدیم مذہبی طبقہ کی طرف سے اس کی شدید مخالفت ہوئی، مگر اس کے باوجود قوم کے عاقبت اندیش، درد مند اور اعتدال پسند عناصر خواہ ان کا تعلق کسی گروہ اور کسی فرقہ سے رہا ہو، اس آواز پر کھنچ آئے، اور دو برس کے بعد ہی ۱۸۹۴ء میں یہ منظر دیکھنے میں آیا، کہ مختلف الخیال اور متضاد عناصر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر دین و ملت کے تحفظ کی تدبیریں سوچنے لگے، اور اجنبی حکومت کی وجہ سے جو نئی صورت حال اور مشکلیں پیدا ہو گئی تھیں ان کو حل کرنے کے منصوبے بنائے۔

دار العلوم ندوۃ العلماء

اس مجلس نے اپنے وسیع اور ہمہ گیر تخیل کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جو تدبیریں اختیار کیں، ان میں ایک یہ بھی تھی کہ ایک ایسی درسگاہ کھولی جائے جس کا طریقۂ تعلیم اور نصاب تعلیم قدیم و جدید کی خامیوں سے پاک اور ان کی خوبیوں کا جامع ہو، تاکہ اس سے جو افراد تعلیم پا کر نکلیں، وہ قوم کے اندر اس جامع تخیل کا احساس پیدا کریں جس کی اس وقت ضرورت تھی، اور جس کے لئے مجلس ندوۃ العلماء کا قیام عمل میں آیا ہے، چنانچہ

قابل ہے اور کیا چھوڑنے کے قابل ہے، اس کے بجائے انھون نے اپنا سارا زور پہلی حالت کے باقی رکھنے پر صرف کیا، ان کا نصاب، طریقۂ تعلیم، اُن کے مشاغل، اُن کے مسائل، اُن کا اندازِ فکر اور طریق کار سب کا وہی تھا جو ایک صدی پہلے تھا، الا ما شاء اللہ۔

اس کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ ہمارے بزرگون نے دین و اخلاق کی جو میراث چھوڑی تھی، کچھ لوگ اس کو سنبھال کر بیٹھ گئے، اور آیندہ نسلون کو منتقل کرنے لگے، اور آج قرآن و سنت کا جو علم ہمارے پاس باقی رہ گیا ہے وہ ان ہی کی بدولت رہ گیا ہے، مگر اس گروہ کے طرزِ عمل سے کچھ نقصانات بھی ہوئے،

انیسوین صدی کے آخر مین قریب قریب پورے ہندوستان مین یہی صورتِ حال رونما تھی کہ ایک طرف جدید گروہ تھا جس مین ایک ولولہ اور جوش تھا، اور جس کا اثر روز بروز دن بدن بڑھتا جا رہا تھا، دوسری طرف ہمارا قدیم گروہ تھا، جو اپنی موجودہ حالت پر بڑی حد تک قانع تھا، اور جس کا حلقۂ اثر روز بروز گھٹتا اور سمٹتا جا رہا تھا، ان دونون گروہون کے فکر و عمل کے اس اختلاف اور اس مین افراط و تفریط کی وجہ سے اُن مین اجنبیت و بے گانگی کی ایک ایسی خلیج حائل ہوگئی، کہ دونون کا ایک جگہ جمع ہونا اور دونون سے بیک وقت تعلق قائم رکھنا بھی دشوار ہو گیا، نہ مذہبی طبقہ نے یہ ضرورت محسوس کی کہ جدید تعلیم کے فوائد سے بہرہ مند ہونا چاہیے، بلکہ وہ اس کو الحاد و زندقہ قرار دے رہا تھا اور نہ جدید تعلیم یافتہ گروہ نے اس بات کی کمی محسوس کی، کہ علم دین حاصل کرنے کے لئے اہلِ دین کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہے، بلکہ وہ اس کو قدامت پرستی اور تنگ نظری سمجھتا تھا،

قدیم و جدید کی اس کشمکش کے علاوہ خود مذہبی گروہ بھی آپس مین متفق و متحد نہین تھے، بلکہ وہ مختلف جماعتون مین بٹے ہوئے تھے، اور ہر جماعت دوسری جماعت کو گمراہ سمجھتی تھی، اُن کا آپس مین ایک جگہ جمع ہونا، ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنا ناممکن ہو گیا تھا، یہان تک کہ کتنی جگہ اختلافات نے خانہ خدا کو بھی تقسیم کر لیا تھا، جن کے اثرات کہین کہین اب بھی باقی ہین، اس صورتِ حال کی وجہ سے مسلمان تو قدیم و جدید کی تفریق کے ساتھ دوسری

داخلی اور خارجی حملے کئے جارہے تھے، اُن کی روک تھام کے لئے ندوہ نے جو پروگرام بنایا تھا، اسے سید صاحب نے ایجابی سلبی دونون حیثیتون سے پورا کیا یعنی انھون نے ان حملون کا جواب بھی دیا، اور اسلامی مسائل کی ایسی صحیح اور دلنشین تشریح کی کہ حملہ کرنے والون کی ہمتین چھوٹ گئین، اور کتنے تائب ہو کر اسلام کے گرویدہ ہو گئے،

سید صاحب کی شخصیت ملک و قوم کے مختلف الخیال عناصر کا ایک سنگم تھی، جہان مختلف دھارے آکر مل جاتے تھے، اُن کی ذات پر ہر حلقے، ہر طبقے اور ہر گروہ کو اعتماد تھا، ندوہ کی سالانہ مجلس جب تک ہوتی رہی اس مین ہر مکتب خیال کے لوگ اکٹھا ہوتے رہے، مگر اس مجلس کے برہم ہونے کے بعد علماء مین صرف ایک سید صاحب ہی کی ذات تھی جہان یہ عناصر جمع ہو سکتے، ہر طبقہ کے لوگ ان پر یکسان اعتماد کرتے، اور اُن کو اپنی مشترک علمی دینی اور سیاسی مجلسون کا صدر نشین بناتے تھے،

تحریک ندوۃ العلماء کے پیش نظر جو مقاصد تھے، مختصراً ان کا تذکرہ کرنے کے بعد اُن کی روشنی مین سید صاحب کے کارنامون کی تفصیل کی جائے گی،

ان مقاصد کی تفصیل علامہ شبلی کی زبان سے سنیئے جنھون نے ندوہ کے قالب مین نئی روح پیدا کی،

جب دار العلوم ندوۃ العلماء کی نئی عمارت بننی شروع ہوئی، اور اس کی دیوارین کچھ بلند ہو گئین تو علامہ شبلی پر اپنے لگائے ہوئے پودے کو پھولتا پھلتا دیکھ کر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی، اور ایک دن تمام طلبہ کو لے کر عمارت کے پاس گئے، جو کمرہ تفسیر قرآن کے لئے تعمیر ہو رہا تھا، وہان سے مزدورون کو ہٹا دیا، اور طلبہ کے ساتھ اپنے ہاتھون سے کچھ دیر اینٹین، گارا اور چونا ڈھوتے رہے، اسکے بعد طلبہ کو جمع کر کے ایک تقریر کی جس کے آخر مین انھون نے بڑے الحاح و زاری کے ساتھ یہ دعا کی،

"اے خدا یہ چند ناتوان، اکم حیثیت، کم مایہ بچّے تیرے گھر مین مزدوری کرنے آئے ہین، اُن کی مزدوری قبول کر، مغربی خیالات کا سیلاب مسلمانون کو اپنی رو مین بہائے جاتا ہے، جن کے ساتھ اُن کی مذہبی حالت، مذہبی علوم، مذہبی شعائر، سب اس طوفان کی زد مین ہین، اے خدا ان

اسی تجویز کے تحت لکھنؤ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نام سے ایک درسگاہ کا قیام عمل میں آیا، اسی جامع تخیل درسگاہ کے گوہر شب چراغ علامہ سید **سلیمان** ندوی رحمۃ اللہ علیہ تھے،

اس وقت مجلس ندوۃ العلماء کا مظہر محض ایک عربی درسگاہ رہ گئی ہے، مگر جس زمانہ میں یہ مجلس قائم ہوئی تھی اسوقت مستقلاً ایک نئی تحریک و دعوت اور قدیم وجدید کی جامعیت کا ایک نشان تھی، اس کے پلیٹ فارم سے دین و ملت کے بیسیوں مسئلے طے ہوئے تھے،

درسگاہ کے قیام کے بعد بھی بہت دنوں تک یہ مجلس اپنی اصلی ہیئت میں باقی رہی، مگر آہستہ آہستہ اس کی تحریکی حیثیت ختم ہوتی گئی، اور اس کے ارباب بست وکشاد کی ساری توجہ اس درسگاہ تک محدود ہو کر رہ گئی، اس میں شک نہیں کہ اس درسگاہ نے تحریک کی جامعیت اور اس کی ہمہ گیری کو کسی نہ کسی حد تک باقی رکھا اور اس کے تخیل کو عملی جامہ پہنایا، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ درسگاہ درسگاہ ہوتی ہے اور تحریک تحریک، درسگاہ کا اثر محدود ہوتا ہے اور تحریک کا اثر ہمہ گیر اور وسیع ہوتا ہے لیکن پھر بھی اس درسگاہ کے نونہالوں نے مسلم قوم کے ہر طبقہ کے فکر و عمل میں جو انقلاب، جو حرکت اور جو اعتدال و توازن پیدا کیا، اسکو بھلایا نہیں جا سکتا۔

آج ہم جس شخصیت کا ذکر کر رہے ہیں، وہ اسی مادر علمی کا پروردہ اور اسی دانشکدۂ علم و فن کا گل سرسبد تھا، اور یہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر دارالعلوم ندوۃ العلماء کی آغوش سے محض ایک سید سلیمان ندوی ہی کی شخصیت پیدا ہوئی تھی، تو بھی ہم اس تحریک کو ناکامیاب نہیں کہہ سکتے تھے، مگر اس نے تو ملک کے اندر اور ملک سے باہر ایسے نشانات چھوڑے ہیں کہ ان کے ذریعہ دین و ملت کے کتنے راہ رو منزل مقصود کا پتہ پا رہے ہیں،

سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تقریباً نصف صدی تک ندوہ کی جامعیت، ہمہ گیری اور اعتدال کو نہ محض زندہ رکھا، بلکہ اس میں اور وسعت دی، قدیم و جدید کی تفریق اور علماء کی گروہی عصبیت کو ختم کرنے اور ان کو باہم شیر و شکر کرنے میں پورے اخلاص کے ساتھ حصہ لیا، اور اس میں سب سے زیادہ کامیاب ہوئے اور اسلام اور اسلامی تمدن و تاریخ پر جو داخلی اور خارجی حملے کئے جا رہے تھے، ان کی روک تھام کیلئے ندوہ نے

دوسرے سوال کا جواب جدید گروہ کے ذہن مین وقتہً نفی کی صورت مین آئے گا لیکن ذرا غور سے کام لینا چاہئے اور پہلے ان سوالات کا جواب دینا چاہئے،

(۱) کیا مسلمانون کی قومیت مذہب کے سوا کچھ ہے ؟

(۲) اگر نہین ہے تو مذہب کے قیام کے بغیر اُن کی قومیت کیون کر قائم رہے گی ؟

(۳) اگر مذہب کی ضرورت ہے، تو مذہبی تعلیم قدیم تعلیم کے بغیر کیونکر قائم رہے گی ؟

شاید یہ کہا جائے کہ انگریزی تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم بقدر ضرورت ممکن ہے، اور اسی قدر کافی ہے لیکن کیا صرف اسی قدر تعلیم سے قرآن و حدیث کی حفاظت ہوسکتی ہے ؟ کیا اس درجہ کے تعلیم یافتہ اسلامی مشکل مسائل کی تشریح کر سکتے ہین، کیا غیر مذہب والے مذہب اسلام..................جو اعتراضات کرتے ہیں انکے مقابلے کے لئے اتنی تعلیم کافی ہے ،؟

اس کے بعد قدیم و جدید دونون طریقۂ تعلیم پر تنقید کرکے آخر مین لکھتے ہین ،

"دونون گروہ اب قوم کے ضروری اجزاء ہین .... دونون کو آپس مین دست و بازو ہوکر کام کرنا چاہئے ،

"علماء کے جس گروہ نے جدید ضرورتون کا اندازہ کیا ہے، اور اس کے موافق عربی تعلیم مین اصلاح و اضافہ چاہتے ہین ، وہ ان اصولون کے سوا اور کیا اختیار کر سکتے ہین، جو ندوہ نے اختیار کیا ہے (مقالات شبلی ج ۳)

یہ تفصیلات اس لئے پیش کی گئی ہین، تاکہ اندازہ ہوجائے کہ ندوۃ العلماء محض ایک درس گاہ کا نام نہین ہے بلکہ وہ ایک جامع تخیل تحریک تھی جس کے پیش نظر حسب ذیل مقاصد تھے،

(۱) مغربی افکار و خیالات اور تہذیب و تمدن کا سیلاب جو مسلمانون کو اپنی رو مین بہائے لیے جاتا تھا اس کا مقابلہ کیا جائے .

چند ناتوان بچوں کا دعویٰ ہے کہ وہ اس سیلاب کی ٹکر کو سنبھال لیں گے، یہ بہت بڑا دعویٰ ہے جوان کے چہرہ پر نہیں کھلتا تو ہی ہے جو اُن کی آبرو رہ جائے۔"

علامہ شبلی جن ناتوان بچوں کو لے کر مزدوری کے لئے گئے تھے، اور جن کے لئے انھوں نے خدا کی بارگاہ میں یہ دعا مانگی تھی کہ ان کو مغربی سیلاب کے مقابلہ کے لائق بنا، ان میں ایک سید سلیمان ندوی بھی تھے،

یہ پردرد اور پرسوز دعا اس کمرے کے پاس مانگی گئی تھی، جو کلام الٰہی کی تفسیر کے لئے تعمیر ہو رہا تھا، جو اس بات کی علامت تھی کہ مغربی سیلاب کے روکنے کے لئے نونہالان ندوہ جو بھی کوشش کریں گے، اس کی بنیاد کتاب اللہ پر ہوگی، چنانچہ سید صاحب نے اپنی تمام علمی سرگرمیوں میں اس کو پیش نظر رکھا،

اوپر ذکر آچکا ہے کہ ندوہ نے نہ تو جدید گروہ کی راہ عمل اختیار کی تھی، اور نہ قدیم گروہ کی، اس لئے شروع میں اس کی شدید مخالفت ہوئی، علامہ شبلی نے اس کے جواب میں بہت سے مضامین لکھے، اور اپنا نقطہ نظر نہایت سنجیدگی سے سمجھایا، ۱۹۰۵ء میں الندوہ میں ندوہ کی تعلیمی پالیسی پر ایک مضمون لکھا جس کے آخر میں لکھتے ہیں:

"ہم نے بار بار کہا ہے، اور پھر یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے لئے نہ صرف انگریزی مدرسوں کی تعلیم کافی ہے، نہ قدیم عربی مدرسوں کی، ہمارے درد کا علاج ایک معجون مرکب ہے، جس کا ایک جزو مشرقی اور دوسرا مغربی ہو۔"

جب ندوہ کی چند سالہ کوششوں سے اس کے نتائج نگاہ کے سامنے آئے تو علماء کو جدید تعلیم کی ضرورت کا کسی قدر احساس ہوگیا، مگر جدید حلقہ میں دینی تعلیم کی ضرورت کا احساس ابھی پیدا نہیں ہو سکا تھا، علامہ شبلی نے اس کے لئے ایک طویل مضمون لکھا جس میں حسب ذیل سوالات قائم کئے، اور پھر خود ہی اُن کے جوابات دیئے:

(۱) جدید تعلیم کی ضرورت ہے یا نہیں؟ (۲) قدیم تعلیم کی ضرورت ہے یا نہیں؟

پہلے سوال کے جواب میں اب اختلاف نہیں رہا، اگر کسی کو ہو تو اس سے خطاب کرنے کی ضرورت نہیں،

الندوہ جاری کیا گیا، اس رسالہ نے مسلمانوں کے فکر و نظر پر جو اثر ڈالا، اس کا کچھ حال سید صاحب ہی کی زبان قلم سے سنئے،

"اس پرچہ میں علوم اسلامیہ کی تجدید، عقل و نقل کی تطبیق، معقول و منقول اور قدیم و جدید علوم کے موازنہ اور عربی نصاب تعلیم کی اصلاح پر بہت سے محققانہ مضامین شائع ہوئے،

اس رسالہ نے سیکڑوں برس بعد علماء کی سطح جامد میں حرکت پیدا کی، اب تک علماء کے تحقیقاتی مسائل منطق، عقائد اور فقہ کے چند مسائل قرار پائے تھے جن پر گو بہت کچھ لکھا جا چکا تھا، پھر بھی جو آتا تھا، وہ انہی کو دہرا دہرا کر اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرتا تھا، حالانکہ زمانہ کا رخ ادھر سے ادھر پھر چکا تھا، اور حالات نے اسلام اور علوم اسلامیہ کی خدمت کیلئے کچھ اور ہی ضروریات پیدا کر دیئے تھے، الندوہ کا یہ بڑا فیض ہے، کہ اس نے علماے کرام کے خیالات میں انقلاب پیدا کیا، اور ان کو کتنی ہی ناگواری ہوئی ہو اور کی پیشانی پر کتنے ہی بل پڑ گئے ہوں، لیکن انھوں نے اس کو پڑھا اور پڑھنے پر مجبور ہوئے،

اس سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ علماء کے سامنے جدید مباحث کا دروازہ کھلا، اسلام اور علوم اسلام کی خدمت کے نئے طریقے ان کو نظر آئے، زبان و بیان کے انداز و پیرایۂ بیان معلوم ہوئے،

الندوہ کا اثر خصوصیت سے نوجوان علماء اور قریب فارغ التحصیل طلبہ پر جدید پڑا، نام نہیں لونگا، مگر بتا سکتا ہوں کہ بڑے بڑے مقدس آستانوں اور درسگاہوں کے حاشیہ نشینوں نے اس کے طرز نگارش اور پیرایۂ بیان کی نقل اتاری، اور اپنے اپنے دائرہ میں ناموری حاصل کی، اور ان سے دین و ملت کو فائدہ پہنچا، خود دار العلوم ندوہ کے طالب علموں کو اس سے بہت فائدہ پہنچا، اور کئی مستند طالب علموں کی (جو اس وقت مشہور مصنف ہیں) بسم اللہ اسی دبستان سے ہوئی؛"[1]

---

[1] خاص طور سے مولانا ابو الکلام قابل ذکر ہیں جن کی علمی تحریروں کا آغاز الندوہ سے ہوا،

(۲) قرآن وسنت کی حفاظت، اور اُن سے براہِ راست تعلق پیدا کرانے کی کوشش کیجائے یعنی اُن کی تعلیمات کو ایسے موثر انداز سے پیش کیا جائے کہ لوگ ان کا زیادہ سے زیادہ اخلاقی اثر لین، اور اُن کو عملاً اپنی زندگی مین نافذ کرین،

(۳) قدیم وجدید دونون طریقۂ تعلیم کی اصلاح کی جائے، اور اس کا عملی تجربہ دار العلوم ندوۃ العلماء مین کیا جائے تاکہ قوم مین ایسے تعلیم یافتہ افراد پیدا ہون جو قوم کی صحیح راہ نمائی کرسکین،

(۴) قدیم وجدید طبقون کی اجنبیت اور علماء کی گروہی عصبیت کو مٹا کر ان کے اندر اعتدال پیدا کیا جائے

سید صاحب کی زندگی اور ان کے کارنامون پر اگر ایک سرسری نظر بھی ڈال لی جائے تو یہ اندازہ ہوجائیگا کہ وہ ان مقاصد کا عملی پیکر تھے۔ انھون نے زندگی کے ہر کام اور ہر موقع پر ان مقاصد کو پیشِ نظر رکھا، وہ سیاست کی ہنگامہ آرائیون مین ہون، یا علم وفن کے گوشۂ تنہائی مین، ندوۃ العلماء کے پرسکون اجلاس مین ہون، یا جمعیۃ العلماء کے پرشور جلسون مین، فاضلانِ دیوبند کے حلقہ مین ہون یا ندویون کی برادری مین، قدیم گروہ کے حجرون مین ہون یا جدید طبقہ کے عشرت کدون مین وہ ندوہ اور اُس کے مقاصد کو کبھی نہین بھولتے تھے،

ندوہ کے مذکورہ مقاصد کی افادیت کو آج ہر طبقہ اور ہر گروہ نے محسوس کرلیا ہے، اور اسی کے مطابق اپنے اندازِ فکر اور طرزِ عمل مین کچھ نہ کچھ تبدیلیان بھی کرلی ہین، مگر نصف صدی پہلے اس کی شدید مخالفت کی گئی تھی اس مخالفت کے نتیجہ مین علامہ شبلی نے ندوہ کی معتمدی سے علٰحدگی اختیار کرلی، سید صاحب کو بھی ان مخالفتون کا سامنا کرنا پڑا، مگر ان کی جامع اور بحرِ بیکران شخصیت مین یہ ساری مخالفتین چھوٹے چھوٹے گندے نالون کی طرح گرین اور بہ گئین،

یون تو ندوہ کے پورے حلقہ نے اس کے مقاصد کو پورا کرنے مین کچھ نہ کچھ حصہ لیا، مگر سید صاحب نے ان مین سب سے زیادہ کامیابی حاصل کی، اور اُن کی کوششین سب سے زیادہ نتیجہ خیز ہوئین،

درسگاہ کے قیام کے بعد ندوہ کے مقاصد کا عملی نمونہ پیش کرنے کے لئے دوسرا قدم یہ اٹھایا گیا کہ

اسی زمانہ میں علامہ شبلی نے ندوہ کی معتمدی سے علٰحدگی اختیار کرلی، اور وہ مجلس برہم ہوگئی، جو ندوہ کے مقاصد کی تکمیل کے لئے علامہ شبلی نے کئی برس کی جانکاہ محنت کے بعد بنائی تھی، ان کی علٰحدگی تحریک ندوہ کے لئے بڑا حادثہ ثابت ہوئی، اور اس میں ایک ایسا خلا پیدا ہوگیا، جس کا اثر برسوں رہا، اور وہ خلا اس وقت پر ہوا جب ۱۹۲۳ء میں سید سلیمان ندوی دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم بنائے گئے، اس علٰحدگی کا سبب ندوہ کے تعلیمی مقاصد میں مولانا شبلی، اور مدرسین و کارکنان ندوہ میں نقطہ نظر کا اختلاف تھا، مدرسین اور کارکنوں کی اکثریت ندوہ کو اسی پرانے ڈھرے پر لیجانا چاہتی تھی، جس کی اصلاح کے لئے ندوہ کا قیام عمل میں آیا تھا، اور علامہ شبلی ندوہ کو ان اصلاحات کا نمونہ بنانا چاہتے تھے، جن کے لئے یہ درسگاہ قائم کی گئی تھی، غرض اسی کشمکش کے نتیجہ میں علامہ شبلی کو الگ ہونا پڑا، اس طرح وہ بزم علم و دین جس کی شیرازہ بندی انھوں نے برسوں کی محنت کے بعد کی تھی، منتشر ہوگئی، خود سید صاحب بھی ندوہ سے علٰحدہ ہوگئے، گو اب استاذ اور شاگرد دونوں کا ندوہ سے کوئی قانونی تعلق باقی نہیں رہا تھا، مگر اس کے مقاصد کی تکمیل کا جذبہ جو ان کی زندگی کا اب مشن بن چکا تھا، باقی رہا،

اسی زمانہ میں ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں ایک نیا شور طرابلس پر اٹلی کے حملہ سے برپا ہوا، جس سے ہر صاحب احساس کا دل بےچین ہوگیا، مولانا ابوالکلام نے جو ہندوستان میں اس کے سب سے بڑے وکیل تھے الہلال کے ذریعہ اسے ایک دینی و قومی مسئلہ بنا دیا، اور مسلمانوں کے دلوں میں مغرب کے خلاف ایک نیا جوش و جذبہ پیدا کردیا، علامہ شبلی نے بھی زبان و قلم سے اس میں پورا حصہ لیا، اور مولانا ابوالکلام کی درخواست پر سید صاحب کو الہلال کی معاونت کے لئے بھیجا، اس طرح مغربی سیلاب کے مقابلہ کا جو کام سید صاحب اب تک الندوہ کے پرسکون علمی گوشہ میں بیٹھ کر کررہے تھے، اب وہ کام سیاسی میدان میں آکر الہلال کے شعلہ بار مضامین کے ذریعہ انجام دینے لگے، الہلال کے زمانۂ ادارت میں انھوں نے بہت سے معرکۃ الآراء مضامین لکھے، اور مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف جو جذبہ مولانا ابوالکلام کے الہلال نے پیدا کیا تھا، اس میں سید صاحب کے زور قلم کو بھی بڑا دخل تھا، خصوصیت سے ان کا مضمون مشہد اکبر، تحریبۃ فی الاسلام تو اس وقت بچے بچے کی زبان پر تھا،

خود سید صاحب نے ندوہ کے مقاصد کے پیش نظر خود دینی اور تحقیقی کام انجام دیئے، اس کی ابتدا الندوہ ہی سے ہوئی ابھی سید صاحب نے اس میں دوسرا یا تیسرا ہی مضمون لکھا تھا کہ مولانا حالی پڑھ کر باغ باغ ہو گئے، اور علامہ شبلی کو ان الفاظ میں مبارکباد دی،

"سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ دارالعلوم نے اپنی تعلیم کا نہایت ہی عمدہ نمونہ پہلی ہی بار پیش کیا ہے فبارک اللہ فیہا وفی طلبتہا وفی تعلیمہا، مجھے امید نہیں بلکہ یقین ہے کہ عربی کی کامل تعلیم اور انگریزی کی بقدر ضرورت ہماری قوم میں ایسے لائق مضمون نگار اور مصنف پیدا کرے گی کہ محض انگریزی تعلیم آج ویسا ایک بھی نہ پیدا کر سکی[1]

سید صاحب کی اسی صلاحیت کی بنا پر ان کی طالب علمی ہی کے آخری زمانہ میں اُن کو الندوہ کی نیابت سپرد کر دی گئی، جس کو انھوں نے بدفعات تقریباً چار سال انجام دیا، سید صاحب نے اس مدت میں بہت سے ایسے مضامین لکھے جس کے ذریعہ مغربی خیالات اور مادی تصوریات کی سطحیت اور ناپائداری ثابت کی، اور ان کے مقابلہ میں اسلامی احکام کی فوقیت اور اسکی پائداری دکھائی مثلاً

مذہب اسلام اور علم وعقل، القرآن والفلسفۃ الجدیدہ، فنائے مادہ، اسلام پر ایک جرمن کا لکچر، اکرمات القرآن، ایمان بالغیب، اسمار القرآن وغیرہ،

ایک اہم مضمون اس وقت اردو زبان میں اشتراکیت اور اسلام کے معاشی نظام پر بیشمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں، مگر اس زمانہ میں یہ موضوع بالکل نیا تھا، اور اردو میں غالباً سب سے پہلے سید صاحب ہی نے اس پر قلم اٹھایا، اور الندوہ میں کئی قسطوں میں اشتراکیت اور اسلام کے عنوان سے ایک محققانہ مضمون لکھا، جس میں اشتراکیت پر تنقید کی، اور اس کے مقابلہ میں اسلام کے معاشی نظام کی خوبی دکھائی، تعلیم سے فراغت کے بعد سید صاحب ندوہ ہی میں استاذ ادب مقرر ہو گئے جسکی وجہ سے تعلیمی حیثیت سے بھی اُن کو ندوہ کی خدمت کا موقع ملا،

---

[1] الندوہ ربیع الآخر ۱۳۲۳ھ

اسلام اور آپ کی حیاتِ مبارکہ کے بارے میں جو غلط فہمیاں پھیلائی تھیں، ان کو دور کیا جائے، اور آپ کی سیرت کا صحیح مرقع دنیا کے سامنے پیش کیا جائے، جلد اول کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :-

"اگلے زمانہ میں سیرت کی ضرورت صرف تاریخ اور واقعہ نگاری کی حیثیت سے تھی، علم کلام سے اس کو واسطہ نہ تھا،

یورپ کے مورخین آنحضرت صلعم کی جو اخلاقی تصویر کھینچتے ہیں، وہ نعوذ باللہ ہر قسم کے معائب کا مرقع ہوتی ہے، آج کل مسلمانوں کو جدید ضرورتوں نے عربی علوم سے بالکل محروم کر دیا ہے، اس لئے اس گروہ کو اگر کبھی پیغمبر اسلام کے حالات و سوانح دریافت کرنے کا شوق ہوتا ہے، تو انہی یورپ کی تصنیفات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے، اس طرح آہستہ آہستہ یہ زہر آلود معلومات اثر کر جاتی ہیں،

علامہ شبلی نے اس کا جو وسیع خاکہ تیار کیا تھا، ابھی اس میں وہ رنگ نہیں بھرنے پائے تھے کہ جوارِ رحمت میں بلا لئے گئے، ان کے بعد سید صاحب نے انہی کے نقشِ قدم پر چل کر اس کی تکمیل کی، سیرت جلد چہارم کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :-

"ہم انشاء اللہ تفصیل سے بتائیں گے، کہ تمدن، معاشرت، بالخصوص قوانینِ نکاح، طلاق، وراثت، حقوقِ نساء، غلامی، جہاد، اصولِ حکومت (سیاست) اقتصادیات وغیرہ کے متعلق تمام دنیا کے مذاہب کے کیا اصول اور تمام سلطنتوں اور قوموں کے کیا قوانین تھے، اور آج مغرب نے اس انتہائی تہذیب تک پہنچکر کس حد تک ان اموری میں ترقی کی ہے، پھر موازنہ کر کے ہم دکھائیں گے کہ شریعتِ اسلام کے مقابلہ میں مغرب کا معراج ترقی شریعتِ اسلام کا پایۂ اولین ہے"

سید صاحب نے فکر و نظر کی جس وسعت اور مجتہدانہ بصیرت کے ساتھ سیرت کا ذخیرہ تیار کیا، اور اس کے ذریعہ مغربی افکار و خیالات پر جو تنقید کی ہے، اس کی مثال کم از کم ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں نہیں ملتی،

جب ہندوستان کی سیاست مین ذرا سکون پیدا ہوا، تو سید صاحب پھر لکھنو واپس چلے آئے، اور اتنا کے مشورے سے پونا چلے گئے،

پونا ہی کے زمانۂ قیام مین ارض القرآن جیسے اہم موضوع پر قلم اٹھایا، ارض القرآن کا موضوع جغرافیۂ قرآن ہے، اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ تو اس کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، مگر اس وقت اس کے بارے مین چند باتین جو ہمارے موضوع سے متعلق ہین، عرض کی جاتی ہین،

آج سے پچاس برس پہلے خاص جغرافیۂ قرآن پر اردو کیا عربی زبان مین بھی کوئی جامع اور مکمل کتاب موجود نہین تھی، قدیم عربی تاریخون مین متفرق طور سے اس پر بحثین ضرور ملتی ہین، مگر عربی مورخین کو قدیم زبانی اور رومی تاریخون اور اثری انکشافات سے فائدہ اٹھانے کا موقع کم ملا تھا، اس لئے جب یہ کتابین اُن کے سامنے آئین، اور عرب و شام، عراق وغیرہ مین اثری انکشافات ہوئے تو ان کی روشنی مین یورپین مورخین نے قرآن مین مذکورہ مقامات اور اُن کی قومون کے بارے مین شکوک و شبہات پیدا کرنے کی کوشش کی، سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب مین مغربی مصنفین کے تمام جدید ذرائع معلومات اور قدیم ماخذ کو سامنے رکھ کر قرآن کا جغرافیہ لکھا، مغربی مصنفین کی تاریخی تحقیقون اور قیاس آرائیون کی کمزوری دکھائی، اور قرآن پر کئے گئے ایک ایک اعتراض کا پردہ فاش اور اس کا مکمل جواب دیا، اس سلسلہ مین انھون نے عربی مورخین کی بعض تاریخی غلطیون کی وضاحت کی،

غرض اس کتاب کے ذریعہ انھون نے قرآن کو ہدف طعن بننے سے بھی بچا لیا، اس لئے اُن کی یہ خدمت دینی حیثیت سے بھی بہت اہم ہے، اور علمی و تحقیقی حیثیت سے بھی،

سیرت نبوی سیرت نبوی کی تالیف کا کام علامہ شبلی نے ندوہ ہی مین شروع کیا تھا جس مین سید صاحب اس کے شریک تھے، اس تالیف سے ان کا مقصود محض حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کی واقعات نگاری اور آپ کی کچھ اخلاقی تعلیمات کا تذکرہ نہین تھا، بلکہ اس کے متعدد مقاصد تھے جن مین ایک یہ بھی تھا کہ

کرپائے تھے کہ اعلیٰ علیین میں جگہ پا گئے، سید صاحب نے اُن کے بعد ندوہ کے اس مقصد کو پورا ہی نہیں کیا، بلکہ اس میں وسعت بھی دی،

دارالمصنفین کے کاموں کی تفصیل کا موقع نہیں ہے، لیکن اگر اس کے کارناموں پر ایک اجمالی نظر بھی ڈال لیجائے، تو اس کا اندازہ ہو جائے گا کہ مغربی مصنفین نے اسلامی نظامِ حکومت، اسلامی تاریخ اور اسلامی علوم کے بارے میں جو غلط فہمیاں پھیلائی تھیں دارالمصنفین نے ان میں سے ایک ایک کا جواب نہایت ہی علمی اور تحقیقی انداز سے دیا، یہاں کی ہر کتاب گویا ایک سوال کا مدلل جواب ہے، دارالمصنفین کا یہ علمی و تحقیقی کام گویا ایک پوری جماعت نے انجام دیا ہے، مگر یہ سب سید صاحب ہی کے فیضِ تربیت کا اثر ہے،

سیرت نبوی کی تکمیل کے بعد دارالمصنفین کا سب سے بڑا کارنامہ سیر الصحابہ کی تکمیل ہے، اس سلسلہ کی سب سے پہلی کتاب خلفائے راشدین ہے، اسلام جس طرح کا نظام دنیا میں قائم کرنا چاہتا ہے اس کی تفصیل تو سیرت کے ذریعہ کی گئی تھی، مگر اس سوال کا جواب کہ یہ نظام اپنی پوری جلوہ سامانیوں کے ساتھ آنحضرت کے بعد بھی باقی رہا یا نہیں، اس کتاب سے ملتا ہے، پھر اس کے ذریعہ اس خیال کی بھی تردید کی گئی، کہ مذہب و سیاست دونوں الگ الگ چیزیں ہیں، دونوں کی آمیزش ممکن نہیں ہے

اس کے بعد کی جلدوں میں عام صحابہ کے حالات ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی انفرادی سیرتیں اسلام کی عملی تفسیر تھیں،

سیر الصحابہ کے ساتھ سید صاحب نے تاریخ اسلام کی تالیف کا کام بھی شروع کرایا، جس کے ذریعہ بتایا گیا کہ گو خلافت راشدہ کے بعد اسلامی حکومت کا طریقۂ انتخاب شورائی نہیں رہا تھا جس کی وجہ سے اسلامی جمہوریت کی روح مردہ ہو گئی تھی، اور اس کی جگہ ملوکیت نے لے لی تھی، پھر بھی نظامِ حکومت کا پورا ڈھانچہ اسلامی ہی تھا، اس لئے علم و تمدن، اخلاق و معاملات، اور عقائد و عبادات پر صدیوں تک اس کی برکتیں باقی رہیں، نیز اس کے ذریعہ اسلامی تاریخ کے ان پہلوؤں کو بھی صحیح اور واضح طور سے پیش کیا گیا جن کو مغربی مصنفین

دارالمصنفین | ندوہ نے اپنے مقاصد کو بروئے کار لانے اور ندویوں کی فکری و علمی تربیت کے لئے یہ کوشش کی تھی کہ ندوہ میں ایک شعبہ تصنیف و تالیف بھی قائم ہو، چنانچہ ۱۹۱۰ء میں دلی میں ندوہ کا اجلاس ہوا، تو علامہ شبلی نے اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے ایک نئی تجویز یہ پیش کی کہ اس کے لئے ایک بڑا کتب خانہ فراہم کیا جائے، ان کی تجویز کے الفاظ یہ تھے،

"یہ تجویز کہ ندوہ میں ایک دائرۂ تالیف قائم کیا جائے جس کے ارکان کا کام صرف مطالعۂ کتب اور تصنیف و تالیف ہو، ...... یہ اسی وقت پوری ہو سکتی ہے، جب ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا جائے"،

اسی جلسہ میں سید صاحب نے بھی ایک مضمون پڑھا تھا جس میں اسی تجویز کو عملی شکل دینے کی متعدد تجویزیں تھیں انہوں نے آخر میں لکھا تھا،

"ندوۃ العلماء جس قسم کے علماء اپنے مدرسہ میں تیار کرانا چاہتا ہے، وہ اسکیم سے ظاہر ہے کہ یہاں کے طلبہ درجۂ عالمیت یا درجۂ تکمیل کے بعد تالیف و تصنیف میں مشغول ہوں، اور ایک بڑے پیمانہ پر صیغۂ تصنیف و تالیف قائم کیا جائے، .... اور اس ادارہ کا نام دارالمصنفین ہو"

مگر بعض کوتہ اندیشوں اور بداندیشوں کے اختلاف کی وجہ سے استاد اور شاگرد کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی کہ دارالمصنفین ندوہ میں کھلے، پھر بھی علامہ شبلی آخر وقت تک اس کیلئے کوشش کرتے رہے، اور ان کے دوسرے شاگردوں کی بھی یہی خواہش تھی، جب مولانا مسعود علی صاحب نے یہ خواہش ظاہر کی تو ان کو لکھتے ہیں:

بھائی وہ لوگ دارالمصنفین ندوہ میں بنانے کب دیں گے، کہ میں بناؤں، حالانکہ اس میں انہی کا فائدہ ہے"،

جب وہ ارباب ندوہ کی طرف سے بالکل مایوس ہو گئے، تو اسے اعظم گڈھ میں کھولنا طے کیا، وہ اس کا خاکہ تیار کر چکے تھے، اور ندوہ کے بعض ذہین طلبہ کا انتخاب بھی کر لیا تھا، مگر ابھی اسکی صورت گری نہیں

نہایت ہی محققانہ جواب دیا، اور ثابت کیا کہ مسلمانوں نے یونانی فلسفہ کی خدمت ضرور کی ہے، مگر اس فلسفہ کے وہ مقلد نہیں ہیں، بلکہ انھوں نے اس کے سارے تار و پود کو بکھیر کر رکھ دیا ہے، اسی زمانہ میں عورتوں کے حقوق کے سلسلہ میں اسلام پر اعتراض کیا گیا، اس کے رد میں ایک طویل مضمون لکھا، سنہ ۱۹۳۱ء کا پورا سال تقریباً اسی طرح کے مضامین کے لکھنے میں صرف ہوا، مشہور انگریزی اخبار اسٹیٹسمین میں ایک مضمون واقعۂ کربلا کے بارے میں شائع ہوا، جس میں بعض قابل اعتراض باتیں تھیں، سید صاحبؒ نے اس کا جواب دیا، اسی سال پنجاب یونیورسٹی میں ڈاکٹر وائل کی کتاب تاریخ اقوام اسلامیہ داخل نصاب کی گئی، جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے بارے میں بعض بے بنیاد اور توہین آمیز باتیں تھیں، سید صاحب نے اس کے خلاف موثر طور پر احتجاج کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کتاب نصاب سے خارج کر دی گئی، اس کے علاوہ اور بھی بہت سے فتنہ نگاروں کا بھی جواب دیا،

معارف کی علمی اہمیت اور اس کی قدر افزائی کا اندازہ اس سے لگتا ہے کہ مولانا محمد علی نے ایک بار سید صاحب کو لکھا کہ

"میرے متعدد انگریزی رسالوں کی جلدیں نہیں بندھی ہیں، یہ شرف خاص معارف کو حاصل ہوگا کہ مجلدات تیار کرائی جائیں گی،"

مولانا ابوالکلام اس کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"معارف کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں، صرف یہی ایک پرچہ ہے، اور ہر طرف سناٹا ہے،"

ایک اہم کارنامہ | اس سلسلہ میں اُن کا سب سے بڑا کارنامہ سیرت النبی کی تالیف ہے، یہ کتاب نہ محض سوانح نبوی کا بہترین ذخیرہ ہے، بلکہ اسلام کی بنیادی تعلیمات کا بھی ایک عمدہ مرقع ہے،

اردو کیا عربی میں بھی سیرت نبویؐ پر جتنا ذخیرہ موجود ہے، کوئی بھی ضعیف اور رطب و یابس روایات سے خالی نہیں ہے، مگر اس سیرت کی یہ سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ اس کی ساری بنیاد یا تو قرآن پر ہے یا صحیح

نے غلط طور پر پیش کیا تھا،

ہندوستان کی جو تاریخیں انگریزوں نے لکھیں ان میں انھوں نے اپنے سیاسی مصالح کے پیش نظر مسلمانوں کے دور کو ایسے انداز میں پیش کیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں کشمکش کی خلیج زیادہ سے زیادہ ہو، سید صاحب نے ادارہ کے ابتدائے قیام ہی سے اس کام کی طرف توجہ کی، خود متعدد مضامین لکھے اور دار المصنفین کے متعدد رفقاء کے سپرد یہی کام کیا،

اس کے علاوہ کون ایسا اہم موضوع ہے جس پر دار المصنفین نے کتابیں نہیں پیش کی ہیں، قرآن، حدیث، فقہ، فلسفہ، تمدن، غرض کوئی گوشہ نہیں چھوڑا ہے،

معارف ادارہ کے قیام کے تقریباً دو ہی سال بعد سید صاحب نے معارف نکالا، اس پرچہ کے ذریعہ انھوں نے دین و مذہب کی، ملک و ملت کی، اور زبان و ادب کی جو بیش بہا خدمت انجام دی اور اسکے ذریعہ ندوہ کی تحریک کو جس طرح زندہ کیا، ہندوستان میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے، قدیم وجدید کا کون سا ایسا مسئلہ ہے جس پر معارف میں مضمون شائع نہیں ہوا، خصوصاً مغربی افکار و خیالات کی تردید میں تو صدہا مضامین اس میں شائع ہوئے ہوں گے، خود سید صاحب نے جو بیش قیمت مضامین اس میں لکھے ہیں، اُن کی ضخامت کئی ہزار صفحات ہوگی، انھوں نے خاص طور سے اہلِ مغرب کے افکار و خیالات کے جواب میں جو مضامین لکھے ہیں انکی تعداد بھی کافی ہے،

یورپ کے مشہور مستشرق مارگولیتھ کی کتاب کے حوالہ سے مانچسٹر گارجین میں ایک مضمون آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے بارہ میں شائع ہوا تھا جس میں مضمون نگار نے بعض نامناسب باتیں واقدی کی روایت سے نقل کی تھیں، سید صاحب نے کئی نمبروں میں اس کا جواب دیا، اس بحث میں مارگولیتھ کے علاوہ ڈرہم یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر گولیم نے بھی حصہ لیا، سید صاحب نے ان دونوں کو اپنے محققانہ مضامین کے ذریعہ خاموش کیا، ۱۹۲۳ء میں ایک یورپین اہل قلم نے ایک مضمون میں لکھا "مسلمان ارسطو کی کاڑی کے قلی تھے"، سید صاحب نے اس کا

روایتوں کو جزوِ ایمان بنا بیٹھے، آج بھی مسلمانوں میں ان دونوں انتہا پسندیوں کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ سید صاحب نے سیرت کا جو حصہ معجزات پر لکھا ہے، اس میں ان دونوں باتوں کو سامنے رکھا، ایک طرف انھوں نے عقل پسندوں کی خشک پسندی کی دھجی بکھیری، اور دوسری طرف ہزاروں روایتوں سے انتخاب کرکے معجزاتِ نبوی کا ایک صحیح مرقع پیش کیا، اور اس استدلال اور انتخاب میں انھوں نے کسی تجدد سے کام نہیں لیا، بلکہ انھوں نے منکرین کے سامنے انہی کے مسلّم عقلا و ائمہ کے اقوال سے معجزات نبوی پر استدلال کیا، اور روایت پرستوں کے موقف کی کمزوری انھوں نے خاص محدثانہ اصول کی روشنی میں دکھائی، جن کی وجہ سے دونوں کو خاموش ہونا پڑا،

معجزاتِ نبوی کے بارے میں عام طور پر یہ خیال ہے کہ معجزہ نام ہے محض کسی ظاہری خرقِ عادت واقعہ کا، جیسے عصائے موسیٰ، یدِ بیضا، شق القمر وغیرہ، سید صاحب نے اس عام غلط فہمی کا پردہ بڑی خوبی کے ساتھ چاک کیا، اور انھوں نے بتایا کہ معجزہ محض اسی کا نام نہیں ہے، یہ تو معجزہ کی ظاہری اور معنوی قسم ہے، کسی نبی کا اصل معجزہ اس کی تعلیم، اس کے اثرات اور نتائج، اس کی پاکیزہ سیرت، اس کا اخلاق اور کردار ہوتا ہے، جن کا اس کی زندگی کے ہر لمحہ میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، اس کو انھوں نے باطنی معجزہ سے تعبیر کیا ہے، ظاہری معجزہ بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے، مگر اس کی حیثیت اصل کی نہیں فرع کی ہے، اس کا اثر کچھ دیر رہتا ہے، اور باطنی معجزہ کا اثر تا قیامت رہے گا، پھر اس دعویٰ پر انھوں نے قرآن و سنت سے سیکڑوں دلیلیں دی ہیں، جن میں سے ہر دلیل نہایت ہی محکم اور ناقابلِ تردید ہے (ملاحظہ ہو سیرت حصہ سوم ز ص ۱۹۳ تا ۲۲۵)

معجزہ کے سلسلہ میں دوسری غلط فہمی یہ بھی ہے کہ انبیاء علیہم السلام براہِ راست کائنات کے تصرف پر قادر ہیں، وہ جب وقت جو چاہیں کر سکتے ہیں، اس غلط فہمی کا شکار سب سے زیادہ عیسائی، اور کسی حد تک جاہل مسلمان ہیں، سید صاحب نے اس سلسلہ میں قرآن کی بے شمار آیات کی روشنی

اور مستند احادیث نبوی پر،

سیرت نبوی کے علاوہ بھی سید صاحب نے جتنے دینی کارنامے انجام دیئے ہیں، ان میں ان کی یہ خصوصیت نمایان نظر آئے گی کہ انھون نے اپنے ہر دعوی کی دلیل قرآن یا سنت صحیحہ سے دی ہے، ہر سوال کے جواب میں قرآن کی کوئی آیت یا حدیث نبوی پیش کی ہے، غرض یہ کہ سیرت کا ضخیم ذخیرہ ہو، یا خطبات مدراس اور معارف کے مضامین، ان سب میں اُن کی یہ امتیازی خصوصیت نمایان نظر آئے گی، خود فرماتے تھے کہ میں نے سیرت کی تالیف اور اسلامی مسائل میں کتاب سنت کے علاوہ کسی تیسری چیز کو بنیاد نہیں بنایا ہے"

بسا اوقات قرآن وسنت سے استدلال کرنے میں وہ اس وقت نظری سے کام لیتے ہیں کہ عام اہل علم کے ذہن کی رسائی، وہان تک نہین ہوتی، اور غالبًا یہی وجہ ہے کہ بعض کم سوادون نے ان کی اسی نارسائی کی بنا پر اُن کی قرآن فہمی پر اعتراضات بھی کئے ہین،

سید صاحب کی اس خصوصیت کی تفصیل کے لئے مستقل ایک مضمون کی ضرورت ہے، اگر مجمل طور سے اُن کے کارنامون کے بارے مین یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا، کہ سید صاحب نے براہ راست قرآن وسنت سے اسلامی مسائل کی جو عالمانہ تشریح کی اور انکی روشنی میں سیرت نبوی کی جیسی جدید ترتیب وتبویب کی ہے، اور پھر ان سب کا ایک دوسرے سے جو ربط وتعلق دکھایا ہے، اس کی مثال پورے اسلامی لٹریچر کی کسی ایک تصنیف مین ملنی مشکل ہے، چند مثالین یہان دیجاتی ہین، جن سے قرآن وسنت پر ان کی وسعت نظر، ان مین غور وتدبر اور اُن سے نتائج اخذ کرنے مین اُن کی مجتہدانہ بصیرت کا اندازہ ہوجائے گا، اور یہ بھی معلوم ہوجائے گا کہ سیرت نبوی کے سرچشمہ کو انھون نے ضعیف روایتون کی آلایشون سے کس طرح پاک وصاف کرکے ہمارے سامنے پیش کیا ہے، اور اس کا اندازہ سب سے زیادہ معجزات کی بحث مین ہوتا ہے،

معجزات نبوی کے سلسلہ مین مسلمانون نے ہمیشہ یا تو افراط سے کام لیا، ہر یا تفریط سے جن لوگون نے افراط سے کام لیا، وہ انکا انکار ہی کر بیٹھے، اور جن لوگون نے تفریط کو راہ دی، وہ ہزارون بے سروپا

شکر وغیرہ کی جو تفصیل کی ہے، اور ان باطنی کیفیات کے حصول کے لئے قرآن و سنت کی روشنی میں جو طریقہ بتایا ہے اس کا عشر عشیر بھی کسی مروجہ تصوف کی کتاب میں نہیں ملتا، سلسلہ سیرت کی دوسری اہم کتاب خطبات ہیں یہ وہ جلسے ہیں جو انھوں نے مدراس میں دیئے تھے، اس کتابچہ میں انبیائے کرام کی انسانی خدمت دوسرے بانیان مذاہب کی تعلیم کی تاریخی حیثیت اور سیرت نبوی کی ہمہ گیری کا جو مرقع پیش کیا گیا ہے اگر اس کو کوئی غیر مسلم غیر جانبدارانہ نقطہ نظر سے پڑھے، تو وہ اسلام اور پیغمبر اسلام کی ذات سے متاثر ہی نہیں بلکہ ان کا عقیدتمند ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، اس کتاب نے مسلم قوم کو سیرت نبوی پر بولنے اور لکھنے کا ایک نیا ماخذ دیا، اس کی بدولت مقررین کو سیرت نبوی کے پیش کرنے کا ایک نیا انداز اور نیا ڈھنگ معلوم ہوا، بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس کی بدولت کتنے لوگوں کو سیرت پر بولنا آگیا،

دوسرے ان کے وہ بیسیوں مضامین ہیں، جو انھوں نے قرآن وسنت کے مختلف موضوعوں پر معارف میں لکھے ہیں، ان مضامین کے علاوہ انھوں نے اس مقصد کی خاطر مولانا حمید الدین صاحب فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کے مختلف حصوں کو اپنے خاص اہتمام سے چھپوایا، جن کی وجہ سے قرآن فہمی کی ایک نئی راہ کھلی، اس مختصر تفصیل سے اندازہ ہو گیا ہوگا، کہ قرآن وسنت کی حفاظت وخدمت کے سلسلہ میں سید صاحب کی امتیازی خصوصیت کیا تھی، اور علما میں اُن کا مخصوص مقام کیا تھا،

دوسرا مقصد | ندوۃ العلماء کے پیش نظر دوسرا اہم مقصد موجودہ نصاب تعلیم اور طریقہ تعلیم کی اصلاح تھا، نصاب تعلیم اور طریقہ تعلیم کی اصلاح کے سلسلہ میں ندوہ کے پیش نظر قریب قریب وہی نقشہ تھا، جو ڈیڑھ صدی پہلے شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پیش کیا تھا یعنی ابتدائی صرف ونحو اور عربی ادب کی تعلیم کے بعد طلبہ کو براہ راست قرآن وسنت کی تعلیم میں لگا دیا جائے، اور پھر یہ سلسلہ تکمیل تعلیم تک جاری رہے البتہ طلبہ کی استعداد کے اضافہ کے ساتھ ساتھ ان کی تعلیم وتدریس کے معیار میں بھی اضافہ ہوتا جائے، یہاں تک کہ اختتام تعلیم تک ان ماخذ پر ایک تحقیقی نظر ہو جائے، دوسرے علوم وفنون مثلاً فقہ، اصول فقہ کی تعلیم، قرآن وحدیث کی تعلیم کے بعد یا پھر ضمنی طور

میں ثابت کیا ہو کہ قرآن نے اس ذہنیت کی اصلاح کی ہے، اور اس نے بتایا ہے کہ معجزہ کا ظہور نبی کی قدرت و تصرف سے نہیں ہوتا، بلکہ وہ خالص خدا کی قدرت اور حکمت کا کرشمہ ہوتا ہو،

غرض یہ کہ اس سلسلہ میں اس طرح کی نہ جانے کتنی غلط فہمیوں کو انھوں نے دور کیا ہے، یہ کہنا امرِ واقعہ کا اظہار ہوگا کہ معجزات انبیاء سابقین اور معجزات نبویؐ پر قرآن کے دلائل کا اتنا انبار، اور فکر و استدلال کا ایسا اچھا مرقع، صحیح روایات کا اتنا بڑا ذخیرہ کسی زبان میں حتی کہ عربی میں بھی موجود نہیں ہو،

معجزات نبویؐ کی طرح معراج نبوی کے بارہ میں بھی عام طور پر اہلِ علم محض روایات ہی پر اعتماد کرتے چلے آتے تھے جس کی وجہ سے یہ ایک مافوق الفطرت واقعہ تو ضرور معلوم ہوتا تھا، مگر اس مافوق الفطرت واقعہ کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ ہماری زندگی کے لئے اس کی کیا اہمیت ہو؟ اگلے انبیاء کے ساتھ بھی واقعہ پیش آیا یا نہیں؟ اس کا صحیح نقشہ کیا ہے؟ اس میں بارگاہِ خداوندی سے کیا پیغام عطا ہوا ہے؟ اس کے سب گوشے بڑی حد تک تشنۂ تفصیل تھے، سید صاحب نے ان تمام گوشوں پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہو اور ہر جگہ اپنے استدلال کی بنیاد قرآن اور صحیح روایات ہی کو بنایا ہے، محض واقعہ میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے کہیں کسی روایت کا سہارا نہیں لیا ہے، خاص طور سے انھوں نے معراج کے پیغام کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اس کی نظیر کسی دوسری کتاب میں کم از کم عاجز کو نظر نہیں آئی،

عام طور پر معراج کا پیغام پنج وقتہ نماز کو سمجھا جاتا ہے، سید صاحب نے بتایا کہ یہ معراج کے پیغام کا ایک اہم جزو ہے، کل نہیں ہے، انھوں نے دکھایا ہو کہ سورۂ اسراء میں عقائد، عبادات، تمدن اور معاشرت و سیاست کے جو اصول بیان کئے گئے ہیں، وہ سب معراج ہی کے پیغامات ہیں، معراج نبویؐ محض ایک خرقِ عادت واقعہ نہیں ہے، بلکہ یہاں سے نبوت محمدی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہو (سیرت جلد ۳ میں تفصیل ملاحظہ ہو،

اسی طرح سید صاحب نے سیرت جلد ۵ میں عبادات قلبیہ کے تحت اخلاص، تقویٰ، صبر،

تحقیقی تفہیم اور براہ راست اس کے مطالعہ کا سلسلہ شروع کرایا تھا، اسی طرح نحو و صرف کی کتابوں میں بھی انھوں نے بہت کچھ رد و بدل کر دیا تھا، بلاغت و معانی میں مختصر و مطول کے بجائے امام بلاغت عبدالقاہر جرجانی کی کتاب دلائل الاعجاز رکھ دی تھی، انگریزی تعلیم کا بھی کچھ سلسلہ شروع ہو گیا تھا، سید صاحب نے اس اصلاح کو اور وسعت دی، انھوں نے عربی ادب کا معیار پہلے سے بلند کر دیا، حدیث کی تعلیم تیسرے ہی درجہ سے شروع کرائی، براہ راست قرآن سے قرآن کی تعلیم بالکل ابتدا سے انتہا تک پھیلا دی، حتیٰ کہ دارالعلوم ندوہ میں بچوں کو ترکیب کی مشق ہی قرآن کے آخری پارہ سے کرائی جاتی ہے، انگریزی کو نصاب کا ایک ضروری جزء قرار دیا،

عربی مدارس میں عموماً عربی ادب کی جو کتابیں خواہ وہ نثر کی ہوں، یا نظم کی پڑھائی جاتی ہیں، وہ بیشتر متاخرین یا عجمی مذاق شعراء و ادباء کی ہیں جن کا اسلوب بیان نہایت ادق اور پیچیدہ ہوتا ہے، جن میں الفاظ زیادہ اور معانی کم ہوتے ہیں، ان کے پڑھنے پڑھانے سے عام طور پر طلبہ کو عربی الفاظ اور کچھ عربی ترکیبوں پر تو ضرور عبور ہو جاتا ہے، مگر ان کے ذریعہ نہ تو عربی کا ستھرا اور پاکیزہ مذاق ہی پیدا ہوتا ہے، اور نہ قرآن کے سادہ اور دلنشین اسلوب بیان سے مناسبت ہی پیدا ہوتی ہے،

اس سلسلہ میں دوسری خامی قدیم طریقۂ تعلیم میں یہ تھی، کہ اس میں طلبہ میں عربی تحریر و تقریر کی صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی تھی، ندوہ کی اصلاحی تحریک سے پہلے عربی مدارس کے عربی مذاق کا کیا حال رہا ہوگا، اس کا اندازہ ایک حال کے واقعہ سے لگائیے، جو مولانا ابوالحسن علی صاحب کے ساتھ پیش آیا تھا، مولانا نے بیان کیا، کہ میں ایک مجلس میں گیا، جہاں ایک مشہور عربی درسگاہ کے ممتاز شیوخ موجود تھے، میں جس وقت مجلس میں پہنچا، تو یہ حضرات کھانے میں مشغول تھے، ندوی سمجھ کر ایک برگزیدہ بزرگ نے برجستہ عربی میں فرمایا، کہ

یاشیخ تعال واجلس ھھُنا وکل معنا۔

اُن کے ساتھ ہی دی جائے تاکہ طلبہ کے ذہن میں اصل و فرع کا فرق بھی پورے طور پر بیٹھتا جائے، اور یہ بھی معلوم ہوتا جائے، کہ یہ علوم بجائے خود ماخذ دین اور بنیاد نہیں ہیں، بلکہ اصل ماخذ قرآن و سنت کے خادم یا نتائج و وسائل ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس اصلاح کی ابتدا سب سے پہلے خود دارالعلوم ندوۃ العلماء سے ہونی چاہیے تھی، مگر ابتدا میں ندوہ کو جو مدرسین اور منتظمین ملے، اُن میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی، جو اُس نصاب تعلیم میں جو کئی صدی سے عربی مدرسوں میں پڑھایا جا رہا تھا، کسی ترمیم کے لئے راضی نہ تھے، حالانکہ یہ اُن کو بخوبی معلوم تھا کہ اس نئی درسگاہ کے قیام کا بنیادی مقصد ہی اصلاح نصاب ہے، اور اُن کو اس طرف بار بار توجہ بھی دلائی گئی، مگر چونکہ ان کے پشت پر پورے مذہبی طبقہ کی حمایت موجود تھی، اس لئے انھوں نے اپنے اس رویہ میں کوئی تبدیلی نہیں کی، اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیجئے کہ امرتسر میں ندوہ کے سالانہ اجلاس میں جب علامہ شبلی نے اپنا مشہور اصلاحی ترکیب بند پڑھا، تو مولانا فاروق چریا کوٹی جو ندوہ ہی میں صدر مدرس اور علامہ شبلی کے استاد رہ چکے تھے، ان شعروں پر بہت خفا ہوئے جن میں ۴ عناصر کے نظریہ اور فلسفۂ قدیم پر تعریض و تنقید تھی اور طلبہ کے سامنے ۴ عناصر کے وجود پر کئی دن تک تقریر کرتے رہے، اس ترکیب بند کا ایک شعر یہ ہے؛

تا چہ سودت دہد آن فلسفۂ عہد قدیم

تا چہ سودت دہد آن ہیئت پارینۂ ما

علامہ شبلی نے جو تحریک ندوۃ العلماء میں ابتدا سے شریک تھے، اس ذہنیت کے بدلنے کے لئے بڑی سخت جد و جہد کی، اسی غرض سے دارالعلوم میں قیام کیا، اور اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہو گئے تھے، مگر پھر اُن کی علیحدگی سے یہ اصلاح کی تحریک کچھ دنوں کیلئے دب گئی، اور پھر اس کو پوری کامیابی اس وقت ہوئی جب سید صاحب معتمد بنائے گئے،

سید صاحب نے بھی ندوہ کے اس مقصد کو بروئے کار لانے کے لئے پوری جد و جہد کی اور اُن کی اس جدّ و جہد کا نتیجہ ندوہ کے اندر بھی اچھا نکلا، اور ندوہ سے باہر بھی، علامہ شبلی نے اپنے زمانہ معتمدی ہی میں قرآن کی

بہ قدیم عربی الفاظ، ترکیبیں اور انشاء کے متعلق سوالات ہیں، جن کو پڑھ کر بچوں میں عربی مذاق آسانی سے ہو جاتا ہے، جدید تعلیمی تقاضوں اور تجربوں کے پیش نظر ندوہ کے دوسرے فضلاء نے اس کے لئے اچھی ریڈریں تیار کرلی ہیں، مگر اس سلسلہ کی سب سے پہلی کوشش سید صاحبؒ نے کی، اُن کی یہ کتاب ملک میں مقبول ہوئی، اس مقبولیت کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے، کہ اب تک اس کے ۱۵-۱ اڈیشن نکل چکے ہیں،

اس سلسلہ میں سید صاحب نے دوسری کوشش یہ کی کہ جدید عربی الفاظ کا ایک لغت "لغات جدیدہ" نام سے تیار کیا جس کے ذریعہ ہندوستان کے عربی مدارس کے طلبہ ہزاروں جدید عربی الفاظ سے واقف ہوئے، یہ کتاب سید صاحب کی ابتدائے عمر یعنی آج سے پچاس برس پہلے کی تصنیف تھی، اور جدید عربی ادب میں نئے نئے خیالات اور جدید اکتشافات کی وجہ سے برابر نئے الفاظ، نئی ترکیبیں داخل ہو رہی تھیں، اس لئے اس کتاب کے دوسرے تیسرے اڈیشن کے وقت اُن کو اس کتاب میں ترمیم و اضافہ کا خیال ہوا، اس کام کے لئے انھوں نے اپنے محبوب شاگرد مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کو منتخب کیا، اور اُن کی اصلاح سے یہ کتاب دوبارہ سہ بارہ شائع ہوئی،

اصلاح نصاب کی ان داخلی کوششوں کے علاوہ سید صاحب نے بہت سی خارجی کوششیں بھی کیں، اس موضوع پر مضامین لکھے، متعدد بڑی اور چھوٹی قدیم و جدید درسگاہوں کو اس سلسلہ میں مفید مشورے دیئے، خاص طور سے جو درسگاہیں ان کے مشورے سے مستفید ہوئیں ان میں مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، جامعہ ملیہ دہلی، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، جامعہ عباسیہ بھاولپور، مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ، اسلامیہ کالج پشاور وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں،

۱۹۳۳ء میں سید صاحب نادر شاہ کی دعوت پر افغانستان گئے، اس سفر میں ڈاکٹر اقبال اور بعض دوسرے اہل علم سید صاحب کے ساتھ تھے، سید صاحب نے نادر شاہ سے تعلیم کے مسئلہ پر جو گفتگو کی اس میں انھوں نے اپنے خیالات کی پوری ترجمانی کی، انھوں نے فرمایا کہ

"افغانستان کی عربی و مذہبی تعلیم کا نصاب ایسا ہو کہ طلبہ میں موجودہ زمانہ کے لحاظ سے

مولانا نے کہا اس عربیت پر مجھے ہنسی تو بہت آئی، مگر بزرگوں کا مجمع تھا، اس لئے ضبط کرکے کہا :-

"اما الجلوس فنعم واما الطعام فلا"

اس کے بعد پھر اردو میں بات چیت شروع ہوگئی،

ندوہ نے شروع ہی سے عربی نصاب تعلیم اور طریقۂ تعلیم کی اس خامی کی طرف توجہ کی تھی، اور کسی حد تک یہ خامی شروع ہی میں دور بھی ہوگئی تھی، مگر پھر بھی جدید ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے، ابھی اس میں مزید وسعت کی ضرورت تھی، سید صاحب نے اس کی طرف خاص طور سے توجہ کی، متعدد نثر و نظم کی پرانی کتابیں نصاب سے خارج کیں، اور متعدد نئی کتابیں داخل کیں، عربی ادب و انشاء کی تعلیم کیلئے بعض ممتاز اساتذہ کو عربی ممالک سے بلاکر ندوہ میں رکھا، بعض طلبہ کو عربی ممالک میں تعلیم کے لئے بھیجا، عربی اخبارات و رسائل کے منگانے کا اہتمام کیا، طلبہ کی ایک مجلس نادیۃ العربیۃ کو جو خاص اسی مقصد سے قائم کی گئی تھی، ترقی دی، غرض اس شعبہ کی اصلاح کے لئے ہر ممکن کوشش کی،

سید صاحب کے دور میں ندوہ کے تمام علمی شعبوں کو ترقی ہوئی، مگر خاص طور سے اس مبارک دور میں عربی ادب و انشاء کو بہت زیادہ عروج ہوا، اس دور میں ندوہ نے عربی ادب کے جیسے لعل بے بہا قوم کے سامنے پیش کئے، اس کی مثال ہندوستان کی کوئی درسگاہ نہیں دے سکتی، اس دور کے متعدد ندوی فضلاء کی عربی ریڈرین داخل درس ہیں، اور ان کی متعدد عربی تصنیفیں وہاں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو رہی ہیں، اور ان کے متعدد اڈیشن نکل چکے ہیں،

اصلاح نصاب کے سلسلہ میں موجودہ ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے ایک کام جدید عربی ریڈروں کی تیاری کا بھی تھا، سید صاحب نے اس سلسلہ میں دوسروں سے بھی کام لیا، اور خود بھی اس کام کو انجام دیا، انھوں نے بچوں میں عربی ادب کا مذاق پیدا کرنے کے لئے دروس الادب کے نام سے دو رسالے لکھے جن میں سیکڑوں

ہند مخلص الایمان، جان نثار اسلام اور دینی عقیدت سے سرمست جدید تعلیم یافتہ ہستیان ہین، وہ
باہم مصالحت اور موافقات کے خوشگوار نتائج ہین،

یہ طرز روش دو ستارین مصالحت سید صاحب ہی کی کوششون کا نتیجہ تھی،
…ن کی تفریقون اور فرقہ بندیون کا ایک بڑا سبب علماء کی غلط بینی اور اُن کی تنگ نظری ہے، سید صاحب نے
بڑے درد و سوز کے ساتھ اُن کو اس خامی کی طرف متوجہ کیا،

"مسلمانون کی مضبوطی کا راز خود اُن کے درمیان باہم اتفاق و اتحاد اور رواداری ہے، تمام
لوگ جو قائین توحید و رسالت مین مشترک اسلامی مفاد کی غرض سے ملت کے باہم مشترکہ
…ائل مین اپنی وحدت ارادہ اور وحدت عمل کا ثبوت دین، اور مختلف فیہ مسائل مین افہام
ان کے لئے مناسب لب و لہجہ اور طریقۂ ادا سے کام لین، مسلمان جس ملک مین تباہ ہوئے
…حدیث مشہور کے مطابق دشمنون کے حملہ سے نہین، بلکہ آپس کے اختلاف سے"

(خطبۂ صدارت ص ۵۲)

سید صاحب زندگی بھر اسی جادۂ اعتدال اور محبت و مسامحت کی اس صراط مستقیم پر قائم رہے
…اسی کی وجہ سے علماء مین سب سے زیادہ کامیاب رہے، اپنے سب سے زیادہ محبوب شاگرد مولانا
…اب ندوی کو ایک خط مین لکھتے ہین،

"محبت، اعتماد اور مسامحت ہمارا دستور العمل ہے، چنانچہ اس وقت تک اس مین
…ابی ہوئی ہے، جس دن یہ بات نہین رہے گی، مین نہین رہون گا،"

(مکاتیب سلیمان ص ۱۳۰)

…ب کے اس طرز عمل کا اثر یہ ہوا کہ مختلف خیال کے لوگ اعتماد کرتے تھے، اور وہ ان کے آپس کے
…مین اکثر ہی حکم بنائے جاتے تھے، مولانا محمد علی اور مولانا عبدالباری کے سیاسی اور مذہبی

سیاسی و اجتماعی اصلاحات کی طرف میلان ہو، اور ان میں مذہبی شیفتگی بھی پیدا ہو،

۱۹۴۳ء میں صوبہ بہار و اڑیسہ کے وزیر تعلیم جناب سید عبدالعزیز صاحب مرحوم نے [illegible]
مدارس کے نئے نصاب کی ترتیب و اصلاح کے لئے رانچی تکلیف دی، اور سید صاحب نے اس مبارک
مناظر احسن صاحب گیلانی کی معیت میں انجام دیا، بہاولپور میں ندوہ کی طرز کی ایک درس گاہ جا
اسکے نصاب کی ترتیب و اصلاح میں بھی سید صاحب نے حصہ لیا،

تیسرا مقصد | ندوہ کا تیسرا مقصد مسلمانوں کے مختلف مذہبی فرقوں، جماعتوں اور جدید و قدیم
اور افراد کے درمیان اتحاد و اتفاق، اور ان میں انتہا پسندی، اور تعصب و تحزب کے بجائے
اور وسعت نظری پیدا کرنا تھا، ارباب ندوہ نے شروع سے اس مقصد کے لئے جد و جہد کی
بڑی حد تک کامیابی ہوئی، ندوہ کی انتظامی مجلسیں اور اس کے عام اجلاس اس اتحاد و اتفاق کا
روح پرور منظر پیش کرتے تھے،

سید صاحب نے بھی ندوہ کے دوسرے مقاصد کی طرح اس مقصد کو بھی ہمیشہ حرز جاں
۱۹۲۶ء میں سید صاحب کو جمعیۃ العلماء کی صدارت پیش کی گئی، تو انھوں نے اپنے خطبہ صدارت
اس احسان کا ذکر علماء کے بھرے ہوئے مجمع میں ان الفاظ میں کیا،

"آج سے تیس برس پہلے چند عاقبت بیں اور معاملہ فہم علماء نے ندوۃ العلماء کی تاسیس کی
اسلام کو جس قسم کے خدمتگزاروں کی ضرورت پیش آئے گی، اس کے لئے قبل از وقت تیاری کا موا
یہ ہوا کہ ہندوستان میں جدید و قدیم نئے اور پرانے خیالات اور جمود و حرکت کے بیچ میں صلح
قائم ہو گئی، اور پٹنہ کے اجلاس ندوۃ العلماء میں یہ موقع پیش آیا کہ طرفین دو
یعنی جدید و قدیم میں مصالحت ہو گئی،

"آج ہمارے درمیان جو چند مصلحت شناس دانائے حال اور اصلاح کوش علماء کا

فراہی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی وغیرہ جیسے مختلف الخیال اور مختلف المذاق اشخاص سے سید صاحب کا کسی نہ کسی درجہ میں تعلق تھا،

ممکن ہو کہ ان کی اس خوبی کو کوئی شخص خامی پر محمول کرے، مگر بہرحال اس خامی کے پیدا کرنے کے لئے بھی بڑی عالی حوصلگی، اور وسعت ظرف کی ضرورت ہے، جو بڑی مشکل سے پیدا ہوتی ہے۔

سید صاحب ندوہ کی درسگاہ کے لئے عملی طور پر بھی بہت کچھ کیا ہے، دارالعلوم ندوہ کی مسجد انہی کے دور کی یادگار ہے، عباسیہ ہال انہی کے دور میں مکمل ہوا، طلبہ کا دارالاقامہ انہی کی کوششوں سے بنا، ندوہ کو ہزاروں روپیے کی مالی امداد تنہا ان کی کوششوں سے حاصل ہوئی،

سید صاحب کو ندوہ سے جو تعلق خاطر تھا، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ آخر عمر میں وہ ندوہ کے مقصد کے بغیر کوئی سفر کرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے، مولانا مسعود عالم صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"گو ڈھاکہ اور جانا وا سے بڑا دا تھا، مگر اب تک ندوہ کے بغیر سفر کرنے کو جی نہیں چاہتا"،

ندوہ کے طلبہ میں کچھ دنوں بدنظمی اور دینی احساس کی کمی ہوگئی تھی، ان کی کوششوں سے جب یہ خامی دور ہونے لگی، تو ان کو حد درجہ مسرت ہوئی، اس مسرت میں مولانا مسعود عالم صاحب مرحوم کو لکھتے ہیں،

"آپ سُن کر خوش ہوں گے کہ دارالعلوم کا رنگ بدل رہا ہے، طلبہ ڈسپلن سے آشنا ہو رہے ہیں"

سید صاحب ندوہ کے مقاصد اور اس کے طریقۂ کار کو جامد چیز نہیں سمجھتے تھے جن میں ضرورت کے مطابق کوئی تغیر نہیں کیا جا سکتا بلکہ وہ اس کو ایک ترقی پذیر چیز سمجھتے تھے جس میں ضرورت کے مطابق تبدیلی کی جا سکتی ہے، انہی کو لکھتے ہیں،

"ندوہ کے مقاصد و مطالب کو نئی روشنی میں پھر سے دیکھنا ہے، کہ اب کیا موادِ

اختلافات کے زمانہ مین سید صاحب ہی کی ایک ذات ایسی تھی، کہ باوجود دوری کے ان پر دونون اعتماد کرتے تھے، چودھری خلیق الزمان اور مولانا عبد الباری کی کشمکش سید صاحب ہی کی کوششون سے ختم ہوئی، اس کے علاوہ علماء کے مختلف گروہون اور افراد کے درمیان بھی عموماً سید صاحب ہی نقطۂ اتصال بنتے تھے، مولانا اشرف علی صاحب تھانوی اور مولانا حسین احمد مدنی مین بعض سیاسی مسائل مین اختلاف تھا اور اب بھی ان کے ماننے والون مین باقی ہے، گو سید صاحب کو مولانا اشرف علی صاحب سے تعلق خاطر زیادہ تھا، مگر مولانا حسین احمد مدنی اور ان کے متوسلین بھی سید صاحب پر پورا اعتماد کرتے تھے، اور یہ دونون مجلسون مین عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، علماے پھلواری، علماے بدایون، اور علماے فرنگی محل کے مسلک سے سید صاحب کو یک گونہ اختلاف تھا، اور اس سے وہ لوگ واقف بھی تھے، مگر سید صاحب کی ندوی روش نے کبھی آویزش نہین ہونے دی، بلکہ یہ لوگ بھی ان کو بڑی وقعت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے، مسلم لیگ و کانگریس سیاسی اختلاف کی وجہ سے پورے ہندوستان کے مسلمان دو حصون مین بٹ گئے تھے، اور دونون مین عوام سے لیکر لیڈرون اور علماء مین شدید کشمکش پیدا ہو گئی تھی اس کشمکش میں سید صاحب کبھی جادۂ اعتدال سے نہین ہٹے،

سید صاحب کی اس معتدل روش کا نتیجہ تھا کہ اُن کے زمانہ کی مختلف مذہب و مشرب کی تمام شخصیتون سے اُن کے تعلقات تھے، ان سب سے ان کے ذاتی اور نجی تعلقات تھے، اور اس مدت میں ایسا قومی سیاسی، یا دینی کام نہین ہوا جس مین سید صاحب نے کوئی اہم حصہ نہ لیا ہو۔ سید کرامت حسین الٰہ آبادی، نواب عماد الملک، حکیم اجمل خان، ڈاکٹر انصاری، گاندھی جی، موتی لال، جواہر لال، فضل اللہ، سر راس مسعود، ڈاکٹر اقبال، ظفر علی خان، مولانا عبد اللہ غازی پوری، مولانا عبد الحی ناظم ندوۃ العلماء، مولانا عبد الباری فرنگی محلی، قاضی سلیمان منصور پوری، مولانا عبد الماجد بدایونی، شاہ سلیمان پھلواروی، مولانا سلیمان اشرف، مولانا ابو بکر شیث، مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی، مولانا احمد

کریں اور آپ لوگ اس کے اہل ہیں،

یہ چند اقتباسات میں نے مولانا مسعود عالم ندوی کے مجموعہ مکاتیب سلیمان سے نقل کر دیئے ہیں، اس طرح کے خطوط وہ خورد و کلاں ندوی کو لکھتے رہتے تھے، مولانا شاہ معین الدین صاحب ندوی کو جو اس وقت انکے علمی جانشین ہیں، اس طرح کے بیشمار خطوط لکھے ہیں خود اس عاجز کو انھوں نے جو تربیتی خطوط لکھے ہیں، اس کا ایک ایک جملہ حرز جان بنائے رکھنے کے قابل ہے

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

کیا کرنا ہے"

ندویوں کی تربیت | سید صاحب کی عین خواہش تھی کہ ان کی جیسی دینی حمیت اور جامعیت، اُن کی اعتدال پسندی اور حق پروری، ان کا شیوۂ محبت و مسامحت ہر ندوی میں پیدا ہو جائے، وہ قدیم ندویوں کے مجمع میں ہوں یا جدید طلبای دار العلوم کے جھرمٹ میں سب کو یہی تلقین کرتے تھے تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے، اس لئے اُن کے خطوط کے چند اقتباسات یہاں پیش کئے جاتے ہیں، مولانا مسعود عالم کو لکھتے ہیں،

"الفرقان میں آپ کا مضمون دیکھا، دین کی حمیت کی شان دیکھ کر خوشی ہوئی۔ میری امیدوں کے مرقعے آپ ہی جیسے چند عزیز ہیں،

مولانا مسعود عالم میں دینی حمیت اور توحید میں شدت نے غلو کی وجہ سے بعض مصلحین سے ان کا تعلق غلو کی حد تک ہو گیا تھا، اُن کو اس کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔

تصلب و تعصب حکم دین میں ہونا چاہیے، نہ کہ اشخاص اور ان کے مسالک میں خواہ حنفیت ہو یا وہابیت بل ملۃ ابراھیم حنیفاً۔

ایک خط میں قانون کے مقابلہ میں اخلاق کی اہمیت اور اظہار رائے میں صداقت کی طرف توجہ دلاتے ہیں :-

"میں قانون کے مقابلہ میں اخلاق زیادہ پسند کرتا ہوں،.........رائے عدل و صداقت کیساتھ دیجائے ولو کان ذا قربیٰ،

مولانا مسعود عالم ندوی نے اشتراکیت اور اسلام پر ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کیا، تو اُن کی ہمت افزائی کرتے ہیں، اور عہد جدید کے فتنوں کے مقابلہ پر ابھارتے ہیں،

"بہت خوب آپ نے اشتراکیت اور اسلام پر لکھنا شروع کر دیا، جی چاہتا ہے کہ جس طرح وقت کے دوسرے فتنوں کے ازالہ میں علمائے ندوہ نے کام کئے ہیں، اسی طرح وہ اس کے ازالہ میں بھی کام

…سے زیادہ بے بہا اور باہمہ ہستیاں اپنی عمر میں نہیں دیکھیں، آپ کے بڑے بھائی مولانا حکیم ابو حبیب جو
…آپ سے ۱۰ سال بڑے تھے، دینہ کے ایک مشہور طبیب جید عالم اور حضرت شاہ ابو احمد بھوپالی مجددیؒ کے
…خلیفہ مجاز تھے، آپ کے چچا حافظ تجمل حسین صاحب ایک صاحب حال بزرگ اور شاہ فضل الرحمن گنج مرادآبادی
…کے خلیفہ تھے،

…تربیت | اس پاکیزہ ماحول اور ان اعلیٰ موروثی صفات کے ساتھ حضرت والاؒ کو کسب کمالات کے بھی پورے
…مواقع ملے ابتدا ہی سے آپ کے والد صاحب نے آپ کی اخلاقی تربیت کو ہمیشہ پیش نظر رکھا، پھر آپ کے بڑے بھائی مولانا
…حکیم ابو حبیب صاحب نے بھی پوری توجہ صرف فرمائی، خود حضرتؒ فرماتے تھے کہ لڑکپن میں میں نے اپنے بڑے بھائی صاحب
…سے بیعت … کچھ ذکر اور مراقبات بھی کئے اور ان کے حلقہ توجہ میں بھی بیٹھا کرتا تھا اور ان کے فیض صحبت
…سے اپنے اندر باطنی … محسوس کرتا تھا لیکن یہ باطنی پہلو اس دور میں کچھ اجاگر نہ ہو سکا کیونکہ اس وقت حصول علم
…کا … چنانچہ ابتدائی تعلیم مدرسہ امدادیہ دربھنگہ اور پھلواری شریف میں پائی اور پھر غالباً ۱۹۰۱ء میں دارالعلوم
…ندوۃ العلماء لکھنؤ میں پہنچے، خداداد فہم و ذکا اور پھر مولانا شبلیؒ کی تعلیم و تربیت نے مل کر
…معاصر علماء میں اس قدر ممتاز کیا کہ متنوع علوم و فنون کی جامعیت اور ان میں تحقیق و نظر کے اعتبار
…سے … انور شاہ … کے بعد اگر نظر کہیں آکر ٹھہرتی ہے تو وہ حضرت سید صاحب ہی کی ذات گرامی ہے، ذٰلک
فضل اللہ یؤتیہ من یشاء،

اثرات … | علوم و فنون کی فضاؤں میں تخت سلیمانی تو خوب پرواز کرتا رہا، مگر مولانا شاہ ابو حبیب
صاحبؒ کی برکت سے روحانی عالم کے جو اثرات قلب سلیمانی پر پڑتے تھے، وہ ساری
مشغولیات کے باوجود قائم رہے، اور برابر فکر لاحق رہی کہ کوئی شیخ کامل ایسا مل جائے جو روحانی
… مدد دے سکے، عجیب بات ہے کہ آواخر ۱۹۲۹ء میں حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے ایماء
… سے … احمد صاحب عثمانی نے رسالہ کشف الدجی لکھا، اور اس کا ایک نسخہ تقریظ کے لئے حضرت علامہ

سیرتِ سلیمانی کا عرفانی پہلو

از

جناب غلام محمد صاحب بی اے حیدرآبادی

اہل اللہ کی بزمِ قدس میں تین طرح کی ہستیاں نظر آتی ہیں، ایک تو وہ جن کی سیرتیں سرتاسر جذب و عشق اور معرفت کا آئینہ ہیں، مثلاً بایزید بسطامیؒ، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، مجدد الف ثانیؒ وغیرہ، دوسری وہ جن کی زندگیاں گو بے داغ ہیں لیکن ان کا جوہر عرفانی ایک عرصہ بعد کھلتا ہے، جیسے امام غزالیؒ، عارف رومیؒ، شیخ فریدالدین عطارؒ وغیرہ، تیسری وہ ہستیاں جن کی حیات کبھی تو عام معیارِ اخلاق سے بھی پست تھی، مگر جب انقلاب آیا، تو رشکِ تقوی اور معیارِ معرفت قرار پاگئی، مثلاً سید الطائفہ جنید بغدادیؒ، حضرت بشر حافیؒ وغیرہ ——— ہمارے ممدوح کا مقام اس اعتبار سے وسطانی زمرہ میں نظر آیا،

وراثت — انسانی سیرت دو ہی اجزاء سے عبارت ہے، ایک تو موروثی صفات، اور دوسرے اکتسابی کمالات ہمارے حضرت والاؒ کو دونوں جہتوں سے حظ وافر ملا تھا، وہ سید زادے تھے، شرافت و مروت، عفو و درگذر ایثار و سخاوت، علم و بردباری، عالی حوصلگی، اور پامردی حضرت کو ورثہ میں ملی تھی، پھر یہ بھی خوش بختی کی بات تھی کہ یہ صفات آپکے گرد و پیش کے بزرگوں میں پوری طرح نمایاں تھیں اور آپ کا ماحول علم و عرفان اور طبابت جسمانی و روحانی کا سنگم بنا ہوا تھا، آپکے والد ماجد ایک عالم و طبیب حاذق اور نقشبندی ابوالعلائی سلسلہ کے شیخ اور صاحبِ نسبت بزرگ تھے، راقم نے خود حضرت کو یہ فرماتے سنا کہ میں نے اپنے والد اور حضرت مولانا

آخر میں جو خانقاہ کے متعلق اپنا انجذاب اور اس کے ساتھ کچھ موانع محتملہ کا ذکر فرمایا ہے[2]
اگر خانقاہ میں حضرت شیخ قدس اللہ سرہٗ رونق افروز ہوتے تو یہ سب مضامین حقیقت پر منطبق ہوتے لیکن اب محض حسنِ ظن پر منطبق ہو سکتے ہیں، اس سے آگے ہیچ، البتہ میں زیادہ تکلف کرنے کو بھی اعادۂ حجاب سابق اور موہمِ انبساط لاحق سمجھکر پسند نہیں کرتا، اس لئے بلا تکلف معاملہ کی سچی بات عرض کرتا ہوں کہ جناب کا یہ حُسنِ ظن اگر کسی روایت پر مبنی ہے تو لا یوثق بہ" اور اگر ذوقی و وجدانی ہے تو میں درستی کرنے کے لئے تیار ہوں، بشرطیکہ مجھکو علوم میں مخاطب نہ بنایا جائے، کہ اُن سے معرّا ہونے کو اوپر ظاہر کر چکا ہوں، والصدق ینجی والسلام

ناکارہ آوارۂ ننگِ نام اشرف برائے نام

از تھانہ بھون، ۲۸ دسمبر ۲۹ء

اس پہلی مراسلت کے بعد جس کے سامان غیب ہی سے ہوئے تھے، ہمارے حضرت والا نے ایک دوسرا خط حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی خدمت میں لکھا جس کا متعلقہ جزء یہ ہے :-

---

(بقیہ حاشیہ ص ۲۸۶) کی رائے یہ تھی: "آپ (یعنی متصوفین) جس کو مکروہ سمجھتے ہیں، میں اس کو عین ربوا کہتا ہوں، اور میرے نزدیک تو قیل وقال و روایت سے زیادہ مستحکم دلیل عمل سلف کرام ہے، کہ ایسا کھلا اور شدید الاحتیاج مسئلہ ہونے کے باوجود کسی نے اس کو جائز نہیں بتایا، اور نہ کبھی اس پر عمل کیا،

[2] حضرت علامہ نے یہ تحریر فرمایا تھا: "بار بار میرا دل جب زمانہ کے فتن و حوادث سے گھبرا گھبرا اٹھتا ہے، اور بے اختیار کسی سکینت و روحانیت کے امن کی تلاش ہوتی ہے تو خانقاہ امدادیہ کی یاد آتی ہے لیکن ڈر تھا کہ معلوم نہیں کہ اجنبیت و بیگانگی سے میرے متعلق کیا کیا آپ تک پہنچا ہو، اور آپ مجھے تخاطب کا اہل بھی سمجھیں نہیں...... اب میں اس کشمکش کی منزل میں ہوں جس میں علوم ظاہری تسکین کا باعث نہیں بنتے، دعا کا طالب اور ہمت کا خواستگار ہوں"،

کی خدمت میں ارسال فرمایا۔ ہمارے حضرت نے اس کے جواب میں حکیم الامتؒ کو ایک خط لکھا، اس مکتوب کی نقل یہاں طوالت کا موجب ہوگی، البتہ اس کا جواب جو حکیم الامتؒ کی طرف سے عطا ہوا وہ اقتباساً درج ذیل ہے اس سے طرفین کی خط و کتابت کا حال معلوم ہو جائے گا۔

"مولانا المحترم دامت فیوضہم السلام علیکم ورحمۃ اللہ،

عجیب بات ہے کہ انبساط کا قصد نہ میرا تھا نہ جناب کا، دونوں طرف اتفاقاً ہی اس کے اسباب پیش آگئے، اس طرف کا واقعہ تو جناب نے تحریر فرما دیا، اس طرف یہ واقعہ ہوا کہ میں نے بالتعیین کسی بزرگ کے پاس رسالہ بھیجنے کو نہ کہا تھا، دو وجہ سے ایک یہ کہ مجھ کو بزرگوں کی فہرست ہی بہت غیر مکمل معلوم ہے، دوسرے کسی کو ایسی تکلیف دیتے ہوئے ہمت نہیں ہوتی، خصوص اگر میرا کلام ہو، تو بے حد حجاب ہوتا ہے۔ یہ رسالہ میرے ہمشیرزادہ نے لکھا، اگرچہ میرے ہی کہنے سے لکھا، چونکہ آج کل عام طبائع کی حالت پر نظر کرکے اس استفتاء کی مضرتِ عامہ کا قوی اندیشہ تھا، اور اس کے انسداد کی سب سے انفع تدبیر علماء کی موافقت حاصل کرنا ذہن میں آیا کہ عوام پر اس کا خاص اثر ہوتا ہے، اس لئے میں نے عزیز موصوف کو معذرت دیکر مشورہ دیا کہ جہاں جہاں مناسب ہو بھیج دیا جائے۔ میں ان کا ممنون ہوں کہ انھوں نے جناب کو بھی تکلیف دے کر یہ موقع دیا کہ میں جناب کا مخاطب بن سکا، غرض یہ واقعہ ادھر سے ہوا، بہرحال حجاب مرتفع ہونے کے بعد مضامین محبت کا جواب عرض کرتا ہوں، جناب کی تواضع نے ضرور مجھ کو ایک معتد بہ درجہ میں معتقد بنا دیا، اور غالب یہ ہے کہ آئندہ اس میں اضافہ اور قوت ہو۔۔۔۔۔ مسئلہ کے متعلق جس عنوان سے رائے سامی ظاہر فرمائی ہے، اس سے سہل اور دل میں اتر جانے والا عنوان کم ذہن میں آتا ہے[۱]، بارک اللہ تعالیٰ فی معارفکم،۔۔۔۔۔۔۔۔۔

[۱] حضرت حکیم الامتؒ کے ہاں ہر ایک کے حفظ مراتب کا جو پاس و لحاظ تھا اسکی دلیل میں تنہا یہ مکتوب کافی ہوگا حضرت

سے معارف" جب جب حکیم الامت ؒ کی خدمت میں عریضہ لکھنے کا ارادہ ہوتا تو کوئی نہ کوئی اختلافی مسئلہ تو ر
میں شائع ہوتا، اور اس کی وجہ سے طبیعت میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی،

پہلی حاضری | ۱۹۳۴ء کے ختم اور ۳۵ء کے آغاز کا زمانہ تھا حضرتِ والاؒ ڈاکٹر اقبال مرحوم کی دعوت پر کسی کمیٹی میں شرکت کے لئے لاہور تشریف لے گئے، اب تک مولانا تھانوی قدس سرہٗ سے کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی، لاہور سے واپسی میں خیال آیا کہ تھانہ بھون کچھ دیر کے لئے اتر جائیں، چنانچہ یہ اندرونی تقاضا پورا ہوا، اور اس حاضری سے مرشد تھانوی نے جو اثر لیا، اس کو خود انہی کے جچے تلے موثر الفاظ میں سنئے، مولانا عبد الماجد دریابادی کے نام ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں،

"مولانا سید سلیمان ندوی صاحب دفعۃً تشریف لے آئے، میں مکان پر تھا نفقہ ہی حاضر ہوا میرے ذہن میں ان کا جثہ طویل و عریض تھا، ملا تو معتدل الخلقت پاکر قلب کو بہت انس ہوا، پھر ملاقات و مکالمت سے اُن کی تواضع وسادگی، رعایتِ جلیس دیکھ کر تو مسخر ہی ہوگیا[۱]، گیارہ بجے تشریف لائے تین بجے واپس تشریف لے گئے، مجلس میں بہت دیر تک ثنا خوانی کرتا رہا[۲]"

رجوع اور بیعت | اس ملاقات سے ظاہر ہے کہ فریقین کے دل محبت و عظمت سے معمور ہو چکے تھے لیکن پھر بھی ایک عرصہ تک خط و کتابت کی صورت نہ نکل سکی، حالانکہ اس عرصہ میں سلیمانی نگاہ، مرشد کامل کے لئے برابر متلاشی تھی، اور ہر پھر اگر کہیں ٹھہرتی تھی تو وہ تھانہ بھون ہی کے شیخ الشیوخ کا آستانہ تھا، اس عرصہ میں ایک مرتبہ حضرت والاؒ کو عالمِ رویا میں شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کی زیارت نصیب ہوئی، حضرت سیدؒ نے اپنے سینہ کی طرف، اور حضرت حاجی صاحبؒ کے سینہ مبارک کی جانب اپنے ہاتھ سے اشارہ

[۱] کیسے منصفِ مزاج ہیں وہ لوگ جنھوں نے بزعم محبت یہ مشہور کر رکھا ہے کہ سید صاحب گئے تو تھے ملنے کے لئے لیکن مولانا تھانوی نے اُن کو مسخر کر لیا، اور خود مرید بنا لیا، اس بیان میں اگر مولانا تھانوی کی شکایت ہے تو سید والا مرتبت کے بلند مقام کا کونسا پاس و لحاظ ہے [۲] حکیم الامت ص ۳۳۸

"میرے لئے کوئی ایسا نسخہ تجویز فرمائیں، کہ مجھ میں استقامت وتثبت اور رغبت الی الطاعات پیدا ہو، فرائض کا پابند ہوں، بدعات سے نفور ہوں، کبھی کبھی ذوقِ سجود کی لذت بھی پاتا ہوں، امام ربانی مجدد الف ثانیؒ و شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ و اُن کے سلسلہ سے عقیدت تام ہے، خرافات وطاماتِ صوفیہ کا منکر ہوں......"

اس کے جواب میں حکیم الامت نے اپنے رسالہ "قصد السبیل" کی تسہیل روانہ فرمائی، اور ساتھ ہی اگر کی یہ تحریر فرمائیں جو عطرِ تصوف ہیں،

"مامور بہ وجوباً یا استحباباً اس طریق میں صرف افعال ہیں، انفعالات نہیں، مثلاً استقامت وتثبت ورغبت الی الطاعات والتزام فرائض وتنفر عن البدعات ولذت وذوق واخلاص واصلاحِ قلب وامثالہا، ان میں جو چیزیں یا بعض چیزوں کے جو اجزاء افعال ہیں، وہ مامور بہ ہیں، کیونکہ وہ اختیاری ہیں، اور جو انفعالات ہیں، وہ مامور بہ نہیں، کیونکہ وہ غیر اختیاری ہیں، البتہ وہ انفعالات بعضے مطلقاً بعضے خاص احوال میں محمود و مفید ہیں، اور اسی وجہ میں مطلوب بھی ہیں، مگر وہ سب آثار وثمرات انہی افعال کے ہیں، اور وہ افعال ہی اُن کے اسباب ہیں، کہ ان کی طرف فی الحال یا فی المآل اکثر مفضی ہیں، ان کے علل نہیں کہ ان سے تخلف ہی نہ ہو، اگر تخلف بھی ہو تو مضر نہیں، کیونکہ اصل مقصود قرب ورضا کی وہ شرط بھی نہیں، والسلام"

رکاوٹ | مذکورہ بالا مکاتبت کے بعد ایک اور خط ان بزرگوں کے درمیان آیا، اور گیا، وہ ماہ آخر تاریخ ۲۹ شوال ۱۳۴۸ھ کی لکھی ہے، انگریزی لحاظ سے ۱۹۳۰ء کا کوئی مہینہ ہوگا، اس کے بعد چھ نو دس برس تک کے لئے استفادہ وافادہ کا سلسلہ منقطع رہا، اور اس کی وجہ راقم نے خود حضرت والا کی زبانی سنی ہے کہ اس زمانہ میں تھانہ بھون سے رسالہ "النور" مولانا ظفر احمد تھانوی کے زیرِ ادارت نکلتا تھا، اور اس میں

دیر سے آیا ہوں ساقی دور سے آیا ہوں میں ہو عطائے خاص مجھکو جو عطائے عام ہے[1]

اور حضرت شیخ نے بھی اس تشنگی کو بجھانے کی پوری سعی فرمائی، بارگاہِ تھانوی کے ایک ممتاز خلیفہ مولانا مفتی محمد حسن صاحب نے کئی بار فرمایا کہ حضرت سید صاحب جب خانقاہ میں تشریف لائے تو ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی طبیعت میں ایک جوش پیدا ہو جاتا، اور معلوم یوں ہوتا کہ گویا جوان ہو گئے ہیں، گھنٹہ بھر کی محفل کو دو دو گھنٹہ طول دیتے تھے، اور محترم ڈاکٹر عبدالحئی صاحب نے فرمایا کہ خود حکیم الامت مجھ سے فرماتے تھے کہ جب رات کو دو بجے آنکھ کھلتی ہے، تو جی چاہتا ہے کہ سید صاحب کو بلالوں اور باتیں کرتا رہوں، مگر اُن کی زحمت کے خیال سے چُپ ہو جاتا ہوں۔

شیخ و مرید کے اس خصوصی ربط سے متعلق کم از کم دو روایات اور سُنائے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ ایک مرتبہ حضرت سیدی خانقاہ میں تشریف لے جارہے تھے محفل آراستہ تھی حکیم الامت کی نظر جو سید والا مرتبت پر پڑی، تو بے ساختہ کھڑے ہو گئے، مرید صادق نے بڑھ کر عرض کی "حضرت تشریف رکھیں" تو ارشاد فرمایا، "واللہ میں تعظیماً کسی کے لئے نہیں اٹھتا، میں تو فرطِ محبت سے کھڑا ہو گیا"

ایک مرتبہ حکیم الامت نے ایک چھڑی تحفۂ محبت کے طور پر بھیجی، اور اس کے ساتھ ایک رقعہ بھی جس کا آغاز اس پرازمحبت اور بلیغ جملہ سے فرمایا تھا:

"راحتِ جان، راحتِ جسم کا سامان بھیج رہا ہوں"

حضرت سیدیؒ نے اس عطائے شیخ کو دل و جان سے قبول فرما کر جواباً تحریر فرمایا کہ

---

[1] یہ سب اشعار حضرت سیدی کے ہیں، ان کو بطور استدلال پیش کرنے میں اس لئے تامل نہیں کہ حضرت والا نے خود اپنے اس دور کے کلام کے متعلق فرمایا کہ "یہ تو میرا سفرنامہ ہے" اس کلام کا آغاز اور انجام حکیم الامت سے رجوع اور اُن کی رحلت پر ہوا جس میں بہ مشکل پانچ چار غزلیں ہوئی ہیں، اس مجموعہ کا نام حضرت والا نے "غزل الغزلات" تجویز فرمایا تھا کہ یہ نام حضرت سلیمان علیہ السلام کے مجموعۂ کلام کا تھا۔ (غ)

کرتے ہوئے عرض کیا "اس کو ایسا کر دیجئے" حضرت حاجی صاحب مسکرائے اور فرمایا "اب تو میں یہ کام نہیں کرتا"

حضرت سیدیؒ کا بیان ہے کہ اس کی تعبیر یہ ذہن میں آئی کہ حضرت حاجی صاحب چونکہ عالم ناسوت سے تعلق منقطع فرما چکے ہیں، اس لئے اُن کو عذر ہے، اور اُن کے کسی جانشین سے تعلق جوڑنا چاہئے، چنانچہ پھر نظر حکیم الامت ہی پر پڑی، ساتھ ہی اس کا بھی اعتراف فرماتے تھے کہ حکیم الامت سے تعلق قائم ہونے میں مولوی عبدالباری صاحب ندوی کے اصرار کو بھی دخل ہے، غرض پھر مستقل تعلق کے اسباب یوں پیدا ہوئے کہ حکیم الامت قدس سرہ اگست ۱۹۳۸ء میں اپنے علاج کے سلسلہ میں لکھنؤ تشریف لائے تھے، اس موقع کو حضرت والا نے غنیمت سمجھا، اور حاضر خدمت ہو کر مستقلاً رجوع ہو کر بیعت سے مشرف ہوئے،

حضرت والاؒ کی بیعت کے سلسلہ میں ایک واقعہ کا اظہار خالی از دلچسپی نہ ہوگا، دو معتبر راویوں[۵] سے حقیر نے یہ بات سنی ہے کہ قطب ارشاد مولانا تھانوی جب لکھنؤ تشریف لے گئے، تو تھانہ بھون میں ایک مجذوب نے آپ کے ایک مرید سے پوچھا "تمھارے پیر کہاں گئے ہیں" ؟ انھوں نے عرض کیا کہ علاج کے سلسلہ میں لکھنؤ تشریف لے گئے ہیں، اس مجذوب نے قہقہہ لگایا، اور کہا علاج ولاج تو ایک بہانہ ہے "ایک شہباز کے شکار کو گئے ہیں" شکار کر لائیں گے" ـــــ چنانچہ جب حضرت والاؒ کے رجوع و بیعت کی اطلاع عام ہوئی تو سب کو اس قلندر کی بات کا یقین آگیا ع

قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید

خصوصی ربط | غرض اب کیا تھا اُدھر قوتِ فیضان جوش زن اور ادھر طلب صادق بے اندازہ، چنانچہ اسی اضطراب میں فرماتے ہیں،

لفظ بے کانہ بھلا کیا ترجمانی کر سکے ۔۔۔ شوق بے اندازہ پیچیدہ وہ میرے دل میں ہے

جام پر جام مجھے دے کے بنادے بدمست ۔۔۔ صبر سرجوشیِ اذکار کہاں سے لاؤں

---

[۵] مراد حاجی عثمان خان صاحب مرحوم مالک کتب خانہ اشرفیہ اور محترمی ڈاکٹر عبدالحی صاحب مدظلہ ہیں،

خلافت | برسوں کی منزلیں دنوں میں طے ہوتی چلی گئیں ایک مرتبہ حکیم الامت کی طرف سے ایک گرامی نامہ موصول ہوا جس کا عنوان تھا "استشارہ بعد از استخارہ" اور اس میں لکھا تھا کہ "میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کو خلافت دوں اس سلسلہ میں میں نے استخارہ بھی کر لیا اب آپ کا کیا مشورہ ہے" ؟ حضرت سیدیؒ نے فرمایا کہ چونکہ قریب ہی میں تھانہ بھون کی حاضری کا قصد تھا، اس لئے میں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا، بلکہ جب حاضر خدمت بھی ہوا تو خاموش ہی رہا، آخر ایک دن حضرت والا کی طرف سے ایک پرچہ ملا کہ آپنے میرے استشارہ کا جواب نہیں دیا[1] — اس اصرار پر میں نے یہ جواب لکھا کہ

"حضرت والاؒ کا مکتوبِ گرامی پڑھ کر قدموں تلے سے زمین نکل گئی کہاں میں اور کہاں یہ ذمہ داری"[1]

بس یہ جواب پانا تھا کہ شیخ الشیوخ کے قلب سے الحمد للہ کی ایک صدا اٹھی، اور سیدو الامرتبتؒ کو خلافتِ باطنی سے سرفراز فرما کر مسندِ ارشاد پر بٹھایا ——— اور اس بات کے راوی حضرت حاجی عثمان خان صاحب مرحوم ہیں جو حکیم الامتؒ کے فدائی اور خلیفہ مجاز تھے کہ حضرت سید صاحب کو خلافت عطا فرما کر حضرت والاؒ اس قدر مطمئن تھے کہ بارہا فرمایا کہ الحمد للہ اب مجھے کچھ فکر نہیں، میرے بعد ایسے ایسے لوگ موجود ہیں، ذَالِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَاءُ،

شور و غوغا | حیرت ہے کہ عین اس وقت جب کہ بارگاہِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا سیرت نگار اپنے ممدوح کی حیاتِ طیبہ کے آخری نقش و نگار سے اپنی زندگی کو آراستہ کرنے میں مشغول تھا، بے بصروں نے اس کے خلاف ایک شور و غوغا بپا کیا کہ علامۂ عصر نے مسندِ علم چھوڑ دی؟ عین اس وقت جب کہ "دہ آبروے ندوہ" اپنے ساتھ ایک جماعتِ کثیر پیدا کر کے اور اس کو بر سر کار لگا کر شتابج بحملِ دبستگی واستخفری کی منزل طے کر رہا تھا بعض نادانوں نے اس کے اس عمل کو تعطل قرار دیا، عین اس وقت جب کہ وہ پیکرِ عبودیت اُن ساری خدماتِ علمیہ

---

[1] سب روایت بالمعنی سمجھی جائے، مگر مفہوم کی صحت میں کوئی کلام نہیں (ا ع غ)

"اس عطائے خاص سے میں نے استقامت فی العمل کی تعبیر لی"

حضرت شیخ نے جب یہ عارفانہ جواب پڑھا تو انبساط سے معمور ہو گئے، اور اس کا ایک طویل جواب تحریر فرمایا، جو سراسر دعاؤں سے لبریز تھا[۱]

مولانا مفتی محمد حسن صاحب نے فرمایا، کہ ہم لوگوں کو تعجب ہوتا تھا کہ حضرت سید صاحب کو اتنی جلد اس قدر رسوخ کیسے حاصل ہو گیا، مگر بعد کو پتہ چلا کہ یہ جوہر ہی کچھ اور تھا،

اسی اثنا میں حضرت علامہ نے حکیم الامتؒ کی تحریک اور اشارہ کے بغیر اپنے احساس سے مجبور ہو کر بعض اختلافی مسائل میں رجوع و اعتراف کا مضمون "معارف" میں شائع فرمایا اور اس کو ملاحظہ کے لیے بھیجا، تو حضرت شیخ بے حد مسرور ہوئے، اور خلافِ عادت دس بارہ توصیفی اشعار مثنوی کے وزن پر لکھ کر بھیجے[۲] چند یہ ہیں:-

از سلیمان گیر اخلاصِ عمل — دان تو ندوی را منزہ از دغل

اے دلت معمور از اسرارِ حق — اے دلت معمور از آیاتِ حق

اے دلت پر نور از انوارِ حق — اے دلت مسرور از اخبارِ حق

ہم کو نہیں معلوم کہ حسام الدین چلپی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد یہ سعادت بجز حضرت سیدیؒ کے کسی اور کے بھی حصہ میں آئی ہو کہ شیخ نے مرید کی مدح میں بے ساختہ اشعار کہے ہوں،

---

[۱] یہ دونوں باتیں حضرت سیدی نے احقر سے تنہائی میں ایک مرتبہ فرمائی تھیں، اور پھر اس کی اجازت بھی عطا فرمائی تھی کہ احقر اس خط و کتابت کی نقل کر لے، جو حکیم الامت اور ان کے درمیان رہی، مگر مرض الموت کی وجہ سے خود یہ خزانہ نکال کر عطا نہ فرما سکے، اور حضرت کے صاحبزادے اپنی پریشانیوں میں اس سلسلہ کے ارشاد و ہدایت کی تعمیل سے قاصر رہے، ورنہ آج اس سے بڑی مدد ملتی، تین چار ابتدائی خطوط کی جو نقلیں مل گئیں، وہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کا کرم ہے [۲] یہ محرم ۱۳۶۱ھ کا واقعہ ہے۔

کیسی یکسانیت ہے عارف رومیؒ و امام غزالیؒ، اور اسی دور کے سید العلماء والصلحاء، مسند نشین شبلیؒ و اشرفؒ میں!!

فنا ء الفناء | سچ کہا ہے ایک صاحبِ نظر نے کہ حضرت سید صاحب کو عروج کی حالت میں تو لوگوں نے کچھ پہچانا بھی، مگر نزول کے عالم میں کوئی سمجھ ہی نہ سکا کہ ان کا کیا مرتبہ ہے[1]، راقم بلا خوف تردید عرض کرتا ہے کہ حضرت والا کا پہلا قدم وہاں پڑا، جو بہت سوں کی انتہا ہے، تفصیل کا موقع نہیں، فنی زبان میں مختصراً یہ سمجھ لیجئے کہ ایک شہرۂ آفاق محقق و مفکرِ اسلام اور ایک مرجع علماء عصر شخصیت کا کسی شیخ وقت کے آگے اپنے آپ کو پیش کر دینا ہی اس امر کی بین دلیل ہے کہ وہ مرتبۂ نفس سے گذر کر مرتبۂ روح میں داخل ہو گیا، اور مرتبۂ نفس کا طے کر لینا بلا مبالغہ بہت سوں کی منتہا ہے، ---- پھر جب اس منزل پر بھی حضرتِ والاؒ نے اپنے شیخ عالی مقام سے عرض کیا کہ حضرت کچھ نصیحت فرما دیجئے، تو حکیم الامتؒ کا خود بیان ہے کہ وہ کچھ دیر کے لئے سوچ میں پڑ گئے کہ ایک عالم عصر کو کیا نصیحت کریں، کچھ سمجھ میں نہ آیا تو یہی فرما دیا کہ اس راہ کی ابتدا و انتہا فنا ہے[2]، یہ بات فاطر سلیمانی میں اس درجہ جم گئی، اور اس کے بعد اپنے آپ کو اس قدر مٹایا کہ خود مٹنے کا احساس بھی جاتا رہا، فنا سے گذر کر فناء الفناء تک پہنچ گئے، مدح و ذم ایک ہو گئی، مفوض کامل بن گئے، خود حضرت حکیم الامت کے متعدد خلفائے اجل مثلاً حضرت مفتی محمد حسن صاحب، مولانا محمود الغنی صاحب، حاجی محمد عثمان خان صاحب مرحوم، مولانا عبد الباری صاحب ندوی، ڈاکٹر عبد الحی صاحب، مولینا مسیح اللہ صاحب وغیرہ کو راقم نے اس معاملہ میں ایک زبان پایا کہ حکیم الامت قدس سرہ سے فنائیت کا درس جیسے حضرت سید صاحب نے حاصل کیا اور جو کمال اس مرتبہ میں پیدا کیا، وہ کہیں اور نظر نہیں آتا، ---- مثالیں اس کی چند ہوتیں تو نقل بھی کرتا، یہ تو ایک مستقل باب ہے،

---

[1] یہ ڈاکٹر عبد الحی صاحب مدظلہ کا جملہ ہے۔ [2] یہ واقعہ تفصیلاً "اشرف السوانح" میں موجود ہے، مگر بغیر نام کے صرف ان الفاظ کے ساتھ کہ "ایک فاضل اجل نے مجھ سے نصیحت کیلئے فرمایا"!

سے فارغ ہو کر جو ایک ادارہ سے بھی ممکن نہ تھیں، فاذا فرغت فانصب والی ترابک فارغب کے حکم کی آگے تگ رہا تھا، تو مدعیانِ دانش نے اس پر اعتراض کیا کہ یہ شغل کیا؟ — لیکن اس عارف نے اس سارے شور و غل کا جواب اپنے عمل کے استحکام اور معنی خیز تبسم کے ساتھ یہی دیا،

دستارِ فضیلت ہو یا دلقِ مرقع ہو

ہوتا ہے اُسے اِک دن نذرِ مے و میخانہ

کبھی خود ماننے والوں نے زیادہ شور مچایا، تو صرف اتنا فرمایا کہ لوگ مجھکو کہتے تو محقق اور علامہ ہیں، مگر درحقیقت بے عقل جانتے ہیں، — اور اگر کبھی کسی نے زیادہ احسان جتایا، تو صاف یہ جواب لکھ دیا کہ جن کمالات کی بنا پر آپ نے مجھے اپنا قبلہ بنایا تھا، انہی کمالات نے مجھکو مولانا تھانوی کے آگے جھکا دیا، میں نے اپنے انجام کی فکر کر لی، اب آپ کو اختیار ہے کہ اپنا قبلہ کوئی اور تجویز کر لیں،

یہ ہنگامہ کوئی نیا یا ہمارے سید ذی شان کے ساتھ خاص نہیں، عرفاء و اتقیاء کی تاریخ میں ایسی اور بھی مثالیں مل جاتی ہیں، — عارف رومیؒ نے جب شمس تبریزؒ کا دامن تھاما تھا، تو کیا خود مولانا رومؒ ہی کے شاگردوں نے شمس تاباں پر دھول جھونکنے کی کوشش نہیں کی؟ اور کیا بالآخر انہی ناقدروں کے ہاتھوں عارف رومیؒ کو مدتوں بادیہ پیمائی نہیں کرنی پڑی؟ — اسی طرح امام غزالیؒ کو بھی اس مرحلہ پر پہنچ کر کیا کچھ نصیحتیں سننی نہ پڑیں، خود امام عالی مقام ہی کی زبانی کچھ روداد سنیئے،:-

"علماء اور ارکانِ سلطنت کو جب خبر ہوئی تو سب نے نہایت الحاح کے ساتھ روکا اور حسرت سے کہا کہ یہ اسلام کی بدنصیبی ہے، ایسی نفع رسانی (یعنی درس و تدریس) سے آپ کا دست بردار ہو جانا شرعاً کیونکر جائز ہو سکتا ہے؟ — تمام علماء و فضلاء یہی کہتے تھے لیکن میں اصل حقیقت کو سمجھتا تھا اس لئے سب کو چھوڑ چھاڑ دفعۃً کھڑا ہوا، اور شام کی راہ لی"[1]

---

[1] الغزالی از علامہ شبلی نعمانی،

..........اذیت نہ ہو تو صبر کا مطلب ہی بے معنی ہو جاتا ہے، صباریت کے اس دور میں اُن کو اذیت ہوئی، اور کافی اذیت ہوئی، لیکن جس راہ پر اب پڑ چکے تھے، اُس راہ کی ہر اذیت دوسرے عالم کی مسرتوں کی ضمانت بنتی چلی گئی، انما یوفی الصابرون اجرھم بغیر حساب پیشعر نہیں الہامی حقیقت ہے۔

(مکتوب مورخہ ۱۵ر فروری ۵۳ء)

جود وسخا — بخشش وعطا بزرگوں کا ایک خاص وصف ہے، بعض بزرگوں میں یہ وصف عیاں ہے، اور بعض میں مخفی، بھوپال کی حاضریوں میں اور کراچی کے دوران قیام میں احقر کو اس کا اندازہ ہو گیا تھا، کہ حضرت والا چپکے چپکے بڑے اعتدال سے مالی ایثار فرمایا کرتے ہیں، لیکن رحلت کے بعد میرے ساتھ ایک عجیب معاملہ پیش آیا، جس سے شیخ کے دستِ کرم کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے، مرض الموت سے کچھ قبل احقر نے اپنی مالی پریشانیوں کا اظہار کیا تھا اور اس سے مقصود بھی بجز حصولِ دعا کے اور کیا ہو سکتا تھا، پھر مرض الموت میں تو اس کا ذکر بھی بے جا تھا، لیکن وہ سراپا مہر و کرم ہستی، اس ناکارہ کے حال پر اس درجہ متوجہ تھی کہ میری پریشانی کا خیال آخر وقت تک قائم رہا، اور اس درد کی درمانی کئے بغیر چین نہ آیا ——— رحلتِ شیخ قدس سرہٗ کے تقریباً ڈیڑھ ہفتہ بعد حضرت کی اہلیہ محترمہ مدظلہا نے ایک بند لفافہ اس ہدایت کے ساتھ عنایت فرمایا کہ گھر جا کر اس کو کھولئے ——— میں یہی سمجھتا رہا کہ شاید کوئی راز کے کاغذات ہوں یا حضرتِ والا کے مکتوبات، لیکن گھر پہنچ کر جو لفافہ کھولا، تو اس میں یہ خط دیکھ کر آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، اور پھر رقت طاری ہو گئی :-

"عزیز القدر سلمہ ——— السلام علیکم۔

"مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ، بجز صبر کے انسان اور کیا کر سکتا ہے، حضرت مولانا جب حیات تھے تو اکثر و بیشتر آپ کو ایک ہزار روپیہ ہدیہ دینے کو کہا کرتے تھے، مگر میں اپنی غفلت یا اُن کی علالت کی وجہ سے ایسے کہ اُن کی حیات میں پورا نہ کر سکی، اب یہ اُن کی خواہش کے مطابق آپ کو ہدیہ کر رہی ہوں

ع : سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکران کے لئے

بس اس وقت تو بزرگوں کی تصدیقات ہی پر قناعت کیجئے !

صبر و شکر | حیاتِ سلیمانی کا بڑا حصّہ "شکر" ہی کا آئینہ ہے، علم و فضل، عزّت و عظمت، دولت و ثروت ہر اعتبار سے ہمیشہ سرافراز رہے، مگر آخر عمر کے دس برس میں اپنوں کی ناقدری و ناسپاسی، اپنے محبوب ادارہ دار المصنفین سے جدائی، تقسیم ہندوستان کے بعد کراچی کا قیام[1] اور یہاں کی مالی اور ذہنی پریشانیاں یہ سب ایک مستقل مجاہدہ اضطرار یہ تھا، پھر شدید شدید بیماریوں کا سلسلہ اس سے الگ ہی ——— یہ وقت صبر کی آزمایش کا تھا اور دیکھنے والوں نے حضرت سلیمانؒ کے ظرفِ عالی کو دیکھا کہ وہ کس وقار اور متانت سے یہ مقام بھی طے کر گئے" مجھے ایک معتقد کی حیثیت سے یہ بات کھٹک جاتی تھی کہ ایک پیکر مروت و شرافت اور ایک مرنجان مرنج ہستی کے خواہ مخواہ لوگ کیوں درپے آزار ہو گئے تھے؟ حضرت سیدی کی رحلت کے بعد اپنا یہ استعجاب استاذی و مخدومی مولانا مناظر احسن گیلانی مدظلہ کی خدمت میں پیش کیا، اس کا جو عارفانہ جواب حضرت گیلانی کی طرف سے ملا، اس سے رنج و غم کے بادل چھٹ گئے، آپ بھی اس کو سن کر بصیرت و سکینت حاصل کیجئے:

"ہمارے سید الملت قدس اللہ سرہ العزیز کی صابریت کے جن حالات کی طرف آپنے اشارہ فرمایا ہے، اُن کا تعلق سچ پوچھئے تو اس جہان سے زیادہ نہ تھا، اُن کی زندگی کا بڑا حصہ شکوریت کے زیر اثر گذرا تھا، صابریت کی منزلیں رہی جاتی تھیں، زندگی کے آخری دور میں ان منزلوں سے بھی وہ گذر گئے، اور خوب گذرے، صرف علامہ، ڈاکٹر، اور اعظم المصنفین ہی ہونا اُن کے لئے مقدر نہ تھا"

سید العارفین بن کر رفیق اعلیٰ میں قدرت نے ان کو بلانا چاہا، اسی کا نظم کیا گیا، ———

---

[1] اس کی کچھ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو احقر کا مضمون" علامہ سید سلیمان ندوی اور کراچی کے تین سال" جو معارف کے خصوصی نمبر بابتہ ماہ مارچ ۱۹۵۵ء میں چھپا ہے۔

احقر کو یوں محسوس ہوا کہ کسی نے سر پکڑ کر خوب اچھی طرح جھنجھوڑ دیا، اور وہ وسوسہ کافور تھا، ! - بعد افطار جب احقر نے اپنی اس حالت کا ذکر کیا، تو متبسم ہوئے، اور فرمایا،

"ہمارے حضرت والاؒ فرماتے تھے کہ جہاں خزانہ ہوتا ہے، چور وہیں نقب لگاتا ہے، انشاء اللہ آپ کو فائدہ ہوگا"

دوسری مرتبہ مارچ ۴۹ء میں پھر خدمتِ شیخ میں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی، حضرت والاؒ کچھ بیمار تھے، ایک روز پلنگ پر جو کمرہ کی دیوار سے متصل لگا ہوا تھا، دیوار ہی کی طرف رُخ کر کے لیٹے ہوئے تھے، خادم سرہانے کے قریب بیٹھا ہوا تھا، میرے دل میں اپنے شیخ کی عظمت و محبت کے خیالات موجزن ہوئے، یکایک حضرت اقدس نے کروٹ بدلی، اور مسکرا کر احقر سے فرمایا،

"آپ تو بس یہ سمجھئے کہ پیرِ من خس است و لے اعتقادِ من بس است"

یہیں قیام کراچی کے دوران ہی میں میں نے حسب عادت اپنا ایک احوال نامہ (جو ملفوف تھا) پیش کیا، اس میں کچھ عقلی الجھنوں کا ذکر تھا، — بس جونہی عریضہ ہاتھ میں لیا، فرمانے لگے،

"معلوم ہوتا ہے فلسفیانہ کتابیں آج کل زیرِ مطالعہ ہیں، اُن کو چھوڑیئے، اس میں کیا رکھا ہے!"

احقر کے والد ماجد سلسلۂ نقشبندیہ سے منسلک ہیں، اور مولانا سید عبد اللہ صاحب مجددی حیدرآبادی صاحب زجاجۃ المصابیح کے مرید رشید، وہ فرمایا کرتے ہیں کہ حضرت والاؒ کا مکاشفہ بھی بڑا زبردست تھا، گو وہ اس کا اظہار نہیں فرماتے تھے!

اور یہ تو حاضری کا معاملہ ہوا، ورنہ حضرتِ والاؒ کے سارے منتسبین خواہ وہ ہندو پاک کے کسی گوشہ میں ہوں اس برکت کو ہمیشہ محسوس کرتے رہے کہ کیسی ہی باطنی الجھن اور پریشانی ہو، جہاں حضرتؒ کی خدمت میں خط لکھا، اور ڈاک کے حوالہ کیا کہ وہ ساری تشویش سکینت سے بدل جاتی تھی، اور احقر کے ساتھ تو حضرتِ والاؒ کے آخر حیات میں یہ معاملہ رہا کہ جب کوئی الجھن پیش آئی اور عریضہ لکھنے بیٹھا کہ اس کا جواب

آپ اس کو قبول کرکے ممنون فرمائیں، آپ کو یہ رقم دے کر میرا قلب بہت مطمئن ہے اور اللہ پاک کی رحمت سے اُمید ہے کہ اُن کی روح کو بھی مسرت اور سکون ہوگا، رب رحیم اُن کو اعلیٰ مرتبہ عطا فرمائیں، میرے خاتمہ بالخیر کے لئے ہمیشہ دعا کیجئے،

والسلام "والدۂ سلمان"

خدا جانے فیض روحانی کے ساتھ ساتھ جود و سخا کے دریا بھی کتنے بہائے گئے ۔۔ قدس اللہ اسرارہٗ،

کشف والہام | کشف والہام اور کرامت جیسی نہ مقصود ہیں نہ مطلوب، نہ اُن کو قرب الٰہی میں کوئی دخل ہے البتہ بقول حکیم الامتؒ یہ قرب سے ناشی ضرور ہیں، اور جو حضرات اِن کی اہمیت کی نفی کرتے ہیں، وہ ان سے کچھ خالی نہیں ۔۔ حضرت مرشدیؒ کی خدمت میں جو لوگ حاضر ہوتے رہے، وہ سب اس بات کو محسوس کرتے رہے کہ جو اشکال ذہن میں لے کر گئے شیخ نے از خود ایک جملہ میں اس کا جواب عطا فرمایا، اور عرض معروض کی نوبت ہی نہ آئی حتیٰ کہ بعض مرتبہ یہ بھی ہوا کہ کئی کئی افراد کے ذہن میں مختلف نوعیت کے شبہات تھے، اور حضرت شیخ نے جب گفتگو فرمائی، تو ہر ایک کے شبہہ کا ازالہ ہوگیا، حالانکہ کسی نے اس کا اظہار نہ کیا تھا، ۔۔ "جب بیتی" سنانے کے لئے تو ایک مستقل باب کھولنا ہوگا، "آپ بیتی" کا ایک جزو پیش کرتا ہوں:

ستمبر ۱۹۵۲ء میں پہلی مرتبہ حضرت شیخ کی خدمت میں بھوپال حاضر ہوا، دو دن بعد ذہن میں یہ وسوسہ آیا کہ یہاں آنے سے حاصل کیا ہوا، یہ نماز روزہ[1] تو گھر پر بھی ہو ہی رہا تھا ۔۔۔ اس وسوسہ سے بچنے کی وہ تمام تدبیریں اختیار کریں جو حضرت حکیم الامتؒ نے تجویز فرمائی ہیں لیکن وسوسہ تھا کہ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا، حتیٰ کہ ۲۴ گھنٹہ اس خیال پر گذر گئے، اور میں نے حضرت والا سے اس سلسلہ میں کچھ عرض نہ کیا، دوسرے دن عصر کی نماز کے لئے حضرت والا مسجد جا رہے تھے، احقر بھی ساتھ تھا، چلتے چلتے دفعتہً رُکے چیں بہ جبیں ہوکر احقر کی طرف دیکھا، اور فرمایا: "تو آپ نے مجھ پر کوئی احسان کیا"۔۔ بس یہ فرما کر تیز تیز آگے چلے گئے۔

---

[1] یہ رمضان کا مہینہ تھا،

نور سے معمور دکھائی دیتا ہے، مگر میں فوراً آنکھیں بند کر لیتا ہوں کہ ہر اینچہ می شود ہمہ غیر خدا است"

ایک مرتبہ اذکار و اشغال کا تذکرہ تھا، تو ارشاد فرمایا کہ سلطان الاذکار شغل، اشد، کشفِ قبور، او اس قبیل کی چیزیں تصوف نہیں ہیں، بلکہ تصوف کا آرٹ ہیں، آرٹ میں حقیقت کہاں؟ تصوف کا مقصود تو صرف حصولِ رضائے الٰہی اور اتباعِ سنّت ہے، ہاں اس سلسلہ میں از خود کوئی بات حاصل ہو جائے تو وہ اور بات ہے!

اسی طرح یہ بھی فرمایا کہ مثنوی مولانائے روم بھی تصوف نہیں بلکہ "فلسفہ تصوف" ہے، اور فلسفہ سے بگڑے ہوئے دماغوں کا علاج ہے نہ کہ ہر ایک کا، اس سلسلہ میں، حقیر نے عرض کیا کہ مثنوی کے پہلے دو اشعار میں جو بات بیان کی گئی ہے وہ تو ایک حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ عالمِ ارواح میں ایک مقامِ حق تعالیٰ کے قرب کا حاصل تھا جہاں وعدۂ الست لیا گیا، تو کیا عجیب جواب مرحمت ہوا فرمایا،

"تو وہ مستقل ہوتا ہے جس کا ذکر آپ کر رہے ہیں، وہ تو ایک کانفرنس تھی جو بادشاہ نے طلب کی تھی، وہ مقام کیسے ہو گیا؟

ایک محفل میں حضرت شیخ اکبر اور حضرت مجدد الف ثانی رحمہما اللہ کا ذکر آیا، تو حضرت سیدیؒ نے کیسی گر کی بات بتائی، ارشاد فرمایا:

"شیخ محی الدین ابن عربیؒ نے توحید کی تعلیم پر زور دیا، اور اس کو فلسفیانہ انداز میں پیش فرمایا، اُن کی اصطلاحات کے ذریعہ جو ضلالت پیدا ہوئی وہ توحید کی راہ سے آئی اور لوگ اناالحق کے مدعی بن گئے، اور حضرت مجدد الف ثانی نے اتباعِ سنت پر زور دیا، مگر ساتھ ہی نبوت کی فلسفیانہ توضیح و تشریح پیش فرمائی، اس کے ذریعہ جو ضلالت آئی وہ نبوت کی راہ سے آئی، اور "انا النبی اور انا مہدی" کہنے والے پیدا ہوئے"

ایک دفعہ احقر سے سوال فرمایا کہ "فنا فی الشیخ" کے کیا معنی ہیں، احقر نے عرض کیا کہ شیخ کی محبت جب مرتبۂ محبت

خود بخود ذہن میں آگیا، ایک مرتبہ حضرتِ والا سے یہ کیفیت عرض کی، اور معذرت کی کہ اسی وجہ سے ایک مرتبہ کوئی احوال نامہ پیش نہ کرسکا، تو فرمایا:- بھئی اس پر تو شکر ادا کیجئے، معذرت کی کیا بات ہے!"

بحیثیت شیخ محقق اب تک حضرت والا سے متعلق جو کچھ عرض کیا گیا وہ اُن کی نیکی، دیانت، تقویٰ و طہارت، محبت و معرفت کا ایک بالکل اجمالی تذکرہ تھا، لیکن اہلِ فن جانتے ہیں کہ ہر زاہد و عابد اور ولی اللہ کا ایک "شیخ محقق" ہونا بھی کوئی لازمی امر نہیں، تربیت روحانی کے لئے فنِ تربیت سے مناسبت اور اس میں درک نہایت ضروری ہے، ہمارے حضرت والا جہاں میدان علم کے شہسوار تھے، وہاں فنِ تصوف میں بھی "شیخ محقق" کی شان رکھتے تھے اور اُن کے فیوض ہند و پاکستان کے طول و عرض میں جاری و ساری ہیں۔ اگرچہ نکون نکتے بھی منتسبین کا حال راقم کے علم میں ہے اس سلسلہ میں حضرت کے صرف چند اقوال نمونۃً پیش ہیں جن سے اُن کی شانِ تحقیق کا اندازہ ہوگا،

ایک مرتبہ راقم نے عرض کیا کہ حضرت عمل پر تو بحمد اللہ دوام ہے لیکن اس کی عدم قبولیت کا گمان ہوتا رہتا ہے، فرمایا:-

"خوب اپنے احوال کو اللہ میاں کے سر تھوپ دیا، اُن کی رضا و قبولیت کا حال تو دوسری دنیا میں معلوم ہوگا، یہاں تو صرف عمل مقصود ہے، عمل میں لگے رہئے"!

پھر عرض کیا کہ حضرت قرب کے آثار کچھ تو یہاں بھی ظاہر ہوتے ہوں گے؟ —— ارشاد ہوا:-

"یہ بھی بندے ہی کے ظنون میں بڑے سے بڑے ولی کا بھی جو اعتقاد ہو وہ محض ظن غالب کی بنا پر ہے، اور اپنے میں آثارِ قبولیت تلاش کرنا عجب ہے، کیسے آثار اور کیسی بزرگی، اس راہ میں تو اپنے آپ کو مٹانا ہی اصل شے ہے!"

ایک مرتبہ احقر نے تنہائی میں بعض اپنے احوال عرض کئے، تو ارشاد فرمایا:-

"میرے ساتھ تو روزانہ کا یہ معاملہ ہے کہ جب سوتے وقت لائٹ بند کر دیتا ہوں تو سلام کر

مولانا کے ساتھ چلا جا رہا ہوں آبادی بہت دور ایک قبر قد آدم سے زیادہ گہری کھدی ہوئی تھی، راقم نے اپنے گوشت پوست کی لاش کو اس کے اندر ڈال دیا، اور پھر ہم دونوں نے جلدی جلدی قبر کو مٹی سے بھر دیا۔

اس کے بعد آنکھ کھلی تو طبیعت میں ایک سکون تھا، — اس کی تعبیر جو ملی، ملاحظہ ہو،

"یہ کا فر نفس امارہ ہے، آپ کی اپنی لاش، آپ کا مرتبہ فنا کے قریب ہونے پر دال ہے، حدیث میں ہے، عدّ نفسک مِنَ الاَموات یہ کیفیت اسی مرتبۂ فنا کی طرف اشارہ کرتی ہے، بحمد اللہ"

حضرت کا آخری حال | احقر کے فہم ناقص میں حضرت والا کا رنگ چشتی نہیں بلکہ نقشبندی تھا، وجد و حال کی جگہ سکون و وقار، قیل و قال کی جگہ اتباع سنت کا اہتمام حضرت کا خاص شعار تھا، پھر بھی منصب ارشاد پر فائز ہونے کے بعد چند برس تک یہ حالت تھی کہ جب بولنے پر آتے تو سوز و گداز کے دریا بہا دیتے ہیں آہ! آج بھی اس تقریر کی یاد سے ایک کیفیت طاری ہو رہی ہے، جب حیدر آباد میں مولوی محمد مظہر صاحب مرحوم کی کوٹھی پر یہ احقر بھی حاضر تھا، اور مولانا سید علی بیابانی صاحب (حال مفسر ریڈیو پاکستان) کے علاوہ اور بھی چند عقیدت کیش موجود تھے، شیخ نے نہ جانے کس سوز میں ڈوب کر فرمایا،

"اللہ تبارک و تعالیٰ کے پاس کس چیز کی کمی ہے، مقام صدیقیت کیوں نہیں طلب کرتے یہ تو آپ کے ظرف کی کوتاہی ہے، حوصلوں کو بلند کیجئے"

ان جملوں سے سارے حاضرین محفل کی آنکھیں اشک بار اور دل شعلہ زار ہو گئے تھے لیکن آخر کے دس چار برس میں دریائے پرشور ایک بحر ذخّار بن گیا تھا، دراصل ۱۳۶۰ھ کے حج بیت اللہ کے بعد حضرت والا کو نسبت کاملہ اور نزول تام حاصل ہو گیا، اور پانی اس سطح پر پہنچ گیا کہ بظاہر جوش کے سارے آثار ختم ہو گئے الا جو بھی بیٹھتا اس کو پتہ چلتا کہ حقیقت حال کیا ہے!

دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اپنی ساری نزاکت و نفاست طبع کے باوجود حضرت والا سفر دوران قیام مکہ

پر غالب آجاتی ہے تو اسی کا نام "فنا فی الشیخ" ہے، فرمایا کہ یہ تو ابتدائی کیفیت ہے "فنا فی الشیخ" ہو جانے کے اصل معنی تو یہ ہیں کہ اپنے احوال وواردات بھی وہی ہو جائیں، جو شیخ کے ہیں، چنانچہ ہمارے مولانا عیسیٰ صاحب فانی فی الشیخ تھے!

رؤیا اور تعبیر رؤیا | مسلک اشرفیہ میں خواب کو کچھ زیادہ اہمیت حاصل نہیں، ایک مرتبہ حضرت سیدیؒ نے ارشاد فرمایا کہ "اخلاق ہی سے قرب حاصل ہوتا ہے، اچھے اچھے خواب یا محض کثرت نوافل سے قرب نصیب نہیں ہوتا، حتیٰ کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں رویت بھی گو بہت بڑی بات ہے، مگر قرب حق پر دلالت نہیں کرتی، بلکہ اس کا منشا صرف یہ ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ آپ کی اتباع کی جائے، چنانچہ اگر رویت کے بعد اصلاح اخلاق کی زیادہ فکر نہیں کی گئی، اور محض رویت پر بزرگی کا خیال ہو گیا، تو پچھلی حالت بھی سب ہو جاتی ہے۔ — یہ تو امر واقعہ کا ذکر ہو گیا، ویسے ہمارے حضرت والاؒ کو تعبیر رؤیا کا خاص ذوق حاصل تھا، دو ایک نمونے ذیل میں پیش ہیں، اہل فن کو ابن سیرین کی یاد آ جائے تو کوئی عجب نہیں۔

راقم کی اہلیہ نے خواب میں دیکھا کہ سر کے بال سفید ہو گئے، یہ خواب جب خدمت شیخ میں عرض کیا گیا تو جواب ملا:-

"شاید اولاد کی بشارت ہو، واشتعل الرأس شیبا"

اس تعبیر کو پاکر تحقیق کی گئی تو بات بالکل صحیح تھی، — اب ایک خواب اس ناکارہ کا اور اس کی تعبیر سنیئے:-

راقم نے دیکھا کہ وہ اور مولینا سید عبدالجبار صاحب (حال مفسر ریڈیو پاکستان) دلّی سے چلے آ رہے تھے کہ ایک کافر مصیبت سے تڑپتا ہوا دکھائی دیا، میرے دل میں ہمدردی کا خیال پیدا ہوا ہی تھا کہ میری ہڈیوں کا ڈھانچہ ایک لکڑی کے تختہ پر ہوا میں معلق ہے، اور اس کافر سے قریب ہونا چاہتا ہے مگر ہو نہیں سکتا، اس کے ساتھ ہی یہ بھی محسوس کیا کہ اپنے گوشت اور پوست کا پورا مجسمہ اپنے کندھے پر اٹھائے

محترمہ کو بلا کر وہی دعا اُن پر دم کر دی، اور پھر سارا ماجرا سنایا، ـــــ غالبًا اس واقعہ کے بعد ہی وہ سکون خاطر اور عبدیت مطلقہ نصیب ہوئی، جو تا آخر حیات قائم رہی، ـــــ اور اس نزدل تام کی وجہ سے ان کی عظمت و رتبت کی معرفت ہی مشکل ہو گئی، مولانا محمود الغنی صاحب سہارنپوری ثم پاکستانی جو حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے قدیم خلفاء میں سے ہیں، اکثر فرمایا کرتے تھے کہ لوگ مولانا کو تو پھر بھی پہچان لیں گے، مگر حضرت سید صاحب کے کمال کو پہچاننا بہت دشوار ہے، اور پھر فرمایا کہ ایک مرتبہ حضرت سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، اور سلام کر کے کمرہ میں داخل ہی ہوا تھا کہ وہ کیفیت محسوس ہوئی جو حضرت حکیم الامت کی رحلت کے بعد پھر کبھی حاصل نہ ہوئی تھی،

اب آخر میں دو لفظ مرض الموت سے متعلق عرض کر کے اس صحبت کو مجبوراً ختم کرنا ہے، ۲۲ر نومبر ۱۹۵۳ء کے دن رجب کے بعد شام کو حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ داغ مفارقت دے گئے) بعد نماز حضرت کی اہلیہ محترمہ حسب معمول حضرت والا کی صحت کے لئے دعا مانگ رہی تھیں کہ یکایک ایک سفید پوش ہستی نمودار ہوئی، اور اُس نے ایک دودھیا رنگ کا گلاس محترمہ کی خدمت میں پیش کیا، محترمہ نے گھبرا کر ہاتھ چھوڑ دیئے، اور پیچھے مڑ کر حضرت والا سے (جو پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے) عرض کیا آپ نے کچھ دیکھا؟ ـــ جواب ملا کیا ہوا؟ اہلیہ محترمہ نے واقعہ سنایا تو خلاف عادت پورے اطمینان سے ارشاد فرمایا :-

"یہ آپ کی تسکین کا سامان کیا گیا ہے"

اس سے گمان ہوتا ہے کہ شاید حق تعالیٰ نے اپنے محبوب بندے کو کوچ کا اشارہ فرما دیا ـــــ دن گذر گیا، مغرب کی نماز پڑھ کر داہنی کروٹ ٹھیک مطابق سنت لیٹ گئے، نظر تیا چہرہ، انور پر جمی ہوئی تھیں، دفعۃً ایک ہچکی آئی، اور روح سلیمانی لبیک کہہ کر اپنے مولیٰ کے حضور حاضر ہو گئی، الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون کا مشاہدہ کھلی

عبودیت کا اس قدر غلبہ رہا کہ صرف ایک کرتہ اور پاجامہ یا تہمد میں ملبوس برہنہ پا چلچلاتی دھوپ میں طواف کرتے دکھائی دیتے تھے اور اس پیرانہ سالی اور ضعف قویٰ کے باوجود اپنا سا را کام خود ہی کرتے تھے راقم نے خود حضرت سے سُنا کہ ایک روز اسی سادگی سے صحن حرم میں بیٹھے تسبیح پڑھ رہے تھے کہ کسی عرب عالم نے سلام کیا، اور پوچھا کہ اے شیخ ہم نے سنا ہے کہ آج کل آپ تصوف کا شغل رکھتے ہیں ؟ ـــ حضرت فرماتے تھے کہ اس وقت کچھ تائید غیبی ایسی شامل حال ہوئی کہ مسلسل آدھ گھنٹہ تک قرآن و حدیث ہی کی آیتوں سے تصوف کو ثابت کرتا چلا گیا جس کا ماحصل یہ تھا کہ رذائل نفس سے پاکی اور فضائل اخلاق کا حصول واجب ہے، وہ عرب عالم اس گفتگو سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ انھوں نے اقرار کر لیا کہ اگر تصوف یہ ہے تو اس سے کس کو انکار ہے ــــــ غرض مکہ معظمہ میں شیخ کو جو فیوض حاصل ہوئے اور جو انشراح نصیب ہوا، اس کا اندازہ اُن کی نظم کے دو ایک شعر سے لگا لیجئے، جو اسی فضا میں کہی گئی تھی، فرماتے ہیں

دیدۂ دل اگر ہو باز، راز رہے نہ راز میں ــ جھانکتی ہیں حقیقتیں آئینۂ مجاز میں

اس کے کرم کے ہیں نثار اسکی عطا کا کیا شمار ــ دیدیا عاصیوں کو بار، پردۂ حریم راز میں

اب مکہ معظمہ سے فارغ ہو کر دیار رسولؐ میں پہنچے، بارگاہ رسالت میں حاضر ہو کر سیرت نگار رسول نے چند نعتیہ اشعار کہے، جس پر شیخ کے کلام کا غالبًا خاتمہ ہے، اس نعت کا آخری شعر ان کی حالت کا آئینہ ہے التجا کرتے ہیں،

بجھ جائے تیرے چھینٹوں سے اے ابر کرم آج

جو آگ مرے سینہ میں مدت سے دبی ہے

عاشق رسول کی یہ التجا قبول ہو گئی، ایک رات حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے، اپنے آپ کو قدم رسالت پر گرا دیا، رحمت عالمؐ نے اپنے شیدائی کو اٹھا لیا اور ایک طویل دعا پڑھ کر سینہ پر دم کر دی ــــــ حضرت والاؒ کی آنکھ کھلی تو حضور انور کی دعا یاد تھی، یہ بھی

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا سلوک و تصوف

اور

طریقۂ تربیت

از

مولانا سید عبدالرؤف صاحب اورنگ آبادی

آہ! علم و ادب، تاریخ و سیر میں یگانۂ روزگار، سلوک و تصوف میں ممتاز اور جملہ اسلامی علوم میں جامع و باکمال ہستی دنیا سے رخصت ہوگئی،

خدایا بران تربتِ نامدار　　بفضلت کہ باران رحمت ببار

ہزاروں تحقیقات علمیہ، حقائق دینیہ، نکات احسانیہ اور رموز روحانیہ کے اپنے نقش و نگار چھوڑ گئی، جو مدتوں باقی رہیں گے۔ ایسی جامع کمالات ہستی صدیوں میں کہیں پیدا ہوتی ہے،

عمرہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات　　تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید برون

علمی بزم کے تو وہ صدر نشین تھے ہی سلوک و تصوف میں بھی اُن کا بڑا درجہ تھا، اور اس کے وہ اسرار و رموز اور معارف و حقائق بیان فرماتے کہ دل کیف یقین سے لبریز ہو جاتا، اس مختصر مضمون میں اس کے بعض جلوے دکھائے جائیں گے، اس راہ میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ علمی صدارت کی بھری مجلس میں اپنی علمی لغزشوں (۱) اور کوتاہیوں کا اعتراف اور ہر اس تحقیق و رائے سے جو کتاب و سنت کے موافق نہ ہو، رجوع کرکے "ذکر دہ اصواب توبہ یارب" کی صدا بلند کی، عملی سلوک و تصوف کی یہ وہ تجلّی تھی کہ مدعیانِ علم و عمل کی آنکھیں خیرہ

آنکھوں ہوگیا، روح کی مفارقت کے بعد اس عاشقِ رسول کے جسم مین کوئی تغیر تو کیا آتا، چہرۂ مبارک اس قدر منور و تابان ہوگیا، اور سکینت و فرحت کے ایسے جلوے نمودار ہوئے کہ جس کی بھی نظر پڑی اُس کے دل نے سیدالملت کے ولی اللہ ہونے کی تصدیق کی ——— آہ! ہندوستان کی تاریخ مین یہ دوسرا "ولی اللہ" پیدا ہوا تھا، سو وہ بھی آج زینتِ تاریخ بن گیا،

عمرہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید برون

تعلیم و ارشاد میں تا امکان غفلت و دریغ نہ کرے اور مسترشد تا امکان اطاعت و انقیاد میں کوتاہی سے کام نہ لے، مرشد کے ذمہ جو فرائض عائد ہوتے ہیں، اس کی ادائگی پر بلا اخذ بیعت بھی تیار ہوں، اور چونکہ میں اپنے میں کوتاہی پاتا ہوں، اس لئے تاخیر کر رہا ہوں یا ابھی وقت اس امانت کی سپردگی کا نہیں آیا ہے، وقت کا انتظار کیجئے جب وقت آئے گا، تو خود بخود یہ دولت نصیب ہو جائے گی،

پیر اور مرید کے فرائض غالباً یہ ذہن نشین ہوگا کہ یہ عمر بھر کا سودا ہے، اس لئے اس راہ میں جو قدم رکھا جائے، وہ خوب سوچ سمجھ کر رکھا جائے، پیر کی نسبت صرف اتنا اعتقاد رکھنا شرط ہے کہ میری تلاش میں میری نافعیت کے لئے اس سے بہتر کوئی شخص اس وقت نہیں ہے، بہرحال یہ طرفین سے احب فی اللہ کا معاہدہ ہے کہ طالب تعمیل میں اور مطلوب یعنی شیخ تعلیم میں کوئی کمی اخلاص میں نہ کرے گا، اس سلسلہ میں چار باتیں بمنزلہ اصول کے ہیں، اعتقاد، انقیاد، اطلاع، اتباع اس راہ میں ضروری ہے کہ اپنے کو مربی کے ہاتھ میں اس طرح دیدیں جس طرح مریض طبیب کے ہاتھ میں اپنے کو دیدیتا ہے، اصول اربعہ کی پیروی رہے، میں نے پہلے ہی لکھ دیا ہے کہ اپنے شیخ کی نسبت یہ اعتقاد رکھنا چاہئے کہ میری نافعیت کے لئے میری تلاش میں یہ سب سے بہتر ہے، پس دوسروں سے انکار کی صورت نہیں ہے، مگر اتباع ایک کی چاہئے، ایک ساتھ دو طبیبوں کا مریض مصیبت میں رہتا ہے، اعتقاد اور انقیاد تو معلوم کر لیا، اطلاع سے مقصود شیخ سے مکاتبت اور اتباع سے احکام شیخ کی پیروی ہے،

نماز کی حقیقت نماز کو اپنی طرف سے پوری ظاہری و باطنی آداب اور خضوع و خشوع کے ادا کرنے کی کوشش کیجئے، جس قدر ہو اللہ کا شکر کیجئے، اور آیندہ کے لئے ہمت کیجئے، اور دعا کیجئے، ہمارے حضرت کی تحقیق ہے کہ مبتدی نماز میں یکسوئی کے لئے لفظ کی طرف اور متوسط معنی کی طرف اور منتہی ذات بحت کی طرف یہ تصور کرے کہ بندہ اپنے آقائے حقیقی کے سامنے کھڑا ہے، اور وہ اس کو دیکھ رہا ہے، اس کا اثر یہ ہو کہ قلب میں سکون اور جسم میں پستی اور تواضع کا شان پیدا ہو، نماز میں اصل شے حضور اور خشوع ظاہری و باطنی ہے، اور نیز ہر قسم کے رذائل سے امکان دوری اور فضائل کے حصول کی کوشش اور اطاعت الٰہی پر مداومت، اور حصول رضائے الٰہی کا شوق

ہوکر رہ گئیں نفس پرستی کے اس دور میں محض رضائے الہٰی، اور اتباعِ حق کے لئے اتنی بڑی ہستی کا اپنی قلمی لغزشوں کا اعتراف اور اس سے برأت کرنا عرفان حقیقت کے کمال اور فنائیت و فنائے نفس کی روشن دلیل ہے،

فنائے ذات اور اتباعِ حق کی یہ وہ مثال تھی جس پر خود شیخ طریقت نے مرید کی شان میں یہ اشعار ارشاد فرمائے، اور اس ناچیز کی عقیدتمندانہ نظر پہلی مرتبہ حضور والا رحمۃ اللہ علیہ پر پڑی، ناچیز اس زمانہ میں حضرت مجدد تھانوی کی بیعت سے مشرف ہوکر مولانا محمد عیسیٰ صاحب کے زیر تربیت تھا، حضرت والا رحمۃ اللہ نے تحریر فرمایا کہ اگر وہ مصلح پسند نہیں ہیں، تو مناسبِ حال کوئی دوسرا مصلح منتخب فرمالیں، اس کے کچھ دنوں کے بعد حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ سے لکھنؤ اسٹیشن پر ملاقات ہوگئی، اور شاہ گنج تک رفاقت کا شرف رہا، اس مختصر صحبت کا دل پر ایسا اثر پڑا کہ خط کے ذریعہ نذرِ عقیدت پیش کی، اس کے بعد حضور کے حسب طلب کئی مرتبہ آپ کے وطن دیسنہ میں حاضری کا موقع ملا، اور دوسرے سفر میں اخذِ بیعت وارادت اور فیوض و برکات حاصل کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، اس کے بعد بارہا شرفِ زیارت حاصل ہوا، مگر پاکستان کی ہجرت کے بعد اس سے محرومی رہی، البتہ مراسلت کا سلسلہ برابر جاری رہا،

اس دس سالہ مدت میں حضور کی زبان و قلم سے جو ارشادات نکلے ہیں، افادۂ عام کے خیال سے ان کے مختصر اقتباسات درج کئے جاتے ہیں کہ شاید ان سے کسی قلبِ سلیم کو فیض و برکت حاصل کرنے کی توفیق ہو، ان سے حضور کے سلوک و تصوف کی حقیقت اور آپکے طریقۂ تربیت کا بھی اندازہ ہوگا۔

تواضع آپ میری نسبت یہ سمجھیں کہ یہ خاکسار حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کے خدام میں سب سے کمتر اور رتبہ میں بھی فروتر ہے، اس پر بھی اگر اس ذرۂ بمقدار کی طرف اپنے دل کی کشش بے تکلف محسوس کریں تو ظاہر فرمائیں ایسا نہ ہو کہ بعد کو پچھتاوا آئے، میرے حالات کو بھی تحقیق فرمالیں کہ میں اس قابل بھی ہوں، اگر ان سب باتوں کے بعد بھی دل کا میلان ہو تو خدمت سے انحراف نہیں،

مقصدِ بیعت اور تفویض امانت بیعت کا مقصد تو یہ ہے کہ مرشد و مسترشد میں اس امر کا معاہدہ ہوتا ہے کہ مرشد

کی فکر دامنگیر ہو، استکبار و افتخار و غرور کہ ہچومن دیگرے نیست کے شیطانی پھندے ہیں گرفتار نہ ہو جائیں، اپنے کو مجموعۂ ذمائم اخلاق سمجھنا خیر و برکت ہے، بےسبب تذکرہ اسرارِ قلبی اور واردات روحانی کو ظاہر کرنا بھی استکبار میں داخل ہے، غیبت بہت بُری چیز ہے، اس سے نیکیاں دوسروں کو مل جاتی ہیں، اپنے قلم سے خود کو مولوی لکھنا کبر کے آثار میں سے ہے، گویا اس کا اظہار ہے کہ لوگ اس کو بڑا سمجھیں، مکائد النفس بہت دقیق ہیں، اللہ تعالیٰ پناہ میں رکھیں، تواضع اور فنائے ذات کی راہ پیش نظر رہے، افنائے نفس کے لئے اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ فِیْ عَیْنِیْ صَغِیْرًا کی دعا مفید ہے، اپنے کو سب سے بدتر سمجھنا سب سے بہتر ہے، اس کا ہمیشہ اور ہر کام میں خیال رہے، بس اپنے عیوب پیش نظر رہیں، اور اُن کی اصلاح کا خیال غالب اور اس باب میں اپنے نفس کے مکائد پر نظر رہے،

حاصل سلوک | حصول تقوی تحلی بالفضائل اور تخلی عن الرذائل برائے رضائے الٰہی اصل سلوک ہے، ہر قسم کے رذائل سے بقدر امکان دوری اور فضائل کے حصول کی کوشش، اور اطاعتِ الٰہی پر مداومت اور حصول رضائے الٰہی کا شوق اور باقی غیر مقصود ہیں، اپنی اصلاح و تربیت کی دھن میں لگے رہئے تاآنکہ اللہ کے سوا دل سے ہر چیز کی محبت فنا ہو جائے، ریا، عجب، کبر رنگ برنگ صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں، اور یہ سالک کے لئے سخت خطرناک ہیں، اس لئے ان سے احتراز کا اہتمام نہایت ضروری ہے، بڑی چیز یہ ہے کہ اپنے پر نظر بُرائی کی نہ پڑے، یہ راستہ مردودیت کا ہے، ابیٰ و استکبر وکان من الکافرین، ہر حال میں تواضع اور فنا پر نظر رہے اور ذمائم اخلاق پر،

حصولِ تقوی | منہیات و اوامر کی تصریح پیش نظر رہے، مقصود حصولِ تقوی ہے، کہ قرآن پاک ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ہے، عبادت کا منشا بجا آوری کے بعد حصولِ تقوی ہی ہے، "لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْن" بعد فرائض و سنن نوافل کی پابندی علی مراتب الوجوب والاستحباب کے منہیات شرعیہ سے احتراز کا لزوم کیا جائے،

باقی غیر مقصود ہیں، تو امورِ مقصودہ میں ان امور کی طرف بیشتر متوجہ رہیں،

التزام سنن و نوافل اور تہجد | نمازِ پنجگانہ کے بعد حسب ذیل نمازوں پر حتی الامکان مداومت کی جائے، نمازِ تہجد بعد مغرب ۶ رکعات نفل اوابین، طلوعِ آفتاب کے بعد ۲، یا ۴ رکعت نفل چاشت، نوافلِ مسنونہ نمازِ پنجگانہ کے بعد، نماز میں اعتدال ارکان، اور حضورِ قلب کی کوشش رہے، تہجد کا التزام ازبس ضروری ہے یہی مفتاحِ اسرار ہے، اگر رات کو احیاناً ناغہ ہو جائے، تو بوقت چاشت، بارہ رکعات پڑھیں، تہجد عجیب عبادت ہے جس پر خود حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً دوام فرمایا ہے، اس لئے سنت موکدہ ہے[1] اب اہل محبت کے لئے کیا گنجایش رہی، فضائلِ اعمال کے اکتساب کا سبق محدثین سے لیں، جن سے لیں علیکم بقیام اللیل فانہ دابُ الصالحین تو لزوم پر دال ہے، تہجد باجماعت اگر اتفاقی ہو تو جائز ہے ورنہ اہتمام اور تداعی کے ساتھ نہیں غور کرنا چاہئے کہ اس میں ریا اور نمود کی خواہش تو پوشیدہ نہیں، اگر تہجد قضا ہو جائے تو طلوعِ آفتاب کے بعد دوپہر سے پہلے تک بارہ رکعتیں پڑھ لی جائیں، تہجد کی نماز ذرا جہر سے پڑھنا مستحب ہے،

دعا کا اہتمام | تہجد کے بعد بارگاہِ الٰہی میں پوری درد و الحاح کے ساتھ اپنے لئے دعا کیجئے، دعا میں تضرع و خضوع ہونا چاہیئے، عصر اور صبح کی نماز کے بعد دعا خوب کیا کیجئے، اور مانگئے جو آپ کے لئے مناسب ہوگا ملے گا، اس در سے کوئی محروم نہیں پھرا ہے، اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ اس کا اعلان ہے اور "الدعا مخ العبادہ" ارشاد ہے،

احتسابِ نفس | اپنے عیوب کی تلاش میں رہیے، اور جو عیب سب سے زیادہ اُبھرا ہوا علی العیان معلوم ہو، اس کے دفعیہ کی کوشش کیجئے، مثلاً کبر، عجب، ریا، حسد، وغیرہ، ان عیبوں کی حقیقت دریافت کیجئے، اور پھر اس کا علاج معلوم کیجئے، اپنے میں شکستگی، انکسار، تواضع ہونی چاہئے، اور ہر وقت اپنے عیوب پر نظر جمی رہے، اور اس کے اصلاح

---

[1] سنتِ موکدہ کی تعریف اس پر صادق آتی ہے، البتہ قولاً تاکید نہیں فرمائی، شفقۃً علی الامۃ، مگر اپنے عمل سے اس کو موکد ثابت کر دیا،

ین ناقص ہین، یادِ الٰہی سے غفلت نہ ہو، ذکر کا مقصود یہی ہی؛

ذکرِ دوام | ادعوا ربکم تضرعًا و خفیۃً الی ولا تکن من الغافلین، تلاوت فرما کر دوامِ ذکر کے فضائل ثمرات اور وعدے اور غفلت کے نتائج بد اور وعید بیان فرمائے، اور پھر ومن یعرض عن ذکر الرحمن الخ کے تفسیری نکات بیان کئے، اور ہر حرکت و سکون پر عمل و قول مین ذکر کی تاکید فرمائی، یادِ الٰہی کو مرکزِ خاطر کرنے کی ہدایت فرمائی، اور بیان کیا کہ احکامِ شرعیہ کی روح ذکر ہی ذکر ہے، جمال، نوال، کمال کے اعتبار سے ذاتِ باری ہی کو محبوبیت حاصل ہی، تو اسی محبوبِ حقیقی کی یاد واجب ہی الذین امنوا اشد حبا للہ منصوص ہی، دنیا اور تعلقات دنیا کے ساتھ یادِ الٰہی بڑی چیز ہے، اور یہی سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اور صحابہ رضوان اللہ علیہم ہے، چنانچہ حضرت عروہ رض کا پاؤن جب کاٹا جانے لگا تو ہوش و حواس ہی مین پاؤن کاٹنے کا انھون نے حکم دیا، اسمِ ذات یعنی اثبات و نفی کے ذکر کے جمالی و جلالی ہر دو طریقہ کو عملاً ظاہر فرما کر تکرار کی ہدایت کی، اور فرمایا کہ وقتِ ذکر قربتِ حق، سماعتِ حق، رحمتِ حق اور نزولِ رحمت پیر اذعان و نظر رکھنا چاہئے تاکہ ثمراتِ ذکر جلد سے جلد تر ظاہر ہون، اپنی بابت فرمایا کہ مجھے تو ذکرِ جلالی مین خشکی پیدا ہو جاتی ہی، اس لئے ذکرِ جمالی پر بیشتر عمل کرتا ہون، اور اسی مین سہولت و لذت محسوس کرتا ہون، آپ کو اختیار ہی کہ جس طریقہ کو چاہین، اختیار کرین، نپولین اعظم جب کسی سپاہی کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا تھا تو اس کا نام لے کر پکارتا تھا، جس کا اثر یہ ہوتا تھا کہ وہ اس پر جان دینے کو تیار ہو جاتا تھا، اسی طرح اسمائے الٰہی کی یاد اور تکرار اُن کی توجہ خاص کو اپنی طرف مبذول کرتا ہے، اس ارحم الراحمین کا نام پاک ورد کیا جائے گا، تو اس کی رحمتین ذاکر کی طرف متوجہ کیون نہ ہون گی، ماسوی سے بے نیازی کے لئے اثبات و نفی کا ذکر اس کے معنی کے استحضار کے ساتھ کافی و وافی ہی،

۵؎ اسم مین خود محبوبیت نہین اسم مین محبوبیت محبوب کی ذات پر دال ہونے کے سبب سے ہوتی ہے کسی اسم کی محبوبیت ذاتِ پاک کی محبوبیت کا نتیجہ اور ظل ہی،

اہتمام والتزام عمل اعمال تو سب کو معلوم ہیں ضرورت عمل کی ہے، اور حصول تقویٰ اور رضائے الٰہی کے لئے ساری کوشش اسی کی چاہئے، باقی سب فلسفہ ہے، کام میں لگے رہیں،

ع "تا دمِ آخر دمے فارغ مباش"

عمل خیر لوجہ اللہ تعالیٰ ہو، اصل یہ ہے کہ امتحان کی تیاری کے لئے جو وقت صرف ہوتا ہے، وہ بیکار نہیں جاتا ہے، نمبر اسی سے ملتے ہیں، کسی اضطراری عذر کے سبب سے اگر کسی معمول میں کمی ہوجائے تو انشاء اللہ تعالیٰ ہم کو ہماری نیت کے مطابق حق تعالیٰ اس کی جزا عنایت فرمائیں گے، یہ ان کی شانِ رحیمی و کریمی ہے، عمل کیلئے صرف ہمت وعزیمت، دوامِ عمل، اور صحتِ فکر ونظر کی ضرورت ہے، عمل، عملیات اور تعویذ کی سی مقبولیت کی خواہش اس راہ کا کانٹا ہے، اللہ تعالیٰ کی رضا کے سوا عمل کا دوسرا محرک نہ ہو، اور ہر حال میں ذکر لساناً و قلباً و عملاً جاری رہے۔

احکام الٰہی کی اطاعت اور رضائے الٰہی کی طلب اصل شے احکام الٰہی کی کلی اطاعت، حلال حرام کا خیال، معاملات میں صفائی ونزاہت، اتباع نبوی کا دھیان، التزام سنت کا اہتمام ہے، بدعات ورسوم تمام امور میں احتراز، اور تمام امور میں رضائے الٰہی کی طلب، ان امور کی طرف توجہ فرمائیے کہ یہ اصول ہیں اور باقی سب فروع، اور تمام برکات دوام ذکر کا ثمرہ ہیں، ہے اتفاقات، مرضیاتِ الٰہی کی اتباع کا ذوق اور اللہ تعالیٰ کی یاد حاصل ہو، باقی کیفیات تو آتی جاتی رہتی ہیں۔

استقامت بڑی دولت ہے اب تو زندگی کے آخر لمحہ تک یہ استقامت قائم رکھنا ہے، توفنی مسلماً والحقنی بالصالحین کی دعا چاہئے، اپنے کام میں تا دمِ آخر استقامت کے ساتھ لگے رہئے، یہی بڑی دولت ہے "تا دمِ آخر دمے فارغ مباش" معمولات پر استقامت مبارک "الاستقامۃ فوق الکرامۃ" قال اللہ تعالیٰ "قل اللّٰہ ثم استقیموا" سلوک کی اصل کلید ہے، عوارض کی وجہ سے کمی باعثِ افسوس نہیں، وہ کمی افسوس کے قابل ہے جو غفلت یا کوتاہی کے باعث ہو، اپنی تکمیل اور اصلاح سے کبھی غفلت نہ برتیں، اہر عات

اوامر و نواہی کی بجا آوری جس گرم جوشی اور خلوص سے ہوگی، اسی قدر انوار رحمت و برکات کا نزول ہوگا، بعض لوگ احکام و اعمال بجالاتے ہیں، ذکر و شغل بھی کرتے ہیں، مگر ثمرات و اثرات مرتب نہیں ہوتے ہیں، وجہ اس کی یہی ہے کہ خلوص و محبت جو بمنزلہ روح کے ہے، وہ ان میں مفقود ہے، کوئی شخص کونین کھائے، اور کونین کے اثرات مرتب نہ ہوں، تو ظاہر ہے کہ اس کے ناقص ہونے کا حکم لگایا جائے گا، اسی طرح نماز و روزہ اور دیگر احکام و اعمال بجالاتے ہیں، اور ان کے اثرات و ثمرات ظاہر نہیں ہوتے ہیں تو سمجھ لو کہ ان اعمال کی بجا آوری میں نقص ہے، اور بارگاہ الہی میں تو قدر کمال کی ہے۔

کیفیات | سالک کو بڑا دھوکہ ذوق و شوق اور لذت کا ہوتا ہے، سو اس کو پوری طرح سمجھ لیجئے کہ یہ چیزیں آثار محمودہ ضرور ہیں، مگر مقصود نہیں، ان کا منشا اسی قدر ہے کہ کام میں جی لگتا ہے، اور آسانی ہوتی ہے، مگر اس کو قرب و رضا اور حصول ثواب میں کوئی دخل نہیں، کیونکہ یہ امور غیر اختیاریہ میں ہیں، اور غیر اختیاریہ نہ مطلوب ہیں، اور نہ مقصود، دوا کا اصل مقصود صحت بخشی ہے، خوش ذائقگی، اور لذت نہیں، جب انسان کے بدن میں صحت آتی ہے، تو طاقت اور کھانے کی لذت تو خود بخود آجائے گی، اس کے لئے کوئی الگ دوا کی ضرورت نہیں، ابتدائی جوش و شوق میں کمی فطری ہے، یہ مرحلہ زندگی میں بھی پیش آتا ہے یہ کوئی افسوس کی چیز نہیں، جوش و شوق ہو یا نہ ہو، عمل میں کوتاہی نہ ہونے پائے، جس طرح آغاز شباب میں عروس نو کے ساتھ جو شورش و جوش طبع کا مظاہرہ ہوتا ہے، وہ رفتہ رفتہ تمکین سے بدل جاتا ہے، اور بجائے بوالہوسی کے دیرینہ محبت ..... اسکی جگہ لیتی ہے، میرا ایک شعر ہے،

دیکھئے ملتی ہے کب دولت سکون عشق کی ہائے ہوئے جوش تو ہنگامہ آغاز ہے

صبر و شکر | حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کا ملفوظ ہے کہ دو حال سے خالی نہیں یا تو بندہ کو نعمت ملتی ہے، تو اس پر شکر واجب ہے، یا ابتلا پیش آتا ہے، تو اس پر صبر مامور ہے، اور یہ دونوں حالتیں موجب ازدیاد ترقی ہیں، اور یہ صبر و شکر کی دوہری منزل پوری زندگی کے سفر میں ملتی رہتی ہے، شکر و رضا بڑی چیز ہے، اور توفیقات الہی

پاس انفاس | پاسِ انفاس کا مقصد بھی یہ ہے کہ کوئی سانس ذکرِ الٰہی سے خالی نہ جائے، اس کی صورت یہ ہے جو آسانی سے ہو سکتی ہے کہ ہر سانس کے ساتھ اللہ اللہ جاری رہے، بغیر تلفظ لسانی محض ذکرِ قلبی کے ساتھ اُس کا فائدہ ذکرِ دوام ہے، جو حسبِ استطاعت مامور ہے،

مراقبۂ اللہ معی | اللہ معی کا مراقبہ شروع کر دینا چاہئے، اللہ معی کا تصور کہ ہر وقت وہ ہمارے ساتھ اور ہمارے قریب اور ہمارے ہر فعل و خیال کا ناظر و حاضر ہے، اس کے مضمون پر غور کیا جائے، اور اس کے مناسب آیات کا استحضار رہے، واذا سئالک عبادی عنی فانی قریبٌ، وھو معکم اینما کنتم، ونحن اقرب الیہ من حبل الورید، نحن اقرب الیہ منکم ولکن لا تبصرون، وھو علیمٌ بذات الصدور، ولا تخفی علیہ خائنۃ الاعین وما تخفی الصدور، اولا یعلم من خلق، الم یعلم بان اللہ یریٰ، اسی کیفیت کا رسوخ اصل روح ہے جس کا طریقہ ذکر و شغل ہے،

قلب کا ذاکر ہونا | قلب کا ذاکر ہونا یہ فن کی کوئی اصطلاح نہیں ہے، کثرتِ ذکر سے قلب میں ذکر کا لفظ اللہ اللہ ہو یا لا الٰہ الا اللہ یا کوئی اور مرکوز ہو کر حدیثِ نفس کے طور پر جاری ہو جاتا ہے، جو ارادہ کے بغیر بھی قائم رہتا ہے، بلکہ اس کا استحضار بھی نہیں رہتا ہے کہ ذکر جاری ہے، . . . . بہرحال اس کا طریقہ صرف کثرتِ ذکر پر توجہ تام ہے، اور یہ کوئی مشکل نہیں ہے،

مجاہدہ و ریاضت اور اس کے ثمرات | مجاہدہ و ریاضت سے فضل و رحمت اور توفیقاتِ الٰہیہ کی صلاحیت و استعداد پیدا ہوتی ہے، ہر نبی و ولی کو مجاہدہ و ریاضت کے عقبات سے گذرنا ضرور ہے، رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کا غارِ حرا میں معتکف ہونا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کوہِ طور پر قیام کرنا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جنگلوں میں مقیم ہونا، اور اولیاء و فقراء کی نفس کشی اسی سلسلہ کی کڑی ہے، لیکن باہمہ کسب و ریاضت ضرور نہیں کہ رحمت کا ورود اور برکاتِ روحانی کا نزول فی البدیہہ ہو، یہ سب فضلِ رحمانی ہے، وہ ذاتِ پاک بے نیاز ہے، اگرچہ سالک کو پُر امید ہی رہنا چاہئے، جزاءً من ربک عطاءً، گویا مزد نہیں بخشش ہے، اور یہ بخشش بے حساب و کتاب ہوتی ہے،

عزت و احترام ظاہری و باطنی دونوں چاہیئے، عملاً اتباع سنت ہر کام میں اور قولاً درود کی کثرت حب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ذریعہ ہیں، اور خصوصاً جمعہ کے دن کہ وہ اس دن پیشگاہ نبوی میں پیش ہوتے ہیں، ہمارے حضرت رحمۃ اللہ کو یہ درود پسند تھا، اللھم صل علیٰ سیدنا و مولانا محمد وعلیٰ آلہٖ سیدنا و مولانا محمد وبارک وسلم، جمعہ کی رات بالخصوص کثیر درود چاہیئے، ایک خواب کے سلسلہ میں سوال ہے کہ کیا واقعاتِ عالم اور حوادثِ روزگار کا وقوع و حدوث پیشگاہ نبوی سے ہوا کرتا ہے؟

جواب:۔ استغفر اللہ" واقعاتِ عالم اور معاملاتِ تکوین صرف اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہیں، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم باعثِ رحمت ہیں، آپ پر اللہ تعالیٰ کی جو بظاہر رحمت ہوئی وہ مثالی بشارت رحمۃ للعالمین کے توسط سے دکھائی گئی، مگر حکم ہے صلوٰۃ و سلام بطور ذکر کے نہیں، بلکہ بطور درود کے پڑھ سکتے ہیں، خصوصاً جمعہ کے روز اگر بجائے ذکر درود پڑھا جائے تو اچھا ہے، وحشت دور کرنے کے لئے کسی مختصر درود کی کثرت کیجئے،

اے نامِ تو دافعِ بلا ہا

بیماری قلب را شفا ہا

بحمد اللہ آپ کے لئے حرمین میں دعا کی گئی، اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں آپ کا خواب مبارک ہے، اور اس سلسلہ میں آپ کی مقبولیت کی دلیل ہے، اللھم زد فزد مناجات مقبول میں جو کچھ ہے ادھی ہمارے ہاں معمول ہے اس کی اجازت ہے، بارک اللہ تعالیٰ،

تصور شیخ اور صالحین کی محبت | تصور شیخ بلا قصد و ارادہ ہو تو حرج نہیں، اور ہمارے حضرت کے خلفاء میں سے جناب خواجہ عزیز الحسن رحمہ اللہ تعالیٰ کا ۸ شعبان کو انتقال ہو گیا، افسوس دعائے مغفرت کیجئے اور ایصالِ ثواب تلاوۃ القرآن کیا کیجئے،

صالحین کی محبت کلید کامیابی ہے،

وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود | وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کا مفہوم صحیح مختصر یہ جان لیجئے کہ صرف اسی کی ذات

پر بھی شکر کیجئے، آپ کو گونہ طمانیت جو حاصل ہوئی ہے، آپ اس طمانیت کو ذکر و مناجات میں صرف کیجئے، کہ اس کا شکر یہی ہے، شادی و غم دونوں توام ہیں،

ع موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

خواب اور اس کی حیثیت رویا اور خواب بشارات ہیں، اس کے سوا ان کی اور کوئی حیثیت نہیں، نہ یہ ذریعۂ قربت اور نہ اپنے اکمال مفید طریق، البتہ خوش ہونا چاہئے کہ خواب سے مطلع کیا جا سکتا ہے، مگر اس سے اپنی بزرگی کا زعم نہ ہو کہ ایسے خواب فاسق بھی دیکھ سکتے ہیں، ہاں اس بات کا شکر کیجئے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی تربیت اس طرح فرماتے ہیں، بہرحال اس کے پیچھے نہ پڑئیے، یہ گو بشارات ہیں، مگر مقصود نہیں،

ع نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم

بیداری کے معاملات کی طرف توجہ فرمائیے اسی کا سوال اور اسی کا مواخذہ ہے، باقی رویا اور خواب بشارات سے زیادہ نہیں، دھن کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہیئے، خواب کی حیثیت شرع میں صرف بشارات کی ہے اللہ تعالیٰ اس اظہار بشارت سے کبھی ان شکلوں کو منتخب فرماتے ہیں، جن سے خواب دیکھنے والوں کو موانست ہوتی ہے، اس میں خواب میں نظر آنے والے بزرگوں کو کوئی دخل نہیں ہوتا، بجز اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے اس اظہار بشارت میں ان کو آلہ اپنے فضل سے بنا لیا،

کمرر مکتوب ہے کہ خواب کی حیثیت صرف بشارات کی ہے، اور اس ہیچمدان کو دیکھنا اس بات کی علامت کہ آپ مجھ سے محبت رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ساری توفیقات ہیں، وہ جب چاہتے ہیں تو کسی بندہ کو خواب میں یا بیداری میں تنبیہ یا توفیق ارزانی فرماتے ہیں اور اس کے لئے کبھی کبھی اُن فی النفس ہونے کے لئے اس کو شکل و صورت کو بمنزلہ . . . . وجہ و آلہ بناتے ہیں، جس سے صاحب معاملہ کو مناسبت اور محبت اور عقیدت ہوتی ہے ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء،

احترام نبوی اور حب رسول رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی اور ذکر گرامی کے ساتھ صلی اللہ علیہ وسلم لکھا کیجئے

اس سے استقامت اور بصیرت میں مدد ملے گی،

آپ التکشف فی التصوف اور بادۂ عرفان شرح دیوان حافظ پڑھا کیجئے، حضرت والا کے مواعظ وملفوظات کے مطالعہ سے انشاء اللہ تعالیٰ کشف حجابات ہوں گے، اور سلوک کی سیدھی راہ معلوم ہوگی،

امام اور امامت کے فرائض | ناچیز کے ذمہ خطابت و امامت کی خدمت بھی سپرد ہے، اس لئے اس باب خاص میں بھی زبانی اور تحریری ہدایات فرمائیں، اور حاضری کے مواقع پر خطابت و امامت کے لئے آگے بڑھا کر عملاً ہدایات حاصل کرنے کا موقع دیا،

امام نماز کا انتخاب تو جماعت کے ہاتھ میں ہے، تو پھر انتخاب واجازت کے بعد امامت کیلئے آپ کو بڑھنا چاہیے تھا، اور تقاضائے ادب تو یہی تھا کہ بعد اذن بلا پس وپیش آگے بڑھ جائیے، ہاں بلا اذن جماعت امامت کرنا غلط تھا، بصورت امامت امام میں جو ریائی کیفیات پیدا ہوئی تھیں، ان کو ظاہر فرما کر ان سے اجتناب واحتراز کی تاکید فرمائی،

تحسین صورت اور بتکلف حسن وخوبی کے ساتھ قرأت ادا کرنے کی کوشش جو امام کرتا ہے، اس کا مقصد مقتدیوں سے دادِ تحسین کے حصول کے سوا اور کیا ہے؟ اور یہ چیز خلوص کے بالکل منافی ہے، نماز میں تمام تر توجہ خلوص نیت کے ساتھ احکم الحاکمین، خالق کائنات اور رب العالمین کی طرف ہونی چاہئے، نماز اور دیگر عبادات محض انہی کی رضا اور خوشنودی کیلئے تو ہونی ہی چاہئیں، بلکہ مومن ومسلم کو ہر معاملہ، ہر فعل وعمل ہر حرکت وسکون میں خدا کی رضا پر نظر رکھنا چاہئے، اور ان ہی کے مرضی کی سعی چاہئے، روایات وآثار اور امثال سے امام وامامت وخطابت سے متعلق آداب ورعایات امام وماموم بیان فرمائے،

کیفیات واحوال اور توحش کے بعد بھی ضبط وسکون کے ساتھ مخلصانہ طور پر اس خدمت کو انجام دینا چاہئے، کسی وقت نماز میں بندہ ہیچمدان سے سہو ہو گیا، جب سجدۂ سہو ادا کر کے نماز سے فارغ ہوا، تو اعادۂ نماز کے لئے بنظر تحسین صلوٰۃ حکم فرمایا،

پاک موجود ہے، ماسوی ذاتِ باری تعالیٰ سب کالعدم ہیں مگر اس کا ہرگز یہ مفہوم نہیں کہ ہر چیز خدا ہی خدا ہے، یہ تو وحدت نہیں، کثرت کا مفہوم ہے، نعوذ باللہ من ذالک وہ وحدہٗ لاشریک ہے،

اور وحدۃ الشہود کا مفہوم یہ ہے کہ ہر چیز میں اسکے وجود اور اس کی قدرت کا ظہور ہے اور بس،

تصوف علمی اور تصوف عملی | تصوف کی دو قسمیں ہیں، ایک علمی دوسری عملی، تصوف کی کتابوں سے جو علم حاصل ہوتا ہے، وہ تو تصوف علمی ہے، اور مجاہدہ اور عمل سے جو صوفیانہ شان پیدا ہوتی ہے، وہ تصوف عملی ہے، آپ تصوف عملی میں اپنا وقت صرف کیا کیجئے، اور اس پر وقت صرف کرنا زیادہ مفید اور موجب خیر و برکت ہے،

ملفوظات قرآن وہ گنجینہ ہے کہ ہر نظریہ والا اپنے نظریہ کے مطابق اس میں نکات و رموز پاتا ہے، ایک متصوف کو تصوف ہی تصوف نظر آتا ہے، ایک سیاسی کو سیاست ہی سیاست اوس میں نظر آتی ہے، مگر مجھے تو قرآن پاک میں تصوف ہی تصوف نظر آتا ہے،

ہمارے شیخ رحمہ اللہ تعالیٰ کا نظریہ تصوف وہی ہے، جو مجدد طریقت شیخ الکل حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، کمال دین و اسلام کا نام تصوف ہے، احکام شرعیہ کی بجا آوری احسان و اخلاص کے ساتھ عین طریقت و حقیقت ہے، تصوف اسلام کا خلاصہ اہتمام طاعت اور اجتناب معصیت، اور دوام ذکر ہے اور بس،

افکار دنیا لاحاصل ہیں | قلب کو طمانیت اور دماغ کو سکون کیوں نہیں ہے؟ اس کے عدم حصول کا باعث کوئی دینی یا دنیاوی فکر ہوگی، اگر دینی فکر ہے تو مبارک، اور دنیاوی فکر ہے، تو اس فکر کا حاصل ہی کیا ہے، اللہ ولی المؤمنین و نعم الوکیل پیش نظر رہے،

کارساز ما بفکر کار ما　　فکر ما در کار ما آزار ما

مجدد طریقت شیخ الکل کی تصانیف کا مطالعہ | بمرات و کرات مکتوب ہے کہ ہمارے حضرت کی تصانیف یعنی جس قدر ملفوظات اور مواعظ ہیں، انھیں مطالعہ کیا کیجئے، مواعظ و رسائل کا مطالعہ اکسیر ہدایت ہے،

الجواب

(۱) کوئی قاضی ریاست اسلامیہ یا غیر اسلامی ریاست میں کوئی مسلمانوں کا مقرر کردہ قاضی یا امام شرعی شہادت لینے کے بعد رویتِ ہلال صوم یا فطر کا اعلان بذریعۂ ریڈیو یا تار ٹیلیفون کرے تو اس کے قضا کے مطابق عمل کرنا درست ہے، کیونکہ یہ شہادت نہیں بلکہ نتیجۂ شہادت ہے۔ قضائے قاضی کا اعلان ہے مگر ضرورت ہے کہ ان آلات نشر کی پوری نگرانی کی جائے، اور اس کا سارا کام مسلمانوں کے ہاتھوں انجام پائے۔

(۲) تنہا عالمِ دین یا امام جامع مسجد ہونا کافی نہیں، اس کا مسلمانوں کی جماعت کا مقرر کردہ یا عملاً مسلّم ہونا ضروری ہے، اگر ایسا شخص ہلالِ فطر، اور ہلالِ صوم کی شہادتِ شرعی لے کر کسی آلہ نشر سے شائع کرے یا تار ٹیلیفون سے ارسال کرے، تو اس کے مطابق عمل کرنا درست ہے، جب کہ آج بھی توپ یا گولہ یا نقارہ سے ہلال یا چاند کے طلوع وغروب کا اعلان حکومت یا کسی مسلّمہ جماعت کی طرف سے کیا جاتا ہے، اور اس پر عمل کیا جاتا ہے۔

سید سلیمان ندوی ۱۲/ اگست ۱۹۴۸ء

از ریاست بھوپال

اس فتویٰ میں یہ فقہی نکتہ کہ یہ شہادت نہیں بلکہ نتیجۂ شہادت ہے۔ قضائے قاضی کا فیصلہ ہے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی فقیہانہ نکتہ سنجی کی دلیل روشن ہے، دوسرے علماء نے اس شہادت کے غیر معتبر ہونے کی وجہ یہ بیان کی کہ یہ آلاتِ جدیدہ شہادت کے قائم مقام نہیں ہیں، یا یہ آلات ذرائعِ شہادت کے قائم مقام نہیں ہو سکتے ہیں، اور اسی پر بار بار زور دیتے ہیں، شہادت اور نتیجۂ شہادت کے فرق کی جانب کسی کی نظر نہیں گئی۔

حضرت مولانا کا تفقہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے تعلقات سے پیشتر گاہے گاہے اور تعلقات کے بعد تو اکثر عاجز استفتا اور استفسارات کیا کرتا تھا، گاہے فرماتے کہ کسی مفتی سے فتویٰ طلب کیجئے، گاہے جواب عنایت فرماتے، چنانچہ چند فتاویٰ راقم کے پاس محفوظ ہیں، ان میں سے صرف ایک فتویٰ بابت رویتِ ہلال صوم و افطار جو علماء کے درمیان میں معرکۃ الآرا ہے، درج کیا جاتا ہے جس سے مولانا کے تفقہ فی الدین کی حیثیت ناظرین پر واضح ہو جائے گی،

استفتاء: علمائے دین متین مسائل مندرجۂ ذیل میں کیا فرماتے ہیں:- ؟

مسئلہ (۱)

کسی مسلم ریاست کی مسلم جماعت یا کسی غیر مسلم ریاست کی مسلم جماعت نے رویتِ ہلال صوم یا رویتِ ہلال فطر کی تحقیق و تفتیش اور شرعی شہادت لینے کے بعد کسی مسلم عادل مجاز شخص یا کسی غیر مسلم صادق و مجاز شخص کی زبانی، ریڈیو یا ٹیلیفون یا تار کے ذریعہ رویتِ ہلال صوم، رویت ہلال فطر کی خبروں کو دیگر بلاد و شہور میں نشر کرایا، اور بیک وقت مختلف مقامات سے نشر کرایا، تو اسی متحقق و مصدقہ اور متواتر خبر دن پر مسلمانوں کا صوم یا افطار شرعاً جائز ہے یا ناجائز؟ اگر ناجائز ہے، تو اس کی دلیلیں از روئے شرع عقلی و نقلی کیا ہیں ؟

مسئلہ (۲)

کسی مسلم یا غیر مسلم ریاست کے کسی شہر کے عالم دین یا امام مسجد جامع جن کی عدالت و صداقت مسلم ہو خود بعد اخذ شہادت شرعی کسی ریڈیو اسٹیشن سے رویتِ ہلال صوم یا رویتِ ہلال فطر کی خبروں کو نشر کرتے ہیں، یا بجواب تار ٹیلیفون کے ذریعہ خبر ارسال کرتے ہیں، تو ایسی صورت میں صوم یا افطار شرعاً جائز ہے، یا ناجائز، اگر ناجائز ہے تو کیوں؟ اس کی عقلی و نقلی دلیلیں از روئے شرع شریف کیا ہو سکتی ہیں،

بینوا و توجروا۔

آشنا کرنا چاہتے ہیں، اس کے لئے غیب سے سامان مہیا کر دیتے ہیں، ورنہ بزرگان پیشین کے حالات ہم تک نہ پہنچے؛ چنانچہ اس دن حضرت قبلہ کے خط کا جواب حضرت تھانویؒ کے دستِ مبارک کا لکھا ہوا موصول ہوا، چونکہ حضرت قبلہ کے علم میں یہ تھا کہ اس ناچیز کو بھی حضرت حکیم الامت سے عقیدت ہے، اس لئے فرمایا کہ حضرت مولانا کا ڈاک آیا ہے، اور خود حضرت کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اس زمانہ میں حضرت مولاناؒ بوجہ ضعف خطوط کے جواب عموماً خود نہیں تحریر فرماتے تھے، بلکہ دوسروں سے لکھوا دیتے تھے لیکن حضرت قبلہؒ سے اس درجہ خصوصیت تھی کہ خود ہی جواب تحریر فرمایا تھا، یہ سن کر میں متوجہ ہوگیا کہ اگر کوئی خاص بات ہوگی تو خود ہی بتلائیں گے، میری توجہ کو دیکھ کر فرمایا حضرت مولانا کبھی کبھی اشعار میں جواب تحریر فرماتے ہیں، میں نے دیکھا کہ چار پانچ شعر حضرت مولانا تھانوی کے تحریر کردہ اس مکتوب پر تھے، مگر مجھے زیادہ قریب بڑھ کر دیکھنے کی جرأت نہ ہوئی، میرا اشتیاق دیکھکر اس کا ایک شعر پڑھ کر سنایا جس کا مصرعہ اولی اوپر تحریر کیا گیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ نے اس کی تصدیق فرما دی کہ حضرت قبلہ اخلاص عمل کی منزل کو طے کر چکے تھے، اس پر رسوخ ہو چکا تھا، اور دوسروں کے لئے ان کا اخلاص عمل نمونہ بن چکا تھا، حضرت تھانویؒ کو جن لوگوں نے دیکھا ہے، اور ان کے معیار و مسلک سے آگاہ ہیں، وہ اس کو سمجھ سکتے ہیں کہ حضرتؒ کا فرمانا کہ فلاں شخص سے اخلاص عمل کا سبق لو معمولی بات نہ تھی یہ خطاب بھی یقیناً ان کے کاغذات میں ہوگا؛

میرا قیام اعظم گڈھ ہی میں تھا کہ حضرت قبلہؒ نے الہ آباد کا سفر کیا، دوران راہ میں یہ غزل وارد ہوئی، جو کسی حد تک ان کے اس وقت کے جذبات کی طرف اشارہ کرتی ہے،

براہ الہ آباد ۲۴ اکتوبر ۴۲ء،

ابھی تو مشقِ[1] نفی مین[2] گنج مین[3] ہزار کرے
اثر[4] کے واسطے کچھ اور انتظار کرے

---

[1] یعنی گوشہ نشینی دخول یا خلوت شب [2] مراد خود طالب یعنی اپنی ذات ہے [3] مراد اپنی زاری [4] رضائے حق؛

حضرت قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کا عارفانہ کلام
اور
تصوف میں اُن کا مقام

از

جناب سید حسین صاحب ڈپٹی کمشنر لکھنؤ ڈویژن

حضرت قبلہ سید صاحب کے ذکر کو اُنہی کے شیخ کے اس مصرعہ سے شروع کرتا ہوں،

ع ز سلیمان گیر اخلاص عمل

یہ ایک شعر کا مصرعۂ اولیٰ ہے اور مصرع ثانی محفوظ نہیں، اس کو خود حضرت قبلہ کی زبانِ مبارک سے سُنا تھا،

غالباً ماہ اکتوبر ۱۹۴۲ء کی آخری تاریخوں میں سے کوئی تاریخ اور شوال ۱۳۶۱ھ کا آخری عشرہ تھا، میں اس زمانہ میں بمبئی سے رخصت پر دار المصنفین اعظم گڈھ گیا ہوا تھا، حضرت قبلہ کے قیام کا کمرہ تھا، عصر و مغرب کے درمیان کا وقت تھا، یہ وہ زمانہ تھا جب کہ حضرت قبلہ کو مہینوں سے [illegible] حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے خط و کتابت کا اصلاحی سلسلہ شروع ہوچکا تھا، حضرت قبلہ اس وقت کن مقامات سے گذر چکے تھے اور کن حالات سے عبور کر رہے تھے، اس کا جاننے والا بجز رب العزت کے اور کوئی نہیں، شیخ کامل واصل و طالب صادق و بے بدل دونوں اس دار فانی سے دار البقا میں پہنچ چکے ہیں، انھوں نے اصول طریقت کے مطابق اس چیز کو راز میں رکھا، مگر عادۃ اللہ ہے کہ حق حالات سے کچھ

کھول دے میرے لئے علم حقیقت کے در | دل دانا دل بینا دلِ شنوا دیدے
قول میں رنگ، عمل بھر کے بنا دے رنگین | لب خاموش بنا کر دلِ گویا دیدے
دل بیتاب ملے دیدۂ پُرآب ملے | تپِ آتش مجھے دیدے مجھے دریا دیدے

دردِ دل سینہ میں رہ رہ کے ٹھہر جاتا ہے
جو نہ ٹھہرے مجھے وہ درد خدایا دیدے

یہ غزل اپنی کیفیات کے اعتبار سے سید صاحب قبلہ کی بہترین غزلوں میں، اور ان کی کیفیات دل کی آئینہ دار ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ اشعار میں جو عرض درگاہ قاضی الحاجات میں کی گئی تھی وہ قبول ہو گئی، اس کو پڑھکر بے ساختہ حضرت خواجہ حافظ رحمۃ اللہ علیہ کی یہ غزل یاد آتی ہے، اس کا لطف و درد کچھ اسی قسم کا ہے،

دوش وقتِ سحر از غصہ نجاتم دادند | و اندران ظلمتِ شب آبِ حیاتم دادند
بیخود از شعشعۂ پرتو ذاتم کردند | بادہ از جام تجلّی بصفاتم دادند
من اگر کامروا گشتم و خوشدل چہ عجب | مستحق بودم و این ها بزکاتم دادند

کیمیائیست عجب بندگی پیر مغان
خاک او گشتم و چندین درجاتم دادند

ایک مرتبہ لکھنؤ سے قبلہ کا سفر تھانہ بھون کا ہوا، اور شیخ کی بارگاہ میں تشنگی کہ میرا جی حل ہوئی، اس کا مرقع ایک غزل اور ایک نعت ہے، نعت یہ ہے،

تھانہ بھون ۔ ۲ شوال ۱۳۶۱ھ

مطابق ۱۳ نومبر ۱۹۴۲ء عیسوی

نام محمد عمل ہی نور محمد عمل سے علے | خدمودہ عمل علی قدرہ عمل علی

جو آج لذتِ دردِ نہاں کا جویا ہے — وہ پہلے سوز سے دل کو تو داغدار کرے
انہی کے دینے سے ملتا ہو جس کو ملتا ہو — وہی نہ چاہیں تو کوشش کوئی ہزار کرے
ادب سے دیکھیں عشاق دوسروں کو — محال ہے جو انہیں کوئی ہمکنار کرے
سنا تو دے اوسے افسانۂ غمِ ہجراں — وہ اعتبار کرے یا نہ اعتبار کرے
وہ اپنے کان سے سنتے ہیں میرے نالوں کو — وہ طرزِ نالہ ہو جو ان کو بے قرار کرے
پلا دے ساغرِ سرشار مجھکو وہ ساقی — خزاں کو ایک اشارہ میں جو بہار کرے
تری نظر میں ہے تاثیرِ مستیٔ صہبا — تری نگاہ جسے چاہے بادہ خوار کرے

تری نگاہ میں دونوں خواص رکھے ہیں
وہ چاہے مست کرے چاہے ہوشیار کرے

اس غزل سے ثابت ہوتا ہے کہ باوجود شیخ کے اس ارشاد، ع از سلیمان گیر اخلاصِ عمل وہ اپنی حالت پر مطمئن نہیں ہیں، اور آثار جذبِ عشق سے پوری غزل اس کیفیت سے لبریز ہے۔

دوسرے ہی دن حضرت سید صاحب قبلہ نے الہ آباد سے لکھنؤ کا سفر فرمایا اور اس سفر میں وہ غزل رقم فرمائی، جو لکھنؤ کے تعزیتی جلسہ منعقدہ ۲۶، ۲۷ دسمبر ۵۳ء کو مولوی حمید صاحب زائرِ حرم نے پڑھ کر سنائی تھی، جس سے حاضرین جلسہ پر وہ حالت طاری ہوئی جو دیکھنے والے ہی جانتے ہیں اور اس کا بیان کرنا کم از کم میرے لیے مشکل ہو، وہ غزل یہ ہے،

براہ لکھنؤ ۲۵ اکتوبر ۱۹۴۲ء

صدقِ احساس کی دولت مجھے مولا دیدے — غمِ امروز بھلا دے غمِ فردا دیدے
دھن کچھ ایسی ہو فراموش ہو اپنی ہستی — دلِ دیوانہ و سودائی و شیدا دیدے
اپنے میخانہ سے اور دستِ کرم سے اپنے — دونوں ہاتھوں میں مجھے ساغر و مینا دیدے

وجد پایا، آپ کے حالات و کیفیات کو یہ ناچیز کیا سمجھ سکتا لیکن اتنا اندازہ ضرور ہوا کہ حضرت بے حد مسرور و شادان ہیں، دارالعلوم کے اساتذہ و طلبہ اور دیگر حضرات مہمان خانہ میں حضرت کے گرد جمع تھے اور آپ اپنے مخصوص انداز میں گفتگو فرما رہے تھے، چائے آئی، میں بھی شریک ہوا، چائے کے بعد مخصوص حضرات وہاں رہ گئے تھے، جن میں زیادہ دارالعلوم ہی کے اساتذہ اور طالب علم تھے، اس مجلس میں قبلہ نے اپنی غزل مورخہ ۱۰ر نومبر جو اوپر درج ہو چکی ہے لوگوں کو سنائی، یہ مجلس تقریباً دس گیارہ بجے ختم ہوئی، کھانا کھایا گیا۔ قدرے غنودگی کے بعد نماز ظہر مسجد دارالعلوم میں جماعت کے ساتھ ہوئی، اس کے بعد پھر مہمانخانہ میں مجلس ہوئی، اس مجلس میں بھی کچھ غزلیں سنائیں، حاضرین میں سے چند حضرات کو میں نے علیحدہ کہتے ہوئے سنا کہ سید صاحب قبلہ میں یہ ایک نئی چیز ہے، یہ باتیں ان میں نہ کبھی دیکھی تھیں اور نہ سنی تھیں، اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ ان کو کبھی اس طرح شعر پڑھتے نہیں سنا تھا، اس سے بہت متعجب تھے، دو یا تین دن دارالعلوم میں قیام رہا اور اس اثنا میں برابر اس قسم کی مجلس ہوتی رہی، پھر لکھنؤ سے قبلہ کے ساتھ میں بھی ہم سفر ہوا، ریل میں یہ غزل ارقام فرمائی،

براہ شاہ گنج ۱۶ر نومبر ۴۲ء

ہر بات میں جس کی ہو کیفیتِ مستانہ — آباد رہے یارب تا حشر وہ میخانہ
چھائی ہے یہاں مستی ہر ایک نمازی پر — حیرت ہے کہ گھر ای دل مسجد ہے کہ میخانہ
زاہد نے کہاں پائی زاہد نے کہاں پی لی — گفتار ہے رندانہ رفتار ہے مستانہ
دستار فضیلت ہو یا دلقِ مرقع ہو — ہونا ہے اسے اک دن نذرِ مے و میخانہ
ہر قطرہ ندامت کا جو دیدۂ تر میں ہے — ہے دامن خالی کا وہ گوہر شاہانہ
وہ چشم محبت تو جویائے محبت ہے — دیکھے تو ذرا کر کے اس سے کوئی یارانہ
معشوق یگانہ ہے عاشق بھی یگانہ ہو — یگانہ ہو ان کا ہر دوست سے بیگانہ

رحمتِ عالم صلِّ علیٰ فخرِ آدم صلِّ علیٰ — مرسلِ اکرم صلِّ علیٰ اسمِ محمد صلِّ علیٰ

چہرۂ انور شمسِ ضحیٰ زلفِ معنبر لیلِ سجیٰ — قلبِ مطہر عینِ ہدیٰ ذکرِ محمد صلِّ علیٰ

شاہدِ عالم تاجِ امم ہادیٔ اعظم شمعِ حرم — صاحبِ لطف جود و کرم حق کے نبی صلِّ علیٰ

راقم کا گمان غالب ہے کہ دس قیام تھانہ بھون میں قبلہ علیہ الرحمۃ فانی فی الرسول ہو گئے اور سیرت نگار نبوی کے لئے فنا فی الشیخ ہونے کے بعد فنا فی الرسول ہونے میں کیا دیر لگ سکتی ہے جس شخص نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس زندگی کے ہر ہر پہلو پر سالہا سال کے غور و فکر کے بعد قلم اٹھایا ہو اور اس کو بہترین [illegible] طریقے سے عیاں کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا ہو کیا یہ ممکن ہے کہ اس نے اپنے حالات و اخلاق کو اسی سانچے میں ڈھالنے کی سعی نہ کی ہوگی جن لوگوں کو حضرت علیہ الرحمۃ اور ان کی نشست و برخاست ان کے رہن سہن ان کے تبسم اور ان کے خورد و نوش ان کی رفتار و گفتار ان کے حالات و کردار ان کے معاملات ——— ان کا صبر و تحمل ان کی جود و عطا وغیرہ کو دیکھنے کا موقع ملا ہے وہ اس کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان کے جملہ حالات میں اسوۂ رسول کی کتنی جھلک تھی اس کے علاوہ حضرت نجیب الطرفین سید تھے اور ان کے اسلاف میں مسلسل دولتِ ولایت و نعمت ہوتی چلی آئی تھی خود ان کے ذاتی حالات اظہر من الشمس ہیں، ان کو قریب سے دیکھنے والوں کا جن میں ہر طبقہ ہر جماعت اور ہر خیال کے لوگ شامل ہیں اس پر اتفاق ہے کہ سیرت نگار نبوی کے ظاہری و باطنی اخلاق و اعمال پر خلق نبوی کا کتنا گہرا اثر تھا خود حضرت مولانا تھانوی نے پہلی ہی ملاقات میں اپنے خاص متعلقین سے فرمایا تھا کہ

"بھائی ان کے اندر کس بات کی کمی ہے، ان کی مثال تو بارود کی سی ہے، محض دیا سلائی لگانے کی دیر ہے"

تھانہ بھون میں دس بارہ روز کے قیام کے بعد جب لکھنؤ واپسی ہوئی تو مجھے بھی ان کے ہمراہ [illegible] ہوئی رخصت پر تو تھا ہی اپنے نجی کام سے لکھنؤ گیا۔ اور جب ندوۃ العلماء کے مہمان خانہ پہنچا [illegible]

اس غزل کا بھی قریب قریب وہی انداز ہے، جو اس سے پہلے کی غزل کا ہے، اب سید علیہ الرحمۃ فانی فی الشیخ ہو چکے تھے، اون کا کلام اسی نہج پر قائم ہو گیا،

دسمبر ۴۲ء کی پہلی یا دوسری تاریخ کو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا والانامہ آیا، عصر کی نماز کے بعد حسب معمول کمرہ مین چاے آئی، سب اعزہ جمع ہوئے، چاے پی کر سب لوگ چلے گئے، مگر مین وہین بیٹھا رہا، قدرے سکوت کے بعد ارشاد فرمایا کہ حضرت مولانا کا والانامہ آیا ہے، تحریر فرمایا ہے کہ من جانب الہی وارد ہوا ہے کہ آپ کو طرق قادریہ نقشبندیہ سہروردیہ وچشتیہ مین اجازت بیعت کی دون، چنانچہ اس وارد غیبی کے تحت آپ کو اس کا اہل پاتے ہوئے اجازت بیعت کی دیتا ہون، اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہون کہ برکت وصبر عطا کرین، اور آپ کے فیوض کو عرصۂ دراز تک جاری رکھین، آپ اس کی اطلاع اپنے ملنے والون، اور دوستون کو بھی کر دین، تاکہ لوگون کو علم ہو جائے، اور ان کو افادہ ہو،

یہ خبر سنانے کے بعد اپنے مخصوص انداز مین فرمایا، کہ بھائی مین تو بالکل عام ہون، لیکن حضرت کے ارشاد کی تعمیل مین تم کو اس کی خبر کرتا ہون، تم اپنے عزیز بھی ہو، اور حضرت سے تم کو عقیدت بھی ہے، مین سن کر باغ باغ ہو گیا، اس کے بعد بھی میرا قیام تقریباً ۳ ہفتہ اعظم گڈھ مین رہا، اور برابر قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میسر رہی، اور بہت قریب سے اُن کے حالات مشاہدہ مین آئے، جن کا پوری طرح تحریر مین لانا میرے لئے مشکل ہے، اور اس کی اس مختصر مضمون مین گنجایش بھی نہین ہے، اس لئے صرف نمونہ مشتے از خروارے پیش کرتا ہون کہ اُن سے محبت کرنے والون کے اشتیاق کو کچھ سیری ہو سکے،

سب سے بڑی بات جو مین نے دیکھی وہ یہ تھی کہ اس کے بعد بڑی تیزی سے ماسوا سے قلب کا رہا سہا علاقہ بھی منقطع فرما لیا، پہلے دار المصنفین کے کامون سے خالی اوقات کا کافی حصہ اہل و عیال کے ساتھ دینی مذاکرہ مین صرف فرماتے یا چھوٹے بچون سے بذلہ سنجی مین، اب ان اوقات کا بڑا حصہ خلوت مین گذرتا، خواہ مسجد مین ہو یا اپنے مسکونہ کمرے مین، پہلے عصر کے بعد چاے رفقاے دار المصنفین کے ساتھ نوش فرماتے، اور مغرب تک اُن سے مختلف

حاصل رہے کیفیت ہر وقت حضوری کی
آ دل میں مرے چھپ جا اے صورتِ جاناں

جو شعر لکھتے تھے اس کو کمترین کو سناتے تھے کچھ اشعار ظہر کی نماز سے پہلے لکھے، کچھ اس کے بعد اور عصر سے پہلے غزل مکمل ہو گئی، اور شاہ گنج ہوتے ہوئے ہم لوگ ۔ بجے شب کو اعظم گڈھ کو پہنچے۔ آخری شعر کے علاوہ پوری غزل میں یا تو شیخ کے فیوض و برکات کا ذکر ہے، یا خود اپنی ذاتی کیفیت و حالت کا بیان ہے، آخری شعر خاص طور پر کئی حیثیتوں سے قابل غور ہے، اس میں فنا فی اللہ کی دلالت پائی جاتی ہے۔

حضور دوام کی تمنا کے ساتھ محبوبِ حقیقی سے دل میں سما جانے کی التجا عروج کا انتہائی مقام ہے جس کے بعد سیر فی اللہ شروع ہوتی ہے جس کی انتہا نہیں، اسی مقام کو کسی عارف نے اس شعر میں ظاہر کیا ہے۔

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

اس کے بعد ۲ نومبر ۴۲ء کو اعظم گڈھ ہی میں یہ غزل ہوئی۔

کیا بھری تاثیر میں مطرب تری آواز ہے
جو تری محفل میں بیٹھا وہ سراپا ساز ہے

باغ میں صحرا نظر آتا ہے اور صحرا میں باغ
اب مرے جوشِ جنوں کا وہی انداز ہے

پاؤں تو حد ادب سے عشق میں باہر نہ رکھ
وہ ہمہ خوبی و محبوبی سراپا ناز ہے

نام اُن کا ہر نفس میں لب پہ یوں آیا کیا
تن سے جیسے روح بسمل مائلِ پرواز ہے

دیکھئے ملتی ہے کب دولت سکونِ عشق کی
ہائے ہوئے جوش تو سرمایہ آغاز ہے

گاہ دیکھا تھا مری چشمِ تصور نے نہیں
اب وہی تصویر میری ہمدم و دمساز ہے

جو نہیں معلوم ہم اُس کو کوئی جانے گا کیا
جب کہ جو معلوم ہے وہ بھی سراسر راز ہے

گزارہ کہ سمندر دریا مین، اور بھی بعض لوگون کے اسی قسم کے خطوط آئے، ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ دیکھئے ان حضرات کو کہ ایک طرف مجھ سے اظہار عقیدت بھی فرما رہے ہین، اور دوسری طرف اپنی تجویز بھی پیش کر رہے ہین، اور میرے فیصلہ پر تنقید بھی ہے، عقیدت کے تو یہ معنی ہین کہ اُن کو یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ میرے متعلق جو کچھ کہتے ہین، اگر وہ سب صحیح ہو تب بھی اُن کو غور کرنا چاہئے کہ مین نے جو کچھ کیا ہے وہ سوچ سمجھ کر، اور درست جان کر کیا ہوگا، یہ تو ایک اصولی بات ہے کہ اگر ایک فن مین مجھے مہارت نہین، اور کوئی اس فن کا مجھ سے زیادہ واقف کار ہے، تو اس سے اس بات کے دریافت کرنے مین کونسی بات خلاف عقل ہے، یہ کیا ضروری ہے کہ ایک انسان مین سارے علوم موجود ہون، تمام کمالات تو اللہ پاک ہی کے لئے ہین، اور یہ تو نص سے بھی ثابت ہے فضلنا بعضھم علی بعض، اس لیے ان کا یہ اعتراض میری کچھ سمجھ مین نہین آتا، گو یہ بیچارے معذور ہین، ان کی نیت بُری نہین ہے، کبھی کسی پر تعریض نہین فرماتے، بات کو منقح کرنے کے بعد فیصلہ سامع پر چھوڑ دیتے، خود قطعی حکم نہ لگاتے، عجیب محتاط اور صاحب خلق و مروت انسان تھے، اکثر فرماتے کہ بھائی ہمارے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ مین اپنے کپڑے بھی خود سی لیا کرون، یہ تو فن کی بات ہے، حضرت مولانا تھانوی کو اللہ پاک نے فن تصوف مین اس دور مین بڑی مہارت عطا فرمائی ہے، اس لئے ان کی مہارت سے اگر فائدہ اٹھایا جائے، تو اس مین کونسی عیب کی بات ہے،

انہی ایام مین اکثر دیکھا کہ حضرت قبلہ فرش زمین پر بیٹھے ہین کہ لوگ آگئے آپ وہین بیٹھے بیٹھے گفتگو فرمانے لگے کبھی بعد نماز مغرب دارالمصنفین کی مسجد کی شمالی چار دیواری پر ایک کونہ مین ذکر حق مین مشغول ہوتے، کبھی مکان مسکونہ کے باہر برآمدہ مین تخت پر بغیر کسی فرش کے کبھی مکان کے کسی اور گوشہ مین متوجہ الی الحق پائے جاتے کھانے کا وقت آتا یا کسی اور ضرورت سے لوگ تلاش کرتے ہوئے پہنچے تو اس حالت مین دیکھ کر عرض کرتے کہ اس طرح کیون تشریف رکھتے ہین، فرما دیئے ہوتے تو فرش بچھا دیا جاتا، یا قالین کی جا نماز بچھا دی جاتی، سردی کا موسم ہے ٹھنڈک نہ لگ جائے، فرماتے کہ ان ظاہری باتون مین کیا رکھا ہے، خود قبلہ کا شعر اس

مسائل پر گفتگو فرماتے، یہ مجلس بھی تقریباً ختم ہو گئی، کبھی اعزہ، اہلیہ محترمہ سے اشتیاق ظاہر کرتے کہ قبلہ سے کچھ باتیں سنوا دیجئے، عرصہ ہوا ان کی صحبت جی بھر کر نہیں میسر نہیں آئی، تو وہ جا کر گوشۂ خلوت سے لے آئیں، اور کچھ دیر کے لئے آپ تشریف لے آتے، اہل و عیال و احباب کی درخواست بہت کم مسترد فرماتے تھے، اس لئے ان کی دلجوئی واستمالت کے لئے برآمدہ یا آنگن میں تشریف رکھتے، مگر دل کہیں اور ہی ہوتا، سب کی خیر و عافیت دریافت فرماتے، اور جلد ہی اٹھ کر جانا چاہتے، اگر کوئی اصرار کرتا، تو تھوڑی دیر کے لئے رک بھی جاتے لیکن سب کو یہ محسوس ہوتا،

چسکا لگا ہے جام کا شغل ہے صبح و شام کا
اب میں تمھارے کام کا ہم نفسو نہیں رہا

یہ صورت دیکھ کر لوگوں نے اصرار کرنا ترک دیا، اور حضرت قبلہ کا اہل و عیال سے ملنا جلنا بھی دس پانچ منٹ کا رہ گیا، باہر کے سفر بھی ترک فرما دیئے، ایم اے وغیرہ کے امتحانات کی ممتحنی وغیرہ سب چھوڑ دیا، دارالمصنفین کے کام کے اوقات کے علاوہ خلوت کو زیادہ عزیز رکھنے لگے،

خورد و نوش اور لباس وغیرہ میں بڑی تبدیلی ہو گئی، پہلے کے لباس فاخرہ سب بکسوں ہی میں بند رہ گئے، نادر شاہ کی عطا کردہ خلعت کو کیڑوں نے چاٹ لیا، اکثر اہلیہ محترمہ یاد کر کے ہر دوسرے دن کپڑے نکال دیتیں، اور اگر کاموں کی مشغولیت سے انھیں خیال نہ رہتا، تو خلاف معمول تین تین دن تک ایک ہی کپڑا پہنے رہتے، بعض لوگ جن کو مزاج عالی میں درخور تھا، کبھی عرض کرتے کہ حضرت تصوف کے یہ معنی تو نہیں کہ انسان کو کپڑا بدلنے کی بھی خبر نہ رہے، مسکرا کر فرماتے کہ اب بوڑھا ہو گیا ہوں، یاد نہیں رہتا آپ یاد دلا دیا کریں،

چودھری اکبر حسین صاحب جج نے جن کو حضرت سے عقیدت تھی، تحریر فرمایا کہ حضرت آپ تو خود علوم و معارف کا سمندر ہیں، آپ کو مولانا تھانوی کے پاس جانے کی کیا ضرورت پیش آئی، دریا سمندر میں

پا کر تجھے اپنے کو میں کیا بھول گیا ہوں | ہر سود و زیانِ دوسرا بھول گیا ہوں
جس دن سے مری دل میں تری یاد بسی ہے | ہر ایک کو میں تیرے سوا بھول گیا ہوں
آتا ہے خدا بھی ترے صدقہ میں مجھے یاد | گویا کہ بظاہر میں خدا بھول گیا ہوں
عالم کے تماشے نہیں اب جاذبِ دل ہیں | ہر لذتِ ہستی کا مزا بھول گیا ہوں
ہر سمت نظر آتے ہیں ہر وقت وہ مجھکو | دوریٔ مسافت کا گلہ بھول گیا ہوں
اب مسئلۂ کثرت و وحدت کو میں سمجھا | پا کر تجھے سب تیرے سوا بھول گیا ہوں
سجدہ طرفِ کعبہ ہے، دل تیری طرف ہے | اب قبلہ بھی اے قبلہ نما بھول گیا ہوں
حل جب سے ہوا فلسفۂ حُسنِ حقیقت | ہر مسئلہ اے ذہنِ رسا بھول گیا ہوں
ہے آہِ سحرگاہ میں وہ ذوقِ لبِ گوش | چنگ و نَے و بربط کی صدا بھول گیا ہوں
منظور تری چشمِ رضا جب سے ہوئی ہے | امید جزا خوف سزا بھول گیا ہوں
اے رہبرِ توفیق مجھے راہ بتا دے | نقشِ قدمِ راہ نما بھول گیا ہوں
اے خضر مرا قافلہ کس سمت گیا ہے | تیسیرِ صداہائے درا بھول گیا ہوں
اُٹھا ہے ورق آج سے افسانۂ نو کا | افسانۂ پارینہ دلا بھول گیا ہوں

یہ غزل حضرت مولانا تھانویؒ سے بیعت ہونے کے ہفتہ عشرہ کے اندر ہی کہی تھی، اس زمانہ میں جو کیفیات اُن پر طاری ہوئیں، ان کی ترجمانی اس سے بہتر اور کسی غزل میں نہیں پائی جاتی۔

تصوف میں حضرت کا جو مقام تھا، اس کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے، مگر اس فن میں حضرت کو جو دستگاہ حاصل تھی، اس کا کسی قدر اندازہ حضرت کے اقوال سے کیا جا سکتا ہے، ایک بار میں نے استفسار کیا کہ حال، و مقام کیا ہے، اور مراتبِ سلوک کسے کہتے ہیں، اس کے جواب میں تحریر فرمایا،

حال:- سالک کے قلب پر جو عارضی کیفیت، اس کے اختیار کے بغیر

موقع پیدا آیا ۔

جون پور ، ۲۷ر اکتوبر ۱۹۴۳ء ،

ہم ایسے رہے یان کہ ویسے رہے　　وہان دیکھنا ہے کہ کیسے رہے
خیالِ دو روزہ کا کیا عیش و غم　　سفر کا بھی کیا جیسے تیسے رہے

یہ اس شخص کا حال ہے جو اس دور مین نفاست مزاج مین مرزا جان جاناں شہید کی مثال اور ظاہری و باطنی حسن اخلاق کا مجسمہ تھا ، جس کا رہن سہن اور لباس شاہانہ رہ چکا تھا ، جس کی سیرت نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرونِ ہند بھی مقبول ہو چکی تھی ، وہ دار العلوم ندوۃ العلماء کا درخشندہ ستارہ جس کی علمی شہرت ساری دنیائے اسلام مین تھی ، وہ صاحب علم جس کے قلم کا لوہا یورپ کے مستشرقین تک مانتے تھے ، جس کے زور قلم نے الہلال کو بدرِ کامل بنا کر چمکایا ، جس کی معارف نوازی نے علم و فن کے دریا بہا دیئے ، جس نے استاد مرحوم کی وصیت کو اس درجہ نباہا کہ اعظم گڈھ جیسے ویرانے کے ایک گوشہ مین ساری عمر گذار دی ، اس چھوٹے سے مقام کو علم و فن کا مرکز بنا دیا ، اور دار المصنفین کی علمی شہرت ساری دنیا میں پھیلا دی ، جس کی زیارت کے لئے دور دور کے اہلِ کمال آتے تھے ،

وہ جامع العلوم جس کو نادر شاہ نے کابل یونیورسٹی کا نصاب بنانے کے لئے منتخب کیا ، جس نے اپنی عربی دانی کا سکہ عربون تک پر بٹھا دیا ، جس نے پیرس اور روم و لندن وغیرہ کے علمی حلقون سے خراجِ تحسین حاصل کیا ، وہ مورخِ اعظم جو اپنے دور مین تو تون معیارِ تاریخ سمجھا گیا ، وہ قدیم و جدید کا سنگم جس کی ذات مین دونون کی حدین ملتی تھین ، وہ پرتو صفاتِ نبویؐ ، وہ نمونۂ اخلاقِ اسلامی ، وہ جامع کمالاتِ انسانی وہ جسے دنیا کی ہر قسم کی جاہ و شہرت بے طلب حاصل تھی ، دفعۃً جب مقام فنا سے گذرتا ہے تو اپنے آپ کو ایسا مٹاتا ہے کہ موتوا قبل ان تموتوا کا مصداق بن جاتا ہو ، حضرت قبلہ کی ایک غزل ان حالات کی بہترین ترجمان ہے :

اور ہم پس ماندگان کے لئے اُن کی ذاتِ اقدس کو نمونہ بنا کر درسِ عمل کی توفیق بخشیں، آپ کی بہت سی خصوصیات اکتسابی و غیر اکتسابی نوادرات میں سے تھیں جو قابلِ مطالعہ و سبق ہیں، اللہ تعالیٰ صبرِ جمیل عطا فرمائیں،

حضرت قبلہ مرحوم میرے محترم بڑے پیر بھائی تھے، جن کا صدمہ مجھے بہت زیادہ ہے، اس کی تلافی تو بس اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہی کرسکتی ہے،"

طاری ہو جائے،

مقام: وہ مرتبۂ سلوک جس پر سالک رسوخ قدم کے ساتھ قائم ہو جائے،

مراتب سلوک: یعنی مقامات جیسے صبر و شکر، توکل، استقامت علی الحق، زہد، رجاء وغیرہ،

ایسے جامع کمالات کا تذکرہ جس کے قلم نے صدہا انسانوں کو زندۂ جاوید کر دیا، مجھ جیسے ہیچ میرز انسان کے بساط سے باہر ہے لیکن اُن کی جو شفقت اس ناچیز پر تا دم آخر رہی، اس کو کسی طرح بھولا نہیں جا سکتا، اور یہ کمترین فرزند خانوادۂ سلیمانی اس وقت بھی اُن کے فیوض کو اپنے اوپر اسی طرح پاتا ہے جس طرح اُن کی حیات میں پاتا تھا، اور انہی کی روحانی برکت سے یہ چند سطر اس ناچیز کے قلم کر تحریر میں آگئیں،

اب میں اس ذکر کو حضرت قبلہ کے خواجہ تاش حضرت مولانا عبدالصمد صاحب مدظلہ دامت برکاتہ کی اس تحریر پر ختم کرتا ہوں، جو انھوں نے حضرت قبلہ کی وفات کے وقت مجھکو لکھی تھی،

"ایک خبر جانکاہ ریڈیو سے ۲۲ نومبر کی شب میں پاکستان سے نشر ہوئی تھی کہ ہمہ صفت علوم دینیہ وادبیہ وتاریخ وتصوف کے آن موصوف نے ارتحال کی تھی، اس کا صدمہ بہت ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون" اللہ تعالیٰ اُن کو بہتر ٹھکانا جنت الفردوس میں عطا فرمائیں، اور ان کے درجات عالیہ ہر روز وہاں بلند فرماتے رہیں، موت تو اس عالم آب وگل کے ہر بساط ہستی کے لئے لازم ہو چکی ہے مگر ممدوح ہمہ صفت پر کیا ماتم کا حق ادا ہو سکے، سوا اس بات کے کہ ہند کی سرزمین کا ایسا فرد جو علمی وادبی عالم میں مایۂ ناز ہستی تھا، جس کی تلافی اس عالم میں ماحول کا اندازہ لگاتے ہوئے دشوار ہی نہیں بلکہ محال ہے" اللہ تعالیٰ آن موصوف کو اعلیٰ علیین میں بلند مقام پر فائز فرمائیں،

رائے ہے کہ پانچ سال کی عمر کے بعد انسان کے کردار میں عموماً کوئی اہم تغیر پیدا ہی نہیں ہوتا، سید سلیمان مرحوم کی سیرت اور خصائص وشمائل کی بنیاد اسی چھوٹے سے گاؤں کے علمی ماحول میں پڑی، اور ان کا تشخص یہیں متعین ہوا،
یہ ماحول ہمارے قدیم طرز کے علمائے اسلام کا تھا، جو قرآن و حدیث وغیرہ کو پڑھ کر صرف اپنے حافظے ہی میں نہ رکھتے تھے، بلکہ ان میں جو اخلاقی تعلیم ہے، اس کو اپنے دلوں میں سمو لیتے تھے، وہ محاسنِ اخلاق کے مجسمے ہوتے تھے، اُن کی جیتی جاگتی چلتی پھرتی تصویر ہوتے تھے، عجز وانکسار، محبت و مودت، صداقت وامانت، صبر و استقامت، تحمل وتشکر، عفت و پاکبازی، عام انسانی ہمدردی، خوفِ خدا، اور جذبۂ خدمتِ خلق، اور دوسری صفاتِ عالیہ کے ساتھ، جن کی تعلیم کلامِ پاک اور رسولِ کریمؐ نے دی ہے متصف ہوتے تھے، یہ لوگ اپنے بچوں اور بچیوں کو ابتدائی عمر میں کریما، اور پند نامہ جیسی اخلاقی کتابیں صرف پڑھاتے ہی نہ تھے، بلکہ انہیں جو اعلیٰ اخلاقی تعلیم دی گئی ہے، ان کا اپنے اعمال و افعال، اور حرکات وسکنات سے، ان کے سامنے مظاہرہ بھی کرتے تھے، وہ جس طرح اپنے اوقات کی قدر کرتے تھے اسی طرح دوسروں کے اوقات کی قدر وقیمت کو بھی سمجھتے تھے،

یہ سارے صفاتِ حمیدہ سید سلیمان نے اپنے آباؤ اجداد سے وراثۃً پائے تھے، اور اُن کے ماحول نے ان کی سیرت و کردار میں پختگی پیدا کر دی تھی، میری جو چند ملاقاتیں سید سلیمان صاحب مرحوم سے ہوئیں، اُن سے مجھ پر یہی اثر ہوا کہ سید صاحب مرحوم کے محاسن اخلاق، اہلِ اسلام کے لئے ایک نمونہ تھے، ان ملاقاتوں کی تفصیل یہ ہے،

یہ عجیب افسوسناک واقعہ ہے کہ باوجود اس کے کہ میرا مولد و موطن ضلع پٹنہ ہی ہے، اور میں نے بھی علوم عربیہ کی ابتدائی تعلیم شہر پٹنہ ہی میں حاصل کی، سید سلیمان مرحوم سے میری ملاقات صرف پانچ دفعہ ہوئی، اور ان میں بھی چار بار محض اتفاقی طور پر،

پہلی ملاقات ۱۹۱۱ء میں ہوئی، جب میں مدرسۂ عالیہ رامپور سے فراغت حاصل کرنے کے بعد اورینٹل کالج لاہور میں مولوی فاضل کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا، سید صاحب اُس زمانہ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مدرس تھے، لاہور سے پٹنہ جاتے ہوئے میں مولانا شبلی مرحوم اور سید صاحب مرحوم کی زیارت کرنے کیلئے دو دن

ڈاکٹر سید سلیمان ندوی مرحوم اور انکا تشخص

از

ڈاکٹر محمد زبیر صاحب صدیقی

مولانا ڈاکٹر سید سلیمان ندوی کی وفات ہم لوگون کے لئے ایک جانکاہ حادثہ ہے، اس حادثہ
جانکاہ سے ہندوستان کی مسلم سوسائٹی مین علی العموم اور ہماری علمی دنیا مین علی الخصوص ایک ایسا خلا پیدا
ہوگیا ہے جس کا پر کرنا بہت ہی مشکل اور متعذر معلوم ہوتا ہے، سید صاحب مرحوم مین اُن کے علمی تبحر کے
ساتھ ساتھ ایسی ذاتی اخلاقی اور نفسانی خوبیان تھین، جو آج کل ہم لوگون مین مفقود ہیں، یہ خصائل حسنہ
اُن کو اپنے آبار داجداد سے وراثۃً ملے تھے، اور علمی تبحر انھون نے اپنی مسلسل محنت و جانفشانی اور
مطالعہ سے حاصل کیا تھا،

وہ علماے بہار کے ایک ایسے ممتاز خاندان کے چشم وچراغ تھے، جن کی اخلاقی خوبیون کی
داستان وہان کے اکثر بڑے بوڑھے بیان کیا کرتے تھے، اُن کا مولد و موطن بہار کا ایک چھوٹا سا گاؤن
دسنہ تھا، جو اب بھی اہل علم کا جنم بھوم ہونے کی حیثیت سے اس صوبہ مین ایک خاص امتیاز رکھتا ہے، ایسی
چھوٹی سی بستی کے علمی ماحول مین سید سلیمان مرحوم نے اپنی ابتدائی عمر صرف کی، اور عربی فارسی کی ابتدائی تعلیم بھی
حاصل کی، زندگی کا یہ ابتدائی حصہ ہر شخص کے لئے بہت ہی اہم ہوتا ہے، اسی زمانہ مین انسان کے خصائل بنتے
ہین، اس کی سیرت کا بڑا اہم حصہ جڑ پکڑتا ہے، اور اس کا تشخص متعین ہوتا ہے، ماہرین نفسیات کی تو

ساتھ دوسرون مین کوئی خوبی ہو تو اس کی داد بھی ضرور دینا چاہئے، اور گولڈزیہر کی وسعت نظر کا مین قائل ہون، اور اس کی داد دیتا ہون، مولانا نے فرمایا کہ جب آپ اوس کی کتاب کا زیادہ غائر مطالعہ کرین گے، تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کی تحقیق کی نوعیت کیا ہے، بعد کے مزید مطالعہ سے مولانا کا فرمانا اتنا بھر تو صحیح ثابت ہوا کہ گولڈزیہر کبھی کبھی اپنے نتائج محض مفروضات کی بنا پر نکالتا ہے، اور اس مین سخت غلطی کرتا ہے لیکن اس کا علمی تبحر اور اس کی وسعت نظر اپنی جگہ پر ہے،

اسی صحبت مین سید صاحب مرحوم نے مجھ سے حضرت عائشہؓ کی تنقید حدیث کا ذکر کیا، اور اس مسئلہ پر سیوطی کے ایک چھوٹے سے رسالہ کا بھی نام لیا، بلکہ کچھ دنون بعد انھون نے یہ رسالہ میرے پاس عاریۃً بھیج بھی دیا، جس سے مین نے استفادہ کیا، لیکن بعد کے مطالعہ سے پتہ چلا کہ ان مین سے اکثر حدیثین مسند ابی داؤد طیالسی مین موجود ہین،

اس کے تھوڑے دنون بعد سید صاحب سے میری ملاقات حیدرآباد کے دائرۃ المعارف کے جلسہ منعقدہ ۱۹۳۰ء مین ہوئی، اُس جلسہ مین ہندوستان کے مختلف حصون کے اکابر علماء شریک تھے، ان مین ایک نہایت جید فاضل بھی تھے جو میرے اور سید صاحب دونون کے دوست تھے، اُن کے علم و فضل کی سید صاحب بھی قدر کرتے تھے، اور مین تو اُن کے فضل و کمال کا قائل تھا ہی، اُن کی ایک کتاب پر دوسرے جید فاضل نے بہت سخت تنقید کی تھی، اور یہ تنقید سید صاحب نے معارف مین شائع کی تھی، انھون نے سید صاحب سے شکایت کی کہ یہ تنقید کیون شائع کی، سید صاحب نے فرمایا کہ یہ ایک علمی مضمون تھا، اور معارف ایک علمی جریدہ ہے، مین نے اس مضمون مین جو سخت اور نا ملائم الفاظ تھے، ان کو نکال کر شائع کر دیا، اور یہ میرا فرض تھا، آپ چاہین تو اس کا عالمانہ جواب لکھین، وہ بھی شائع کر دیا جائے گا، لیکن اگر اس مین کوئی سخت اور نا مناسب الفاظ ہونگے تو ان کو بھی حذف کر دیا جائے گا، باوجود اس جواب کے جو میرے خیال مین نہایت معقول تھا، ہمارے دوست خفا ہوتے رہے، اور سید صاحب مرحوم سنجیدگی اور متانت کے ساتھ جواب دیتے رہے، میرے دوست کی گفتگو کی سختی کے باوجود انھون نے کسی طرح کے غم و غصہ کا اظہار نہ کیا

لکھنؤ میں ٹھہر گیا، سید صاحب سے مسجد میں نماز ظہر کے وقت ملاقات ہوئی، صرف چند منٹ کچھ باتیں کیں، پھر میں نے رخصت چاہی، تو سید صاحب نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا، میں نے مدرسہ کے طلبہ کے شرارت آمیز انداز میں مسکرا کر عرض کیا کہ مولانا! رخصت کے وقت تو مصافحہ آیا نہیں ہے، سید صاحب مسکرائے، اور بجائے اس کے کہ اس مسئلہ پر بحث کرنا شروع کر دیتے، خاموش ہو رہے، حالانکہ وہ اس مسئلہ پر اچھی خاصی عالمانہ بحث کر سکتے تھے،

سید صاحب سے میری دوسری ملاقات ۱۹۳۶ء میں ندوۃ العلماء کے کتبخانہ میں محض اتفاقی طور پر ہوئی میں کتب خانہ میں ابن تیمیہ کی کتاب المعتبر کے مخطوطہ کی تلاش میں گیا تھا، اتفاق سے سید صاحب بھی وہاں موجود تھے، لیکن میں نے اُن کو نہ پہچانا، مہتمم کتب خانہ سے باتیں کرکے واپس ہونے لگا تو سید صاحب نے خود ہی بلا تکلف میرا نام دریافت کیا، میں نے عرض کیا "زبیر" تو فرمایا کہ "میں بھی یہی سمجھا تھا، میرا نام سید سلیمان ہے، میں نے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا، اور نہ پہچاننے کی معذرت کی، اس کے بعد ندوہ کے متعلق چند باتیں ہوئیں، اور آیندہ تفصیلی ملاقات کی امید پر میں نے رخصت حاصل کی،

میری تیسری ملاقات سید صاحب سے اتفاقی طور پر ریل میں ۱۹۴۳ء میں ہوئی، سید صاحب حسب معمول نہایت بے تکلفی سے ملے، اس زمانہ میں میں تاریخ علم الحدیث پر کام کر رہا تھا، اس موقع کو غنیمت سمجھ کر میں نے اُن سے استفادہ کے خیال سے فن اسماء الرجال کی ابتداء، اور نقد حدیث وغیرہ کے متعلق مختلف سوالات کئے، اور اس سلسلہ میں گولڈزیہر کی کتاب "مطالعاتِ اسلامیہ" کی تعریف کی، سید صاحب کو میری یہ بات پسند نہ آئی، فرمایا کہ یورپین مصنفین اصطلاحات وغیرہ کی ناواقفیت کی وجہ سے غلطیاں کرتے ہیں اور اسلام پر حملے کرتے ہیں، آپ ان لوگوں کی باتوں پر نہ جائیے، میں نے عرض کیا کہ یہ تو صحیح ہے کہ پڑھے لکھے آدمی کو کسی دوسرے کے کہنے پر بے سوچے سمجھے آمنّا وصدّقنا نہ کہنا چاہئے، بلکہ ہر مسئلہ پر جہاں تک ممکن ہو تو تحقیق کے بعد رائے قائم کرنا چاہئے .... لیکن اس کے ساتھ

ہو سکتا ہے ؟ لیکن اس کا علم کس کام کا ہے ؟

سید سلیمان ندوی مرحوم فضائلِ عالیہ نفسانیہ کے ساتھ متصف ہونیکے ساتھ ساتھ عالم متبحر اور فاضلِ اجل بھی تھے، اور مختلف علوم اسلامیہ کا وسیع علم رکھتے تھے، انھون نے اپنی پچاس سالہ علمی زندگی مین سیکڑون مضامین الندوہ، الہلال، معارف اور دوسرے جرائد کے لئے لکھے، بیسیون چھوٹے بڑے خطبے پڑھے اور درجنون چھوٹی بڑی کتابین تصنیف کین، اُن کے ہر مضمون، خطبے اور تصنیف سے معلوم ہوتا ہی کہ وہ اپنے موضوع سے کافی واقفیت رکھتے تھے،

سید صاحب جب کسی اہم موضوع پر قلم اٹھانا چاہتے تھے، تو اس کے متعلق کافی مطالعہ کرتے تھے اور جہان کہین بھی ان کو اپنے موضوع کے متعلق معلومات کے ملنے کی توقع ہوتی، وہان سے جو کچھ ان کو مل سکتا تھا، اس کو اخذ کرتے تھے، اور حتی الوسع تحقیق و تنقید کے بعد جو کچھ اُن کو ملتا تھا، اس کو نہایت سلیقے اور عالمانہ طور سے سجاتے تھے،

سید صاحب کا طریق تحقیق عموماً تو وہی تھا، جو اُن کے استاد مرحوم مولانا شبلی کا تھا، لیکن ایک حد تک وہ آزادانہ اپنے خیال کا اظہار کرتے تھے، چنانچہ بعض مسائل مین انھون نے مولانا شبلی سے اختلاف بھی کیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ سید صاحب تقید فکر کے اُس جنجال سے جو گذشتہ دو تین صدیون مین مسلمانون مین پھیل گیا تھا، بہت باہر نکل آئے تھے، یہ لوگ تو علومِ عقلیہ مین بھی اپنے اساتذہ سے اختلاف کرنے کو اثم عظیم سمجھتے تھے، چنانچہ میرے استاذ مولانا فضلِ حق رامپوری مرحوم نے جب میرزاہد امور عامہ کے حاشیہ مین مولانا عبدالحق خیرآبادی مرحوم پر جو میرے استاذ الاستاذ تھے بعض فلسفیانہ مسائل کے متعلق کچھ اعتراضات کئے، تو مولانا عبدالحق مرحوم کے معتقدین اور شاگردون مین غم و غصہ کا ایک طوفان اٹھا، اور مولانا ہدایت اللہ جونپوری مرحوم مولانا حکیم برکات احمد ٹونکی مرحوم، مولانا محمد طیب عرب رامپوری مرحوم مولانا عبدالعزیز بہاری نپوری مرحوم وغیرہ ہم مین عناد کی ایک زبردست لہر دوڑ گئی، متعدد رسالے

سید صاحب مرحوم سے میری پانچوین اور آخری ملاقات ڈھاکہ مین آل پاکستان ہسٹوریکل کانفرنس کے جلسہ کے موقع پر ہوئی، سید صاحب مرحوم اس جلسہ کے صدر تھے، انھون نے اپنے خطبۂ صدارت مین چند تاریخی اور ادبی حقائق بیان کئے تھے جن سے کسی پڑھے لکھے آدمی کو انکار نہین ہوسکتا، لیکن بعض خاص سیاسی اسباب کے باعث طلبہ مین غلط فہمی پھیل گئی، یا پھیلائی گئی، ان لوگون نے جلسہ کے دوسرے دن سید صاحب کے سامنے اُن کے خلاف نہایت سخت اور افسوسناک مظاہرہ کیا، اور اُن کو مجبور کیا کہ وہ جلسے چلے جائین، جلسہ موقوف کردیا گیا، اور مولٰنا رفع شر کے خیال سے اپنے جاے قیام پر چلے گئے، مین بھی وہان گیا، مولانا لیٹے ہوئے تھے، مین نے حال دریافت کیا، فرمایا سب ٹھیک ہے، پھر یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور چند اساتذہ معافی مانگنے کے لئے آئے، اُن سے سید صاحب نے دوران گفتگو مین بلا کسی غم و غصہ کے فرمایا کہ جو کچھ مین نے کہا وہ تاریخی حقائق ہین، اور مظاہرہ اور ہنگامہ کرنے سے یہ حقائق تو بدل نہین سکتے،

اس تمام ہنگامہ اور قصہ مین سید صاحب کا صبر و تحمل اور ضبط نفس قابلِ ستایش و آفرین تھا، انھون نے نہ تو طلبہ کی کسی سے شکایت کی، نہ کسی کے خلاف ایک حرف زبان سے نکالا،

ان پانچون واقعات سے سید صاحب کے کردار اور اُن کی شخصیت پر نمایان روشنی پڑتی ہے، اُنکے اندر نہ تو کبر و نخوت تھا، نہ خود پسندی تھی، وہ لاطائل صحبت ناپسند کرتے تھے، چھوٹون سے محبت و خلوص سے ملتے تھے، علمی کام کرنے والون کی ہر طرح اعانت کرتے تھے، تحمل و بردباری اُن کی خاص صفت تھی، شر و فساد سے اُن کو نفرت تھی، جو لوگ ان کی تذلیل کرتے تھے، اُن کو بھی وہ مخلصانہ اور مصلحانہ نصیحتین کرتے تھے،

علماے اسلام کے طرۂ امتیاز یہی نفسانی اور اخلاقی فضائلِ حسنہ ہین، اگر علومِ اسلامیہ کی درس و تدریس کے بعد بھی یہ فضائل نہ پیدا ہون تو سارا علم و فضل بیکار ہے، معلم الملکوت سے زیادہ بڑا عالم کون

کی مزید تحقیق اور اشاعت ہوتی رہی ہے، اسی طرح سید سلیمان مرحوم کا سب سے بڑا کارنامہ دارالمصنفین کے قائم رکھنے، اور نئے کارکنوں کے پیدا کرنے میں مضمر ہے، دارالمصنفین اب صرف مولانا شبلی کی یادگار نہیں ہے بلکہ زیادہ تر سید سلیمان مرحوم کی یادگار ہے،

دارالمصنفین ہندوستان کا اپنے قسم کا سب سے پہلا قومی علمی ادارہ ہے جس نے اب تک نہایت مفید علمی خدمت کی ہے، اس نے اب تک اپنی زندگی اور افادیت کا کافی ثبوت دیا ہے، اب اس کو قائم رکھنا اور اس کو ترقی دینا ہم لوگوں کا فرض ہے، حیدرآباد کا دائرۃ المعارف بھی اسی طرح کا ایک مفید علمی ادارہ ہے لیکن اولاً تو وہ سرکاری یا نیم سرکاری ادارہ ہے، دوسرے اس کی افادیت عربی خوان طبقہ تک محدود ہے، اور اس کی اشاعتوں سے استفادہ کرنے، اور اہل ہند کے لئے عموماً مفید تر بنانے کے لئے بھی دارالمصنفین جیسے اداروں کی ضرورت ہے، دہلی کا ندوۃ المصنفین دارالمصنفین جیسا ایک علمی قومی ادارہ ہے لیکن ایک تو وہ ابھی نوعمر ہے، دوسرے ہندوستان جیسے وسیع ملک کے لئے ایک قسم کے دو علمی ادارے بھی کم ہی ہیں،

لہٰذا جو لوگ سید سلیمان مرحوم کی یادگار قائم کرنا چاہتے ہیں، اُن کے لئے بہترین صورت یہ ہے کہ اُن کی اس زندہ یادگار کو مزید ترقی اور وسعت دیں اور اس میں نئی شاخیں پیدا کریں،

شائع کیے گئے، اور آخر میں نواب حامد علی خان رئیس رامپور کے دربار میں مولانا عبدالوہاب بہاری مرحوم اور مولانا برکات احمد البہاری ثم التونکی کے درمیان مناظرہ ہوا، مسلمان علما میں جمود فکر اور تقلید ذہنی کی یہ حد تھی، حالانکہ فقہی اور مذہبی مسائل میں صحابۂ کرام نے آپس میں اختلاف کیا، ائمۂ فقہ میں بعض اہم اصولی اختلافات ہوئے اور مختلف مذاہب فقہیہ پیدا ہوئے، محمد بن جریر طبری نے بعض مسائل میں ائمۂ اربعہ سے اختلاف کیا لیکن ان اختلافات نے کبھی ذاتیات کی حیثیت نہ اختیار کی،

اسی طرح سید سلیمان مرحوم نے بھی بعض علمی اور تاریخی مسائل میں اپنے استاذ محترم سے مودبانہ اختلاف کرکے اپنی حریتِ فکر اور آزادانہ تحقیق کا بھی ثبوت دیا ہے،

مولانا سید سلیمان مرحوم کا طرز تحریر اور طریقۂ بیان صاف ستھرا اور سلجھا ہوا تھا، نہ تو ان کی تحریروں میں کسی طرح کی تعقید ہے، نہ اُن کی تقریر میں کسی طرح کا جھول ہوتا تھا، بلکہ اُن کی تقریریں صاف ستھری اور سادی ہوتی تھیں، ان میں نہ تو ادا کا اتار چڑھاؤ ہوتا تھا، نہ الفاظ کا خطیبانہ الٹ پھیر، تحریر میں وہ مختلف انداز میں مہارت رکھتے اور ہر موضوع کے لئے وہی انداز بیان اختیار کرتے تھے، جو اس کے مناسب ہوتا تھا، چنانچہ الہلال میں جو مضامین سید صاحب کے شائع ہوئے ہیں، ان کا طرز بیان "خطبات مدراس" کے انداز تحریر سے بالکل مختلف ہے، "عربوں کی جہاز رانی" اور "عرب و ہند کے تعلقات" کے انداز بیان میں نمایاں فرق ہے، ارض القرآن، سیرت عائشہؓ اور سیرت النبی کی زبان تو یکساں ہے لیکن ان میں بھی سلاست اور علمیت کے مختلف درجے نظر آتے ہیں،

سید سلیمان مرحوم کا شاہکار عام طور پر سیرت النبی کی جلدیں ہی سمجھی جاتی ہیں، اس میں شک نہیں کہ اس کارنامے پر سید صاحب مرحوم جتنا بھی فخر کرتے کم تھا، انھوں نے سیرۃ النبی لکھ کر تمام مسلمانوں کی طرف سے ایک فرض کفایہ ادا کر دیا ہے جس کا اجر اُن کو خدائے تعالیٰ دے گا، لیکن میرے خیال میں جس طرح مولانا شبلی مرحوم کا بہترین کارنامہ اُن کی تصنیفوں میں مضمر نہیں ہے، اگرچہ وہ بھی یقیناً بہت اہم ہیں بلکہ ان کا سب سے بڑا کام علمی خدمت کرنے والوں کی ایک جماعت پیدا کرنا، اُن کی رہنمائی کرنا اور دارالمصنفین کی تاسیس ہے جس کے ذریعہ سے علم

معاشی مسائل پر آزادانہ طور سے تبادلۂ خیالات بھی ہو جاتا، مگر علامہ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ہم لوگوں میں اکثر سیاسی مسائل میں سخت اختلاف رائے تھا،

نہ ملنے کی دوسری اور اصل وجہ یہ تھی کہ میرے بعض بزرگوں اور دوستوں نے جو سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اچھی طرح واقف تھے، بلکہ اُن کے ہم خیال و ہمراز تھے، مجھے واقف کر دیا تھا کہ اب سید صاحب اُس گروہ کے ایک بلند مقام فرد ہیں جن سے تم ملنے سے ڈرتے ہو، شرماتے ہو اور ہچکچاتے ہو

آپ شاید سوال کریں کہ وہ کونسا گروہ ہے، جواب ہے، اہلِ دل اور اہلِ نظر کا گروہ، آپ پوچھ سکتے ہیں، — کیوں؟ — بلا تصنع عرض کرتا ہوں — ڈرتا ہوں کہ کہیں اپنا بھرم نہ کھل جائے شرماتا ہوں کہ میرے مخفی عیوب سے اہلِ نظر واقف نہ ہو جائیں اور ہچکچاتا ہوں کہ کہیں میری حاضری سے اُن لوگوں کی طبیعت منغض نہ ہو جائے،

اسلئے تمنائے قدمبوسی کے باوجود علامہ مرحوم سے ملنے کی ہمت نہ پڑی، کئی بار صحنِ حرم میں مشغولِ نماز یا محوِ دیدارِ کعبہ نظر آئے، دو ایک بار سعی کرتے کوہِ صفا پر دعا مانگتے اور آنسو بہاتے ہوئے بھی دیکھا، سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق آنکھ والوں کو یہ بھی کہتے سُنا کہ

"ایمان و احتساب کی جلوہ ریزیاں اُن کی ہر نقل و حرکت سے ظاہر ہیں"

مگر مجھ کو سید صاحب علیہ الرحمہ میں کوئی خاص کیفیت نظر نہ آئی، قیامِ مکہ مکرمہ کی مدت ختم ہوئی، مدینہ منورہ جانے کا حکم ملا تو میرے ایک دوست نے کہا کہ تم کو مبارک باد دیتا ہوں کہ سید صاحب بھی اُسی دن تشریف لے جائیں گے جس دن تم کو جانا ہے، میں نے کہا کہ —— بھائی معاف کرنا میں نے سید صاحب کو نزدیک سے بھی دیکھا اور دور سے بھی، اور سوچتا رہا کہ تم اُن کو اب "علامہ سید سلیمان ندوی" نہیں بلکہ "سید العارفین" کہتے ہو آخر اُس کی وجہ کیا ہے، مجھے تو آج سے تین سال پہلے کے سید صاحب اور آج کے سید صاحب میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آیا، میرے پھٹے پرانے کپڑے والے اخود فراموش

سفر حجاز کے چند تاثرات

از

جناب پروفیسر عبد المنان صاحب بیدل، سابق صدر شعبۂ فارسی پٹنہ یونیورسٹی

۱۹۴۹ء سے پہلے الحاج سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بہ قصد انتفاع و استفادہ حاضر ہونے کی سعادت نصیب نہ ہوئی تھی،

۱۹۴۹ء میں بفضل باری تعالیٰ، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی حاضری کا موقع ملا، مکہ مکرمہ میں ایک عالم دوست، رفیق سفر نے خبر دی کہ مولٰنا سید سلیمان صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی فریضۂ حج ادا کرنے کے لئے اپنے چھوٹے بیٹے محمد سلمان سلمہ المنان، اور چند خواتین کے ساتھ تشریف لائے ہیں، اور رباط بھوپال میں قیام فرما ہیں، مگر یہ خوشخبری ملنے کے بعد بھی میں اُن سے ملنے نہ گیا،

سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ملنے کی تمنا بھی تھی، اور ضرورت بھی، مگر اُن کے پاس نہ جانے کی ایک وجہ تو یہ بھی تھی کہ میں فطرۃً کم آمیز ہوں، اور سید صاحب رحمہ اللہ سے عمر بھر میں چند بار سے زیادہ اطمینان کے ساتھ ملنے اور تبادلۂ خیالات کا موقع مجھے نہ ملا تھا، چند بار پٹنہ کالج کے پروفیسر محمد قاسم مرحوم کے بنگلہ پر اور چند مرتبہ ریاض حسن خان خیال مرحوم مظفرپوری کی قیام گاہ پر، پروفیسر محمد قاسم مرحوم میرے عزیزوں میں تھے، اور پٹنہ کالج کے بعض اساتذہ اور محلہ کے دو ایک وکیلوں کی شام کی نشست پروفیسر محمد قاسم مرحوم ہی کے یہاں ہوا کرتی تھی، کبھی کبھی خصوصاً جب سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی تشریف فرما ہوتے، تو سیاسی، تاریخی، مذہبی

ایک دن خبر ملی کہ مولانا جدہ کے لئے روانہ ہو گئے، مجھے بھی حکم ہوا کہ جدہ جاؤ جہاز تیار ہے، روانہ ہو گیا۔ مدینہ منورہ سے تھوڑے ہی فاصلہ پر دیکھا کہ کئی لاریاں بالوں میں دھنسی ہوئی ہیں ۔ کئی دنوں سے موسلا دھار بارش ہو رہی تھی کہ سونتی تک سڑکوں پر بڑے بڑے گڈھے پڑ گئے تھے اور بھاری لاریوں کا گذرنا سخت دشوار ہو گیا تھا، حجاج کرام کو لاریوں سے اتر کر ڈرائیوروں کی ہدایت کے مطابق اپنی اور اپنی ساتھیوں کی لاریوں کو ٹھیلنا پڑا، اس کام میں سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی کسی سے پیچھے نہ رہے، لاریوں کے پھنسنے چھنے، اور پھر رُک جانے کا سلسلہ رابغ تک رہا، رابغ پہنچکر اطلاع ملی کہ مکہ مکرمہ کے قریب تک ایسا ہی راستہ ہے، اس لئے حکومت کا حکم ہے کہ پانچ چھ دنوں تک حجاج کرام رابغ ہی میں رہیں اور راستہ کے خشک ہو جانے اور بنجانے کا انتظار کریں، اس لئے چھ سات دن چھ سات سو حجاج رابغ ہی میں ٹھہرے رہے رابغ کے قیام کے دوران میں سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اکثر مسجد جاتے وقت یا مسجد سے لوٹتے وقت ملاقات ہو جاتی، ایک دو بار گفتگو کا موقع بھی ملا، رابغ میں دو مسجدیں ہم لوگوں نے دیکھیں، ایک منزل سے بہت قریب، اور ایک بڑی مسجد منزل سے دو تین فرلانگ کے فاصلہ پر، مگران دونوں مسجدوں میں سے کسی میں بھی وہ سامان نہ تھا جس کے دیکھنے اور استعمال کرنے کے ہم ہندوستانی عادی ہو گئے ہیں، ایک مسجد میں تو چراغ وغیرہ قسم کی کوئی چیز بھی نہ تھی، نمازی اندھیرے میں نماز ادا کرتے تھے بمبئی کے ایک بوہرے تاجر ظروف شیشہ کو توفیق ہوئی، انھوں نے لالٹین کا سامان کر دیا، جزاک اللہ فی الدارین خیرا، ایک روز مسجد سے واپس آرہا تھا کہ مولانا سے گفتگو کا موقع ملا، عرض کیا بڑے افسوس کی بات ہے مسلمانوں کا ملک ہے حجاج ابرابر اس راہ سے گذرتے رہتے ہیں، مگر یہاں کی مسجدیں شکستہ حال ہیں، نہ وضو کا سامان ہے، اور نہ جانمازیں قرینہ کی ہیں، صرف دو چار گرد آلود چٹائیاں بچھی ہوئی ہیں، فرمانے لگے، ـــ حالت تو ظاہر ہی ہے، مگر اس پر واسے زنی وہی کرے جو صاحب اختیار بھی ہو، اور دانا ہے اصول سیاست بھی، ایک دن میں نے عرض کیا، بیچارے سب اب تک بہت مفلوک الحال نظر آتے ہیں، حالانکہ کہا جاتا ہے کہ یہ یار محبوب خدا

دوست نے کوئی جواب نہ دیا، اور یہ شعر گنگناتے ہوئے حرم شریف کی طرف روانہ ہو گئے،

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب راچہ گناہ

(۲۰)

مدینہ منورہ مین ایک دن باب مجیدی کے قریب سید صاحب نظر آئے مین نے السلام علیکم کہا جواب ملا وعلیکم السلام و رحمۃ اللہ و برکاتہ اس کے بعد مولانا آگے بڑھے، مین نے قریب جاکر عرض کیا حضور نے اس دیرینہ نیازمند کو یقیناً نہ پہچانا ہوگا فرمایا، ہان، دیکھ کر تو نہین پہچانا تھا، مگر آواز سُن کر اب پہچان گیا، بھلا کہئے تو کیسے پہچانتا نہ وہ سوٹ مین ملبوس بھرا ہوا بدن ہے، نہ منڈی ہوئی داڑھی، نہ ہاتھ مین طلائی دستہ کی چھڑی ہے، نہ لب کے دائین گوشہ مین نیم سوختہ سگریٹ ہے، آپنے تو ایسی صورت بنائی ہو کہ مین کیا آپ کا قریب ترین اور قدیم ترین دوست بھی شاید ہی پہچانے، عرض کیا حضور صورت ہی صرف بدلی ہے، مسکرا کر فرمانے لگے، انشاء اللہ اس دربار سے جاتے جاتے سیرت بھی بدل جائے گی، —— اس جملہ کے ساتھ ہی ساتھ اُن کی آنکھون سے آنسو کے چند قطرے بھی نکل پڑے —— کہنے لگے، — بیدل صاحب کیا عرض کرون، جلال و جبروت والے کے دربار مین بھی بہت کچھ ملتا ہے مگر رافت و رحمت والے کے دربار مین سب سے بڑی چیز یعنی محبت ملتی ہے آنا شرط ہے، آئے نہین کہ ہدیۂ محبت ملا نہین، ہان ایک بات اور عرض کرون کچھ ایسے لوگ بھی ہین جن کو یہان آئے بغیر بھی بہت کچھ دیدیا جاتا ہے، اللہ رے اُن کی قسمت،

مدینہ منورہ کے بارہ روزہ قیام کے زمانہ مین بھی سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سوا ایک بار کے گفتگو کا موقع نہ ملا، مجھے ایسا شبہہ ہوا کہ وہ مجھ سے اس سرزمین مقدس مین ملنے سے پرہیز کرتے ہین، کوئی تعجب کی بات نہین صحبت ناجنس، عذاب الیم ہے،

خسرو جہاز کل بمبئی کے لئے روانہ ہو رہا ہے چونکہ بمبئی سے جدہ آتے وقت آپ ہی امیر الحاج تھے، اس لئے ہم لوگ آپ ہی کو پھر امیر الحاج بنانا چاہتے تھے، مگر مولانا سید سلیمان ندوی صاحب بھی اسی جہاز سے تشریف لیجا رہے ہین اس لئے اُن کی موجودگی مین کسی دوسرے کو امیر الحاج بنانا سخت گستاخی ہے، مین نے بھی کہا کہ ان کے ہوتے ہوئے، کوئی بھی امیر الحاج ہونا پسند نہین کرے گا،

۱۵ دسمبر کو جب مین جہاز پر سوار ہو گیا، تو ظفر جمیل صاحب قونصل جنرل کے سکریٹری تشریف لائے اور مجھ سے کہا کہ مولانا (سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہین، کہ بیدل صاحب کی موجودگی مین ہرگز یہ عہدہ قبول نہ کرون گا، مین نے جب بہت اصرار کیا، تو فرمایا مین اسی شرط پر امیر الحاج کہلائے جانے پر راضی ہو سکتا ہون کہ عملاً آپ ہی اس خدمت کو انجام دین، اور کپتان کے ساتھ ہر روز گشت مین بھی آپ چلین تاکہ لوگون کو معلوم رہے کہ آپ امیر الحاج کا کام کر رہے ہین، سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے انکسار و خاکساری کا اس سے بہتر نقشہ اس سفر مین مجھے نظر نہ آیا، جہاز پر سوار ہونے کے چند دنون بعد سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بخار آگیا، اور بمبئی پہنچنے کے بعد تک صحت نہ ہوئی، خسرو جہاز ۲۹ دسمبر ۱۹۴۹ء کو بمبئی پہنچا، اتنی دیر مین پہنچنے کی وجہ یہ ہوئی کہ اکثر گودیون مین ٹھہرتا ہوا آیا تھا، مدت سفر طویل تھی، اس لئے سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت مین اکثر انتفاع و استفادہ کی خاطر حاضر ہوا کرتا تھا، وہ خود بھی ازراہ نوازش اکثر مجھے اپنے کیبن ہی مین بلا لیتے تھے، ایک روز سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بخار زیادہ تھا، اور طبیعت بے چین تھی، مین نے جہاز کے ڈاکٹر کو خبر دی، مگر وہ گھنٹون کے بعد آیا، جب مین جہاز کی رپورٹ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے لکھ کر لے گیا، اور سید صاحب کو ترجمہ کر کے سُنانے لگا، تو سید صاحب نے فرمایا آپ ـــــ پڑھئے مین سمجھتا ہون، ـــــ اس کے بعد فرمایا ـــــ رپورٹ بہت خوب ہے، مگر ڈاکٹر کی شکایت والا جملہ نکال دیجئے، اور عملہ کی کارگزاری کی تعریف مین دو جملے اور بڑھا دیجئے، مین نے عرض کیا کہ ڈاکٹر کی بے پروائی، اور سخت کلامی سے اکثر مریض ناراض ہین، اور مجھ سے اس کے خلاف شکایت

اور خداوند کریم کے محبوب ترین ممالک مین ہے، کاش امرکیہ کی دولت کا کچھ حصہ ان لوگون کو بھی مل جاتا ــــ ارشاد ہوا، ـــــ دنیا دارون خصوصًا غیر مسلمون کی ترقی پر رشک کرنا حکمتِ الٰہی سے ناواقفیت کا ثبوت ہے، ایک روز مین نے کہا مسجد نبوی مین بعض لوگ اماموں کے پیچھے نماز نہین ادا کرتے تھے بلکہ جب نماز جماعت ہو جاتی تو اپنی ٹولی الگ بناکر نماز پڑھتے تھے، ارشاد ہوا ـــــ ہوسکتا ہے، بیدل صاحب اب مذہب تو نہ رہا مذہب کے جھگڑے رہ گئے، غرض جب تک رابغ مین قیام رہا، اور جب جب موقع ملا، سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے مختلف سوالات بہ نظر استفادہ کرتا رہا، اور ہمیشہ تشفی بخش جواب ملا، جب رابغ مین ٹھہرے ہوئے کئی دن ہوگئے، اور دل گھبرانے لگا تو ایک دن سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ حضور مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے بجائے بندرگاہ رابغ مین ہم لوگون کے ٹھہرانے مین کیا مصلحتِ خداوندی ہے، ـــــ فرمایا ـــــ دعوی عبودیت کا ثبوت طلب کیا جارہا ہے، سبق یہ دیا جارہا ہے کہ اپنی خواہش کو مرضی مولا کے تابع بنانے کی عادت ڈالو،

(۳)

رابغ سے روانہ ہوکر جدہ پہنچا، جدہ مین سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے صرف دوبار عبدالمجید صاحب حریری قونصل جنرل ہند کے آفس مین ملاقات ہوئی کسی خاص قابلِ ذکر گفتگو کا موقع نہ ملا، صرف ایک دن دورانِ گفتگو مین ایک جملہ کہہ گئے جس کا مفہوم مین نہین سمجھا ـــــ قونصل صاحب ایک شخص کو کہہ رہے تھے "کہ آپنے رڈکپن کیا" مولانا نے کہا "لڑکپن نہین کیا جوانی کیا" بعد کو معلوم ہوا کہ وہ حضرت کسی عز دوشیزہ سے محبت کرنے کے جرم مین ملازمت سے برطرف کردیئے گئے تھے، اُسی نشست مین ایک جملہ اُن بھی ارشاد ہوا کہ ـــــ عرب کے قونصل خانہ مین "خاص قسم کے لوگون کا تقرر ہوا کرے تو زیادہ مفید ہو" معلوم نہین اس سے کس کی طرف اشارہ تھا، اور کیا مطلب تھا،

۱۳ر دسمبر ۱۹۴۹ء کی شام کو عبدالمجید صاحب قونصل جنرل ہند سے ملنے گیا، تو انھون نے کہا کہ

اے زائرِ بیتِ نبوی یاد رہے یہ بے قاعدہ یان جنبشِ لب بے ادبی ہے

آہستہ قدم، نیچی نگہ، پست صدا ہو

خوابیدہ یہاں روح رسولِ عربی ہے

یاد نہین کہ اُن کے علاوہ دوسرے اشعار کہاں رکھدیئے، پھر جب دوبارہ سلمان سلمہ کو لکھا تو کوئی جواب نہین ملا،

دورانِ سفر مین مولانا کا وقت اوراد و وظائف یا تبلیغ و تفہیم مسائل مین صرف ہوتا تھا، مجھے یہ دیکھکر بڑی خوشی ہوئی کہ مولانا بیانِ مسائل مین "مصلحتِ وقت" اور اظہارِ حقیقت مین کسی شخصیت کا کوئی خیال نہین کرتے تھے جس چیز کو صحیح سمجھا، اس کو کہہ دیا، ایک روز مجھ سے حاجیون نے فرمایش کی کہ مجلسِ میلاد شریف منعقد کرنے کا ارادہ ہے، ۔۔۔ آپ مولانا صاحب کو راضی کر دیجئے کہ وہ بیان فرمائین، مین نے کہا ۔۔۔ کوشش کرون گا، ۔۔۔ مگر شاید ہی کامیابی ہو، ۔۔۔ لوگون نے نہ مانا اور مین سید صاحب کو مجلس میلاد النبی مین لے آیا، اور میلاد پڑھنے کی درخواست کی، انھون نے مختصر سی تمہید کے بعد وعظ و پند شروع کر دیا، تقریر مین بہت سی باتون کے علاوہ یہ بھی کہا کہ اگر مجلسِ میلاد آپ اظہارِ محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی پیروی کرنے کے طریقون کا ذکر کرنے کے لئے منعقد کرتے ہین، تو آپ کو سمجھ لینا چاہیئے کہ ہر وہ طریقۂ اظہارِ محبت غلط ہے جس کا پسندیدہ ہونا خود حضور سرورِ کائنات یا صحابۂ کرام سے ثابت نہین ہے، جو شخص محبتِ رسول اور ساتھ ہی ساتھ اللہ کی محبت کا دعویٰ کرتا ہے، اس کو چاہیئے کہ ہر کام مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم اور منشار کا لحاظ رکھے، صرف اسی حال مین اسکی بات اصلی معنون مین محبت ہوگی، رسول اللہ سے محبت کرنے کا واحد اور شرعی طریقہ رسول کا اتباع کامل ہے، اُس لیجئے کہ رسول سے جس قدر محبت بڑھتی ہے اسی قدر اللہ کے محبوب رسولِ کریم کی تابعداری ہوتی جاتی ہے، ۔۔۔ اسی طرح کی باتین کہنے کے بعد سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے

کی ہے فرمایا:

"آپ اس کی شکایت نہ کیجئے، ممکن ہے سمجھ آجائے گی، اور مسلمان بھی تو ہے"

جہاز پر سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ جب تک اچھے رہے بعد نماز عصر کیبن سے باہر عرشہ پر آکر ادھر ادھر ٹہلتے، یا دیر تک کھڑے ہوئے سمندر کا نظارہ کرتے رہتے، میں بھی معمولاً اس وقت حاضر خدمت ہو جاتا، چونکہ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو معلوم تھا کہ ان کا مخاطب نہ مولوی ہے نہ مولانا، نہ عالم ہے نہ عارف نہ مورخ ہے، نہ مفسر، بلکہ صرف اردو کا شاعر ہے، اور کبھی فارسی کا پروفیسر تھا، اس لئے جب وہ خود سلسلۂ گفتگو شروع کرتے، تو فرماتے ——— بیدل صاحب کچھ پڑھیے؛ ——— عرض کرتا کہ کالج کے مشاعروں میں لڑکوں کی خاطر غزل لکھتا بھی ہوں اور پڑھتا بھی ہوں، مگر کالج کے مشاعرہ سے باہر شعر سنانے سے پرہیز کرتا ہوں، اسی لئے اشعار بھی یاد نہیں ہیں، ——— اس کے بعد عرض کرتا ——— شاید کہ آپ بھی تو شعر کہتے ہیں، کچھ اشعار یاد ہوں تو ارشاد فرمایا جائے، میری درخواست پر اکثر سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی نظمیں اور غزلیں مجھے سنائیں، میں نے عرض کیا، اگر یہ اشعار لکھوا دیے جائیں تو میں انہیں اپنے رسالہ (معاصر) میں چھاپ دوں۔ پہلے تو مسکرا کر فرمایا، "اس کی اجازت نہیں" مگر جب میں نے بہت اصرار کیا، تو فرمایا ——— سلمان سے کہئے وہ یہ اشعار لکھ کر آپ کو دیدیں گے، میں نے سلمان سے کہا، انہوں نے جو نظمیں مجھ کو دیں، ان میں سے حسب ذیل نعت جس کا عنوان ہے "گل ہائے عقیدت" معاصر بابت نومبر و دسمبر ۱۹۴۹ء میں چھاپ دی،

مکی، مدنی، ہاشمی و مطلبی ہے ——— آدم کے لئے فخر یہ عالی نسبی ہے
پاکیزہ تر از عرش و سما جنت فردوس ——— آرام گہ پاک رسول عربی ہے
کیا شان ہوا اللہ رے محبوب نبی کی ——— محبوب خدا ہو وہ جو محبوب نبی ہے
بجھ جائے ترے چھینٹوں سے اے ابر کرم آج ——— جو آگ مرے سینے میں مدت سے دبی ہے

سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تحمل کی داد دینی پڑتی ہے میں دینی علوم سے ناواقف ہوں، اکثر ان سے عامیانہ گفتگو اور مہمل سوالات کرتا، غیر مفید نزاعی مسائل چھیڑتا، مگر کبھی بھی سید صاحب رحمۃ اللہ کے ماتھے پر شکن نہ آتی مہمل سوالوں کے پوچھنے پر مجھے کبھی نہیں جھڑکا پیچیدہ سیاسی مسائل بھی بحث میں لے آتا مگر سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نہایت نرمی اور محبت سے میری تشفی کرنے کی کوشش فرماتے ایک روز شاہ حجاز کی روز افزوں دولت اور عرب تاجروں کے آرائش و آسائش کے سامانوں کی فراوانی پر اظہار مسرت کر کے سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اپنے خیال کی تائید چاہتا تھا ___ کہنے لگے ، ___ بیشک دولت نعمت ہے اور خداوند کریم کی نعمتوں میں ایک بڑی نعمت ہے، مگر اس دور میں دولت کے دور کے برے نتائج کی تلافی و تدارک کا امکان بہت دشوار ہے، مولانا کے سیاسی شعور کی بلندیوں تک پہنچنا میرے لئے ناممکن ہے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ہندوستان و پاکستان کے غیر دانشمندانہ تعلقات پر گفتگو کی عربوں کی امریکہ نوازی پر رائے زنی کی، بھارت کے مسلمانوں کی بدحالی کے اسباب بیان کئے، اور جن مسائل کو میں بڑے بڑے لیڈروں کی توضیح و تفصیل کے بعد بھی نہ سمجھا تھا، سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تشریح سے پوری طرح سمجھ میں آ گئے، اور کشف صدر ہو کر اطمینان ہو گیا، اور خدا کا شکر ادا کیا کہ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مختصر صحبت سے برسوں کی الجھن دور ہو گئی، غرض بمبئی پہنچنے تک مولانا کی تعلیمات سے اپنی معلومات میں اضافہ کرتا رہا، مگر ایک تمنائے دیرینہ پوری نہ ہوئی ۔ ___ ایک دن جو چشم کرم اپنی طرف دیکھی تو عرض کیا ،

آنانکہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

مسکرا کر رہ گئے اور کوئی جواب نہ دیا، صاحب نظر تھے، سمجھ گئے ہونگے، کہ کثرت گناہ سے وعظ و نصیحت کے قبول کی استعداد ہی ضائع ہو گئی ہے، سچ ہے

تہیدستان قسمت را چہ سود از رہبر کامل کہ خضر از آب حیوان تشنہ می آرد سکندر را

اور مجلسِ میلاد" ختم ہوگئی،

سفر میں عموماً اور سفرِ حج میں خصوصاً لوگوں کا مزاج چڑچڑا ہو جاتا ہے، مگر میں نے دیکھا کہ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو حاجیوں کی بیجا حرکتوں، غلط شکایتوں اور احتجاجی نعروں کے باوجود کبھی غصہ نہ آیا، بلکہ جب کبھی میں تند و تیز لہجہ میں جواب دیتا، تو سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ آہستہ سے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر فرماتے

"سراپا محبت و عنایت والے کے دربار سے ابھی نہ آپ آرہے ہیں"

مقلہ کے کچھ عرب جہاز پر ساتھ تھے، اور اپنی سیٹ کے پاس ہی کھانا پکاتے تھے، جہاز پر اسٹوڈ جلا کر کھانا پکانا منع ہے، مگر وہ نہ کپتان کا حکم مانتے تھے اور نہ میری ڈانٹ سنتے تھے، میں نے سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کہا ___ آپ ان لوگوں کو ڈانٹئے اور کہہ دیجئے کہ اگر کپتان کا حکم نہیں مانوگے، تو سزا کردی جائے گی، ___ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ آپ چوکتے ہیں، وہ تو نہ کہوں گا، مگر سمجھا دوں گا، غالباً مان جائیں گے، ___ چنانچہ میرے ساتھ ان عربوں کے پاس تشریف لے گئے، اور دو چار جملے عربی میں نہایت نرمی اور محبت سے ان سے کہے، کہنا تھا کہ اُن لوگوں نے اسٹوڈ گل کردیا، اور کھانا پکانے کا سامان اس جگہ سے اٹھا لے گئے، جہاں جانے سے پہلے وہ انکار کر چکے تھے، میں نے سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ آپ کی زبان میں بلا کا اثر ہے، ___ ارشاد ہوا کہ ___ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی پر غصہ نہیں فرمایا، ہم لوگوں پر اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرض ہے، درشتی و نرمی دونوں مفید ہیں، مگر نرمی زیادہ کارآمد ہے،

سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ خود سے کوئی دینی، شرعی یا تاریخی مسئلہ نہیں چھیڑتے تھے، جب میں خود کچھ پوچھتا تو مختصر جملوں میں جواب باصواب دیدیتے، اور زیادہ تفصیلی گفتگو نہ فرماتے، ___ ایک دن میں نے عرض کیا ___ حج کے مقبول ہونے کی کوئی ایسی علامت بھی ہے جو ہم عامیوں کی سمجھ میں آجائے ___ فرمایا ___ اگر آپ کی زندگی کا لاحق دورِ سابق سے بہتر ہو جائے تو سمجھئے کہ حج مقبول ہوگیا

علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم

از

جناب مالک رام صاحب ایم۔اے

آج سے رُبع صدی قبل کم و بیش ۱۹۲۹ء کی بات ہے، یادش بخیر! میری طالب علمی کا زمانہ تھا، مین گورنمنٹ کالج لاہور مین پڑھتا تھا، جب علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کی کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" وہان پہنچی، چونکہ موضوع میرے مذاق کے مطابق تھا، مین نے اسے شوق کے ہاتھون لیا، اور عقیدت کی نظر سے پڑھا، اور جب پڑھ چکنے کے بعد کتاب ہاتھ سے رکھی، تو اس حسرت کے ساتھ کہ کاش یہ ابھی اور لمبی ہوتی، کتاب کی خوبی اور مصنف کی کاوش اور دیدہ ریزی کا اندازہ کچھ اس سے لگایا جاسکتا ہے، جب معلوم ہو کہ یہ آج تک اردو ہی مین نہین بلکہ دوسری زبانون مین بھی اپنے موضوع پر اکیلی کتاب ہے، لیکن مجھے یہان اس کتاب پر تبصرہ لکھنا منظور نہین،

اس مین مصنف مرحوم نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ہندوستان کی تاریخ لکھنے والون نے جتنی توجہ فارسی ماخذون پر کی ہے، اتنی ہی عربی سفرنامون اور تاریخ و جغرافیہ کی کتابون سے بے اعتنائی برتی ہے، حالانکہ یہ قیمتی معلومات کا خزانہ ہین، اور اُن سے کماحقہ استفادہ کئے بغیر ہمارے ملک کی تاریخ مکمل ہو ہی نہین سکتی،

خدا انھین خوش رکھے، میرے ایک ہم سبق اور عزیز دوست فیروز دین بھٹی تھے، خدا معلوم

جب جہاز بندرگاہ میں پہنچ گیا تو سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے رخصت ہونے کے لئے اُن کے کیبن میں حاضر ہوا، اور درخواست کی کہ جس کتابچہ کا نام آپ نے "اقوالِ اشرف" تجویز فرمایا ہے، اس کی تزئین کے لئے سوانحِ حیات محیّ الملّت مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھکر بھیجدیئے جائیں — ارشاد ہوا کہ انشاء اللہ تعالیٰ بہ شرطِ یاد ضرور بھیج دوں گا، آپ تصنیفاتِ حکیم الامت کا مطالعہ جاری رکھیئے، اچھا شوق ہے۔ تھوڑے دنوں کے بعد یاددہانی کی تو سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کراچی سے سوانحِ حیات لکھ کر میرے پاس بھیج دیئے، اور میں نے اقوالِ اشرف میں اُسے شامل کر دیا۔

سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے رخصت ہوتے وقت درخواست کی کہ میرے حالِ زار و زبوں کے پیشِ نظر مجھ پر خاص توجہ فرمائی جائے، اور عرض کیا کہ

خورشید عمر بر سرِ دیوار و خفتہ ایم — فریاد از درازیِ خوابِ گرانِ ما

جواب ملا — جدّ و جہد جاری رہے، سعی محمود ہمیشہ مشکور ہوتی ہے۔ اس کے بعد حکم ہوا کہ — جایئے، سامان کی نگرانی کیجئے، سلام عرض کیا اور چلا آیا۔

ع حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد

غلطیاں چھاپا۔ میں ان دنوں دہلی میں تھا۔ ایک دن میں جناب نواب سراج الدین احمد خاں سائل مرحوم کے مکان پر گیا، تو یہ رسالہ اُن کی بیٹھک میں پڑا مل گیا۔ میں اسے اٹھا لایا۔ اب یہ اتنے دن کی بات ہے کہ یقینی طور پر کچھ کہہ نہیں سکتا، تاہم اتنا یاد پڑتا ہے کہ اس میں سیرۃ النبی میں نقل کردہ آیات قرآنی کے ترجموں کی بعض غلطیاں مصنف نے اپنے نزدیک دکھائی تھیں۔ مولانا نے غالباً دسمبر ۱۹۳۶ء کے معارف کے شذرات میں اس کا اس طرح جائزہ لیا، جس سے مترشح ہوتا تھا کہ اُن کے خیال میں یہ رسالہ نہ صرف جناب امداد صابری نے کسی اور صاحب کے کہنے پر لکھا ہے، بلکہ یہ غالباً ان کا لکھا ہوا بھی نہیں ہے، اور انھوں نے کسی اور سے لکھوا کے اسے اپنے نام سے شائع کر دیا ہے۔ اس پر صابری صاحب نے ازالہ حیثیت عرفی اور ہتک عزت اور ہرجانے کا دعویٰ کر دیا۔

مرحوم سے میری پہلی ملاقات اسی سلسلہ میں ہوئی۔ وہ اس مقدمے میں پیشی کے لئے دہلی آئے، تو حسب معمول جامعہ ملیہ (قرول باغ) میں بھی تشریف لائے۔ ان دنوں میرا بھی اسی قرب وجوار میں قیام تھا، یہیں ایک شام میں بھائی حامد علی خاں صاحب کے مکان پر اُن سے ملا۔ نسبتہً چھوٹا قد، آفتابی چہرہ، بڑی بڑی تیز آنکھیں، کشادہ اونچی پیشانی، کسی قدر لمبی ناک، جو پھننگ کے قریب قدرے موٹی ہو گئی تھی۔ "قصّ الشارب اعفاء اللحیٰ" کا مصداق چھوٹی مونچھیں، اور گھنی کھچڑی داڑھی، جو بہت لمبی نہیں تھی، اور جس میں سپید بال زیادہ تھے، اور سیاہ کم، صاف ستھرا، کھلتا رنگ، گلے میں شیروانی نما بند گلے کا کوٹ، جس کی دائیں طرف کی جیب سے گھڑی کی زنجیر لٹک رہی تھی، اور دوسری طرف لکھنے کا قلم نظر آرہا تھا، نیچے سپید پاجامہ، اُور سر پر عمامہ، جس کا شملہ پیچھے سے اٹھا کر خاص طریقے سے اڑس رکھا تھا، یہ تھا اُن کا حلیہ، میں یہ الفاظ لکھ رہا ہوں اور اُن کی صورت میری آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے۔

جب مجھے اس مقدمے کی روداد معلوم ہوئی، تو میں نے پیش کش کی کہ اگر اجازت ہو تو میں نواب سائل صاحب کے ذریعہ صلح صفائی کی کوشش کروں، اس پر انھوں نے رضا مندی کا اظہار کیا، میں نے

آج کل کہاں ہیں، میری عربی کی واقفیت تو شد بد سے زیادہ نہیں تھی لیکن وہ کم از کم مجھ سے زیادہ جانتے تھے، بی اے میں ان کا اختیاری مضمون عربی رہا تھا، ہم دونوں نے مشورہ کر کے فیصلہ کیا کہ اگر ممکن ہو تو یہ کام ضرور کرنا چاہیے، ارادہ یہ تھا کہ جس طرح ایلیٹ نے مختلف فارسی تاریخوں کے متعلقہ حصوں کا انگریزی میں ترجمہ کر دیا ہے، اسی طرح عربی ماخذوں کو اردو میں منتقل کر دیا جائے، چنانچہ میں نے ایک خط مرحوم کی خدمت میں لکھا کہ میں نے آپ کی کتاب پڑھی ہے، اور یہ ہمارا ارادہ ہے۔ مہربانی ہوگی اگر اس معاملے میں ہمیں اپنی رہنمائی سے مستفید کریں، اور سب سے پہلی یہ بات کہ ان کتابوں کی فہرست لکھیں، جو آپ کے خیال میں ترجمہ کرنے کے لائق ہیں، فوراً جواب آیا، اس میں بیس ایک کتابوں کی فہرست تھی، اس پر میں بازار سے بلاذری کی فتوح البلدان کا ایک نسخہ خرید لایا، اور ہم نے اس کے ہندوستان سے متعلق حصے کا ترجمہ شروع کر دیا، اسی دوران میں سلیمان تاجر کا سفرنامہ جو نسبتہً مختصر چیز ہے، میرے ہاتھ لگ گیا، اور میں نے جلد ہی سے اس کا ترجمہ بھی کر ڈالا لیکن افسوس کہ یہ مفید کام ہماری خواہش کے مطابق جاری نہ رہ سکا، پہلے تو ہماری تعلیمی مشغولیتوں کے باعث یہ بہت آہستہ آہستہ ہوتا رہا۔ پھر جب تعلیم سے فارغ ہوئے، تو غم روز گار نے وہ رہی سہی عافیت بھی نہ چھوڑی، وہ جگ ٹوٹ گیا، بھٹی صاحب کہیں اور میں کہیں، اور اس کے بعد آج تک اس موضوع کے دیکھنے کا موقع نہیں ملا،

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان، لیکن پھر بھی کم نکلے

لیکن حسرتوں کے گنوانے سے فائدہ، ان کی فہرست بہت طولانی ہے، یہاں اس حکایت کے بیان کرنے سے مقصود یہ بتانا تھا کہ مرحوم سے میری واقفیت کی تقریب کیسے پیدا ہوئی، بہرحال اس کے بعد خط و کتابت کا سلسلہ قائم ہو گیا،

۱۹۳۶ء میں جناب امداد صابری صاحب دہلوی نے ایک رسالہ "علامہ سید سلیمان ندوی کی قرآنی

اس کے کچھ دن بعد میں نے عورت اور اسلامی تعلیم لکھی، یہ اتنی بڑی جسارت تھی کہ میں آج بھی بعض اوقات اپنے آپ پر تعجب کرتا ہوں، موضوع نہ صرف اسلامی، بلکہ خالص علمی اور فقہی بھی، مجھے بجا طور پر اندیشہ تھا کہ کم از کم علامۃ المسلمین اسے دخل در معقولات سے زیادہ وقعت نہیں دیں گے لیکن لکھ ڈالنے کے بعد اُسے ضائع کرنا بھی مشکل تھا، میں نے سوچا کہ اس خسارے کے سودے میں نفع حاصل کرنے کی ایک ہی صورت ہو کہ اُسے چھپوا کر بھیجا جائے، چنانچہ میں نے اُن سے ایک تو اس پر نظرِ ثانی کرنے کی درخواست کی، اور دوسرے مقدمہ لکھنے کی، انھوں نے لکھا کہ میں وعدہ نہیں کرتا، مضمون بھیج دیں، تو دیکھ کر بتاؤں، جب مسودہ ان کے پاس پہنچا، تو انھوں نے میری توقع سے بہت زیادہ اس کی تعریف فرمائی لیکن اتنا اضافہ کیا کہ مجھے تمھارے بعض خیالات سے اختلاف ہے، ظاہر ہے کہ اس صورت میں مقدمہ لکھنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا، انھوں نے یہ نہیں لکھا تھا کہ انھیں کون سے مقامات پر مجھ سے اختلاف ہے، جب میں نے پوچھا تو فرمایا کہ لکھنے میں خواہ مخواہ طوالت ہو جائے گی، کبھی موقع ملے تو ذاتی ملاقات کے ذریعہ انھیں دور کیا جا سکتا ہے، اس کے علاوہ مجھے یونہی سا خیال ہوتا ہے کہ انھیں یہ بھی شبہہ تھا کہ میں نے اسے دہلی کے ایک مشہور اہلِ قرآن عالم سے مشورہ کرنے کے بعد لکھا ہے، حالانکہ یہ ٹھیک نہیں میں نے جو کچھ لکھا تھا بالکل اپنے ذاتی مطالعہ کے نتیجے میں لکھا تھا، بہرحال چونکہ اس کے تھوڑی ہی مدت بعد میں ملک سے باہر چلا گیا، اس لئے معاملہ وہیں پر ختم ہو گیا، نہ میں اُن سے مل سکا، اس گفتگو کی نوبت آئی، یہ مسودہ بہت دن تک اُن کے پاس پڑا رہا، اور آخر انھوں نے اُسے ۱۹۴۶ء میں میرے ایک دوست کے پاس لاہور بھیج دیا،

اس دوران میں خود مجھے بھی غور و فکر کا موقع ملا، پہلے میں نے پردہ کی بحث میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ منہ چھپانا، اسلامی پردے میں شامل نہیں، لیکن بعد میں مزید مطالعے اور قرآن و حدیث پر زیادہ غور کرنے پر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ منہ بھی اس حکم میں شامل ہے، اور بھی دو ایک جگہ خفیف سی تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوئی، چنانچہ میں نے نہ صرف یہ مقام ہی بدل ڈالے، بلکہ پورا مضمون نئے سرے سے دوبارہ

نواب صاحب مرحوم سے مل کر طے کیا کہ صابری صاحب سے ملنا چاہیئے لیکن اگلی صبح اُن کے ہاں جانے سے پہلے مین پھر مرحوم کی خدمت مین حاضر ہوا، اور اُن سے دریافت کیا کہ آپ کن شرائط پر صلح کرنے کو تیار ہون گے، کیونکہ مین نے خیال کیا کہ فریق ثانی سے بات چیت کرنے سے پہلے مجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ مین اُن کی طرف سے کس حد تک جانے کا مجاز ہون،

جاڑون کے دن تھے، مین بھی آٹھ ساڑھے آٹھ بجے صبح کے وقت اُن کے پاس پہنچا، وہ جناب سید مرتضی علی صاحب کے مکان پر اُترے ہوئے تھے، جب مین نے اطلاع کرائی ہے؛ تو وہ ناشتہ کرکے باہر برآمدے مین تشریف لاچکے تھے، بہت لطف اور مہربانی سے پیش آئے، علیک سلیک کے بعد پہلے میرے متعلق دو چار باتین ہوئین، لیکن چونکہ وقت تنگ تھا، اس لئے مین زیادہ دیر ٹھہر نہین سکا، میرے پوچھنے پر فرمایا کہ یہ مقدمہ محض غلط فہمی کی بنا پر دائر کیا گیا ہے، مین نے جو کچھ لکھا تھا، اس سے ہرگز میرا یہ منشا نہین تھا کہ کسی طرح جناب امداد صابری صاحب کی ہتک یا دل شکنی ہو، وہ اگر مقدمہ واپس لے لین، تو مین مناسب الفاظ معارف مین شائع کردون گا، تاکہ ان کا ملال دور ہوجائے، خود مجھے بھی یقین تھا کہ معارف کے بناے دعوی شذرات سے صابری صاحب کی مخالفت مقصود نہین تھی، بلکہ مرحوم اس سے صرف یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ

ع کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری مین

بہرحال اس وقت انھون نے جو کچھ مجھ سے کہا، اس سے میرا اطمینان ہوگیا، اور اس کے بعد سائل صاحب اور مین مدعی کے پاس پہنچے،

بقیہ حالات سب کو معلوم ہی ہین، فریقین نے راضی نامہ داخل کردیا، اور مقدمہ واپس لے لیا گیا، مجھے اس سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ اس بہانہ میرا گذشتہ چھ سات برس کا غائبانہ تعلق ذاتی واقفیت مین تبدیل ہوگیا، اور خط وکتابت مین بھی زیادہ وباقاعدگی پیدا ہوگئی،

ترکیبون کی بھرمارست پڑھنے والے کا سر جھکرانے لگتا ہے، غیر ضروری تکرار اور طول نویسی اس پر مستزاد، اور ان سب سے بڑھکر بسا اوقات اپنے طرز استدلال، اور متقدمین کی ہر رطب و یابس تحریر کی صحت پر اصرار، غرض کہ ان سب باتون کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کتابین ایک خاص حلقے مین محدود ہو کے رہ گئین، اور عام پڑھے لکھے ان سے استفادہ کرنے سے محروم رہ گئے، ظاہر ہے کہ ایسی صورت مین علم و ادب کی تاریخ لکھنے والے ان کا ذکر کیون کرنے لگے تھے،

خدا مغفرت کرے مولانا شبلی نعمانی مرحوم کی، سب سے پہلے انھون نے اس بھول بھلیان سے نکلنے کی راہ دکھلائی، انھون نے خالص مذہبی اور علمی مضمونون پر کتابین اور مقالے لکھے، اور ایسی دلکش اور شستہ و رفتہ زبان مین کہ اس مین شیر و شکر کی حلاوت محسوس ہونے لگی، نہ صرف یہی، بلکہ یہ واقعہ ہے کہ اُن سے پہلے اردو مین صحیح علمی تحقیق بھی تقریباً مفقود تھی، اس میدان مین بھی اولیت کا سہرا انہی کے سر ہے، انھون نے مختلف اسلامی اور تاریخی موضوعات پر اپنے زندۂ جاوید مضامین لکھے، ہر طرف سے اس بدعتِ حسنہ پر آفرین اور ہل من مزید کا نعرہ بلند ہوا، اس سے دوسرے اصحابِ قلم کو بھی توجہ اور جرأت ہوئی، چنانچہ اُن کے زمانے مین بعض صحاب نے اُن کے تتبع مین کتابین لکھین، اور ان کے بعد دوسرون کے علاوہ خود اُن کے تربیت یافتہ تلامذہ نے اس مین جو اضافہ کیا ہے، وہ اردو کا مایۂ ناز سرمایہ ہے، اس گروہ مین علامہ مرحوم کی ذات رئیس الطائفہ کی حیثیت رکھتی تھی، اگر انھون نے اپنی عمر بھر مین صرف سیرۃ النبی ہی کی تکمیل کی ہوتی، تو یہی اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ تاریخ علم و ادب مین ان کا نام زندہ رکھنے کو کافی تھا، لیکن انھون نے اس کے علاوہ ہمین خطباتِ مدراس دیئے، جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر بالکل اچھوتے انداز مین روشنی ڈالتے ہین، پھر انھون نے جو تحقیقی کتابین ـــــ ارض القرآن اور عرب و ہند کے تعلقات اور عربون کی جہاز رانی ـــــ لکھی ہین، وہ ہماری زبان کی بہترین کتابون مین شمار ہونے کے لائق ہین، اسی طرح سوانحعمریون مین حیاتِ امام مالکؒ، سیرۃ عائشہؓ، خیام، حیاتِ شبلی، اپنے اپنے موضوع پر حرفِ آخر کا حکم رکھتی ہین، حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ بنیادی طور پر ان کی تعلیم بھی سراسر مذہبی تھی لیکن انھون نے اپنے مطالعہ کو اسی حد تک محدود نہین رکھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اسلوبِ فکر مین تنوع پیدا

لکھ کے اُسے شائع کر دیا، جب یہ مطبوعہ نسخہ ان کی خدمت میں پہنچا، تو انھوں نے اُس کی تعریف فرمائی،

اس تمام زمانے میں میری ان سے خط و کتابت رہی، وہ خط لکھنے میں ذرا سُست تھے لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ دیر سویر انھوں نے خط کا جواب نہ دیا ہو، مجھے اپنی ہیچ میرزی اور ہیچ مدانی کا پورا احساس ہے، لیکن جانے کیوں، اس کے باوجود میں بزرگوں کی خدمت میں ہمیشہ سے بہت بے باک رہا ہوں، اور کبھی الٹی سیدھی بات کہنے میں شرم محسوس نہیں کرتا، پھر اس پر بھی خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ وہ اس پر طرح دیتے ہیں اور چشم نمائی کی جگہ چشم پوشی فرماتے ہیں، حضرت علامہ مرحوم سے بھی میرا رویہ کچھ اس سے مختلف نہیں تھا، میں اُن کی خدمت میں بھی گستاخ تھا، جو جی میں آتی، بے جھجک لکھ دیتا، لیکن یہ اُن کی ذرہ نوازی تھی کہ وہ کبھی ماتھے پر بل نہیں لائے، لطف فرماتے، میرے لکھے سے درگذر کرتے، اور جواب دیتے،

افسوس کہ ان کے تمام مکاتیب محفوظ نہیں رہے، تقسیم کے پہلے کے بیشتر خطوط لاہور میں رہ گئے، کچھ میرے مختلف ممالک کے سفروں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل مکانی کرتے ہوئے کھو گئے، گذشتہ چند برس میں جو خط آئے تھے، ان میں سے جو اس وقت میرے پاس موجود ہیں، انھیں ضمیمہ میں درج کر رہا ہوں تاکہ کم از کم یہ ضائع ہونے سے بچ جائیں[1]، بعض جگہ تلمیح کو واضح کرنے کے لئے میں نے حاشیہ میں چند نقطے لکھ دیئے ہیں،

اردو میں مذہبی موضوعات پر لکھنے والوں کی کمی نہیں رہی، اُن میں سے بعض حضرات کی مصنفات کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے لیکن اس کے باوجود اردو زبان کی تاریخ میں کہیں ان کا نام نہیں ملتا، اس کے دو سبب ہیں، اوّل نفسِ موضوع، اور دوسرا اسے پیش کرنے کا طریقہ، موضوع بالعموم عام لوگوں کی دلچسپی کا نہیں ہوتا، بنیادی مذہبی عقائد کو تو رہنے دیجئے کہ ان میں کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں لیکن جہاں موضوع میں وسعت پیدا ہو سکتی ہے، اور یہ اپنوں کے علاوہ بیگانوں کے لئے بھی قابلِ مطالعہ اور کشش کا باعث ہو سکتا ہے، وہاں بھی بہت کم ایسا اتفاق ہوا ہے کہ اُن میں سے کوئی کتاب زبان و بیان کے پہلو سے بھی معیاری رہی ہو، یہ اللہ والے لوگ اس بارے میں الا ماشاء اللہ عموماً بے نیاز واقع ہوئے ہیں، مشکل اور نامانوس الفاظ، ...

---

[1] معارف: جگہ کی تنگی کی وجہ سے یہ خطوط شائع نہیں کئے گئے،

علالت سے وفات تک

علامہ سید سلیمان ندوی

از

جناب سید ابو عاصم صاحب ایڈوکیٹ کراچی

"یہ مضمون ریاض کراچی کے سلیمان نمبر میں شائع ہوا تھا، اُس کے بعض حصے حذف کر کے جن کا تعلق علالت و وفات کے حالات سے نہیں ہے نقل کیا جاتا ہے" "م"

دم سرد ہے آہ پُر آ ہ ہے تسلسل حوادث کا جانکاہ ہے

پہلی مرتبہ ۱۹۴۵ء میں مجھے اطلاع ملی کہ چچا جان کی طبیعت ناساز ہے، سیدھا اعظم گڈھ پہنچا، بیچ کا کمرہ حسب قاعدہ فرش و قالین سے مزین ہے، مسہری پر چچا جان لیٹے ہیں، سب عزیز و اقارب پہنچ چکے تھے، مجھے دیکھا مسکرا کر فرمایا،

ع کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو

علالت کی نوعیت یہ معلوم ہوئی کہ سینہ میں شدید درد اٹھا جس نے کئی رات مسلسل سونے نہیں دیا، ڈاکٹر حفیظ صاحب کا علاج تھا، اُن کی تجویز تھی کہ قلبی شکایت ہے، فوراً بمبئی جا کر علاج ہو مگر ڈاکٹر حفیظ صاحب ہی کے علاج سے جب افاقہ ہو گیا تو مزید جانچ نہ ہو سکی،"

اسی سال جاڑے دن میں راقم کے یہاں کبھی کبھی تشریف لاتے، رات کا وقت تھا کہ یک بیک تنفس کی

ہوگیا، اور انھون نے اپنے گرامی قدر استاذ کی پیروی مین ہماری زبان کو اپنی گوناگون تصنیفات سے مالا مال کردیا، اُن کی ہمہ گیری اور جامعیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ، جغرافیہ، سیرت، ادب، تنقید، شعر، سفرنامہ، کوئی موضوع اُن کے افادات سے محروم نہین رہا، ان مین سے ہر ایک پر انھون نے معیاری کتابین لکھی ہین، جو نہ صرف معلومات کا خزانہ ہین، بلکہ خیال انگیز بھی، اور مزید کام کرنے والون کیلئے مشعل راہ کا کام دے سکتی ہین۔

جو جگہ خالی ہوئی ہے، وہ تو اب خالی ہی رہے گی، اس سے پہلے کس کی پُر ہوئی ہے جو اُن کی ہوگی، لیکن ان کے اخلاف اتنا تو کر سکتے ہین، کہ جو شمع انھون نے جلائی تھی، اگر وہ اس کی روشنی مین اضافہ نہین کر سکتے، تو کم از کم اس مین جان لڑا دین، کہ اس کی تابناکی مین کمی نہ آنے پائے، اور سچ تو یہ ہے کہ یہ ان کا اپنے آپ پر احسان ہوگا کہ اس بہانے ان کا اپنا نام زندہ جاوید ہو جائے گا، ورنہ مرنے والے کے کارنامے تو ایسے ہین کہ اگر کوئی انھین بھلانا بھی چاہے تو وہ بھلائے نہین جا سکتے،

بارے دنیا مین رہو، غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کرکے چلو، یان کہ بہت یاد رہو

یہاں بلانے کے متمنی تھے لیکن بمبئی کے مشہور مخیر تاجر بھائی عزیز صاحب کی بے پناہ محبت سب پر غالب آئی کسی کو سوچنے کا موقع دیئے بغیر وہ اُن کو کرسی پر بٹھا کر اٹھا لائے، اور اپنی گاڑی میں بٹھایا، اپنے گھر لے آئے جس خلوص محبت دلدہی سے انھوں نے تیمارداری کی ہے، حق یہ ہے کہ اس نے بہت سے قریبی عزیزوں کو بھی شرمندہ کردیا ڈاکٹروں کی تشخیص یہ ہوئی کہ دوسری شکایتوں کے ساتھ دل بھی بڑھ گیا ہے لیکن انھوں نے اس کو کوئی اہمیت نہیں دی، بلکہ یہی کہا کہ اس عمر میں عموماً دل بڑھ جایا کرتا ہے،

اسی زمانہ میں پاکستان آنے کی خبر گرم ہو چکی تھی، ہندوستان کے متعدد اخبار لکھ رہے تھے کہ وہ ہجرت کرنے والے ہیں، حالانکہ حقیقت اس وقت صرف اس قدر تھی کہ یہاں سے دعوت ضرور دی گئی تھی، مگر انھوں نے اب تک قبول نہیں فرمائی تھی بلکہ مشکیش کی مزید تشریح چاہی تھی، وہ بستر پر بیمار تھے، لوگ چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے، اتنے میں ایک اخبار کے نامہ نگار صاحب تشریف لائے اور انھوں نے سوال کیا کیا آپ پاکستان تشریف لیجا رہے ہیں، اسکے جواب میں انھوں نے صرف یہ شعر پڑھا،

رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے

نامہ نگار صاحب تو اسی شعر کا مزہ لیتے ہوئے رخصت ہو گئے، جب صحت ہو گئی تو وہ بھوپال تشریف لے گئے، وہاں سے سبکدوش ہو کر لکھنؤ اعظم گڈھ اور کانپور میں چند مہینے قیام رہا،

میں ۱۹۴۸ء کے اوائل ہی میں کراچی آ گیا تھا، اُن کے یہاں آنے سے پہلے ایک مرتبہ اُن کے پاس بھوپال اور والدہ کے انتقال پر وطن اور بھی گیا، اُن کو پاکستان کا مشتاق اور دعاگو پایا، مگر آنے کے متعلق مجھے یقین نہیں تھا ۱۳ رجون ۱۹۵۰ء کی صبح کو میں نے اخبار میں یک بیک یہ خبر پڑھی کہ چچا جان لاہور تشریف لے آئے ہیں، اور ۱۴ رجون کو کراچی تشریف لانے والے ہیں، ہم لوگ کینٹ اسٹیشن گئے، اوران کو ڈاکٹر منزل لائے، ڈاکٹر منزل خواجہ شہاب الدین جوان دنوں وزیر داخلہ تھے، اُن کی عنایت خاص کی وجہ سے مجھے پہلے ہی مل چکا تھا، وہ ایک

تکلیف شروع ہوئی، مگر انش وغیرہ سے فوراً ہی یہ تکلیف جاتی رہی، اُس کے بعد یہ شکایت کبھی کبھی ہو جاتی تھی، اور معمولی ہومیوپیتھی دواؤن سے چلی جاتی تھی، اس وقت اس کی تشخیص نہ ہو سکی کہ اس کی نوعیت کیا ہے، ہمیشہ یہی خیال رہا کہ حلق کی خرابی ہے، اور سانس کی نالی مین بلغم پھنس جاتا ہے جس سے یہ تکلیف ہو جاتی ہے،

اتفاق سے اسی زمانہ مین بھوپال اور حیدرآباد سے بلانے کی گفتگو جاری تھی، حیدرآباد مین اگرچہ تنخواہ زیادہ تھی لیکن بھوپال سے ایک تو شعیب قریشی صاحب مدظلہ کا اصرار تھا، دوسری طرف بقول شعیب صاحب قاضی ریاست کا عہدہ تو ان کو اپنی طرف متوجہ نہ کرسکا لیکن تعلیم عربی کی اصلاح کی خدمت کے موقع کو وہ انکار نہ کرسکے، وہ بھوپال مین قاضی القضاۃ اور امیر جامعہ احمدیہ کی حیثیت سے بلائے گئے تھے، اور بالآخر جولائی ۱۹۴۶ء مین وہ بھوپال تشریف لے گئے، اور ۱۹۴۹ء اکتوبر تک مسلسل اُن کا قیام وہان رہا، اور صحت اچھی رہی، کچھ لوگون کو اُن کے دارالمصنفین چھوڑنے پر اعتراض تھا، اُن کی مظلومیت کی یہ انتہا ہے کہ خود مظلوم مورد الزام بنایا جارہا ہے، اس کے باوجود اس نے اپنی زندگی مین کبھی بھی کسی کو بُرا کہنا تو بڑی بات ہے کسی کا نام بھی اپنی زبان پر آنے نہین دیا،

ع کبھی فرصت سے سُن لینا بڑی ہے داستان میری

یون تو وہ دو مرتبہ حرمین شریفین کی زیارت کرچکے تھے لیکن اُن کے دل مین یہ بات کھٹکتی تھی کہ وہ دونون سفر سیاسی تھے، اس سے پہلے ۱۹۲۴ء اور پھر ۱۹۲۶ء مین وفد حجاز مین ہندی مسلمانون کے نمائندہ بن کر تشریف لے گئے تھے، کون کہہ سکتا ہے کہ وہ بھی رضائے الٰہی کے لئے نہ تھے لیکن اللہ کے بندے اور رسول کے عاشق نے ان کے دربار مین صرف انہی کا نام لے کر حاضری مناسب سمجھی، چنانچہ ۱۹۴۹ء اکتوبر مین حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے،

واپسی شاید دسمبر مین ہوئی، راستہ ہی مین طبیعت خراب ہوگئی، بمبئی مین یون تو بہت سے لوگ اپنا

لیکن آپ مجھے سعادت اور مسرت سے کیون محروم کرتے ہین حقیقت یہی تھی کہ یہ اُن کے دل کی آواز تھی' اس مین ذرا بھی رسمی تکلف نہ تھا، وہ باوجود بے انتہا مشغول ہونے کے خود تشریف لاتے، اور انجکشن دیتے، اُن کے علاج اور توجہ سے وہ کچھ صحت مند ہوگئے، یہ غالباً جنوری ۱۹۵۲ء کی بات ہے،

۱۹۵۲ء کی گرمیون مین بنیادی کمیٹی کا اجلاس نتھیا گلی مین طے پایا، چچا جان بھی تشریف لے گئے، آٹھ ہزار فٹ کی بلندی اُن کے قلب و اعصاب کے لئے ناقابلِ برداشت ہوگئی، اور ان پر تنفس کا شدید دورہ پڑا، فوراً ڈاکٹر آئے، انھون نے دیکھا اور کہا کہ خون کا دباؤ بہت بڑھا ہوا ہے، خان عبدالقیوم خان اور میان ممتاز دولتانہ نے اپنے خصوصی اثر سے فوجی اسپتال راولپنڈی پہنچایا، وہان کرنل سرور نے معائنہ کیا، دل کافی بڑھ چکا تھا، اور سب سے بڑی بات یہ تشخیص ہوئی کہ یہ تنفس کی تکلیف بھی قلب ہی کی وجہ سے ہے، وہان سے لاہور تشریف لائے، لاہور کے ایک تجربہ کار ڈاکٹر صاحب نے بھی وہی تشخیص کیا، اور نسخہ تجویز کیا، اور نمک کا سخت پرہیز بتایا، اس کے بعد کراچی تشریف لے آئے، یہان ڈاکٹر رحمان کی طرف رجوع کیا، انھون نے بھی اسی علاج سے اتفاق کیا، اور علاج ہوتا رہا، اور تنفس جاتا رہا، اور بہت دنون تک کوئی شکایت نہین رہی، ہان حکیم محمد نصیر الدین صاحب ندوی نے جو اُن کے شاگرد بھی' شیدائی بھی، معالج خاص بھی، اور محرم درد دل بھی ہین، طاقت کی دوائین ہمیشہ جاری رکھین

فروری ۱۹۵۳ء مین ڈھاکہ مین مجلس تاریخ کی کانفرنس تھی، اس کے صدر منتخب ہوئے، ڈاکٹرون کا مشورہ تھا کہ اتنا طویل سفر نہ فرمائین لیکن نہ مانے اور بذریعہ طیارہ تشریف لے گئے، ڈھاکہ کے خطبۂ صدارت مین ایک تاریخی صداقت کے اظہار کے بعد وہان کے طلبہ نے جو شرمناک سلوک اُن کے ساتھ کیا، وہ سب کو معلوم ہے، ایک نیم جان قلب کے مریض وضعیف کے ساتھ ایسا سلوک انسانیت سے گذری ہوئی بات تھی'

جلسہ کے بعد محبی راحت رضوی صاحب کے یہان چند دن قیام رہا، اور وہان سے کلکتہ تک ہوائی جہاز اور پھر ریل لکھنؤ ہوتے ہوئے دہلی پہنچے، کہتے تھے کہ راہ مین بختیار پور جنکشن (جہان سے ہمارے وطن کی ریل مڑتی ہے) کی طرف بہت دیر تک حسرت بھری نگاہ ڈالتا رہا، پٹنہ جنکشن پر مقامی ندوی حضرات تشریف لے آئے تھے'

خاص ولولہ کے ساتھ تشریف لائے تھے، اُن کی گفتگو مین کتنی امید اور کتنی آرزو جھلکتی تھی،

ڈار منزل جہانگیر روڈ کی ایک شاخ چمن اسٹریٹ پر واقع ہے، یہ ایک پچھم رُخ کا مکان ہے، پھاٹک سے داخل ہوتے ہی سامنے پندرہ فٹ بے آب وگیاہ میدان ہے، اس کے بعد ۱۵ فٹ کا پختہ صحن ہے، اسی سے ملحق تین کمرے سڑک کے رُخ پر ایک سلسلہ سے ہین، پھاٹک کے سامنے کا کمرہ ملاقات کے لئے مقرر ہوا، اس کے بعد بیچ کا کمرہ اُن کی خوابگاہ بنا، اور آخری کمرہ مین میرا قیام تھا، کلفٹن کوارٹرز کے پاس ایک مسجد تھی، لوگون نے اس کا نام جامع مسجد سلیمانیہ رکھنا چاہا، انھون نے اس کو ناپسند کیا لیکن لوگ نہ مانے، آخر وہ اسی نام سے مشہور ہوگئی، وہان روز صبح بعد نماز درس قرآن کا سلسلہ شروع ہوا، اس مرتبہ مین نے ایک بات یہ دیکھی کہ تنفس کا دورہ عموماً رات کو کبھی کبھی پڑ جاتا تھا، ہومیوپیتھی دوا سے فوراً سکون بھی ہوجاتا تھا، یہ تکلیف کھانے کے بعد تقریر کرنے یا کوئی حرکت کرنے سے ہوجاتی تھی، اس لئے ڈاکٹرون کا خیال تھا کہ یہ تکلیف ریاح اور سوءِ ہضم کا فساد ہے، اسی لئے ساری توجہ ریاح اور اصلاح معدہ کی طرف رہی،

ایک مرتبہ مسجد سلیمانیہ مین درس دے رہے تھے، اسی دوران مین اُن کی آواز مدھم ہوتی گئی، اور انھون نے گردن جھکالی، فوراً لوگون نے پکڑ لیا، اور اٹھا کر گاڑی پر گھر لائے، اور ڈاکٹر میجر حسن کو ٹیلیفون کیا، میجر حسن فوراً تشریف لائے، لوگون کو خیال ہوا کہ فالج کا حملہ تھا، میجر حسن صاحب نے معائنہ فرمایا، سب سے پہلے خون کا دباؤ دیکھا، وہ بجائے زیادہ ہونے کے معمول سے بھی کم تھا جس سے اس خیال کی تردید ہوئی، تلوؤن مین تھوڑی سی بے حسی ضرور تھی، چچاجان کو شدت سے انکار تھا کہ ان پر کسی قسم کا حملہ تھا، وہ کہتے تھے رات کو نیند نہین آئی تھی، اسی لئے آنکھ لگ گئی تھی، بہرحال احتیاطی طور پر میجر صاحب نے انجکشن دینے شروع کئے، انھون نے بڑی محبت، خلوص اور شرافت کا ثبوت دیا، جب مین نے فیس پیش کی اور اصرار کیا تو انھون نے سختی سے انکار کیا، اور فرمایا کہ مجھے کمانے کے مواقع توبہت ملین گے

ایک دو دن اسمبلی بھی تشریف لے گئے لیکن گاڑی میں اگلی سیٹ پر سر ٹیک دیا، میں نے بے قرار ہو کر پوچھا کوئی خاص تکلیف ہے؟ فرمایا نہیں لیکن مجھے معلوم ہو رہا تھا کہ گھلتے جا رہے ہیں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں، میری خواہش ہوتی کہ ان کو تکلیف نہ کرنی پڑے، اور اُن کی خواہش ہوتی کہ اُن کے لئے کسی کو تکلیف نہ ہو، میری خواہش ہوتی کہ ڈاکٹر اُن کے پاس آتا لیکن میں ذکر نہیں کرتا، اس لئے کہ مجھے جواب معلوم تھا، وہ فرماتے مرض مجھ کو ہے یا کہ اُن کو، اور پھر جو شخص جتنا کر دے اُس کا احسان ہے، نہ کرے تو اس کی کوئی شکایت نہیں، وہ پوچھتے تم کیسا ڈاکٹر چاہتے ہو، میں کہتا مجھے ایسا ڈاکٹر چاہئے جس کو جب جس وقت بلایا جائے، فوراً آ جائے، خواہ اس کے لئے وہ کوئی فیس لے، وہ مسکرا دیتے، بات ختم ہو جاتی، لیکن دوسرے دن کپڑے پہن کر مجھ سے پہلے گاڑی میں جا کر بیٹھ جاتے، اب میری بے بسی دیکھنے کے قابل ہوتی، میں تھوڑی دیر تذبذب کی حالت میں کھڑا رہتا، نہ کچھ کہہ سکتا، نہ کچھ کر سکتا، شکست کھا کر گاڑی میں بیٹھ جاتا، اور گاڑی چل دیتی،

ساری تکلیفیں خود اٹھائی ان کی فطرت بن چکی تھی، کسی کو اُن کی ذات سے تکلیف نہ ہو، اس کا بڑا خیال رکھتے تھے، اسی لئے ڈاکٹر کو گھر پر بلانے کی مخالفت کرتے تھے، کوئی ڈاکٹر اُن سے فیس نہیں لیتا تھا، اور سب نہایت محبت سے پیش آتے تھے، ڈاکٹر فاروقی سے بالکل عزیزوں جیسے تعلقات تھے، وہ خود بھی اپنی ذات سے بڑے متواضع اور خلیق انسان ہیں ہمارے گھر میں کسی کو کچھ تکلیف ہو، اطلاع سنتے ہی آ جاتے، دیکھنے انجکشن لگانے عثمان صاحب کمپونڈر کو متعین کر دیتے، عثمان صاحب بھی بڑے ہی شریف اور محبت والے آدمی ہیں، ان سب باتوں کے باوجود ان کی خواہش یہی ہوتی کہ کسی کو تکلیف نہ دی جائے۔

ڈاکٹر رحمان کے علاج کو ایک دو ہفتہ ہوا ہو گا کہ ایک دن مختار صاحب نے ٹیلیفون کیا کہ کرنل شاہ سید صاحب کو دیکھنا چاہتے ہیں، کس وقت تشریف لائیں، میں بہت خوش ہوا، کرنل شاہ کے اخلاق کی دل ہی دل میں تعریف کرتا ہوا ابا جان کو مطلع کیا، انھوں نے فرمایا جس وقت جی چاہے تشریف لے آئیں، ان کی عنایت ہو گی، چنانچہ اسی دن گیارہ بجے تشریف لائے اور بہت دیر تک معائنہ کرتے رہے، میں نے

کچھ دن لکھنؤ مین قیام رہا، اعظم گڈھ سے شاہ معین الدین صاحب اور سید صباح الدین صاحب بھی ملنے آئے، ان دونون حضرات کو ان کی ذات سے والہانہ محبت تھی، اس غیر متوقع ملاقات کا ذکر مزہ لے لے کر اپنے خطوط مین مہینون کرتے رہے اور سیر نہ ہونے کا گلہ کرتے رہے، ان حضرات کو کیا معلوم تھا کہ یہ ملاقات اُن کے لئے آخری ثابت ہوگی، اور ع

بوئے گل سیر، ندیدیم و بہار آخر شد

کا مصرعہ ان پر صادق آئے گا،

اپریل ۱۹۵۳ء مین واپس کراچی تشریف لائے، کچھ ہی دنون کے بعد تنفس کا پھر دورہ پڑا، وہی انجکشن دیا گیا، جس سے سکون ہو گیا، اس کے بعد سیاسی ہنگامون کا طوفان اٹھا، بنیادی کمیٹی کا جلسہ علمائے کرام کا اجتماع، کیا کچھ نہ ہوا، منتین کین، خوشامدین کین، روٹھ گیا کہ ان ہنگامون سے آپ علیحدہ رہین،

یان لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب مین
وان ایک خاموشی تری سب کے جواب مین

ایک دن تو مجھ سے چڑھ گئے، وہ دن تھا اور آخری دن، مین نے زبان بند کر لی، میری آنکھون مین آنسو آگئے، میرے انداز کو دیکھ کر وہ سمجھ گئے، اکثر چھیڑا کرتے تاکہ مین کچھ بولون لیکن مین نے طے کر لیا کہ مین ہرگز ان کی گرانی طبع کا باعث نہ ہون گا، اس لئے صرف تعمیل حکم مین نے اپنا فرض بنا لیا، کوئی آتا مین اطلاع کر دیتا، لوگ آتے اور گھنٹون بیٹھے جاتے اور ہر قسم کے موضوع پر لمبی لمبی بحثین ہوتین، دل کڑھتا، اکثر آنکھین رو دیتین، چہرہ متغیر ہو جاتا، پیشانی پر شکن پڑ جاتی لیکن زبان بہرحال بند رہتی،

اگست ۱۹۵۳ء کی کوئی تاریخ تھی کہ زکامی کیفیت محسوس ہوئی، اور کچھ تنفس کی تنگی سی تکلیف بھی، پھر حرارت آگئی یہی ۹۹ - اور ۱۰۰ کے درمیان، ڈاکٹر رحمان کے یہان خود تشریف لے گئے، انھون نے کھانسی کا مکسچر دیدیا، دو چار دن مین بخار اتر گیا، لیکن تنفس کی تکلیف بڑھنے لگی انھین دنون مین فاطمن کا انجکشن دیا گیا تنفس کم ہو گیا

کے علاج کے بعد حالت بظاہر اچھی خاصی معلوم ہونے لگی، اب وہ بستر سے ادھر ادھر چلنے پھرنے لگے، پاخانہ جو ان کے کمرے سے کچھ دور پر تھا، خود سے جانے لگے، اور فرماتے کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر دن کی شدید ہدایت تھی کہ کسی کو ملنے نہ دیا جائے تاکہ دل و دماغ کو مکمل آرام نصیب ہو کسی قسم کی ملی اور سیاسی گفتگو میں حصہ نہ لیں، صرف انہی حضرات کو ملنے دیا جائے جن کی باتوں سے دل خوش ہو، میں نے ڈاکٹر صاحب سے اپنی عاجزی اور بے بسی کا اظہار کیا، اور ان سے استدعا کی کہ آپ خود گزارش گذار کر دیں، چنانچہ ایک دن ڈاکٹر صاحب نے کہنا شروع کیا، کہ آپ نے زندگی میں بہت کام کئے ہیں، اتنی خدمت کی ہے جتنی کم ہی لوگوں نے کی ہوگی، اور ابھی قوم کو آپ کی ضرورت ہے، اس لئے کچھ دنوں قومی، ملی، اور علمی مصروفیتوں سے بالکل علیحدہ ہو جائیے صحت کے بعد انشاء اللہ پھر حصہ لے لیجئے گا، انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا، کبھی مجھے اور کبھی ڈاکٹر صاحب کو دیکھ کر مسکراتے رہے۔

اُن کی علالت کی اطلاع قصداً اخبارات میں نہیں دی تھی، اس لئے کہ لوگوں کا ہجوم بس سے باہر ہو جاتا، اس پر بھی مشتاقوں محبوں، اور مخلصوں کا تانتا لگا رہتا تھا، سمجھدار لوگ صرف دریافت حال کے بعد چلے جاتے تھے، میں لوگوں سے کہہ دیتا تھا کہ ان کا یہ حال ہے، آپ کہیں تو اُن کو مطلع کر دوں، کچھ لوگ کہتے میں اُن کی خیریت پوچھنے آیا ہوں تکلیف دینے نہیں، بعض لوگوں کو اصرار ہوتا کہ آپ میری آمد کی اطلاع کر دیجئے، میں جانتا تھا کہ اگر اطلاع کرائی گئی تو وہ ضرور بلالیں گے، اور پھر کچھ نہ کچھ گفتگو بھی ہوگی، اور موضوع اور عنوان کی کوئی پابندی باقی نہیں رہے گی،

شروع شروع جب لوگوں کو واپس کر دیا گیا، اور انھیں علم ہوا تو بہت خفا ہوئے، اور فرمانے لگے تم لوگ مجھے وزیر اعظم بنا دینا چاہتے ہو، مجھے یہ پابندیاں پسند نہیں ہیں، میرے پاس جو آتا ہے محبت اور خلوص سے آتا ہے کسی غرض سے نہیں آتا ہے کسی کو نہ روکو، چنانچہ جس کی بھی اطلاع کی گئی ضرور بلایا گیا، اور اُن کے جسم ناتواں پر جتنا بھی وہ بار ڈال سکتا تھا، اس کو برداشت کرتے، اور کبھی تکدر کا اظہار نہیں فرماتے،

اُن کی راے پوچھی، انھون نے پورے وقار اور سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا، مین ابھی کوئی راے نہین دیسکتا،
کل اُن کو جناح اسپتال لے آیئے ہین اُن کے قلب کا اکسرے اور کارڈ وگراف لینے کے بعد کوئی فیصلہ کرونگا،
چنانچہ دوسرے دن ٹھیک گیارہ بجے اُن کے دفتر پہنچ گیا، وہ دفتر مین نہین تھے، چچاجان کو دفتر مین بٹھا دیا،
اور ڈاکٹر صاحب کی تلاش مین اسپتال کا رُخ کیا، وہ اسپتال کا چکر لگا کر آ ہی رہے تھے، جیسے ہی مجھے دیکھا،
تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے گلے مین پڑے ہوئے اسٹتھ اسکوپ سے کھیلتے ہوئے دفتر کی طرف تشریف لائے،
اور بڑی تعظیم و تکریم اور تواضع سے پیش آئے، اور دوسرے کمرے مین لے گئے، وہان کارڈ وگراف لیا گیا، اور
پھر وہان سے اپنی گاڑی پر دوسری جگہ گئے، وہان ایکسرے لیا گیا، اور پھر تیسری جگہ خون کی جانچ
کے لئے خون لیا گیا، اور دوسری جانچ مکمل ہوئی،

اتنی دوڑ دھوپ مین سانس کچھ تیز ہو گئی لیکن بڑے حوصلہ اور ہمت سے سارا کام کرتے رہے، گھر پہنچے
تو سب لوگون نے گھیر لیا جیسا کہ ہمیشہ سے قاعدہ تھا جب کبھی وہ باہر سے آتے تھے، تو گھر کے سارے افراد
اُن کے گرد جمع ہو جاتے تھے، لوگ تفصیل جاننا چاہتے تھے لیکن وہ چند جملون مین ساری بات کہہ جاتے تھے جس
سے گھر کے لوگون کو تسلی نہین ہوتی تھی، مزید تفصیل اور استفسار کے جواب مین ان کا ایک نیم تبسم بس تھا، چنانچہ
اسی طرح اُن سے تفصیل کی فرمایش ہوئی، انھون نے میری طرف اشارہ کر دیا اور خود پلنگ پر بیٹھ گئے، اور
زیرلب تبسم کے ساتھ اپنی ساری رُوداد لیٹے لیٹے سنتے رہے،

دوسرے دن شام کو ڈاکٹر صاحب کا ٹیلیفون آیا کہ مین ساری رپٹ لے کر خود آؤن گا، اور دوا اور
علاج تجویز کرون گا، چنانچہ جب وہ تشریف لائے، تو کہا کہ قلب بڑھ گیا ہے، اور اسی کے ساتھ ساتھ قلب
کی کسی شریان مین ایک ایسی گرہ بن گئی ہے جس سے دورانِ خون مین دقت ہوتی ہے اور قلب کو زور
لگانا پڑتا ہے، اور اسی سے تنفس کی تکلیف ہوتی ہے، کم و بیش تشخیص وہی تھی جو سارے اطبا اور ڈاکٹرون
کی تھی، انھون نے ایک ٹکیہ ڈیجاکسن کا اضافہ کیا، کچھ دوائین کھانسی وغیرہ کی بھی دین، دس بارہ دن

کی اجازت دیدیجئے، فرمایا بڑے شوق سے بیچ ہے،

نہ کتابون سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا دین ہوتا ہے بزرگون کی نظر سے پیدا

کچھ دنون کے بعد کراچی کے ایک پروفیسر صاحب تشریف لائے، انھون نے اپنی علمی لیاقت کے متعلق کوئی تحریر چاہی، فرمایا کہ یہ تو ایک قسم کی شہادت ہے، اور شہادت بغیر ذاتی واقفیت کے دینا دیانت کے خلاف ہے، اس کے بعد خاموش ہوگئے، پروفیسر صاحب کے چہرہ پر افسردگی چھاگئی، یہ بھی اُن سے دیکھا نہین گیا، آخر مین اُن سے سوالات شروع کئے، اور وہ جوابات دیتے رہے، اس کے بعد انھون نے پوچھا کہ اس موضوع پر آپنے کون کونسی کتابین پڑھی ہین، ان کا نام بتایئے، جو انھین یاد تھا، بتاتے رہے، اس کے بعد خود عربی، انگریزی، اردو کتابون کا نام لے کر پوچھنا شروع کیا، بیچارے پروفیسر صاحب کو پسینہ آگیا، لیکن انھون نے نہایت صفائی سے جوابات دیئے، جو جانتے تھے اس کو بتایا، جو نہین جانتے تھے اس کا اعتراف کرلیا، اس کے بعد تحریر کا وعدہ فرمایا، پھر خود اس سوال کا جواب دینے لگے، سوال یہ تھا کہ اسلام کے اندر غیر اسلامی عنصر کہان کہان سے اور کب داخل ہوا، وہ گفتگو کررہے تھے، ٹھہر ٹھہر کر جیسا کہ ان کا ہمیشہ کا قاعدہ تھا، لیکن تسلسل کا یہ عالم تھا کہ جیسے بند ٹوٹ چکا ہے اور سیلاب تھمتے نہین تھمتا، اسی سلسلہ مین قدیم وجدید فلسفہ یونانی فلسفہ، اسرائیلیات نیز سارے عالم کے فلسفہ کی تاریخ کی ارتقاء پر سیر حاصل بحث کرتے رہے کہ کس طرح یونانی (Logos) جس سے (Logic) وغیرہ مشتق ہین، کلمہ، کلام، اور پھر علم کلام کی بنا پڑی، اس دن کی ساری گفتگو بڑی ہی پر از معلومات تھی جو الحمدللہ محفوظ کرلی گئی،

مین بار بار کھانے کے لئے کہہ رہا تھا لیکن ان کی بات ہی نہین ختم ہوتی تھی، یہان تک کہ مین نے ان کو اراد ے کرا ٹھایا، اور دوسرے کمرے مین لے جانے لگا، پھر بھی وہ دو ایک بات بولتے ہی جاتے تھے، سانس تیز ہو چکی تھی، پیرون مین خود سے کھڑے ہونے کی طاقت نہین تھی، ہاتھ میرے کاندھے پر تھا، اور مین

کراچی یونیورسٹی کے ایک لائق پروفیسر اسلامی تاریخ کے پروفیسر کے تقرر کے سلسلہ میں اُن سے مشورہ کرنے کے لئے تشریف لائے، انھیں ان کی علالت کا علم نہیں تھا، ملازم کے ذریعہ انھوں نے اطلاع کرائی، فوراً بلا لئے گئے، چچا جان رنج کے ساتھ اس ملک میں علمی فقدان کا ذکر کرنے لگے، اور فرمایا ہمارے پی ایچ ڈی زندگی میں صرف ایک مقالہ لکھتے ہیں، اور ساری عمر اسی کو چومتے چاٹتے رہتے ہیں، حالانکہ پی ایچ ڈی ہونا صرف اس بات کی سند ہے کہ تم تحقیق کرسکتے ہو، محقق نہیں ہو، بعد میں مجھ سے پروفیسر صاحب نے فرمایا کہ علالت کا علم نہیں تھا، ورنہ کبھی تکلیف نہ دیتا، پھر بھی بیچارے پوری گفتگو کئے بغیر ہی اٹھ گئے، لیکن احساس والے لوگ کم ہی آتے،

ایک مرتبہ راجشاہی یونیورسٹی کے ایک لکچرار صاحب تشریف لائے، میں نے اُن کو ان کی حالت بتادی، کہنے لگے کوئی حرج نہیں، میں بھی علیگ ہوں، اس تعلق سے آپ ہی کے پاس تھوڑی دیر بیٹھ جاؤں گا، چنانچہ مجھ سے برادرانہ گفتگو کرتے رہے، اتنے میں چچا جان اندر کے کمرے سے باہر تشریف لے آئے، لکچرار صاحب نے سلام کیا، اور انھیں کے ساتھ صوفہ پر بیٹھ گئے، مزاج پرسی کے بعد انھوں نے وحدۃ الوجود کا مسئلہ چھیڑ دیا، پہلے تو انھوں نے معذرت کی کہ میں اپنی صحت سے مجبور ہوں، لیکن تھوڑی دیر بعد خود اُن سے نہیں رہا گیا، اور تقریباً ایک گھنٹہ تک اس مسئلہ پر روشنی ڈالتے رہے، لکچرار صاحب الجھتے رہے، اور ان کی تسلی نہیں ہو پائی تھی، انھوں نے پھر سوال کیا، فرمانے لگے بھائی! بس اب دم نہیں ہاں اس سلسلہ میں سعدی کا صرف ایک شعر سن لیجئے،

یکے قطرہ باران ز ابرے چکید — خجل شد چو پہنائے دریا بدید
کہ جائے کہ دریاست من نیستم — گر او ہست حقا کہ من نیستم

اس شعر کو سُن کر لکچرار صاحب جھومنے لگے، کہنے لگے کہ ہزاروں مرتبہ اس شعر کو سنا تھا لیکن کبھی اس مطلب کو نہیں سمجھا تھا، اب وحدۃ الوجود کے مسئلہ کو سمجھ گیا، آپ سے صرف ایک گذارش ہے کہ کبھی خط و کتابت

انھون نے ملک کی اقتصادی بدحالی کا بہت ہی پردرد منظر کھینچا، وہ اُن کی بات بڑے غور سے سنتے رہے، جب وہ ختم کر چکے تو فرمانے لگے، مین تو پاکستان کے مستقبل سے مایوس نہین ہون، مشکلات فرد اور ملت کی آزمائش کیلئے ہوتی ہین، اور آزمائش ہی فرد اور قوم کو زندہ رکھتی ہے، مشکلات سے گھبرانا نہین چاہئے، بلکہ مردانہ وار ان کا مقابلہ کرنا چاہئے،

اب انھین جلد جلد دورہ پڑنے لگا تھا، کرنل شاہ کی راے ہوئی کہ اُن کو جناح اسپتال مین داخل کر دین، لیکن اسپتال مین داخل کرنے کے لئے گھر کا کوئی فرد تیار نہین تھا، وہان کے ماحول اور بے بسی سے اور وحشت ہوتی تھی، آخر کرنل شاہ کی راے کے مطابق ڈاکٹر عبدالصمد کانپور والے بھی علاج مین شریک کر لئے گئے، کرنل شاہ اور ڈاکٹر عبدالصمد مین مشورہ ہوا، دونون بالکل متفق تھے، چنانچہ اسی نہج پر علاج ہوتا رہا،

جمعرات یعنی ۱۹ر نومبر ۱۹۵۳ء کے دن وزیر شام ۴ بجے تشریف لائے، اور انھون نے ایک مسئلہ چھیڑ دیا، چچا جان نے گفتگو شروع کی، بار بار کلام پاک سے حوالے دیتے جاتے تھے، جب وہ تشریف لائے تھے مین انجکشن کے لئے قیوم صاحب کو لانے جا رہا تھا، مین ان کو لے کر واپس آیا تو وہ محو گفتگو تھے، حاضرین کی اجازت لے کر بستر پر لیٹ گئے، کمزوری اور ضعف کے سبب سے رگ کی تلاش مین بڑی دقت ہوتی تھی، کبھی کبھی غلط جگہ سوئی چبھ جاتی تھی، تو بڑی تکلیف ہوتی تھی، انتہائی ضبط کے باوجود آہ نکل جاتی تھی، ایک ہاتھ مین ناکامی ہوئی تو دوسرے مین کوشش کی گئی، بارے اس مین کامیابی ہوئی، اس کے بعد وہ اُٹھ بیٹھے، گفتگو کا تار جہان سے ٹوٹا تھا، وہین سے شروع کر دیا، کس کو یقین آ سکتا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جو ابھی دو منٹ قبل درد اور تکلیف سے بے چین تھا، میرا دل کڑھ رہا تھا، لیکن زبان سے بول نہین سکتا تھا، مین قیوم صاحب کو چھوڑ کر جب واپس آیا تو دیکھا کہ گفتگو اب بھی جاری ہے، یہان تک کہ مغرب کا وقت ہو گیا، وزیر شام نے باہر صحن مین نماز پڑھی، اس کے بعد کچھ دیر گفتگو کے بعد وہ رخصت ہوئے، ساری گفتگو عربی مین ہو رہی تھی، مین ان کو گاڑی تک رخصت کرنے گیا، وہ بڑے متحیر اور متاثر تھے،

ان کو اپنے سہارے پر کھڑا کئے ہوئے تھا، صرف زبان اور دماغ میں طاقت موجود تھی، جو آخر وقت تک اسلام اور دین کی خدمت میں مصروف رہی،

بنیادی کمیٹی کی سفارشات پر غور کرنے کے لئے اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا، اسلام ریاستی مذہب ہو، قوم کا مطالبہ تھا، ان کے بیان کا ایک مسودہ اُن کے سامنے پیش کیا گیا، انھوں نے اس کو پڑھا اور رد کر دیا، دوسری مرتبہ جب محترمی راغب احسن صاحب اور مولانا عبدالقدوس بہاری تشریف فرما تھے، انھوں نے خود سے اپنے بیان کی اصلاح کی، اور اخبارات کو بھیجنے کی اجازت دی،

اسلام کے ریاستی مذہب کی تائیدی جلسہ کی صدارت کے لئے انھوں نے پیر غلام مجدد سرہندی کو نامزد کیا، یہاں کے تمام علماء میں وہ پیر صاحب کے خلوص اور جوش جہاد کے بہت معترف تھے، اُن کی ذات پر انھیں بہت بھروسہ تھا،

ایک مرتبہ رات کے گیارہ بجے تھے، ابھی ابھی ان کی آنکھ لگی تھی کہ کسی نے دروازہ پر دستک دی، دروازہ کھولا گیا تو دیکھا ایک مولوی صاحب اپنے ساتھی کے ساتھ ایک بیان پر دستخط لینے کے لئے تشریف لائے ہیں، اُن سے کہا گیا کہ ابھی آنکھ لگی ہے، ان حضرات کا اصرار ہوا کہ جگا دیا جائے، اور ان کی شدید علالت اور ان کی نوعیت بتائی گئی تو بڑی مشکل سے واپس تشریف لے گئے، اس ہنگامہ میں اُن کی آنکھ کھل گئی، فرمانے لگے کہ مجھے صرف یہ بتا دو کہ کون حضرات تشریف لائے تھے؟ اُن کی غرض نہ بتاؤ، جب انھیں نام معلوم ہوا تو ایک دم خاموش ہو گئے، صبح جب ڈان میں اُن حضرات کا بیان دیکھا تو فرمایا کیا اسی لئے آئے تھے؟ دوسرے دن ڈاکٹر عبدالحی صاحب تشریف لائے، تو اُن سے بڑے دکھ کے ساتھ شکایت کی ——————————— ڈاکٹر صاحب نے ندامت سے اس طرح سر جھکا لیا، جیسے انہی سے یہ غلطی ہوئی ہو،

ہمارے ایک عزیز لوہے کے تاجر ہیں، وہ ان سے ملنے کے لئے آئے، اُن سے تجارت کی حالت پوچھی

ملنے آیا، اس کو اپنے پاس بلایا، اور بٹھا کر فرمایا، تم تو محمد علی کی جوانی کی ہو بہو تصویر ہو،

آخری دنون مین اپنے گذرے ہوئے بزرگون اور عزیزون کی یاد بہت آنے لگی تھی، ہم لوگون کو اپنے قریب بلاتے، سب لوگ اُن کے پلنگ کے پاس فرش پر بیٹھ جاتے، وہ اُن روحون کو عجیب انداز سے یاد کرتے، کبھی اُن کے خلوص و محبت کو یاد کرکے بے چین ہو جاتے، کبھی اُن سے متعلق گذرے ہوئے واقعات اُن کو تڑپا دیتے، اُن کی آنکھون مین اکثر محبت کے آنسو جھلکتے دیکھے، دور کے عزیزون مین سے بھی کوئی ملنے آجاتا، تو سب سے پہلے اُس سے اپنا رشتہ بتاتے، پھر خاندانی تعلقات و روابط کے قصے اتنا مزا لے لیکر بیان کرتے کہ سننے والے کی آنکھون کے سامنے ان بیتے ہوئے دنون کا نقشہ پھر جاتا، اور اپنے پچھلے بزرگون کی محبت اور عظمت دل مین جاگزین ہو جاتی،

جمعہ ۲۰ نومبر ۱۹۵۳ء کو اصرار سے غسل کیا، اور مل مل کر بدن کو صاف کراتے رہے، غرض بڑی مکمل صفائی ستھرائی کرائی،

ہفتہ کا دن سکون سے گذر گیا، پچھلے پہر رات کو یک بیک میری آنکھ کھل گئی، کان میں بڑی کا درد بھری ایک آواز آئی، غور سے سُنا تو چچا جان بڑے درد و کرب سے یہ شعر پڑھ رہے تھے،

موت کا ایک دن معیّن ہے نیند کیون رات بھر نہین آتی

مین مضطر ہو گیا، اتنے مین والدہ نے آواز دی، مین تڑپ کر بستر سے کودا اور اُن کے کمرے کی طرف گیا، دیکھا کہ تنفس کا زور ہے، چہرہ درد و کرب کا آئینہ دار ہے، لیکن مجھے دیکھکر مسکرا دئیے مین نے کہا مین ابھی ڈاکٹر کے پاس جاتا ہون، کہنے لگے ابھی نہ جاؤ، ڈاکٹر صاحب سو رہے ہون گے، اُن کو تکلیف ہوگی، مین اب کچھ بہتر ہون، نماز فجر کے بعد جانا،

مین نے والدہ سے کہا مجھے پہلے کیون نہین اٹھا دیا؟ انھون نے فرمایا، وہ تو اب بھی مجھے روک رہے تھے،

رات کی تاریکی دور ہو چلی تھی، سپیدہ سحر نمودار ہو چکا تھا، ہوا تیز تھی، ٹھنڈ خاصی تھی، فضا مین

جمعہ ۲ رنومبر ۱۹۵۲ء ایک صاحب مجھ سے ملنے آئے، اُن کے ساتھ ایک اور صوفی منش بزرگ تھے، ان سے یہ طے تھا کہ ہم لوگ ماہر القادری صاحب کو دیکھنے جائیں گے، چنانچہ ان دونوں کو ملاقات کے کمرے میں بٹھا دیا، اور خود کپڑا بدلنے چلا گیا، اور فوراً واپس آ گیا، چچا جان اسی کمرے میں محوِ خواب تھے، ان صاحب نے مجھ سے روایت بیان کی کہ صوفی صاحب کہہ رہے تھے، عاصم صاحب جلد واپس آ گئے، سید صاحب پر انوار کی ایسی بارش ہو رہی تھی کہ اٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا،

ایک دن مجھ سے سوال کیا کہ تمھارے والد کا کس عمر میں انتقال ہوا، میں نے عرض کیا کہ رحلت کے وقت اُن کی عمر باسٹھ ۶۲ برس کی تھی، پھر پوچھا اور بڑے بھائی (حکیم سید ابو حبیب صاحب) کی عمر کیا تھی،

ان کی عمر تریسٹھ برس تھی،

پھر کہنے لگے کہ میں نے تو خاندان میں سب سے زیادہ عمر پائی،

میں اُن کا مطلب سمجھ گیا، اسی لئے عرض کیا لیکن بڑے دادا (یعنی ان کے والد سید ابو الحسن صاحب) کی عمر تو ۷۰ برس کی تھی، وہ مسکرا کر خاموش ہو گئے، لیکن میں اس گفتگو سے سہم گیا، پھر اپنا وہم سمجھ کر اس کو ٹال گیا،

ایک دن حکیم نصیر الدین صاحب ندوی تشریف لائے، انھوں نے حسب عادت بڑے حوصلہ افزا الفاظ کہے،

قلب کی حالت بہت اچھی ہے، الحمد للہ نبض بھی متوازن ہے، چہرہ بھی شگفتہ ہے، ماشاء اللہ بہت اچھی حالت ہے

وہ اُن کی باتیں سنتے رہے، اور مسکراتے رہے، صرف یہ شعر پڑھ دیا:

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

ایک مرتبہ شعیب قریشی صاحب کا خط آیا کہ عمر جو سلمان کا ہم عمر اور مخلص دوست ہے، اور ان سے

چلے گئے، میں واپس آگیا، اس کے بعد ہم لوگوں کے ساتھ مل کر انھوں نے ناشتہ کیا، دو توس جیلی لگے ہوئے اور ایک نیم برشت انڈا کھایا،

تھوڑی دیر بعد سفیر حجاز آگئے، میں نے کہا کہ اسی کمرے میں بلا لیجئے، کہنے لگے نہیں مجھے ملاقات کے کمرہ میں لے چلو، میں نے ان کو سہارا دیا، اور اس کمرہ میں پہنچا دیا، وہاں بھی بستر لگا رہتا تھا، اس پر لیٹ گئے، خطیب صاحب بستر کے قریب ہی بیٹھ گئے، اُن سے بھی اسی طرح گفتگو کرتے رہے، جیسے ابھی دورہ پڑا ہی نہ تھا، گیارہ بجے کے قریب میں انجکشن کے لئے قیوم صاحب کو لانے گیا، حالت اتنی بہتر ہو چکی تھی کہ انھوں نے کہا کہ اگر میں ایک گھنٹہ کے بعد آؤں تو کوئی حرج تو نہیں، میں نے کہا کوئی ہرج نہیں، چنانچہ وہ ایک بجے آئے، اور انجکشن لگا کر چلے گئے، ہم لوگ کھانے سے فارغ ہو کر اُن کے پلنگ کے پاس بیٹھ گئے، اس دن انھوں نے کھیر کی فرمائش کی تھی، تھوڑی سی کھائی باقی رکھوا دی کہ بعد میں کھاؤں گا، شاید دو بجے ہوں، عادل میاں پینٹ وغیرہ پہن کر آئے اور نانا کے پاس بڑی شان سے السلام علیکم مولانا صاحب کہکر کھڑے ہوگئے، اور کہنے لگے ابا ہم صاحب بن گئے ہیں، انھوں نے کہا تم صاحب ہوگئے، مولوی نہیں ہوگے، انھوں نے اسی بے تکلفی سے فرمایا، نہیں ہم صاحب نہیں بنیں گے، متبسم ہو کر بولے تو پھر ہم تم سے رنج ہو جائینگے، عادل میاں نے فوراً جواب دیا، اچھا تو نہیں بنیں گے، اس پر وہ ہنسنے لگے، اور عادل میاں پینٹ میں ہاتھ ڈالکر اٹھلاتے ہوئے چلے گئے، اور وہ اس کو محبت بھری نگاہ سے دور تک دیکھتے رہے،

اب اتفاق سے میں تنہا رہ گیا، مجھ سے مخاطب ہوئے، اور بہت ہی سنجیدہ ہو کر کہا عاصم میاں!

میں نے کہا جی!

آپ کو والد صاحب کی خدمت کا موقع نہیں ملا،

میں نے کہا جی نہیں،

پھر فرمایا تمھیں والدہ کی خدمت کا بھی موقع نہیں ملا، میں نے عرض کیا جی نہیں

ایک عجیب اداسی محسوس ہورہی تھی،

آج اتوار کا دن شروع ہوچکا تھا، مین نے فجر کی نماز پڑھی، بارگاہ الٰہی مین اُن کی صحت عاجلہ وکاملہ کے لئے دعا مانگی، ڈرائیور کو بیدار کیا، اور ڈاکٹر صاحب کے پاس گیا، ان کا پھاٹک کھل چکا تھا، لیکن کسی آدمی کا پتہ نہ تھا، مین ہر طرف دیوانون کی طرح بھٹکتا رہا تھا، اتنے مین ایک ملازم آیا، اُس نے کہا ڈاکٹر صاحب نماز فجر کے بعد سوگئے ہین،

مین نے کہا ڈاکٹر صاحب کو اٹھا دو، لیکن وہ چلا گیا،

تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر صاحب کے لڑکے نے مجھے دیکھا،

مین نے اُن سے حال بیان کیا،

انھون نے ڈاکٹر صاحب کو باہر بھیجا،

ڈاکٹر صاحب نے کہا آپ جائیے مین ابھی آتا ہون، جب مین لوٹ کر آیا، تو ان کو پہلے سے بہتر دیکھا، انھون نے ازخود کہا کہ مجھے دوا کی ایک ٹکیہ اور دیدو، چنانچہ دیدی گئی، اتنے مین ڈاکٹر صاحب آگئے، انھون نے کہا اچھا کیا کہ ٹکیہ کھالی، پھر پوچھا کہ دل مین درد تو نہین؟ فرمایا الحمد للہ ذرہ برابر نہین ہے،

ڈاکٹر صاحب: پھر کوئی بات نہین ہے،

ڈاکٹر صاحب سے سوال کیا، ڈاکٹر صاحب! یہ مرض اچھا بھی ہوجاتا ہے؟

ڈاکٹر صاحب کیون نہین، آپ اچھے ہوجائین گے،

پھر فرمایا میرے خیال مین کوشش بیکار ہے،

ڈاکٹر صاحب: ایسی مایوسی کی بات نہین ہے،

مین ڈاکٹر صاحب کو لے کر باہر آیا، اُن سے پوچھا کیا حال ہے؟ کہنے لگے حملہ ہوگیا تھا، کمزور جسم ہے، مین نے پوچھا کوئی تشویش کی بات تو نہین؟ کہنے لگے کوئی بات نہین ہے، آج پھر انجکشن لگوا دیجئے گا، وہ

اور شام کی چائے کے بعد وو گلوری پان کھاتے تھے، اور اقتدا خان متقدا خان کا الائچی دانہ تمباکو نوش فرماتے تھے، اس مرتبہ پان کھانے کے بعد وہ مل نہیں رہا تھا، مین نے تلاش کرکے ان کو دیا، جب مین نے تمباکو دیا، تو انھون نے مجھے بڑی عجیب نظر سے دیکھا، اور جب تک کھڑا رہا، دیکھتے رہے، مین ان کا مفہوم کچھ بھی نہین سمجھا، اب سمجھتا ہون کہ شاید وہ حسرت بھری نگاہ تھی، رخصتی کا پیام تھا، فرقت کا پیغام تھا، آہ مجھ کو کیا خبر تھی،

کیا خبر تھی انقلاب آسمان ہو جائیگا باپ کا ملنا نصیب دشمنا ہو جائیگا[1]

ساڑھے پانچ بجے مشتاق جوہری ملنے آئے، وہ بھی چچا جان سے خصوصی محبت کرتے ہین، اُن سے وہ بیان کرتے رہے کہ رات پھر تنفس کا دورہ پڑگیا تھا، اب اچھا ہون، اس کے بعد مغرب کی نماز کا وقت ہوگیا، سلمان نے نماز پڑھوائی، بیٹھے بیٹھے نماز ادا کی، جب نماز سے فارغ ہوے تو مسکرائے سلمان نے پوچھا کیا بات ہے ؟

فرمایا آج مین نے شوکت علی کی نماز پڑھی

سلمان نے پوچھا کیا مطلب ؟

فرمایا وہ اسی صورت سے نماز پڑھتے تھے،

اس کے بعد سلمان نے کہا ابا سوجائیے آپ رات کو بھی نہین سوے ہین، انھون نے فرمایا بہت اچھا، اس کے بعد وہ بستر پر لیٹ گئے، اور روشنی بجھادی، اسکے بعد سلمان دبے پاؤن آئے اور اُن کے سر سے ٹوپی اُتارنے لگے، انھون نے پوچھا کون؟ سلمان نے کہا کوئی نہین، اور پھر وہ سوگئے،

مین نے باہر صحن مین مشتاق صاحب کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھی، نماز کے بعد وہی چٹائی پر مشتاق صاحب سے باتین کرنے لگا، اتنے مین تھوڑی دیر بعد غلام محمد صاحب آئے اب تاریکی کچھ بڑھ چلی تھی، وہ بھی

---

[1] یہ شعر اسی ترمیم کے ساتھ میری اہلیہ کی زبان سے بے ساختہ "نکلا" "ہم"

پھر تھوڑی دیر توقف فرمایا، اور مجھے عجیب نظروں سے دیکھتے رہے میں ان کا مفہوم مطلق نہ سمجھ سکا، انکی باتوں میں عجیب بات نظر آئی میں اس کو بیان نہیں کر سکتا ہوں، شاید آنکھیں پر نم تھیں، بڑے ہی درد میں ڈوبی ہوئی دھیمی آواز میں فرمایا لیکن اس مرتبہ تمھیں موقع مل گیا،

میں بلبلا اٹھا، اور بے اختیار زبان سے نکلا "میرے باپ! میں نے تو آپ کی کوئی خدمت نہیں کی" وہ صرف مسکرا دیئے، اور مجھے دیکھتے رہے، میرا دل بھر آیا، اور میں وہاں سے اٹھکر اپنے کمرہ میں چلا آیا، والد مرحوم کی یادنے تڑپا دیا، اپنی کم فہمی پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے کہ میں بالکل نہیں سمجھا کہ یہ الوداعی فقرے تھے ورنہ قدموں سے آنکھیں ملتا، اور پیر پکڑ کر کہتا کہ مجھے بے سہارا چھوڑ کر نہ جائیے،

کوئی چار بجے کے قریب والدہ سے مخاطب ہوے، اور کہنے لگے کہ آپ عاصم کے ساتھ مطمئن ہیں،

وہ کہنے لگیں کہ یہ کوئی سوال ہے، ——؟

فرمایا میرے سوال کا جواب دیجئے، فضول باتوں میں مت الجھائیے،

والدہ نے ان کے سوال کا جواب دیا، "بے شک"

پھر فرمایا الحمد للہ میرا قلب بھی بہت مطمئن ہے،

والدہ نے میرے پاس آکر اُن کے فقروں کو دہرایا،

میں نے اُن کی تسلی کر دی،

لیکن خود اپنا دل کسی نا معلوم خوف سے دھڑکنے لگا،

مجھ پر ایک عجیب اضطراب کی کیفیت تھی، کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا لیکن عجیب سناٹا سا معلوم ہوتا تھا، جیسی اداسی تھی وہ بیان سے باہر ہے میں اٹھا پھر اُن کے کمرہ میں گیا، دیکھا کہ سلمان وضو کرا رہے ہیں، یہ خدمت اُن کی سب سے چھوٹی لڑکی کے لئے مخصوص تھی، ہمیشہ وہی وضو کرایا کرتی تھی، عصر کی نماز پڑھی اور دو کھانے کے وقت کی بچی ہوئی کھیر منگا کر نوش کی، پھر سلمان نے پان دیا، ان کا معمول تھا کہ ہر دو کھانے کا تشتہ

میں نے ان سے لرزتے ہوئے پوچھا "خیریت!" ـــــ انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا، صرف گردن ہلا دی، ان کا اترا ہوا چہرہ اور بہتی ہوئی آنکھیں سب کچھ بتلا چکی تھیں کمرہ کے اندر قدم رکھا، دیکھا کہ اسی شان سے لیٹے ہوئے ہیں، اوپر سے چادر اوڑھا دی گئی ہے، عجیب قیامت کا منظر تھا، گھر کے سارے افراد اس شمع کے چاروں طرف پروانوں کی طرح کھڑے ہیں، سب کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہے، والدہ، اُف چوڑی نداردہ، چہرہ سفید، آنکھیں جل تھل لیکن ضبط و صبر کی کوہ پیکر بنی کھڑی ہیں، مجھے دیکھتے ہی لپٹ گئیں، اور کہا بیٹا ضبط و صبر کا مقام ہے، میں نے کہا اماں میں ڈاکٹر کو لاتا ہوں۔

ہاں میرے لال تم ڈاکٹر کو لاتے ہو، لیکن وہ ڈاکٹر سے بے نیاز ہو چکے،

میرا سر چکرا گیا، معلوم ہوا جیسے دل کی دھڑکن بند ہو جائے گی، حلق خشک ہو گیا، والدہ نے مجھے اپنے کلیجے سے لگا لیا، اور میرا سر اپنے شانے پر رکھ لیا، وہ میری پیٹھ پر تھپکی دیتی رہیں اور زبان سے یہی کہتی رہیں "صبر بیٹا صبر" شمیمہ کو پکار کر مفرح منگوایا، اور مجھے دیا، پھر پانی پتیا رہا، ایک بیک کچھ خیال آیا، میں ہوش میں آگیا، ڈاکٹر صاحب باہر کھڑے تھے، اُن کو دکھلادوں، شاید ان لوگوں کا خیال غلط ہو، بس میں تیر کی طرح باہر گیا، اور ڈاکٹر کو لے آیا، والدہ کہتی رہیں کہ ابھی ڈاکٹر عبدالصمد آ چکے ہیں، اور اعلان کر چکے لیکن دل نہیں مانا، ڈاکٹر صاحب نے دیکھا (آہ! کتنا شاہانہ سکوت کتنی پروقار نیند تھی، ابدی نیند، ہائے انھوں نے بھی دوسرا فیصلہ نہیں سنایا"

ان کو رخصت کیا ہی تھا کہ سلمان ڈاکٹر رحمان کو لیکر آئے اور آتے ہی چادر الٹ دی ـــــ اور اُن کی داڑھی چھو کر بے تابانہ پکارنے لگا، ابا ـــــ ابا ـــــ میرے ابا ـــــ بولئے!

ڈاکٹر رحمان نے بھی دیکھا اور کھڑے ہو گئے، سلمان کے سر پر ہاتھ پھیرا، اور کہا، صبر کرو، صبر اور رخصت ہو گئے،

مجھ پر اب سکتہ کا سا عالم تھا، کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا ہوا! اور کیا ہو رہا ہے، میں بُت بنا کھڑا تھا، سلمان بہت بے قرار ہو رہا تھا، والدہ سلمان کو پکڑ کر لائیں، اور مجھ سے لپٹا دیا، میں نے اس کو سینہ سے چمٹا لیا،

وہیں چٹائی پر بیٹھ گئے، اور خیریت پوچھی، اُن کو حال بتاتا رہا، اتنے میں سلمان نے روشنی جلائی، اور پکارا دیکھئے تو دیکھئے تو، ہم لوگ دوڑ پڑے، دیکھا کہ وہ مٹھی بھینچ رہے ہیں، اور گہری سانس لے رہے ہیں، فوراً ڈاکٹر عبدالصمد صاحب کو ٹیلیفون کیا، انھوں نے فرمایا ابھی میرے پاس دو بجے ہیں، ہم لوگوں نے سمجھا کہ شاید وہ اس وقت نہ آسکیں گے، میں دوڑا کہ کسی دوسرے کو لاؤں، گھر کی گاڑی باہر گئی ہوئی تھی، پیدل ہی بھاگا، تھوڑی دور جا کر ٹیکسی لی، اور مارٹن ہسپتال کے ڈاکٹر فاروقی کے پاس گیا، معلوم ہوا کہ وہ گھر پر نہیں ہیں، اب وہاں سے پیر الٰہی بخش کالونی گیا، ایک ڈاکٹر صاحب سے حال بیان کیا، انھوں نے کہا یہ تو میرے مطب کا وقت ہے، میں نہیں جا سکتا، پھر پوچھا معالج کون ہیں، میں نے کرنل شاہ اور عبدالصمد کا نام بتایا، وہ کہنے لگے کہ ایسے ایسے ڈاکٹروں کے بعد میں کیا علاج کروں گا، میں نے کہا ڈاکٹر صاحب میں آپ کو علاج کے لئے کہاں کہہ رہا ہوں، میں تو صرف اس لئے آپ کو لیجانا چاہتا ہوں کہ آپ دیکھ کر مجھے یہ بتلا سکیں کہ ان کی حالت کیسی ہے، کہنے لگے کوئی بات نہیں نیند آگئی ہوگی، میں نے کہا ازراہ کرم یہی بات وہاں دیکھ کر کہئے گا، چنانچہ وہ راضی ہو گئے،

نہ معلوم کیوں یک بیک دل کا سارا اضطراب، ساری بیقراری، ساری تڑپ، ساری دھڑکن ختم ہو گئی۔ جیسے سکون ہو گیا، دل نے کہا شاید اب بہتر حالت ہے، شاید اب وہ خطرہ سے باہر ہیں، شاید میں اُن کو دیکھ سکوں گا، اُن سے باتیں کر سکوں گا، ان کی نورانی صورت سے اپنے قلب کو منور کر سکوں گا، اُن کی اس غفلت کی نیند پر اپنی پریشانی کا اظہار کروں گا، وہ مسکرا کر فرمائیں گے آپ کیا سمجھے میں چل بسا، میں کہوں گا میں قربان ایسا کیوں ہونے لگا، تھوڑی دیر تک اسی کا چرچا رہے گا، ٹیکسی اپنی پوری رفتار کے ساتھ گھر کی طرف لوٹ رہی تھی، میرے خیالات کی رو اس سے بھی زیادہ تیز تھی،

آہ جب گھر پہنچا کیسی خاموشی تھی، موت کی خاموشی، تاریکی بھیانک تاریکی، دل بیٹھنے لگا، تیز تیز قدم رکھتا ہوا دروازہ پر پہنچا، دیکھا غلام محمد صاحب، درمشتاق صاحب زمین پر پھیلے ہوئے بیٹھے ہیں

بیچارے ڈاکٹر عابد نے کہا کہ میرے ساتھ چلیے میں انہی کے موٹر پر مولینا عبدالقدوس بہاری اور دوسرے بزرگون کے یہان سے ناکام ہوکر شعیب صاحب کے مکان پر پہنچا، اور وہان سے ٹیلیفون کے ذریعہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے مکان کا پتہ چلایا، اور اُن کی تلاش مین نکلا، کچھ دیر تک بھٹکتا رہا، بالآخر یہ معلوم ہوا کہ کلکٹر صاحب نے میونسپل کمشنر مسٹر ہوا نڈ سے اجازت مانگی، انھون نے فرمایا کہ میرا ارادہ اس زمین کو قبرستان بنانے کا نہین، اس لئے نہین مل سکتی،

اب مین اور عابد سیدھے اس قبرستان پہنچے، جہان عبدالرحمٰن صدیقی سوئے ہوئے ہین، اور انہی کے قریب مسجد کے دامن مین قبر کھودنے کا حکم دے کر گھر لوٹے یہان معلوم ہوا کہ مولانا امیر الدین خان نے نقوی صاحب چیف کمشنر کو ٹیلیفون کیا تھا، انھون نے وعدہ کیا ہے کہ انشاء اللہ صبح تک انتظام ہو جائے گا، اس کے بعد طے پایا کہ کل ساڑھے آٹھ بجے اس عاشقِ رسول کا جنازہ اُٹھے گا، دس بجے کے قریب شعیب صاحب کا اندرونِ سندھ سے ٹیلیفون پہنچا، کہ مین نماز جنازہ مین شرکت کی غرض سے آ رہا تھا لیکن راستہ مین اُن کی گاڑی خراب ہوگئی، اس لئے نماز جنازہ مین شریک نہ ہو سکے،

اب اخبارات اور خبر رسان ایجنسیون کے مسلسل ٹیلیفون آنے شروع ہوئے، کہین سے جنازہ کے متعلق استفسار، کہین تدفین کے متعلق بعض اُن کے سوانحِ حیات جاننے اور چھاپنے کے لیے بےچین، اس پر لوگون کا ہجوم بس قیامتِ صغریٰ کا منظر تھا، اپنی بےبسی اور بیچارگی کو کیا کہون کہ اتنی بھی فرصت نہین ملی تھی کہ کہین چھپ کر رو ہی لیتا، دوڑتے دوڑتے پیر جواب دے چکے تھے، ایک بجے تک لوگ جمع رہے،

رات بھر دعاؤن اور قرآن خوانی، اگر عود، اور لوبان نے کیا سمان کھینچا تھا، اس کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے، جس کے گھر کا سب سے بیش قیمت سرمایہ اس کی آنکھون کے سامنے اس سے چھین گیا ہو، جب کبھی فرصت ملتی، مین اُن کے قریب جاتا، اور اُن کی پیشانی کو بوسہ دیتا، اُن کے جسم کو غور سے دیکھتا، کیونکہ یقین کرنے کو دل ہی نہین چاہتا تھا، بس یہی خیال ہوتا اب اٹھیں گے، اب بولین گے، اب اٹھا

میرے پاس الفاظ نہین تھے جس سے مین اُن کو تسکین دیتا، شاید دل کی بات دل تک پہنچ رہی ہو،

مین سلمان سے علیٰحدہ ہوا اور صوفہ پر گر پڑا، والدہ نے مجھے پھر مفرح دیا، اور کہا بیٹا تم اپنے آپ کو سنبھالو دل کو مضبوط کرو، تم پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے، سب کام تم ہی کو انجام دینا ہے،

اب مین نے دل کی قوت کو مجتمع کرنا شروع کیا، مجھے ہوش آچکا تھا، اتنے مین ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

— ریڈیو پاکستان کا ٹیلیفون تھا، انھون نے پوچھا کہ مین نے بہت ہی افسوسناک خبر سنی، کیا وہ سچ ہے،

(ا ہ) آپ نے جو کچھ سنا سب سچ ہے،

سب بچیان، سلمان، — والدہ پلنگ کے چارون طرف کلام پاک لے کر بیٹھ گئے، اور تلاوت شروع کردی، ریڈیو سے اعلان کے فوراً ہی بعد لوگون کا آنا شروع ہو گیا،

زہرہ آپا، مولانا محمد علی کی صاحبزادی، شوکت علی کی بہو، زاہد علی صاحب کی بیگم، روتی ہوئی آئین اور کہنے لگین، للہ میرے چچا کو مجھے دکھا دو، پھر بیگم وسیم، گلنار آپا، (بیگم شعیب قریشی) تشریف لائین،

باہر لوگون نے تجہیز و تکفین کے متعلق سوالات شروع کر دیے، ان مسائل پر آہ مین نے کب سوچا تھا، کچھ سمجھ مین نہین آتا تھا، اتنے مین شعیب قریشی کے داماد ڈاکٹر عابد نے کہا، آپ متردد ہون، جہان مامون یعنی عبدالرحمٰن صدیقی کا مزار ہے، وہین انتظام کر لین گے مجھے کچھ تجربہ ہے، اور لوگون کی رائے ہوئی، کہ جہان مولانا شبیر احمد صاحب صاحب مدفون ہین وہان انتظام کیا جائے، اس لیے سب سے پہلے مین نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو ٹیلیفون کیا، اور اس جگہ دفن کرنے کی اجازت مانگی، انھون نے کہا مجھے یہ بھی معلوم نہین ہے کہ مولانا عثمانی کہان مدفون ہین، مین نے اُن کو بتایا کہ میونسپلٹی کی زمین ہے اور آپ اجازت دیسکتے ہین، میرے دماغ مین تھا کہ نقوی صاحب چیف کمشنر کی وہ قائمقامی کر رہے ہین، انھون نے کہا آپ ان لوگون سے ملیے جنھون نے مولانا عثمانی کی تدفین کا انتظام کیا تھا،

مجھے فوراً مولانا عبدالقدوس بہاری کا خیال آیا، چنانچہ ان کو ٹیلیفون کیا، ان کو کوئی پتہ نہین تھا،

کلام پاک یئے قرآن خوانی مین مصروف تھے،

ساڑھے آٹھ بجے گھر سے جنازہ نکلا، ٹرک پر رکھا گیا، دو بڑے بڑے بانس دونون طرف لگا دیئے گئے، تاکہ ہزارون آدمی کاندھا دے سکین، لوگون نے پھول سے اُسے ڈھک دیا، اُس کے بعد جنازہ ایک جلوس کی شکل مین گھر سے رخصت ہوا، سفیر مصر نے کہا کہ آپ مسجد مین نماز کے لئے چلے جائین لیکن انھون نے کہا مجھے اس سعادت سے کیون محروم کرنا چاہتے ہین، ہر شخص کاندھا دینے مین ایک دوسرے سے سبقت کرنا چاہتا تھا،

(ک) ان کے جنازہ کا منظر بھولتا ہی نہین، امیر غریب، فقیر، سفیر، سب اس طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے، جیسے اُن کا باپ اُن کا بھائی، اُن کا سب کچھ آج رخصت ہو رہا ہے جس راستے سے یہ جلوس گذرتا تھا، مکان کی چھتون پر سے عورتون کی آہ و بکا کی آوازین آتی تھین، ممالکِ اسلامیہ کی سفرا آگے بڑھ کر کاندھا دے رہے تھے، اُن کی آنکھین نمناک اور لب کانپ رہے تھے، جیسے اُن کا عزیز ترین محبوب اُن سے چھن گیا ہو یون تو اُن کی محبوبیت کے بہت سے واقعات دیکھے لیکن اس دن اندازہ ہوا کہ ہر خاص و عام کے قلوب مین ان کی کتنی جگہ تھی،

سفیر حجاز خطیب صاحب جنازہ کے آگے ایک طرف مجھے اور دوسری طرف سلمان کو اپنی طرف لئے ہوئے تھے،

پوری سڑک طے کرنے کے بعد نیوٹاؤن مسجد جہان ایک مرتبہ انھون نے بقرعید کی نماز پڑھائی تھی اور ایک دو جمعہ بھی پڑھائے تھے، وہ ابھی زیر تعمیر مسجد ہے، اس کی تعمیر کا سامان پھیلا ہوا تھا، اس کے وسیع احاطہ مین مسجد کے محرابی در کے سامنے جنازہ رکھا گیا، اور ڈاکٹر عبدالحی صاحب نے نماز پڑھائی،

(ک) افسوس کسی کا گھر لُٹ گیا، اور کوئی اپنی شہرت کے لئے اس کو بھی وسیلہ بنانا چاہتا تھا، اسی لئے ڈاکٹر صاحب کا انتخاب کیا گیا، ان سے خادمانہ موانست تھی، نماز کے بعد زیارت کے لئے لوگون کا اصرار ہوا، اس کیلئے لوگون کا ہجوم ہوا، پھر زائرین اور مشتاقین کی ایک قطار بنا دی گئی، جو یکے بعد دیگرے سامنے سے آتے، چہرۂ انور کو

کی نماز کے لئے پکارین گے، اب وضو کے لئے بلائین گے، رات ڈھلتی جا رہی تھی، سناٹا بڑھتا ہی جا رہا تھا، اب ان کے تہجد کا وقت آگیا، لیکن وہ تہجد مین ناغہ کرین گے، انھون نے تہجد کبھی ناغہ نہین کی ہی! اب وقت پر تہجد کی نماز کے لئے گھنٹی نہ بجے گی، اب اُن کے جسم کو حرکت ہوگی، لیکن آہ کچھ بھی نہین ہوا،

اُف صبح ہوگئی، رخصت کی صبح، دائمی فرقت کی صبح، وداع کی صبح، آہ وہ صبح جس مین کوئی پیغام حیات نہین، بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساری فضا نے کفن اوڑھ لیا ہے،

اُف! ہم اس جسم اطہر کو اٹھا کر بیچ کے کمرے مین لائے، قینچی سے کاٹ کاٹ کر سارے کپڑے علٰحدہ کئے، بے اختیار جی یہی چاہتا تھا، کہ بس لپٹ جاؤن اور کہون؛

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملین گے کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اَور

سب لوگون نے مل کر تخت پر لٹایا، آہ سارا جسم کتنا نرم تھا، جس طرف موڑا جاتا تھا، مڑ جاتا تھا، چہرے پر وہی سنجیدگی، وہی وقار، وہی متانت، وہی تبسم، اب تک جو تھا، مین نے پھر پیشانی کو چوم لیا، ڈاکٹر عبدالحئی صاحب نے شہادت کی انگلی چوم لی، اور لرزتی ہوئی آواز مین کہا کتنی مبارک ہین یہ انگلیان، جو سرور کائنات ؐ کی سیرت نگاری مین زندگی بھر مصروف رہین، اہد، مین —— اور —— شمون ماموں پانی ڈال رہے تھے، صوفی جی کپڑے سے طہارت کر رہے تھے، ڈاکٹر بتا رہے تھے، سلمان بُت بنا کھڑا تھا، کبھی پانی ڈالتا، اور کبھی قریب آکر غور سے دیکھتا رہتا،

آخر آٹھ بجے رخصت کا لباس پہنایا گیا، داڑھی مین عطر لگایا گیا، کافور چھڑکا گیا، اور پلنگ پر لٹا دیا گیا،

دوسرے کمرے مین سفیر مصر، سفیر حجاز، ڈاکٹر محمود حسین، سابق وزیر تعلیم، اور بہت سے لوگ تھے؛ وہ بلائے گئے، انھون نے آخری زیارت کی، اور پھر کمرہ بند کر دیا گیا، اور عورتون کو بلا لیا گیا،

! ہر ہر طرف کیمونڈ مین ہزارون کی تعداد مین لوگ جمع تھے۔ ہر طرف دری بچھا دی گئی تھی، سب

جس کے ایک طرف مولانا شبیر احمد کا مزار ہے، وہاں پہنچا اُن کے مزار کے سامنے رکھا گیا، اور چونکہ اجازت ملنے بہت دیر ہوئی، اس لئے ابھی تک قبر تیار نہ تھی، مولانا عثمانی کے مزار پر میگرہ فون لگا دیا گیا تھا، شام کو ابوالخیر صاحب نے ایسی تقریر کی جس نے سب کو رلا دیا،

اُن کی تقریر جذبات و خیالات اور معلومات سے لبریز تھی، آخری فقرہ تو ہمیشہ یاد رہیگا، انھوں نے کہا

"اے سلیمان! تمہارے جانے کا اتنا غم نہیں جتنا اس گنجینۂ علم کا صدمہ جو تمہارے ساتھ دفن ہو رہا ہے"

اس کے بعد قبر تیار ہوئی،

قبر کے اندر ایک طرف غلام محمد صاحب، دوسری طرف میں، اور میرے ساتھ صلاح الدین احمد صاحب ندوی اُترے، سلمان دیوار کے حصہ میں کھڑے تھے،

آہ اس کے بعد میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنے سب سے قیمتی سرمایہ کو زمین پر لٹایا، آہ جس کی نفاست طبع شکن بستر بھی کھلی محسوس کرتی تھی آج وہ مٹی کی خوابگاہ میں سو رہا ہے،

چہرہ کھول دیا گیا، پھر ڈھک دیا گیا،

میرے بڑے ابا حکیم سید ابوحبیب صاحب کا نواسہ مصطفےٰ چیخا، بابا نہ چھپا،

ارے میرے چھوٹے نانا کو ایک مرتبہ اور دکھلا دو،

جس کو سردی سے گرمی سے ہوا سے لو سے ہمیشہ بچایا جاتا تھا، وہ آج منوں مٹی کے اندر چھپا دیا گیا،

میرے لئے ہر طرف تاریکی،

ہر طرف اندھیرا،

ہر طرف سناٹا تھا،

اللہ بس باقی ہوس

ٹھہرے گا دل تھمیں گے اشک آہ! مگر، ابھی نہیں،

ایک نظر دیکھ کر گذر جاتے تھے ہر شخص آتا اور ایک نظر دیکھتا یا پھر شاید دیکھ بھی نہیں پاتا، اور صرف محبت اور عقیدت کے آنسو ان کی بارگاہ میں پیش کر کے چلا جاتا، ایک انجینیر صاحب چیخ چیخ کر پکار رہے تھے زیارت کرتے جائیے، چلتے جائیے،

قطار کسی صورت سے ختم ہی نہیں ہو پاتی تھی، اُن کا چہرۂ انور نور سے معمور تھا، ایک طرف آفتاب کی روشنی اُن پر پڑ رہی تھی دوسری طرف خود اس آفتاب کی تابانی لوگوں کی نگاہوں کو خیرہ کئے ہوئے تھی، کتنا شاداب چہرہ، کتنا روشن چہرہ، کتنا پُرسکون کتنا درویشانہ جلال، اور کتنا روحانی وقار تھا، سلمان اور میں اُن کے سرہانے کھڑا اس منظر کو دیکھ رہا تھا، دھوپ سے بچانے کے لئے چادر کا ایک کونہ پکڑے ہوئے تھا، تین طرف سے اور لوگ گھیرے ہوئے تھے، اس منظر کو دیکھ کر کلیجہ پھٹا جا رہا تھا، خیالات و جذبات کا سیلاب امنڈا آ رہا تھا، آنسو تھے کہ تھمتے نہ تھے کلیجہ تھا کہ کٹا جاتا تھا لیکن نگاہیں تھیں، کہ اُن کے چہرۂ انور پر مرکوز تھیں کہ

ابھی جی بھر کے دیکھ لیں یہ جمال جہاں فروز | پھر یہ جمال نور تو دیکھا نہ جائیگا

کبھی جی چاہتا کہ چیخ چیخ کر رو دوں، اور سینوں کے بند سکوت کے در کھول دوں،

اے عم محترم! آج آپ کیوں نہیں بولتے، دیکھئے آج کتنے آپکے مشتاقان دید جمع ہیں، آپنے کسی کو کبھی مایوس نہیں لوٹایا، آپکی صحبت سننے کے لئے لامتناہی سلسلہ کلمہ گویوں کا ٹوٹا پڑ رہا ہے، یہ تو وہی ہیں جن کے لئے آپنے اپنے چین کو چین نہیں سمجھا، اپنی راحت کو راحت نہیں سمجھا، یہ کسی غرض سے نہیں آئے ہیں یہ آپکے محبت اور خلوص سے ملنے آئے ہیں، انجینیر صاحب کی آواز کانوں میں ہتھوڑے کی طرح سے پڑ رہی تھی،

حکیم صاحب دوڑے چلے آرہے آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں، اور وہ گذر گیے، سابق وزیر یوسف ہارون سابق وزیر دولت سب وزراعظم ان دنوں پنجاب میں علیل تھے، اُن کا نمائندہ اور گورنر جنرل کا نمائندہ شریک تھا، خواجہ ناظم الدین باہر تھے،

یہاں سے جنازہ تقریباً ایک فرلانگ کی مسافت طے کر کے اٹھارہ ہزار مربع گز زمین کا وہ وسیع رقبہ

زبردست نقصان پہنچا ہے، مجھکو بھی ذاتی نقصان ہوا، کیونکہ مین نے اُن سے بہت سے فیوض حاصل کئے۔"

سردار عبدالرشید، وزیراعلیٰ سرحد:

"...... ابھی پاکستان کو مولانا جیسے علم و کردار کے آدمیون کی سخت ضرورت تھی۔"

سردار عبدالرب نشتر:

"...... انھون نے اسلامی تاریخ کی تدوین مین جوگران قدر خدمات انجام دی ہین، انھین ہمیشہ قدر منزلت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔"

مس فاطمہ جناح:

"سید سلیمان ندوی کی وفات سے قوم ایسے جید اور فاضل عالم سے محروم ہوگئی ہے جس نے اپنی تمام زندگی اسلام کا پرچم بلند کرنے کے لئے وقف کر رکھی تھی۔"

ابو صالح محمد اکرام، چیف جسٹس پاکستان و صدر قانون کمیشن:

"...... مولانا ندوی قانون کمیشن کے رکن تھے، حکومت پاکستان نے یہ کمیشن ملک کی عدالتون مین اسلامی قانون جاری کرنے کے سلسلہ مین مقرر کیا تھا، اُن کی موت نے ہمین جو نقصان پہنچایا ہے اسکی تلافی ناممکن ہے۔"

چودھری خلیق الزمان:

"...... وہ نہ صرف ایک ممتاز عالم، بلند پایہ مورخ اور زبردست اہل قلم تھے، بلکہ دلآویز شخصیت کے بھی حامل تھے، بڑی میٹھی گفتگو کرتے تھے، خلافت اور دوسری اسلامی تحریکون مین انھون نے جو حصہ لیا، وہ فراموش نہین کیا جا سکتا، سچ یہ ہے کہ جب تک سیرۃ النبی زندہ ہے، وہ بھی زندہ رہین گے۔"

مولانا قطب میان مرحوم فرنگی محل لکھنؤ:

"مولانا مرحوم کے ان روابط کے پیش نظر جو ہمیشہ سے ہمارے خاندان کے ساتھ قائم ہے، مجھکو یہ حادثہ اپنے گھر کا سانحہ نظر آرہا ہے۔"

ہندوپاکستان مین ماتم

"ہندوستان وپاکستان مین اس حادثہ پر جس قدر ماتم کیا گیا، ان دونون ملکون کے اکابر نے جو بیانات دیئے، اور اخبارات ورسائل نے جس قدر لکھا، ان سب کی تفصیل کی گنجائش نہین، نمونۃً چند بیانات اور تحریرون کے مختصر اقتباسات نقل کئے جاتے ہین۔" "م"

بیانات

عبدالوہاب عزام سفیر مصر:

"علامہ ندوی جیسے اہل علم کی موت سے نہ صرف پاکستان بلکہ پورے عالم اسلام کو نقصان پہنچا ہے، وہ قاہرہ کی عرب اکیڈمی کے ممبر بھی تھے، جہان وہ عربی کے ایک بہت بڑے عالم کی حیثیت سے بڑی وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے"......

شیخ ابوالخیر سفیر شام:

"ہم کو علامہ سید سلیمان ندوی کی موت سے دکھ ضرور ہے لیکن اس سے کہین زیادہ اس کا دکھ ہے کہ جو علوم وفنون ان کے سینے مین تھے، وہ بھی اُن کے ساتھ دفن ہوگئے"......

گورنر جنرل پاکستان:

"... مولانا سید سلیمان ندوی کے پایہ کا عالم صرف پاکستان ہی مین نہین بلکہ تمام عالم اسلام مین بھی کوئی نہ تھا"

خواجہ شہاب الدین گورنر سرحد:

"..... علم وفضل کے لحاظ سے تمام عالم اسلام مین اُن کا پایہ بلند تھا، اُن کے انتقال سے عالم اسلام

علمائے میر پور کی تعزیت:

"آج کے پرآشوب دور میں اسلامی تاریخ، اسلامی علوم و فنون اور آثار اسلامی کو فلسفۂ جدیدہ کی روشنی میں جس حسن و خوبی کے ساتھ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے مرتب کیا، اور تاریخ اسلامیہ کے بہت سے اہم پہلو فلسفۂ تاریخ کی روشنی میں مدون کئے، بالخصوص سیرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی تالیف و تصنیف، یہ آپ کی زندگی کی زندہ جاوید یادگار اور صفحۂ زمین کے بسنے والے انسانوں کے لئے ہدایت و تعلیم کا ایک سرچشمہ ہے، اور امت مسلمہ بجا طور پر اس مورخ اسلام کے علمی کارناموں پر ہمیشہ فخر کرے گی،

اخبارات میں ماتم

جنگ کراچی، مورخہ ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء

"برصغیر بھارت و پاکستان کے عظیم ترین عالم محقق، مورخ، ادیب اور مفکر حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کی وفات ایک پورے عہد کی موت اور ایک پورے دور کا اختتام ہے۔ یہ عہد مسلمانوں کی علمی تحقیقی خدمات کا دور تھا، جس نے اس برصغیر میں اسلامی نشو و ارتقاء اور ملی تفکر و تجسس کی نئی اساسیں استوار کیں، اور برصغیر میں حضارت اسلامیہ کی بنیادیں رکھیں،

بصیرت لاہور مورخہ ۲۷ نومبر ۵۳ء:-

عہد حاضرہ کے فرزندان اسلام جن ممتاز و نامور ہستیوں اور رہبروں پر بجا طور پر ناز کر سکتے ہیں ان میں سے ایک حضرت علامہ سید سلیمان ندوی ہیں ..... !!

نوائے وقت لاہور، ۳۰ نومبر ۵۳ء:

اسلامی علوم و فنون کی تحقیق و تصنیف کا جو پودا حضرت مولانا شبلی نعمانی نے لگایا تھا اس کی آبیاری میں سید سلیمان ندوی نے جس کاوش اور جانفشانی سے حصہ لیا، اہل علم و فضل ہمیشہ اسے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے رہیں گے، شاید ہی کوئی مسلمان گھرانا ہوگا جس میں سیرت نبوی، سیرت عائشہ، رحمت عالم

مولانا عبد الشکور صاحب لکھنوی:

وہ نہ صرف علم و فضل بلکہ زہد و تقوی میں بھی ممتاز درجہ کے مالک تھے"

مولانا محمد سعید مجتہد:

.... علامہ کے انتقال نے سب سے زیادہ نقصان ہندو پاکستان میں عربی ادب کو پہنچایا ہے، موصوف عربی ادب میں بھی ایک ممتاز مقام رکھتے تھے، ہندی الاصل ہونے کے باوجود قدیم اور عصری عربی ادب کے ماہر تھے، اُن کے عربی مضامین کو نام ہٹا کر دیکھا جاتا تو یہ امتیاز کرنا مشکل تھا کہ یہ مقالہ کسی عرب کا ہے یا ہندوستانی کا۔

ڈاکٹر عبد العلی ناظم ندوۃ العلماء لکھنو

..... تقریباً تیس سال موصوف کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا، یہ مدت جتنی ہی بڑھتی گئی، اتنی ہی موصوف کی قدر میرے دل میں بڑھتی گئی، میں نے ذاتی تعلقات میں انھیں شفیق بھائی پایا، تو ندوۃ العلماء کے کاموں میں اُن کی رائیں رضائے الٰہی کی طلب پر مبنی پائیں، اگر اختلاف رائے کی کبھی نوبت آئی تو میں نے انھیں ایک شریف اور کریم انسان پایا، اور جلد وہ اختلاف اشتراک عمل میں تبدیل ہو گیا،

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی

مرحوم مشرقی اور اسلامی لٹریچر کے ایک مقبول ترین اور تسلیم شدہ عالم تھے، اور اس کے لئے انھوں نے عظیم ترین خدمات سرانجام دی تھیں، جدوجہد آزادی کے دوران میں قوم پرستانہ نظریات اور خیالات کے دل و جان سے حامی تھے،

مفتی عتیق الرحمان ندوۃ المصنفین دہلی،

"..... آہ! کسے خبر تھی کہ عالم اسلام کا یہ گوہر شب چراغ اس قدر جلد ہم سے جدا ہو جائے گا......"

اور مقبولیت آپ نے حاصل کی، وہ بہت کم لوگوں کو ملا کرتی ہے، .... افسوس ہے کہ آج ہم سے وہ ہستی جدا ہوگئی، جو پروفیسر مارگولیتھ کی تاریخ کا جواب دیا کرتی تھی، اور جس کی تحقیقات کا لوہا انسائیکلوپیڈیا آف اسلام اور انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا کے مصنفین کو بھی ماننا پڑا۔ .... افسوس آج ہم سے ایک ایسا عالم دین، مفسر، مؤرخ، ادیب اور اڈیٹر جدا ہوگیا جو عصری رجحانات اور نفسیات کا ماہر، عقلی ترقی کے نئے تقاضوں کا شناسا تھا، ......"

مدینہ بجنور مورخہ ۲۸ نومبر ۵۳ء

"۲۲ نومبر کی شام کو کراچی میں مولانا سید سلیمان ندوی اللہ کو پیارے ہوگئے، وہ آفتاب علم و حکمت گہن میں آگیا جس کی شعاعوں نے ہندوستان اور پاکستان کی علمی مجلسوں، ادبی محفلوں، اور دینی انجمنوں کو اپنی آب و تاب سے بقعۂ نور بنا رکھا تھا۔ .... رسالہ معارف کے صفحات ایک مدت سے جس راہ فکر اور جس روشن خیالی کی دعوت دیتے رہے ہیں، یہ مولانا مرحوم ہی کے فیضان نظر کا اثر اور ان ہی کے مافی الضمیر کا عکس ہے، معارف سے قبل رسائل میں مضامین کا انداز محققانہ نہیں ہوتا تھا، سطحی موضوعات پر ہمارے ادبا، جو کچھ قلم برداشتہ لکھ دیتے تھے، اسے بہ ہزار تشکر و امتنان زیب قرطاس کر دیا جاتا تھا، لیکن معارف نے اسلوب نگارش کی پرانی قدریں کچھ اس انداز سے بدیں کہ سطحی نگارشات کی کوئی قیمت ہی باقی نہ رہی، مولانا کے اس تجدیدی کارنامے کو پیش نظر رکھتے ہوئے، اگر ہم انھیں دنیائے ادب کا ایک مصلح یا ایک مجدد کہہ دیں تو یہ خطاب اس عظیم الشان شخصیت کو زیب دیتا ہے، ....."

سیاست کانپور:

"..... معارف میں علامہ مرحوم کے شذرات ملک بھر میں شہرت رکھتے تھے، یہی حال ان کے قلم سے نکلنے والی تنقیدات کا تھا، گذشتہ چند سال سے وفیات کے عنوان سے وفات پانے والے معاصرین کے حالات لکھنے لگے تھے، یہ مضامین اپنے رنگ میں بہت خوب نہایت درجہ موثر، اور مرحوم کی زندگی

وغیرہ موجود نہ ہون، یہ بلند پایہ تصنیفات اُن کے لئے لازوال خراجِ تحسین کی حیثیت رکھتی ہین ۔۔۔۔۔"

ڈان (اداریہ) کراچی :-

۔۔۔۔۔ وہ نہ ایک ممتاز مصنف اور مشہور اہلِ علم تھے، بلکہ اُن کی ایک یادگار دارالمصنفین کے بانی کی حیثیت سے ایک مدت مدید تک رہیگی، یہ وہی ادارہ ہے جہان سے علم کی شعاعین برابر پھیلتی رہی ہین، جو علوم کا خزانہ اور پسبر آزما علمی تحقیق و تدقیق کا بڑا مرکز رہا ہے، اور جس نے ایک عہد کے علمی ضمیر کو بنانے اور ترقی دینے مین گہرا اثر ڈالا ہے۔ ۔۔۔۔۔ علامہ موصوف کی زندگی کا مشن قرآن و سنت کی تعلیم کو خاطر خواہ طریقہ پر پیش کرنا تھا ۔۔۔۔۔ ہر شخص اُن کو محبت کی نظرون سے دیکھتا تھا، اس لئے اُن کی رحلت سے ہر شخص کو ذاتی نقصان پہنچا ہے،

ڈان (میگزین سیکشن) کراچی،

"۔۔۔ اُن کی موت سے ایک ایسی دل آویز شخصیت، ایک ایسا متبحر اہلِ علم، ایک ایسا زبردست اہلِ قلم، ایک ایسا غیر جانب دار مورخ اور ایک ایسا عالم باعمل ہم مین سے اُٹھ گیا، جو صدیون کے بعد پیدا ہوا کرتا ہے،

حمایت اسلام لاہور، ۱۱ دسمبر ۵۳ء

۔۔۔۔۔ اُن کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ نہ صرف زمانہ حاضر کے اسلوبِ فکر سے واقف تھے، بلکہ فکر کی پوری تاریخ اُن کے سامنے تھی، اور وہ اس حقیقت سے پوری طرح باخبر تھے، کہ فکر و عمل کے اسلوب ہر زمانہ مین بدلتے رہتے ہین، ۔۔۔۔۔ انھون نے تعلیماتِ اسلامیہ بورڈ کے صدر کی حیثیت سے پاکستان کے دستور کے متعلق علماء اور جدید یود کی جو رہنمائی فرمائی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم افراط و تفریط سے بچ گئے ۔۔۔"

الجمعیتہ دہلی، مورخہ ۲۶ نومبر ۱۹۵۲ء

۔۔۔۔۔ آپ بیک وقت ادیب بھی تھے، اور شاعر بھی، مورخ بھی تھے، اور سوانح نگار بھی، فلسفی بھی تھے، اور متکلم، مفسر بھی تھے، اور فقیہ بھی، سیرۃ النبی اور دوسری بلند پایہ تصانیف سے جو شہرت

انجمن ترقی اردو پاکستان :

"........ مرحوم اردو زبان کے نامی انشا پرداز اور ادیب تھے، اپنی متعدد تصانیف اور مجلہ معارف کے ذریعہ اردو زبان اور ادب کی جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، وہ ناقابل فراموش ہیں"

نقیب امارتِ شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ، :

"حضرت علامہ سید سلیمان ندوی کا حادثۂ انتقال دنیائے اسلام کے لئے عظیم ترین حادثہ ہے"

کی تصویر کشی میں کامل ہوتے تھے۔ ...."

حق، لکھنؤ :-

"...............عظیم المرتبت ہستی .... اپنی نیکی، اپنے علم، اپنے اخلاق، اپنی خدا ترسی اور اپنے تقوای وطہارت کے باعث زمانۂ قدیم کے ان بزرگوں اور پایہ کے نمونہ کی تھی، جن کے زرین نقوش آج بھی زمانہ کی ریگ پر نظر آرہے ہیں، جو بھولے بھٹکے مسافروں اور گم کردہ راہ رفیقوں کو صراطِ مستقیم بتاتے ہیں ......"

شاکر مدراس :-

حضرت علامہ سید سلیمان ندوی کی اچانک وفات سے علم و فضل کی ایک ایسی کرسی خالی ہوگئی ہے جس کا پُر کرنے والا اس وقت ساری دنیائے اسلام میں کوئی نظر نہیں آتا،

انقلاب بمبئی ۸ دسمبر ۵۳ء

......سید صاحب شروع سے نیک طبیعت اور شریف النفس انسان تھے، ان کی نیک فطرت ماحول پر غالب رہی، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے علم و تحقیق کی راہ میں ہمیشہ صراطِ مستقیم ہی کو پسند کیا ...

جمعیۃ العلمائے اسلام پاکستان کی تعزیتی قرارداد :-

"........... استاذ الاساتذہ بطل الاسلام علامۂ اجل حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات موجودہ حال و ماحول کے لئے سانحۂ عظیم اور ملت اسلامیہ کے لئے ناقابل تلافی نقصان ہے، .... ان کی رحلت سے پورے عالم اسلام بلکہ عصر حاضر کی تمام علمی، تعلیمی و فکری اجتہادی حلقہ جات و مجالس کی تابناکیاں کم ہوگئیں، .... وہ اس دور میں علوم اسلامی کی حرکت دائرہ تھے، معیار علم و عمل تھے، اور دینی و ملی تحریکات و دوائر کے اعتبار سے اس منصب پر فائز تھے جو فنا ہونے کے بعد میات داوف سنین میں مشکل سے ہو سکتا ہے،

بہشت منزل ہے خوش اقبال باد

۱۹ ء ۵۳

آج دانا ادب متقدمین کی یادگار زندہ نہیں رہی

۱۴ ھ ۶۳

(۱)
آہ آن سید سلیمان ذی حشم — پاک صورت پاک باطن پاک دین
سن بہ ہجری رحلتش معراج گفت — رونق ہنگامہ خلد برین

(۲)
خبر یادا کہ گئے دنیا کو آج — تھے سلیمان سید عالی نشان
عیسوی مین کہہ دلِ معراج سال — عازم خلد برین فخر جہان

۵۳ ء ۱۹ء

(۳)
ازین دہر فانی بدار بقا رفت — چو سید سلیمان بزرگ و فہیم
بہجری بیاورد معراج سال — مہ ملک اجلال باغ نعیم

۶۳ ۱۴ھ

(۴)
وہ سید سلیمان وذی اقتدار — گئے آج دنیا سے سوے عدم،
سنِ عیسوی مین ہر معراج سال — بہارِ تمناے باغ ارم

۵۳ ۱۹ء

(۵)
فضاے جہان را نمودی اَلم دیدۂ رنج ماتم،
بشد زین سراے خیالی، ادب را چہ مغموم کوی
سلّم تبارنخ ہجری، حزین قلب معراج گفتا
ادیب و بستانِ جنت، محمد سلیمان ندوی

۶۳ ھ ۱۴ھ

(۶)
تلاطم سا اٹھا جہان مین، ہوا عالم حشر برپا
ہر اک سمت چھائین گھٹائین صفین بچھ گئین رنج و غم کی
مسیحی پئے سالِ رحلت، اے معراج تاریخ لکھئے
زر افشانِ خلد برین مین، محمد سلیمان ندوی

۵۳ ء ۱۹ء

(۷)
قیامت نے انگڑائیان لین بنا دل سراپا محشر
زمانے نے آنسو بہائے، ہوئی غیر حالت جہان کی
فلک نے پئے سال رحلت ہجری سنایا یہ مصرع
مقیم بہشت دل افزا، محمد سلیمان ندوی

(۸)
بگرو اب رنجِ مسلسل گرفتار کردہ جہانے
برفتہ بدریاے رحمت، محمد سلیمان ندوی
ملائک پئے سالِ رحلت مسیحی بہ معراج گفتا
سخن گوے عرفانِ جنت، محمد سلیمان ندوی

۶۳ ہجری ۱۴ — ۵۳ عیسوی ۱۹

قطعات اور تاریخی مادّے

از

جناب قاضی معراج الدین صاحب دھولپوری

آہ مرد پاک باطن سید سلیمان ندوی جانشین مولانا شبلی علیہ الرحمۃ
۵۳ ۱۹ء

باسم اللہ الرافع الدرجات عزّ اسمہ
۷۳ ھ ۱۳

ھو الغفور الوھاب
۷۳ ھ ۱۳

تاریخ رحلت بلند پایہ
۵۳ ء ۱۹

آہ مرد حکیم سخن سید سلیمان ندوی
۷۳ ھ ۱۳

فاضل بلیغ
۵۳ ء ۱۹

مرد میدان تحقیق مؤرخ فلک اوج
۵۳ ء ۱۹

غریق حقائق و معارف آگاہ
۵۳ ء ۱۹

جانشین خاص، جادو کلک مولانا شبلی مرحوم،
۵۳ ء ۱۹

مغز سلوک معرفت
۵۲ ء ۱۹

اے باادب واحسرتا واحسرتا
۷۳ ھ ۱۳

رفت مورخ و عالم و شارح | صدرِ گرامی محفلِ عرفان
سیرت احمد مرسل گفتہ | سفتہ بہ سلک لآلی تابان
نثر مقفی نظم مرصع | فکر بہ اوجِ ثریا طیران
آہ ز مرگش گشت فسردہ | مسند دیوان منبرایشان
تختِ فقہ را صدر نماندہ | رخت سلیمان زشک سلیمان
صبر و تحمل ہیچ نماندہ | قلب پریشان تاب بے جان
یادِ شبلی تازہ گشتہ | رفت بسویش بستہ دامان
لکھنؤ پٹنہ و اعظم گڑھ را | شہرت خاص بداوسلیمان
مرقد شہر کراچی گشتہ | اللہ اللہ سبحان سبحان
قائل حکمت و تحقیقش را | رازی و سینا و سعدی سحبان
نامِ بلندش تابان ہرسو | ماہِ درخشان انجم رخشان
باز نیامد از ما رفتہ | رفت بگوشۂ روضۂ رضوان
صبر و تحمل باید کردن | اے دلِ نالان اے دلِ نادان

فاتحہ خواند و فاتح گفتہ

اہلِ ادب، دہ گونہ سلیمان
۹۱۰ = ۱۰ × ۱۹۱ × ۴۴
۱۹۵۳ء

یادِ سیدؒ

از جناب یحییٰ اعظمیؒ

ہوگئی پھر تازہ یادِ سیدِ معجز رقم | آگئی تیئیس ۲۳ نومبر کی گذشتہ شامِ غم

(۹)

مچا تہلکہ اہلِ دل میں اٹھا شور محشر جہان سے
زمانہ ہوا صرفِ ماتم، بہیں ندیان اشک غم کی
خبر دی بسالِ ہلالی، ملائک نے معراج مجکو
مکین بہشتِ حسین ہین، محمد سُلیمان ندوی

۷۳ ہجری ۱۳

(۱۰)

نمودم بہ خیلے تفکر بہگ دو و تبا تاریخ موزون
چو رفتہ بآغوشِ رحمت، محمد سلیمان ندوی
سر وشم بسالِ مسیحی، بگفتا اے معراج محزون
تنّا ے تو یسع جنّت، محمد سُلیمان ندوی

۵۳ عیسوی ۱۹

درد مندِ غم دل معراج دھولپوری

۵۳ عیسوی ۱۹

قطعۂ تاریخ

از

جناب قاضی فتح محمد فاتح بی اے منشی فاضل بھکر

آہ برفت آن ندوی سلیمان
جانب جنت شادان و فرحان

خلق بمرگش زار و پریشان
چاک گریبان سینہ بریان

اہلِ کراچی افتان خیزان
سوے جنازہ زود گریزان

جملہ مسلمان ششدر و حیران
آہ سلیمان آہ سُلیمان

صورت و معنی ظاہر و پنہان
اسف و تاسف خوان و گریان

اشک پیاپے ریزان ریزان
آہ تو اتر افتان افتان

اشک بہ دیدہ دجلہ دجلہ
نالہ و گریہ قلزم و عمان

درد و عنا و کرب و مصیبت
بوشر باشد صورتِ طوفان

درد نہ حدِ تکلم افزون
رنج برون از حیطۂ امکان

صد آه

از

جناب حکیم سید مصلح الدین صاحب کاظمی

آه اے سید و علامہ سلیمان صد آه — آه اے باعثِ صد نازشِ دوران صد آه
آه اے پرچمِ معمورۂ شبلی منزل — آه اے طرۂ آن شبلیِ ذیشان صد آه
آه اے آنکہ تو غالب و حالی نازان — آه اے صاحبِ اقبالِ درخشان صد آه
آه اے رمز شناسِ ادب و روحِ سخن — آه اے واقفِ اسرارِ قلمدان صد آه
آه اے شاهِ سخن فخرِ زمن نازِ وطن — آه ممدوحِ همه گبر و مسلمان صد آه
آه اے متبعِ سنت و متبوعِ زمان — آه اے پیکرِ اوصافِ رسولان صد آه
آه اے مجتنبِ جمله نواهی ز شباب — آه تا شیب چنان تابعِ قرآن صد آه
عالمِ عظمتِ سرکارِ دو عالم بکمال — کاتبِ سیرتِ لولاک بدیسان صد آه
صدقِ بوبکرؓ، نظامِ عمرؓ و حبِ علیؓ — بود روشن ز تو با غیرتِ عثمانؓ صد آه
انجمان پرتوِ خود گرچه فرو می ریزند — بود نورِ تو دگر، اے مہِ تابان صد آه
آمدی دشتِ سخن گشت گلستانِ بهار — رفتی، شد همه گلزار بیابان صد آه
گلشنِ علم و ادب آه نمودی ویران — کردی آباد مگر شهرِ خموشان صد آه
هاتفم گفت بتاریخِ وفاتش ثاقب — رونقِ باغِ ادب آه سلیمان صد آه
۱۳۷۳ھ

عیسوی هم بہمین لهجۂ غم ظاهر کرد
خود استادِ زمان رفت ز مایان صد آه
۱۹۵۳ء

ہو گیا مصروفِ ماتم، پھر جہانِ علم و فن
وقفِ غم پھر ہو گئی دنیائے قرطاس و قلم

مسندِ استاذ پھر سونی نظر آنے لگی
بن گئی "بزمِ معارف" پھر سراپا بزمِ غم

رمزِ حکمت کے ہیں اب وہ نہ نکتے علم کے
ہو گئی ہے کس کے ماتم میں جبینِ خامہ خم

دیر سے روشن تھی جو وہ شمعِ دانش بجھ گئی
ہے بجا گر ہیں سیہ پوش آج اسرار و حکم

کس کی محفل میں قلم اسکا ہو اب معجز طراز
وہ کہ مسجودِ ملک تھا جس کا ہر نقشِ قلم

نسخۂ سیرت ابھی تک تشنۂ تکمیل ہے
اب کہاں سے لائیں ہم وہ خامۂ معجز رقم

ہم نے مانا منتظر تھی قدس کی محفل، مگر
اس قدر عجلت تھی کیا اے سیدِ الاشم

کارنامے تیرے مقبولِ حریمِ قدس ہیں
تیری صورت کی قسم، پاکیزہ سیرت کی قسم

سرورِ کونین کے دربار میں ہے مستجاب
زندگی بھر کی تری سعیِ گرامی لاجرم

صرف کر دی مدحِ سرکارِ دو عالم میں حیات
تیرے طغرائے شرف کے واسطے یہ کیا ہے کم

تیری ہی ذاتِ گرامی کے لئے مخصوص تھے
طرۂ تاجِ معارف، خاتمِ مجد و کرم

تیرے فیضانِ معارف سے سبھی تھے بہرہ مند
ہند سے تا خاکِ پاکستان عرب سے تا عجم

روز اٹھتے ہیں کہاں ایسے رجالِ علم و فن
عصرِ نو میں یہ مبارک زندگی تھی مغتنم

غیر ممکن ہے تلافی آہ اس فقدان کی
تیری ہستی تھی وطن میں نازشِ خیر الامم

سینۂ اُمت سے مٹ سکتا نہیں ہرگز یہ داغ
کس طرح ملت بھلائے "سید الملت" کا غم

تیرے اس عزمِ سفر کی ہم کو کیوں ہوتی خبر
دیر سے تھے دور تیری بزم سے اے محترم

آہ کیا معلوم تھا، اے سید و مولائے ما
محفلِ امکان سے اب اٹھنے کو ہیں تیرے قدم

ورنہ کچھ جلوے جمالِ آخریں کے پاکے ہم
اپنی چشم تر میں کر لیتے ادب سے مرتسم

آہ یہ تنہا نہیں اک ملت و اُمت کا غم
بلکہ ہے سارے جہانِ دانش و حکمت کا غم

تلملا کر مسکراہٹ رہ گئی غنچوں کی آج　　ہو گئی تبدیل اشکوں میں ہنسی پھولوں کی آج
لٹ گیا تاریخ حاضر کا موادِ بے شمار　　بجھ گئی شمع کمالی چھن گیا جوشِ بہار
اُف کہ ماہِ بزم ندوہ پر گہن طاری ہے آج　　دودِ اسود، ابرِ تیرہ، نور پر بھاری ہے آج
ایک اعظم گڑھ ہی کیا عالم ہوا ماتم کدہ　　جسم کیا دل بھی ہیں ملبوس لباسِ غم کدہ
سیرتِ شاہِ دو عالم کا مصنف مر گیا　　گوہر نایاب سے پہلو زمیں کا بھر گیا
مر گیا سید سلیمان؟ کون کہتا ہے ندیم　　سو گیا وہ گور میں کس نے کہا تجھ سے ندیم
اُس کی تصنیفات لافانی تو زندہ ہیں ابھی　　اُس نے جو سینچے تھے وہ پودے شگفتہ ہیں ابھی
موت اُس کی اصل میں اک دوسری تمہید ہے　　ورنہ ہر سچی سلیمان زندۂ جاوید ہے
آنے والے ہر مؤرخ کے لئے زندہ ہے وہ　　جادۂ تاریک میں نجم درخشندہ ہے وہ

اس کی تصنیفات دیں گی تقویت اسلام کو
ڈال دیں گی گردشوں میں گردشِ ایام کو

تاریخ وفات حضرت علامہ سلیمان ندوی

از

جناب مشتاق واندیری

(۱)

سینہ کوبی میں ہر اک ہے مبتلا
ہے جہان غمگین و دل افگار آج
خلد کا پروانہ سید کو ملا
داخلِ جنت ہوا سید آج

۱۳۷۳ھ

(۲)

سید عالی و سلیمان جاوید
وہ مورخ وہ فخر اہل تعلیم
اُن کو جنت خدا نصیب کرے
جن کی خوبی تھی تو اضع و تکریم

۱۹۵۳ء

قطعہ تاریخ

از

جناب سید شاہ محمد منظور الرحمن اختر کاکوی

پھول پژمردہ ہیں اور کلیاں اداس　　روح فرسا کیا خبر لائی صبا
مرثیہ خواں کیوں ہیں مرغانِ چمن　　رنگ پھیکا ہو گیا کیوں باغ کا
رہبرِ قوم و امامِ اہلِ دین　　مخزنِ صد علم و زہد و اتقا
فخرِ اشرف، نازِ شبلی حیف حیف　　ہائے وہ سیرت نگارِ مصطفٰے
گلستانِ علم کو تھا جس پہ ناز　　وہ گلِ سرسبد ہی مرجھا گیا
وہ سلیمان باعثِ فخرِ بہار　　سوگ میں ہے جس کے سارا انڈیا
ہند ہی کیا عالمِ اسلامیان　　وقفِ نالہ وقفِ غم وقفِ بکا
اہلِ ندوہ غم کی اک تصویر ہیں　　دار شبلی میں ہے اک محشر بپا
روح یہ کس کی چلی سوئے فلک　　جس سے روشن ہو گئے ارض و سما
عالمِ بالا سے آئی ہے صدا　　مرحبا اھلاً و سھلاً مرحبا
می شود بارانِ رحمت را نزول　　بر مزارش روز و شب صبح و مسا

سالِ رحلت اس سے جب پوچھا گیا
بولا اختر فخرِ ملت ہائے وا

آہ سید سلیمان ندوی

از جناب فانی مرادآبادی

آج اک مہرِ درخشاں تیرگی میں کھو گیا　　وسعتِ آغوشِ ظلمت میں سویرا ہو گیا

ہجری و عیسوی تاریخی مادے

از

جناب نسیم دہلوی

برائے ۱۳۷۳ھ

۱- آہ مولانا سید محمد سلیمان صاحب ندوی سنوہی انا للہ وانا الیہ راجعون

۲- آہ علامہ سید محمد سلیمان ندوی علیہ الرحمۃ

۳- آہ سید محمد سلیمان صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ

۴- بلند قدر زیبائے جہان مولٰنا سید محمد سلیمان ندوی مرحوم

۵- ہادی دین سید محمد سلیمان ندوی رحلت کرد

۶- ارتحال علامہ جہان سید محمد سلیمان صاحب ندوی

۷- بقول انہ من سلیمٰن و انہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۸- آہ مقبول دوران عالیجناب مولانا سید محمد سلیمان صاحب ندوی چل بسے

برائے ۱۹۵۳ء

۱- آہ ہادی مخدوم مولانا سید محمد سلیمان صاحب ندوی انا للہ وانا الیہ راجعون

۲- ادیب مولانا سید محمد سلیمان ندوی غفرلہ اللہ

۳- امیر علم و دین و ادب مولٰنا سید محمد سلیمان صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ

۴- موحد ادیب مولانا سید محمد سلیمان صاحب ندوی رضوان میں ہیں

۵- صاحب اقبال و علم و فضل مولانا سید محمد سلیمان صاحب ندوی

۶- آہ واحد مورخ اسلام مولانا سید محمد سلیمان صاحب ندوی مرحوم

۷- ادیب مولانا سید محمد سلیمان صاحب کراچی پاکستان میں فوت ہوئے

۸- حضرت ادیب سید محمد سلیمان صاحب ندوی

قطعۂ تاریخ

از

جناب عطاء الرحمٰن پالوی

کرے کیا کہ انسان مجبور ہے — خدائی میں حکم قضا ہے اٹل

یہ سید سلیمان ندوی کی موت — ہے ماتم کی جا اور غم کا محل

(۳)

موت عالم کی موت عالم ہے
مضطرب ہو رہے ہیں اہلِ دل
بے شبہہ سید سلیمان تھے
زبدۂ خلق زینتِ محفل

۱۳۷۳ھ

(۴)

سید با خدا کے مرنے پر
موت کو موت بھی نہیں آئی
باغ رضواں پائیں خلد میں وہ
جن کے غم میں ہے خلق بولائی

۱۳۷۳ھ

قطعۂ تاریخ و تاریخی مادے

راقم تردامن سید مہدی حسن
۱۳۷۳ھ
جادو رقم ۔ سیفِ قلم ، علامہ ۔ استادالکل
۱۳۷۳ھ

علوم اسلام کے جوئے شیر کے فرہاد
سید محمد سلیمان بدر الاسلام
۱۹۵۳ء

غفرہ المجید
۱۳۷۳ھ

ہر طرح سے وہ کامیاب ہوئے
اُس کی رحمت سے فیضیاب ہوئے
اپنی خدمات کا صلہ پایا
داخل خلد بے حساب ہوئے
۱۳۷۳ھ

در سن رحلتش چو شد مامور
ہاتفے گفت نداہدے مغفور
۱۳۷۳ھ

یہ ان کی نہیں علم و فن کی ہے موت | نہ آنکھوں سے کیوں آئیں آنسو نکل
وہ علامۂ دہر شیریں مقال | مکمل صفات و مجسم عمل
عطا کو ہوئی فکر تاریخ کی | تو یہ مادہ خود ہی آیا نکل

نہ کچھ تعمیہ اور نہ کچھ تخرجہ
ہم عالم بے بدل با عمل

۱۳۷۳ھ

قطعۂ تاریخ ارتحال

از

جناب اصطفا خان صاحب لکھنوی

اجل مرتبت سید سلیمان ندوی

بفردوس سید سلیمان ندوی | ز دار فنا رفت شادان و فرحان
سبک گام چون بود بر جادۂ دین | گران بود منزل چہ سان گشت آسان
نماز عشا کرد و از اشارد | بہ پیک اجل گفت لبیک شادان

بگفت اصطفا سال رحلت بہجری
ولا شیخ الاسلام سید سلیمان

۱۳۷۳ھ

مجلسِ ادارت

جناب مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی — صدر

جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی — رکن

جناب ڈاکٹر عبد الستار صاحب صدیقی — "

جناب مولانا عبد السلام صاحب ندوی — "

شاہ معین الدین احمد ندوی — مرتب

سید صباح الدین عبد الرحمٰن ایم اے — شریک

(طابع و ناشر صدیق احمد)